BAIS101CCT

سیرت نبوی، خلافت راشدہ اور اموی دور

(Seerat, Pious Caliphate & Umayyad Period)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

برائے

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے)

(پہلا سمسٹر)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course-Bachelor of Arts

ISBN: 978-93-80322-90-2

Edition: June, 2021

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	جون، 2021
قیمت	:	170/-
تعداد	:	3000
ترتیب وتزئین	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مطبع	:	کرشک پرنٹ سولیوشنس، حیدرآباد

سیرت نبوی، خلافت راشدہ اور اموی دور

(Seerat, Pious Caliphate & Umayyad Period)

For B.A. 1st Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

مجلس ادارت

(Editorial Board)

مضمون مدیران

(Subject Editors)

Prof. Abdul Ali	پروفیسر عبدالعلی
Former Head, Dept of Islamic Studies, AMU, Aligarh	سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. Mohd. Fahim Akhter	پروفیسر محمد فہیم اختر
HoD, Dept of Islamic Studies, MANUU	صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
Dr. Ghazanfar Ali Khan	ڈاکٹر غضنفر علی خان
Asso. Prof. of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU	اسوشی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ
Assistant Professor, Islamic Studies, DDE	اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم
Mr. Saleh Ameen	جناب صالح امین
Guest Faculty, Islamic Studies, DDE	گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم
Mr. Mohammad Haziq	جناب محمد حاذق
Guest Faculty, Islamic Studies, DDE	گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم

زبان مدیر

(Language Editor)

Dr. Mohd Akmal Khan	ڈاکٹر محمد اکمل خان
Guest Faculty (Urdu), DDE	گیسٹ فیکلٹی (اردو)، نظامت فاصلاتی تعلیم

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد-32، تلنگانہ، بھارت

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر مجیب اختر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 1 تا 4
جناب صالح امین، گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 5
ڈاکٹر ندیم اشرف، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ سنی تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	اکائی 6 تا 11
ڈاکٹر محمد مشتاق، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	اکائی 12
جناب محمد علی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	اکائی 13
مولانا اعجاز ارشد قاسمی، رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ	اکائی 14
ڈاکٹر جمشید احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، یونیورسٹی آف ممبئی، ممبئی	اکائی 15، 23، 24
ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 16
ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	اکائی 17
ڈاکٹر محمد اسامہ، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	اکائی 18 تا 20
مولانا سید عبدالرشید، اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ	اکائی 21 تا 22

پروف ریڈرس:

اول : جناب صالح امین

دوم : جناب محمد حاذق

فائنل : ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ

سرِورق : ڈاکٹر محمد اکمل خان

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : جاہلی دور

اکائی1	جزیرۂ عرب اور عرب قوم	11
اکائی2	جاہلی دور میں عربوں کے سیاسی حالات	26
اکائی3	جاہلی دور میں عربوں کے سماجی وتمدنی حالات	41
اکائی4	جاہلی دور میں عربوں کے مذہبی حالات	56

لاک 2 : مکی زندگی

اکائی5	بعثت سے پہلے کی زندگی	71
اکائی6	بعثت اور تبلیغ اسلام	86
اکائی7	بعثت کے بعد کے اہم واقعات	101

بلاک 3 : مدنی زندگی

اکائی8	ہجرت کے بعد نبی ﷺ کے ابتدائی اقدامات	116
اکائی9	اہم غزوات (حصہ اول)	131
اکائی10	اہم غزوات (حصہ دوم)	146
اکائی11	شخصیت رسول ﷺ	161
اکائی12	تدوین سیرت	176

بلاک 4 : خلافت راشدہ

اکائی13	خلافت راشدہ اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت	191
اکائی14	حضرت عمر بن خطابؓ: حیات اور کارنامے	206
اکائی15	حضرت عثمان بن عفانؓ: حیات اور کارنامے	221
اکائی16	حضرت علی بن ابی طالبؓ: حیات اور کارنامے	236
اکائی17	خلافت راشدہ کا نظم ونسق وخصوصیات	251

بلاک 5 : اموی حکومت (حصہ اول)

اکائی18	بنوامیہ کا قیام واستحکام	266
اکائی19	بنوامیہ کے اہم حکمراں (حصہ اول)	281
اکائی20	بنوامیہ کے اہم حکمراں (حصہ دوم)	296
اکائی21	اموی حکومت کی توسیع	311

بلاک 6 : اموی حکومت (حصہ دوم)

اکائی22	بنوامیہ کا نظم ونسق	326
اکائی23	عہد اموی میں علوم کا ارتقا (حصہ اول)	341
اکائی24	عہد اموی میں علوم کا ارتقا (حصہ دوم)	356

نمونہ امتحانی پرچہ **371**

پیغام

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل واخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزار رہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گرد و پیش اور ماحول کے مسائل ہوں۔ وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ مبارزات (Challanges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمے داری ہے۔ چوں کہ اسی مقصد کے تحت اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔ احقر کو اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمے داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کے بعد اس کے ذمے داران، عام اردو قارئین کے لیے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر کرا کے کتابوں کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تاکہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کرسکیں۔

پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ

وائس چانسلر؍ انچارج

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیغام

آپ تمام بخوبی واقف ہیں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا باقاعدہ آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا تھا۔ 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا۔ متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی (UGC-DEB) اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہٗ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بند کر کے خود اکتسابی مواد (SLM) از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھے بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ اِس طرح سے یونیورسٹی نے روایتی طریقۂ تعلیم سے پہلے فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اردو آبادی تک تعلیم پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل یہاں کے تدریسی پروگراموں کے لیے امبیڈکر یونیورسٹی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے نصابی مواد سے من و عن یا ترجمے کے ذریعے استفادہ کیا گیا۔ اِرادہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے اپنا نصابی مواد تیار کرا لیا جائے گا اور دوسری یونیورسٹیوں کے مواد پر انحصار ختم ہو جائے گا، لیکن اِرادہ اور کوشش دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے، جس کی وجہ سے اپنے خود اکتسابی مواد کی تیاری میں اچھی خاصی تاخیر ہوئی۔ بالآخر منظّم اور جنگی پیمانے پر کام شروع ہوا، جس کے دوران میں قدم قدم پر مسائل پیش آئے۔ مگر کوششیں جاری ہیں، نتیجتاً بہت تیزی سے یونیورسٹی نے اپنے نصابی مواد کی اشاعت شروع کر دی ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور 5 ذیلی علاقائی مراکز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی) کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ ڈی ڈی اِی نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر ابوالکلام

ڈائرکٹر، نظامتِ فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو.جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹر) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامیات، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامیات کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعہ تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامیات کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ سمسٹر اول کے اس پہلے پرچہ کا عنوان ''سیرت نبویؐ، خلافت راشدہ اور اموی دور'' ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی اے سمسٹر اول کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل چوبیس اکائیاں ہیں جن کو چھ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں سیرت نبوی ﷺ کے علاوہ خلافت راشدہ اور اموی حکومت (دمشق) پر تحریری مواد مہیا کیا گیا ہے۔

واللہ الموفق

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ (الازھری)

کورس کوآرڈی نیٹر

سیرت نبوی، خلافت راشدہ اور اموی دور

(Seerat, Pious Caliphate & Umayyad Period)

اکائی 1 : جزیرۂ عرب اور عرب قوم

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقصد

1.2 جزیرہ نمائے عرب

1.3 حجاز کے مشہور شہر

1.3.1 جدہ

1.3.2 طائف

1.3.3 بدر

1.3.4 رابغ

1.3.5 مکہ

1.3.6 مدینہ

1.4 یمن اور اس کے مشہور شہر

1.5 طبعی حالت

1.5.1 جبال السراۃ

1.5.2 جبال حجاز

1.6 عرب قوم

1.6.1 عرب بائدہ

1.6.2 عرب عاربہ

1.6.3 عرب مستعربہ

1.7 مشہور قبیلے

1.7.1 بنوقحطان

1.7.2 بنوعدنان

1.8 اکتسابی نتائج

1.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید

اس اکائی میں عرب اور جزیرۂ عرب کا مختصر تعارف کرایا جائے گا، اس میں جزیرۃ العرب کے ممالک، حجاز، یمن وغیرہ کے مشہور شہروں کا تذکرہ ہوگا۔ ساتھ ہی وہاں کے طبعی حالات، عرب اقوام کی تقسیم اور خاندانی قبائل کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

1.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ جزیرۂ عرب سے واقف ہو جائیں گے۔ جزیرۂ عرب کے ضمن میں اُس کے جائے وقوع، مشہور شہر، عرب قوم اور اُن کے مختلف قبائل کے بارے میں آپ معلومات حاصل کرسکیں گے۔

1.2 جزیرہ نمائے عرب

زمین کے جس حصے پر عرب قوم آباد ہے، اس کو ''جزیرہ نمائے عرب'' کہتے ہیں۔ اسے 'جزیرہ نمائے عرب' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تین اطراف میں پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔ جزیرہ نما عرب براعظم ایشیاء کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ جزیرہ نما عرب مشرق وسطی کا اہم ترین حصہ ہے، تیل اور گیس کے وسیع تر ذخائر اس خطہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جزیرہ نما عرب کا ساحل مغرب میں بحیرہ احمر اور خلیج عقبہ، جنوب مشرق میں بحیرہ عرب اور شمال مشرق میں خلیج عمان، آبنائے ہرمز اور خلیج فارس سے ملتا ہے۔

جزیرہ نما عرب ایشیاء کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس جزیرہ نما کا رقبہ تیس لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے اور جغرافیائی اعتبار سے تین منطقوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مرکزی حصہ صحرائے عرب کے نام سے مشہور ہے اور اس جزیرہ کا وسیع ترین علاقہ ہے۔ شمالی علاقے کا نام حجاز ہے۔ حجاز حجز سے مشتق ہے جس کے معنی حائل اور مانع ہونے کے ہیں۔ چونکہ یہ سرزمین نجد اور تہامہ کے درمیان واقع اور مانع ہے اسی لیے اس علاقے کو حجاز کہا جاتا ہے۔ شمالی علاقے میں عراق، اردن، مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں بحر عمان اور مغرب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ واقع ہے۔ جس کی حدود کوہ زاگرس تک جاکر ختم ہو جاتی ہیں۔ جغرافیائی طور پر یہ بغیر کسی واضح علامت کے صحرائے شام سے مل جاتا ہے، اور سیاسی طور پر جزیرہ نما عرب سعودی عرب اور کویت کی شمالی سرحدوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس جزیرہ نما کا جنوبی حصہ بحر ہند اور بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے جس میں یمن اور ''حضر موت'' کے علاقے شامل ہیں۔ جنوبی منطقے کے علاوہ جزیرہ نما کا پورا علاقہ خشک اور بے آب و گیاہ صحراء ہے، مگر بعض جگہوں پر اس میں نخلستان بھی پائے جاتے ہیں۔

مولانا محمد رابع ندوی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جزیرہ نمائے عرب تقریباً ساڑھے چونتیس درجہ طول البلد مشرقی سے تقریباً 60 درجہ مشرقی تک، اور ساڑھے بارہ درجہ عرض البلد شمالی سے 32 درجہ شمالی تک پھیلا ہوا ہے، اس کے جنوب میں بحیرۂ عرب، مشرق میں خلیج عمان، خلیج عربی اور جنوب مشرقی عراق، مغرب میں بحیرۂ احمر اور علاقۂ اردن و فلسطین اور شمال میں شام و عراق کے ملک پڑتے ہیں''۔

بحرین (تکنیکی طور پر جزیرہ نما سے کٹا ہوا ایک جزیرہ ہے)، کویت، قطر، سلطنت عمان، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور یمن جزیرہ نمائے عرب کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

جزیرہ نما کا بیشتر حصہ سعودی عرب میں شامل ہے اور آبادی کی اکثریت بھی سعودی عرب اور یمن میں رہائش پذیر ہے۔ جزیرہ نما عرب میں دنیا کے سب سے زیادہ تیل کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی یہیں ہیں۔ معاشی طور پر متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب اس خطہ کی امیر ترین اقوام ہیں۔

عالم عرب دو براعظموں پر محیط ہے، ایک ایشیاء دوسرا افریقہ، اس کا ایشیائی حصہ جزیرۂ نمائے عرب اور بعض دوسرے شمالی ممالک پر مشتمل ہے، جزیرۂ نمائے عرب عربوں کا وطن اصلی اور عربی نسلوں کا اصل منبع وسرچشمہ ہے۔ بعض حضرات زمین کے اس خطے کو سامی نسلوں کا منبع بھی قرار دیتے ہیں، یہ خطۂ زمین متعدد حیثیتوں سے غیر معمولی اہمیتوں کا حامل ہے، کیوں کہ یہ رسول اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اور اسلام کے اولین حاملین اور داعیوں کا گہوارہ رہا ہے، اللہ کی آخری کتاب 'قرآن مجید' یہاں کی زبان میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اسی زبان یعنی عربی میں تدوین کی گئیں۔

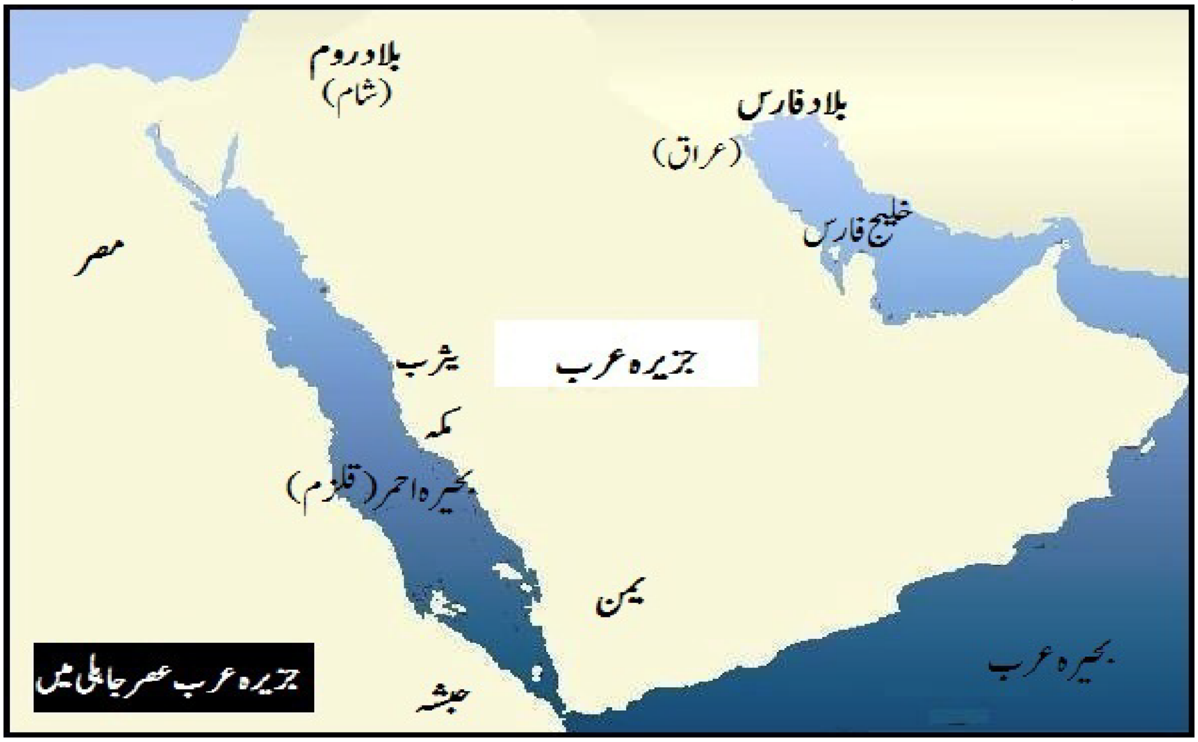

پروفیسر عبدالحلیم ندوی عربی ادب کی تاریخ جلد اول میں رقمطراز ہیں: ''عرب قوم زمین کے جس حصہ پر رہتی ہے، اس کو 'جزیرۂ نمائے عرب' کہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی۔ یہ جزیرہ نما، براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اس کی شمالی سرحدیں شام، جزیرہ (سعودی عرب) اور عراق سے ملتی ہیں اور جنوبی سرحدیں بحر ہند سے۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس اور عمان کے علاوہ بحر ہند واقع ہیں اور مغرب میں بحر احمر یا بحر قلزم (Red Sea) ہے۔ ملک عرب کے باشندوں کی مجموعی تعداد، یورپ کی مجموعی آبادی کی چوتھائی ہے۔ اس جزیرہ نما کے اندر پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے، جسے 'کوہ سراۃ' کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام کی سرحدوں سے جا ملتا ہے اور اس کی وجہ سے جزیرہ نما عرب قدرتی طور پر دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ (1) مغربی حصہ، (2) مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ 'کوہ سراۃ' کے دامن سے لے کر بحر احمر (Red Sea) کے ساحل

تک پہنچتا ہے،اس لیےاس کے نشیبی علاقے کو(غور) کہتے ہیں اور چونکہ اس علاقے میں گرمی بہت پڑتی ہے،اس لیےاسے ’تہامہ‘ یعنی پیاس لگنے والی جگہ بھی کہتے ہیں۔مشرقی حصہ ابھرا ہوا ہے اور اس کی سرحدیں عراق سے ملی ہوئی ہیں، اس لیے اس کو ’نجد‘ یعنی اونچی زمین کہتے ہیں۔ان دونوں حصوں کے بیچ زمین کا جو ٹکڑا ہے اسے حجاز یعنی ’حد فاصل‘ کہتے ہیں، کیوں کہ یہ دونوں کے درمیان فاصل کا کام کرتا ہے۔اس حصے کا وہ خطہ جس میں نجد کے بعض علاقوں کے علاوہ ’یمامہ‘، ’بحرین‘ اور ’عمان بھی آجاتے ہیں۔یہ حصہ عروض یعنی چوڑائی میں پڑا ہوا حصہ اس لیے کہلاتا ہے کہ یہ یمن اور نجد کے درمیان چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔حجاز کے جنوب میں جو علاقہ ہے اسے ’یمن‘ کہتے ہیں، یمن کے معنی داہنی جانب اور خیر و برکت والی زمین کے ہیں، چوں کہ یہ خانہ کعبہ کی داہنی جانب ہے اور خاصا سرسبز و شاداب علاقہ ہے، اسی لیے سب سے پہلے یونانیوں نے اسے خیر و برکت کی سرزمین کے نام سے یاد کیا، اس کے بعد عربوں نے بھی اسی نام کو اپنایا اور آج تک یہ علاقہ اسی نام سے مشہور ہے‘‘۔

’’حجاز جزیرہ نما عرب کا خاصا گرم خطہ ہے، یہاں بہت پرانے پہاڑ پائے جاتے ہیں، جن پر سورج کی سخت کرنیں جب پڑتی ہیں تو یہ گرم ہو کر سارے خطہ کو آگ سے بھر دیتے ہیں، یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، اسی لیے عام طور یہاں پر خشکی کا سماں رہتا ہے۔ان پہاڑوں کے بیچ میں بعض وادیاں بھی ہیں، جن میں جہاں تہاں گھاس پھوس اُگ آتی ہے۔طائف اس علاقے کا سب سے سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔یہاں ہریالی کے علاوہ پھلوں میں انجیر، انگور، سیب اور زیتون بکثرت پیدا ہوتے ہیں‘‘۔

1.3 حجاز کے مشہور شہر

حجاز میں کئی مشہور اور بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں، ذیل میں ان پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے:

1.3.1 جدہ:

جدہ (عربی: جدة) تاریخی خطہ حجاز کے تاریخی علاقہ تہامہ میں بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع ایک شہر ہے جو مغربی سعودی عرب کا اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز ہے۔نیز یہ مکہ علاقہ کا سب سے بڑا شہر اور بحیرہ احمر کی سب سے بڑی بندرگاہ بھی ہے۔

علاوہ ازیں شہر جدہ حرمین شریفین (اسلام کے مقدس ترین مقامات مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام اور مدینہ منورہ کی مسجد نبوی) کے لیے اہم گزرگاہ ہے۔جب کہ مدینہ منورہ میں بھی ہوائی اڈا موجود ہے جس کے ذریعہ کچھ حجاج اور زائرین براہ راست وہاں پہنچ جاتے ہیں، تاہم اس سلسلہ میں جدہ کے ہوائی اڈہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس سے قبل بہت سے زائرین بحری جہازوں کے ذریعہ جدہ اسلامی بندرگاہ سے بھی آتے تھے تاہم اب زیادہ تر ہوائی سفر ہی کرتے ہیں۔

اقتصادی طور پر جدہ سعودی عرب اور مشرق وسطی میں قائدانہ کردار حاصل کرنے کے لیے سائنس اور انجینئرنگ میں مزید ترقی پذیر سرمایہ کاری پر اپنی توجہ مرکوز کر رہا ہے۔

جدہ کو سعودی عرب کے تفریحی شہروں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔بحیرہ احمر سے قریب ہونے کی وجہ سے ملک کے دوسرے حصوں کے برعکس ماہی گیری اور سمندری غذا یہاں کی ثقافت پر غالب ہے۔یہ شہر پہلے سعودی عرب کا سب سے زیادہ کھلا شہر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ دیگر شہروں کی بہ نسبت یہاں اسلامی اقدار پر عمل میں قدرے رعایت تھی۔

جدہ شہر تقریباً 3000 سال پرانا ہے۔روایات کے مطابق جدة بن جرم بن ربان بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ جو اسلام سے قبل عرب میں پیدا ہوا تھا، اس کا خاندان اس جگہ آباد تھا، بعد میں اسی کے نام پر اس شہر کا نام ’جدہ‘ رکھ دیا گیا تھا۔647ء میں خلیفہ راشد عثمانؓ بن عفان نے

جدہ کو مکہ میں آنے والے حجاج کے لیے بندرگاہ کے طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ اس شہر کے نام کے تلفظ میں کئی روایات ہیں۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق شہر کا اصل نام جُدۃ ہے۔ عربی میں جُدۃ ساحل کو کہتے ہیں۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شہر کا نام جَدۃ ہے (جدۃ مقامی لوگوں کا تلفظ ہے)، اس کے معنیٰ ''دادی'' کے ہیں۔ شہر میں ایک قدیم قبرستان ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں آدم علیہ السلام کی بیوی حوا دفن ہیں۔ روایات کے مطابق بیبی حوا کی وفات کے بعد ان کو جدہ میں دفن کیا گیا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس شہر کو 'جِدہ' کہا جانے لگا۔ جدۃ وہ تلفظ ہے جو مقامی لوگ استعمال کرتے ہیں۔

1.3.2 طائف:

طائف سعودی عرب کے صوبہ مکہ کا ایک شہر ہے جو مکۃ المکرّمہ کے نزدیک ہی واقع ہے۔ یہ سطح سمندر سے 1,700 میٹر (5,600 فٹ) کی بلندی پر واقع ہے۔ طائف کا موسم خوشگوار ہے اس لیے سعودی حکومت کے بیشتر امراء گرمیوں میں طائف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کی آبادی ساڑھے پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے انگور اور شہد مشہور ہیں۔ اس شہر کا تذکرہ اسلامی تاریخ میں بھی آتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ اسلام کے لیے طائف کا سفر کیا تھا، لیکن طائف کے لوگوں نے آنحضور ﷺ کے ساتھ بڑا برا سلوک کیا تھا۔ انہوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے یہاں تک کہ آپؐ کے دونوں جوتے لہولہان ہو گئے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی میں اس علاقے میں بنوثقیف کا قبیلہ رہتا تھا۔ شہر کے اردگرد دیوار تھی اور لوگ بت پرست تھے۔ ان لوگوں نے کعبہ پر حملہ کے وقت ابرہہ کا ساتھ دیا تھا۔ 620ء میں حضرت محمد ﷺ کے طائف کے سفر کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب مسلمان کی عظمت وشوکت کی شہرت چاروں طرف ہونے لگی تھی، اور اس کے بعد وفود کی آمد اور قبولیت اسلام کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اسی وقت طائف والے بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ طائف پر کافی صدیوں تک عربوں کی حکمرانی رہی مگر اسے 1517ء میں شریف مکہ نے عثمانی سلطان سلیم اول کے حوالے کر دیا۔ 1802ء میں نجدی افواج نے اسے فتح کر لیا جن کا تعلق آل سعود سے تھا، مگر 1813ء میں سلطان محمود دوم نے اسے دوبارہ عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ 1916ء میں شریف مکہ نے اس پر قبضہ کیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد شریف مکہ حسین بن علی اور نجد کے حکمران عبدالعزیز السعود کے درمیان اس شہر پر جھگڑا رہا۔ حتیٰ کہ 1926ء میں طائف عبدالعزیز آل سعود کے بادشاہ بننے پر اس کے قبضہ میں آیا اور سعودی عرب کا حصہ بنا۔

1.3.3 بدر:

بدر کا پورا نام بدر حنین ہے جو سعودی عرب کے صوبہ المدینہ میں مدینہ منورہ شہر سے 80 میل دور، شام کو جانے والے راستہ میں ایک گاؤں ہے۔ یہیں پر اسلام کی پہلی جنگ لڑی گئی تھی جس میں اسلام کے 313 جانبازوں نے کفار مکہ کے ایک ہزار کے لشکر کو مات دی تھی، حالانکہ ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، یعنی فوج میں سوار سپاہیوں کی تعداد 2 تھی، شمشیریں اور تلواریں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ 2 ھجری بمطابق مارچ 624ء میں مسلمانوں اور قریش کے درمیان حق و باطل کا اولین معرکہ پیش آیا۔ جو غزوہ بدر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

1.3.4 رابغ:

رابغ سعودی عرب کے مغربی ساحل (بحیرہ احمر) پر ایک قدیم شہر ہے۔ یہ صوبہ مکہ میں واقع ہے۔ سترہویں صدی کے ابتدائی سالوں تک اس کا نام جحفہ تھا۔ کچھ قدیم کہانیوں کے مطابق یہ شہر مکمل طور ایک سمندری طوفان سے تباہ ہو گیا تھا، تعمیر نو کے بعد اس کا نام تبدیل ہو کر ''رابغ'' ہو گیا۔

1.3.5 مکہ:

مکہ جسے عربی میں 'المکۃ المکرّمۃ' کہتے ہیں، تاریخی خطہ حجاز میں سعودی عرب کے صوبہ مکہ کا دارالحکومت اور مذہب اسلام کا مقدس ترین شہر ہے۔ شہر کی آبادی 2004ء کی مردم شماری کے مطابق 12 لاکھ 94 ہزار 167 ہے۔ مکہ جدہ سے 73 کلومیٹر دور وادی فاران میں سطح سمندر سے 277 میٹر بلندی پر واقع ہے۔ یہ بحیرہ احمر سے 80 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ شہر اسلام کا مقدس ترین شہر ہے، کیونکہ روئے زمین پر مقدس ترین مقام بیت اللہ یہیں موجود ہے اور تمام باحیثیت مسلمانوں پر زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ یہاں کا حج کرنا فرض ہے۔

معروف مؤرخ ابن خلدون کے مطابق مکہ پہلے بکہ کے نام سے جانا جاتا تھا تاہم مؤرخین کے درمیان اس امر پر اختلاف ہے۔ ابراہیم النخعی نے بکہ کو کعبہ اور مکہ کو شہر سے منسوب کیا، جبکہ امام زُہری بھی اسی کے حامی ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بکہ میں استعمال ہونے والا 'ب' دونوں آوازوں کے درمیان قربت کے باعث بعدازاں 'م' میں تبدیل ہوگیا۔ مکہ کو 'ام القریٰ' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

1.3.6 مدینہ:

یہ حجاز کا دوسرا سب سے مشہور اور مقدس شہر ہے۔ مدینہ منورہ مغربی سعودی عرب کے خطہ حجاز کا شہر ہے، جہاں حضرت محمد ﷺ کا روضہ مبارک ہے۔ یہ شہر اسلام کا دوسرا مقدس ترین شہر ہے۔ شہر کی آبادی 2004ء کی مردم شماری کے مطابق 9 لاکھ 18 ہزار 889 ہے۔ یہ شہر پہلے ایک اہم تجارتی قصبہ تھا اور یہاں کے بت پرست باشندے ہر سال زیارت مکہ کیا کرتے تھے، ان دونوں شہروں کا بت ''منات'' تھا۔ یہ شہر عرب یہودیوں کا بھی مرکز تھا، یہاں بنو قینقاع، بنو نظیر، بنو سیدہ، بنو حارث، بنو جشم، بنو نجار اور بنو قریظہ کے یہودی قبائل آباد تھے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مدینہ میں یہودیوں کے علاوہ دو معروف قبائل بنو اوس اور بنو خزرج بھی موجود تھے۔ اس شہر کا پرانا نام یثرب تھا، لیکن حضرت محمد ﷺ کی ہجرت مبارکہ کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی پڑ گیا تھا، اور پھر بعدازاں یہ شہر اولین اسلامی ریاست کا دارالخلافہ بنا۔

خصوصیات: شہر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مسجد نبوی اور نبی کریم ﷺ کا روضہ مبارک ہے۔ جس کی زیارت کے لیے ہر سال لاکھوں فرزندان توحید یہاں پہنچتے ہیں۔ تاریخ اسلام کی پہلی مسجد 'مسجد قباء' بھی مدینہ میں ہے۔ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ میں بھی صرف مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت ہے۔

1.4 یمن اور اس کے مشہور شہر

یمن مشرق وسطیٰ کا ایک مسلم ملک ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں سعودی عرب اور عمان، جنوب میں بحیرہ عرب ہے اور مغرب میں بحیرہ احمر واقع ہے۔ یمن کا دارالحکومت صنعاء ہے اور عربی اس کی قومی زبان ہے۔ یمن کی آبادی 2 کروڑ سے زائد ہے، جن میں زیادہ تر عربی بولتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں یمن عربوں کی اصل سرزمین ہے۔ قدیم دور میں یمن تجارت کا ایک اہم مرکز تھا، جو مسالوں کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ یہ وہ قدیم سرزمین ہے جس میں سے ولادت نبوی ﷺ سے کچھ دنوں پہلے ایک ابرہہ نامی عیسائی بادشاہ خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ خطہ حجاز کے مقابلے میں بہت سرسبز و شاداب ہے اور پرانی تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ اس علاقے میں تاریخ کی چند بہت مشہور و ممتاز ہستیاں ابھری ہیں، جنھوں نے تہذیب و تمدن کے بعض ایسے نقوش چھوڑے ہیں، جو صدیوں تک ان کے ذہنی ارتقا اور ان کے فضل و کمال کی نشاندہی کرتے رہیں گے۔ یمن کے مشہور شہروں میں ''نجران'' کا ذکر عربی ادب کی تاریخ میں بطور خاص کیا جاتا ہے، یہاں کے لوگ عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔ یہاں مکہ مکرمہ کے خانہ کعبہ کی طرح ایک عبادت گاہ بھی تھا، جس میں یہاں کے لوگ عبادت کیا کرتے تھے۔

یمن کا دوسرا سب سے مشہور شہر ’’صنعا‘‘ ہے۔اس کے شمال مشرق میں ’’مآرب‘‘ کا وہ مشہور شہر آباد تھا، جہاں کی رہنے والی ملکہ ’’سبا‘‘ تھی۔، جسے ’’سبا‘‘ بھی کہتے تھے۔یہیں وہ مشہور بند تھا، جسے قرآن کریم میں ’سد مآرب‘ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔بعد میں یہ سیلاب میں بہہ گیا تھا اور یہاں کے باشندگان ہجرت کر کے عمان میں آباد ہو گئے تھے۔حجاز کے اسی علاقے کے جنوبی حصے میں ’’حضرموت‘‘ کا علاقہ ہے، جس کے شمال میں شہر ’احقاف‘‘ آباد ہے، جہاں ’’عاد‘‘ کی قوم آباد تھی، اس کا ذکر قرآن کریم کے سورۃ ’’الاحقاف‘‘ میں آیا ہے۔

1.5 طبعی حالت

مولانا محمد رابع حسنی ندوی اپنی کتاب ’جزیرۃ العرب‘ میں رقمطراز ہیں: ’جزیرہ نمائے عرب کو قدیم جغرافیہ داں پانچ حصوں میں تقسیم کرتے تھے، ایک حجاز، یہ وہ کوہستانی خطہ ہے، جو جزیرہ نمائے عرب کے مغربی ساحل کے قریب شمال میں فلسطین واردن کے جنوب سے، جنوب عرب میں یمن کے شمال تک شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے تہامہ، یہ وہ میدانی علاقہ ہے، جو مذکورہ بالا کوہستانی خطہ کے مغربی ساحل سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ تیسرے نجد، یہ وہ سطح مرتفع (پلیٹو) ہے، جو حجازی پہاڑوں کے مشرقی جانب وسیع علاقے میں واقع ہے۔ چوتھے یمن، یہ حجاز وتہامہ کے جنوب میں واقع بلند سلسلۂ کوہ اور اس کے مغربی جانب واقع میدانی وساحلی خطہ کو کہتے ہیں، لیکن یہ تقسیم دراصل مکمل نہ تھی، کیونکہ اس میں حضرموت کا علاقہ اور عمان کا علاقہ شامل نہیں، اسی طرح احساء کا خطہ بھی شامل نہیں، جن کا تذکرہ عرب جغرافیہ دانوں کے یہاں جزیرۃ العرب کے ہی حصوں کے طور پر ملتا ہے۔لیکن اب جزیرۃ نماء کو صرف تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا، ایک اس کے مغربی اور جنوبی ساحلوں کے پہاڑ اور ان کے ساحل ومیدان، اس میں حجاز وتہامہ، عسیر ویمن، حضرموت، شحر مہرہ وظفار اور عمان شامل ہیں۔

دوسرے جزیرۃ العرب کے مختلف صحراء اور ریگستان، اس میں صحراء الربع الخالی، الدہناء، النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں۔

تیسرے جزیرہ نما کی سطح مرتفع (جو اس کے وسط میں ہے) نیز اس کے مشرق میں واقع سواحل اور میدان اس میں نجد (یمامہ، قصیم، جبال طے) احساء قطر، کویت اور بحرین شامل ہیں‘‘۔

جزیرہ نمائے عرب کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کی جغرافیائی حالت کی معرفت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر اس کے حدود اربعہ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔اس لیے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے حدود اربعہ کے ساتھ ساتھ اس کے ساحلی علاقوں کی بھی معرفت ہو جائے۔جزیرہ نماء عرب کے ساحلی پہاڑ ومیدان غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔یہاں ساحلی پہاڑ ومیدان کو بالتفصیل بیان کیا جا رہا ہے۔

1.5.1 جبال السراۃ:

سلسلہ کوہ سراۃ (Sarawat Mountains) (عربی: جبال السروات) جزیرہ نما عرب کے مغربی ساحل کے متوازی ایک سلسلہ کوہ ہے۔سرات کی ابتدا اردن کی سرحد کے شمال سے شروع خلیج عدن کے جنوب سے ہوتے ہوئے سلسلہ سعودی عرب اور یمن میں جاتا ہے۔جزیرہ نما کے مغربی رخ پر شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے سلسلہ کو جبل السراۃ کہتے ہیں۔یہ سلسلۂ کوہ جزیرہ نما شمال سے جنوب تک اور کچھ جنوب مشرق سے گھرے ہوئے ہیں۔شمال میں اس کا رشتہ شام وفلسطین کے پہاڑوں سے جا ملتا ہے، اس میں منتہائے شمال سے وسط کے بعد تک کے حصے کو جبال الحجاز اور اسکے جنوب کے حصوں کو جبال العسیر اور جبال الیمن کہتے ہیں۔جبال الیمن کے مشرق میں جو پہاڑی سلسلہ چلا ہے، وہ جبال حضرموت کہلاتا ہے، اس کے بعد کچھ دور تک پہاڑ نہیں ملتے، یہاں صرف ساحل اور میدان ہیں، یہ ساحل اور میدان شحر مہرہ اور ظفار کے علاقے کہلاتے ہیں، ظفار کے شمال مشرق میں پھر پہاڑی سلسلہ ملتا ہے، جو جزیرہ نما کے جنوب مشرقی کونے پر ایک قدرے وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے، یہ جبال عمان

کہلاتا ہے۔

نقشہ: کتاب ''جزیرۃ العرب''، مولانا محمد رابع ندوی

پہاڑوں کا یہ سارا سلسلہ عموماً اپنے سامنے سمندروں سے قریب ہے، بعض علاقوں میں ان کے اور سمندر کے درمیان کا ساحل خاصا وسیع وعریض ہے، جیسے حجاز کا ساحل، جس کا عرض عموماً پچاس میل یا اس سے زیادہ ہے، اسی وسعت کی وجہ سے اس کو قدما مستقل الگ علاقہ قرار دیتے ہوئے تہامہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور جبال حجاز کو اس سے علاحدہ ایک الگ علاقہ قرار دیتے ہیں۔ اس تقسیم کے لحاظ سے چونکہ اس کے پہاڑ نجد اور تہامہ کے درمیان ایک دیوار کی سی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کا نام حجاز (رکاوٹ) ہوا۔

جبال حجاز کے علاوہ سلسلۃ السراۃ کے سب پہاڑ عموماً ساحلوں سے قریب ہیں اور ان کے ساحل چوڑے نہیں ہیں، چنانچہ وہ سب ساحل اپنے اپنے پہاڑوں کے علاقوں کے جزء سمجھے جاتے ہیں اور اب تو حجاز و تہامہ بھی ایک ہی علاقہ سمجھا جاتا ہے، جس پر حجاز کا اطلاق ہوتا ہے۔ جبال

السراۃ کی بلندی یمن اور عسیر کو چھوڑ کر اوسطاً پانچ سات ہزار فٹ بتائی جاتی ہے۔ البتہ اس سلسلہ کا عرض کئی کئی سو میل کا ہے، اس سلسلہ کو جگہ جگہ وادیاں (وسیع نالے) قطع کرتی ہیں، جن میں سے بارش کے بعد پانی سیلاب کی صورت میں بہتا ہوا گزرتا ہے، جو مغربی جانب سمندر میں جاتا ہے، اور مشرقی جانب بہتا ہوا صحراؤں اور میدانوں یا ریگستانوں میں جذب ہوتا ہے۔ جبال السراۃ کے مشرقی جانب کا سارا علاقہ بتدریج پست ہوتا چلا گیا ہے، اسی لیے ان پہاڑوں سے مشرقی جانب اتر کر جزیرہ نما کے مشرقی ساحل تک ایک ہلکی سی ڈھال معلوم ہوتی ہے، البتہ مغربی جانب تھوڑے ہی فاصلے پر کافی نشیب شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں اور سمندر کے درمیان پورے ساحلی علاقوں کو جو پہاڑوں کے مغربی یا جنوبی جانب واقع ہیں، تہامہ، اور غور کہتے ہیں، تہامہ اس کے گرم موسم کی وجہ سے اور غور اس کی سطح پست ہونے کی وجہ سے، جو تہامہ جس علاقے کا ہوتا ہے، وہ اس علاقے کے پہاڑوں کے نام کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے، سوائے تہامۂ حجاز کے، کیونکہ وہ اپنی وسعت کی وجہ سے ایک مستقل خطہ بن گیا ہے اور تہامہ اس کا مستقل نام ہو گیا۔

1.5.2 جبال حجاز:

خلیج عقبہ سے یمن کے قریب تک سارے پہاڑی خطہ کو حجاز کہتے ہیں، یہ پہاڑوں کا ایک دیوار نما سلسلہ ہے، جو جزیرہ نما کی سطح مرتفع (نجد) اور تہامہ حجاز کے درمیان حائل ہے، اسی لیے اس کا نام حجاز پڑا۔ حجاز جبال السراۃ کا شمالی جزء ہے، اس کا طول سات میل اور اس کا عرض مع تہامہ اوسطاً پونے تین سو میل ہے، اس کے مشرق میں وسیع سطح مرتفع ہے، جس کو نجد کہتے ہیں۔ اور مغربی جانب ایک وسیع ساحل تہامہ ہے، اسی تہامہ وحجاز میں مکہ اور مدینہ کے مقدس اور مشہور شہر آباد ہیں، حجازی پہاڑی کی عمومی بلندی 6 ہزار فٹ ہے، لیکن اس کے مختلف اطراف مختلف بلندیاں رکھتے ہیں، اس کے شمالی پہاڑ زیادہ بلند ہیں، وسط میں اس کے پہاڑوں کی بلندی زیادہ نہیں، بلکہ پورے جبال السراۃ میں اسی جگہ کے پہاڑ بہت کم بلند ہیں، البتہ اس کے جنوب کے پہاڑ وسط کے پہاڑوں سے بلند ہیں اور ان ہی پر طائف کا شہر آباد ہے۔ علاقۂ حجاز میں شمال اور جنوب کے پہاڑوں کو علاحدہ کر کے دیکھا جائے تو حجاز کے سارے پہاڑ عموماً سپاٹ اور خشک ملیں گے، وہ بجائے شادابی کا ذریعہ بننے کے ہواؤں کو گرم کرتے ہیں اور اپنے علاقوں میں گرمی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں، اسی لیے مکہ مکرمہ باوجودیکہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور پہاڑوں کے قریب ہونے کے سبب گرم اور موسم گرما میں سخت موسم کا شہر ہو جاتا ہے، البتہ جبال حجاز کے مشرقی دامنوں میں وادیاں اور میدان نسبتاً شاداب ہیں۔

1.6 عرب قوم

عرب مشرق وسطی اور شمالی افریقہ میں رہنے والا نسلی گروہ ہے جس کی زبان عربی ہے۔ توریت اور بائبل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے سام کی اولاد میں سے ہیں۔

اسلام میں اس امر کی تشریح تو نہیں کی گئی کہ عرب کون ہیں، تاہم حضرت محمد ﷺ کی احادیث سے علم ہوتا ہے کہ وہ شخص عربی ہے جو عربی زبان بولتا ہے۔ جینیاتی طور پر عربی وہ شخص ہے جس کے آباو اجداد جزیرہ نما عرب یا صحرائے شام میں رہتے تھے۔ سیاسی طور پر عربی وہ شخص کہلاتا ہے جو کسی ایسے ملک کا باشندہ ہے جہاں عربی قومی زبان ہے یا ملک عرب لیگ کا رکن ہے۔

ظہور اسلام سے قبل اکثر عرب بت پرستی کرتے تھے اور ان کے بڑے بتوں میں ہبل، لات، منات اور عزی شامل تھے۔ چند قبائل مسیحیت اور یہودیت کو مانتے تھے تاہم چند حنیف بھی تھے جو توحید کے قائل تھے۔

آج کل عربوں کی اکثریت سنی اسلام کو مانتی ہے اور شیعہ بحرین، جنوبی عراق، سعودی عرب سے ملحق علاقوں، جنوبی لبنان، شام کے علاقوں، شمالی یمن، جنوبی ایران اور عمان کے باطنی علاقوں میں ہیں۔

مورخین اور مستشرقین نے عربوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: عرب بائدہ، عرب عاربہ، عرب مستعربہ۔

1.6.1 عرب بائدہ:

یہ عرب کے وہ پرانے باشندے ہیں جن کا اب نام ونشان نہیں رہا۔ان میں عاد، ثمود، جدیس، طلسم، عملاق، اُمیم، جُرہم اور جاسم شامل ہیں۔ان میں سے اکثر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو کر ہلاک ہوئے۔

یہ قدیم عرب لوگ ہیں جو اس ملک میں آباد تھے ..ان میں قوم عاد وثمود اوران کے علاوہ عمالقہ'طسم '، 'جدیس'امیم وغیرہ بھی اہم ہیں۔ان لوگوں نے عراق سے لیکر شام اور مصر تک سلطنتیں قائم کرلی تھیں، بابل اور اشور کی سلطنتوں اور قدیم تمدن کے بانی یہی لوگ تھے۔

یہ قومیں کیسے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں اس کے متعلق تاریخ ہمیں تفصیل سے کچھ بتانے سے قاصر ہے۔لیکن اب بابل'مصر'یمن اور عراق کے آثار قدیمہ سے انکشافات ہو رہے ہیں اور کتابیں لکھی جارہی ہیں۔جبکہ قوم عاد وثمود کے حوالے سے قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ یہ قومیں اللہ کی نافرمانی اور سرکشی میں جب حد سے بڑھ گئیں تو ان کو عذاب الٰہی نے گھیر لیا اور یہ نیست ونابود ہوگئیں۔

1.6.2 عرب عاربہ:

یہ یمن اور اس کے قرب وجوار کے باشندے ہیں اور بنو قحطان کہلاتے ہیں۔بنو جرہم اور بنو یعرب انہی کی شاخیں ہیں۔بنو یعرب میں سے عبدِ شمس جو سبائی کے نام سے مشہور ہے یمن کے تمام قبیلوں کا جدامجد ہے۔اسی نے یمن کا مشہور شہر مآرب بسایا تھا اور وہاں تین پہاڑیوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا بند باندھا تھا۔اس بند میں بہت سے چشموں کا پانی آکر جمع ہوتا تھا جس سے بلند مقامات کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔

یہ بند کچھ مدت بعد ٹوٹ گیا تھا جس سے سارے ملک میں بہت بڑا سیلاب آگیا تھا اس سیلاب کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے اور عرب کی کہانیوں اور شعروں میں بھی جابجا موجود ہے۔اس سیلاب سے تباہ ہو کر یمن کے اکثر خاندان دوسرے مختلف مقامات پر جابسے تھے۔

عرب عاربہ کو بنو قحطان بھی کہا جاتا ہے، یہ حضرت نوح علیہ سلام کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد سے ہیں اور یہ لوگ قدیم عرب (عاد ثمود وغیرہ) کی تباہی اور جزیرہ نما عرب سے مٹ جانے کے بعد یہاں آباد ہو گئے تھے۔قحطان حضرت نوح علیہ سلام کا پوتا تھا جس کے نام پر یہ لوگ بنو قحطان کہلائے، پہلے پہل یہ لوگ یمن کے علاقے میں قیام پزیر ہوئے۔مشہور ملکہ سبا یعنی حضرت بلقیس کا تعلق بھی بنو قحطان سے تھا۔پھر ایک دور آیا کہ بنو قحطان کو سرزمین عرب کے دوسرے علاقوں میں نقل مکانی بھی کرنا پڑی، اس کی ایک وجہ تو وہ مشہور سیلاب ہے کہ ''مآرب بند'' ٹوٹ جانے کی وجہ سے انہیں اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے علاقوں کا رخ کرنا پڑا، اس سیلاب کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ کہ جب ان کی آبادی پھیلی تو مجبوراً ان کے مختلف قبائل کو یمن سے نکل کر اپنے لیے نئے علاقے ڈھونڈنے پڑے، جس کے نتیجے میں یہ لوگ جزیرہ نما عرب کے طول وعرض میں پھیل گئے، جبکہ کچھ قبائل شام وایران اور عرب کے سرحدی علاقوں کی طرف بھی نکل گئے اور وہاں اپنی آبادیاں قائم کیں، جبکہ ایک قبیلہ بنو جرہم مکہ کی طرف جا نکلا اور زم زم کے چشمے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی اجازت سے وہاں آباد ہو گیا۔بنو قحطان کا ہی ایک سردار ثعلبہ اپنے قبیلہ کے ساتھ یثرب (مدینہ) پر حملہ آور ہوا اور وہاں قابض ہو گیا۔بعد ازاں وہاں قلعے بنائے اور باغ لگائے۔اسی کی اولاد سے مدینہ کے مشہور قبائل اوس خزرج تھے، جن کا تاریخ اسلام میں بہت اونچا مقام ہے۔

قحطانی عرب کا اصل گہوارہ ملک یمن تھا۔یہیں ان کے خاندان اور قبیلے مختلف شاخوں میں پھولے، پھلے اور بڑھے۔ان میں سے دو قبیلوں

نے بڑی شہرت حاصل کی۔

(الف) حمیر: جس کی مشہور شاخیں زید الجمہور، قضاعہ اور سکاسک ہیں۔

(ب) کہلان: جن کی مشہور شاخیں ہمدان، انمار، طی، مذحج، کندہ، لخم، جذام، ازد، اوس، خزرج اور اولاد جفنہ ہیں، جنہوں نے آگے چل کر ملک شام کے اطراف میں بادشاہت قائم کی اور آل غسّان کے نام سے مشہور ہوئے۔

عام کہلانی قبائل نے بعد میں یمن چھوڑ دیا اور جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ ان کا ترک وطن اس وقت ہوا جب رومیوں نے مصر و شام پر قبضہ کر کے اہل یمن کی تجارت کے بحری راستے پر اپنا تسلّط جمالیا اور برّی شاہراہ کی سہولیات غارت کر کے اپنا دباؤ اس قدر بڑھا دیا کہ کہلانیوں کی تجارت تباہ ہو کر رہ گئی۔ کچھ عجب نہیں کہ کہلانی اور حمیری خاندانوں میں چشمک بھی رہی ہو اور یہ بھی کہلانیوں کے ترک وطن کا مؤثر سبب بنی ہو۔ اس کا اشارہ اس سے بھی ملتا ہے کہ کہلانی قبائل نے تو ترک وطن کیا لیکن حمیری قبائل اپنی جگہ برقرار رہے۔

جن کہلانی قبائل نے ترک وطن کیا ان کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

1. ازد: انہوں نے اپنے سردار عمران بن عمرو مزیقیاء کے مشورے پر ترک وطن کیا۔ پہلے تو یہ یمن ہی میں مختلف جگہوں میں منتقل ہوتے اور حالات کا پتہ لگاتے رہے، بالآخر شمال کا رخ کیا اور وہیں مختلف جگہوں پر سکونت پزیر ہو گئیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ثعلبہ بن عمرو: اس نے اولاً حجاز کا رخ کیا اور ثعلبیہ اور ذی وقار کے درمیان اقامت اختیار کی۔ پھر جب اس کا خاندان مضبوط ہو گیا تو مدینہ کی طرف کوچ کیا اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اسی ثعلبہ کی نسل سے اوس اور خزرج ہیں جو ثعلبہ کے صاحبزادہ حارثہ کے بیٹے ہیں۔

حارثہ بن عمرو: یعنی خزاعہ اور اس کی اولاد۔ یہ لوگ پہلے سرزمین حجاز میں گردش کرتے ہوئے مرّ الظہران میں خیمہ زن ہوئے، پھر حرم پر دھاوا بول دیا اور بنو جرہم کو نکال کر خود مکہ میں بود و باش اختیار کر لی۔

عمران بن عمرو: اس نے اور اس کی اولاد نے عمان میں سکونت اختیار کی، اس لیے یہ لوگ ازد عمان کہلاتے ہیں۔

نصر بن ازد: اس سے تعلق رکھنے والے قبائل نے تہامہ میں قیام کیا۔ یہ لوگ ازد شنوئۃ کہلاتے ہیں۔

جفنہ بن عمرو: اس نے ملک شام کا رخ کیا اور اپنی اولاد سمیت وہیں متوطن ہو گیا۔ یہی شخص غسّانی بادشاہوں کا جدّ اعلیٰ ہے۔ انہیں آل غسّان اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شام منتقل ہونے سے پہلے حجاز میں غسّان نامی ایک چشمے پر کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔

2. لخم و جذام: ان ہی لخمیوں میں نصر بن ربیعہ تھا، جو حیرہ کے شاہان آل منذر کا جدّ اعلیٰ ہے۔

3. بنو طیٔ: اس قبیلے نے بنو ازد کے ترک وطن کے بعد شمال کا رخ کیا اور اجاء اور سلمیٰ نامی دو پہاڑیوں کے اطراف میں مستقل طور پر سکونت پزیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ دونوں پہاڑیاں قبیلہ طی کی نسبت سے مشہور ہو گئیں۔

4. کندہ: یہ لوگ پہلے بحرین، موجودہ الاحساء، میں خیمہ زن ہوئے، لیکن مجبوراً وہاں سے نکل کر 'حضر موت' چلے گئے، مگر وہاں بھی امان نہ ملی تو آخر کار نجد میں ڈیرے ڈال لیا۔ یہاں ان لوگوں نے ایک عظیم الشّان حکومت کی داغ بیل ڈالی، مگر یہ حکومت پائیدار ثابت نہیں ہوئی اور اس کے آثار جلد ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

کہلان کے علاوہ حمیر کا بھی صرف ایک قبیلہ قضاعہ ایسا ہے، اور اس کا حمیری ہونا بھی مختلف فیہ ہے۔ جس نے یمن سے ترک وطن کر کے حدود عراق میں بادیۃ السماوہ کے اندر بود و باش اختیار کر لی تھی۔

1.6.3 عرب مستعربہ:

یہ حجاز اور نجد وغیرہ کے باشندے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔ان میں بہت سے قبیلے ہیں جن میں ربیعہ اور مُضَر مشہور ہیں۔مُضَر ہی کی ایک شاخ قریش ہے جس سے ہمارے نبی عربی ﷺ کا تعلق ہے۔عربِ مستعربہ کو بنوعدنان بھی کہتے ہیں۔سرزمین عرب پر سب سے آخر میں آباد ہونے والے بنواسماعیل تھے،انھیں عرب مستعربہ بھی کہا جاتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم پر اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا تھا،اور خود واپس چلے گئے تھے۔

یاد رہے کہ اس وقت نہ مکہ کی آبادی تھی اور نہ ہی خانہ کعبہ کا وجود،خانہ کعبہ ویسے تو حضرت آدم علیہ سلام کے وقت تعمیر ہوا،مگر خانوادہ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے وقت وہ تعمیر معدوم ہو چکی تھی اور پھر بعد میں جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر 15 سال کی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے اور ان دونوں باپ بیٹے نے مل کر اللہ کے حکم پر اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی راہنمائی اور نگرانی میں خانہ کعبہ کو انہی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کیا جن پر حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔

1.7 عرب کے مشہور قبیلے

1.7.1 بنوقحطان:

یہ بنوعدنان کے مقابلے عرب کے دوسرے قبائل کا بنیادی نام ہے۔بنوقحطان کی مختلف شاخیں ہیں۔یہ سب بھی سام بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا قدیم وطن یمن ہے۔یہ یمن اور اس کے قرب و جوار کے باشندے ہیں اور عرب عاربہ بھی کہلاتے ہیں۔بنوجرہم اور بنویعرب انہی کی شاخیں ہیں۔بنویعرب میں سے عبدِ شمس جو سبائی کے نام سے مشہور ہے یمن کے تمام قبیلوں کا جدامجد ہے۔اسی نے یمن کا مشہور شہر مآرب بسایا تھا اور وہاں تین پہاڑیوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا بند باندھا تھا۔اس بند میں بہت سے چشموں کا پانی آکر جمع ہوتا تھا جس سے بلند مقامات کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔

یہ بند کچھ مدت بعد کمزور ہو کر ٹوٹ گیا تھا جس سے سارے ملک میں بڑا سیلاب آ گیا تھا۔اس سیلاب کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے،اور عرب کی کہانیوں اور شعروں میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔اس سیلاب سے تباہ ہو کر یمن کے اکثر خاندان دوسرے مختلف مقامات پر جا بسے تھے۔

1.7.1.1 تاریخ:

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہ سارے عرب میں فائق تھے۔ملکہ بلقیس بنوقحطان کے ازدی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔قبائل ازد میں سے ایک قبیلہ نے مدینہ آکر اپنی حکومت قائم کی تھی۔بنوقحطان کا ہی ایک قبیلہ بنوخزاعہ تھا جس نے مکہ کا رخ کیا اور بنوجرہم کو وہاں سے بے دخل کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔مدینہ کے مشہور قبیلے بنواوس اور بنوخزرج بھی بنوقحطان کی ہی شاخیں تھیں۔ظہور اسلام کے وقت قحطانی قبائل بڑے طاقتور اور سارے عرب پر چھائے ہوئے تھے۔

1.7.2 بنوعدنان:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے قیدار کی اولاد میں ایک شخص عدنان ہوئے ہیں۔ان کی اولاد بنوعدنان کہلاتی ہے۔عدنان کے بیٹے کا نام معد اور پوتے کا نام نزار تھا۔اس لیے آل عدنان کو معدی اور نزاری بھی کہتے ہیں۔نزار کے ایک بیٹے مضر کی اولاد میں فہر بن مالک تھے۔جن کو قریش بھی کہتے تھے۔یہ خاندان قریش کے جداعلیٰ ہیں۔ان کی اولاد میں بنی سہم،بنی مخزوم،بنی عدی،بنی عبدالدار،بنی زہرہ اور بنی عبدمناف زیادہ

مشہور قبیلے ہیں۔

یہ حجاز اور نجد وغیرہ کے باشندے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔ ان میں بہت سے قبیلے ہیں جن میں ربیعہ اور مُضر مشہور ہیں۔ مُضر ہی کی ایک شاخ قریش بھی ہے جس میں نبی عربی ﷺ کا تعلق ہے۔ بنو عدنان کو عربِ مستعربہ بھی کہتے ہیں۔

عبد مناف بن فہر کے بیٹے ہاشم محمد ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے والد تھے۔ جن کی نسبت سے رسول اللہ ﷺ کا خاندان ہاشمی کہلاتا ہے۔ عبد مناف کے والد قصی نے پانچویں صدی عیسوی میں قریش کے قبائل کو متحد کر کے مکہ معظّمہ بلکہ سارے حجاز پر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ خانہ کعبہ کی تولیت بھی اسی خاندان میں منتقل ہوگئی تھی۔ جس کے باعث یہ خاندان سارے عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ رسول کریم ﷺ کی ولادت با سعادت نے بنو عدنان کو وہ شرف بخشا کہ دنیا کا کوئی خاندان ان کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔

1.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جزیرہ نمائے عرب ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اس کا ساحل مغرب میں بحیرۂ احمر اور خلیج عقبہ، جنوب مشرق میں بحیرۂ عرب اور شمال مشرق میں خلیج عمان ابنائے ہرمز اور خلیج فارس سے ملتا ہے۔
- جغرافیائی اعتبار سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جس کا رقبہ تقریباً تین لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔
- مرکزی حصہ صحرائے عرب کے نام سے مشہور ہے، شمالی علاقے کا نام حجاز ہے، جنوبی حصہ بحر ہند اور بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے، جس میں یمن اور حضر موت کے علاقے شامل ہیں۔
- اس کی حد بندی کے بارے میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، عرب قوم زمین کے جس حصہ پر رہتی ہے، اس کو جزیرہ نمائے عرب کہتے ہیں، اس کے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی۔
- قدرتی اعتبار سے جزیرۃ العرب دو حصوں مغربی حصہ اور مشرقی حصہ میں منقسم ہوگیا ہے۔ اور ان دونوں حصوں میں آنے والے علاقوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔
- حجاز کے مشہور شہروں میں جدہ، طائف، مکہ اور مدینہ شامل ہیں، جو اسلامی تاریخ کے اعتبار سے خصوصیت کے حامل ہیں۔
- یمن کے مشہور شہر نجران، صنعا، مآرب اور احقاف ہیں، جس کا دارالسلطنت صنعا ہے۔
- عربی یمن کی قومی زبان ہے، یمن ہی عربوں کی اصل سرزمین ہے، جس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ سے زائد ہے۔
- یہ خطہ حجاز کے مقابلے نہایت ہی سرسبز و شاداب، پرانی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے، اس علاقے میں تاریخ کی چند بہت ہی مشہور و ممتاز ہستیاں ابھری ہیں، جنھوں نے تہذیب و تمدن کے بعض ایسے نقوش چھوڑے ہیں، جو صدیوں تک ان کے ذہنی ارتقا اور فضل و کمال کی نشاندہی کرتے رہیں گے۔
- جزیرہ نما کے ساحلی پہاڑ و میدان غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، جن میں جبال السراۃ اور جبال حجاز کو نمایاں مقام حاصل ہے۔
- قدیم جغرافیہ داں جزیرۃ العرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے تھے، جن میں حجاز، تہامہ، نجد اور یمن وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔
- عرب مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں رہنے والا نسلی گروہ ہے، جس کی زبان عربی اور حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادہ سام کی اولاد میں

سے ہے۔

- عربوں کو تین طبقوں، عرب بائدہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔
- عرب بائدہ، وہ پرانے باشندے ہیں، جن کا اب نام ونشان نہیں رہا۔ عرب عاربہ، یمن اور اس کے قرب وجوار کے باشندے ہیں، جو بنو قحطان کہلاتے ہیں، جن کا اصل گہوار ملک یمن تھا۔ عرب مستعربہ، حجاز ونجد وغیرہ کے باشندے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔
- عربوں کی اکثریت کا مذہب اسلام ہے اور مسیحی اقلیت میں ہیں، جب کہ عرب میں یہودی بھی پائے جاتے ہیں، اسلام کے آنے سے پہلے عرب قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی۔
- یہ قوم خاندانی اعتبار سے مختلف قبائل میں منقسم تھیں، جن میں ربیعہ ومضر مشہور قبائل ہیں۔ ان کی مختلف شاخیں ہیں، مضر کی ہی ایک شاخ قریش ہے، جس سے نبی ﷺ کا تعلق ہے۔

1.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مغرب میں جزیرہ نما کا ساحل کس سے ملتا ہے؟

a. بحیرۂ عرب b. خلیج فارس c. خلیج عمان d. بحیرۂ احمر

2. کتنے ملکوں کو جزیرہ نما کا مانا جاتا ہے؟

a. چھ b. سات c. پانچ d. آٹھ

3. جغرافیائی اعتبار سے جزیرہ نما عرب کو کتنے منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

a. دو b. تین c. چار d. پانچ

4. قدرتی طور پر جزیرہ نما کتنے حصوں میں منقسم ہے؟

a. تین b. چار c. چانچ d. دو

5. اردو میں نجد کے کیا معنی ہیں؟

a. نیچی زمین b. اونچی زمین c. پتھریلی زمین d. سخت زمین

6. عربی میں ''پیاس لگنے کی جگہ'' کس مقام کے معنی ہیں؟

a. حجاز b. نجد c. تہامہ d. یمامہ

7. جزیرۂ عرب کا کون سا قدیم شہر اہم تجارتی وثقافتی مرکز کے نام سے مشہور ہے؟

a. طائف b. جدہ c. صنعاء d. حیرہ

8. قریش کے لیے موسم گرما کا سہارا کون سا شہر تھا؟

a. صنعاء b. مدینہ c. بدر d. طائف

9. جزیرۂ عرب کے کون سے قدیم شہر میں ''سد مارب'' تھا؟

a. نجران	b. رابغ	c. خیبر	d. تمام غلط

10. عرب قوم کس کی اولاد ہے؟

a. حام	b. سام	c. کنعان	d. تمام غلط

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. جزیرہ نمائے عرب کا تعارف پیش کریے۔
2. یمن اور اس کے مشہور شہروں کا اجمالی جائزہ پیش کریے۔
3. جبال سروات اور جبال حجاز کا تعارف پیش کریے۔
4. عرب عاربہ پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔
5. عرب مستعربہ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. عرب قوم اور اس کے مختلف طبقات کا تفصیلی جائزہ پیش کریے۔
2. جزیرہ نمائے عرب کے طبعی وجغرافیائی حالات کا مفصل جائزہ لیں۔
3. حجاز اور اس کے مشہور شہروں کا مختصر تعارف کرائیے۔

1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. جزیرۃ العرب : مولانا محمد رابع حسنی ندوی
2. عربی ادب کی تاریخ، جلد اول : عبدالحلیم ندوی
3. تاریخ الامت، جلد اول : اسلم جیراجپوری
4. الرحیق المختوم : صفی الرحمٰن مبارکپوری

-:oOo:-

اکائی 2 : جاہلی دور میں عربوں کے سیاسی حالات

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید
2.1 مقصد
2.2 عربوں کی قدیم تاریخ کے ذرائع
2.3 قحطانی عرب
2.3.1 قحطانی عرب کا طرز زندگی
2.4 عاد
2.4.1 عاد ثانیہ
2.5 سلطنت معین
2.6 مملکت سبا
2.6.1 تجارت وزراعت کا کرشمہ
2.6.2 سد مارب
2.6.3 مملکت سبا کے زوال کے اسباب
2.7 سلطنت حمیر
2.8 عدنانی عرب
2.8.1 جنگ بسوس
2.8.2 داحس وغبرا کی لڑائی
2.9 عربوں کا غیر قوموں سے رابطہ اور اس کے ذرائع
2.9.1 تجارت
2.9.2 سرحدی ریاستیں
2.9.2.1 حیرہ کی ریاست
2.9.2.2 غسانی ریاست
2.10 اکتسابی نتائج
2.11 نمونہ امتحانی سوالات

2.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید

اس اکائی میں جاہلی دور میں عربوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے گا اور اس ضمن میں اُس زمانے میں قائم ہونے والی مختلف سلطنتوں، اس کے عروج وزوال، بادشاہوں کے نام اور جائے وقوع سے بحث کی جائے گی۔ نیز اس دور میں ہونے والی مشہور جنگوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جائے گی۔

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ عربوں کی قدیم تاریخ کے ذرائع سے واقف ہوسکیں گے، قحطانی اور عدنانی عرب کی طرز زندگی، سیاسی حالات، قبائلی نظام، اور اس دور میں قائم ہونے والی سلطنتوں اور اس کے عروج وزوال کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے اور قحطانی اور عدنانی عرب کے درمیان تفاوت سے واقف ہوسکیں گے۔

2.2 عربوں کی قدیم تاریخ کے ذرائع

عربوں کی قدیم تاریخ خصوصاً زمانہ جاہلیت کے اولین دور میں عربوں کی سیاسی اور ادبی حالت کا پتہ لگانا نہایت ہی مشکل کام ہے، کیوں کہ اس کے بارے میں مستند اور باوثوق ذرائع سے جمع کی گئی کوئی صحیح اور معتبر تاریخ نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں مکمل عدم معرفت کے دو اسباب بتائے گئے ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی سیاسی وحدت نہیں تھی، وہاں کے بیشتر باشندے بدویانہ اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے تھے، آپسی لڑائی، جھگڑوں اور دشمنی کا شکار تھے، جامع وحدت کا تصور مفقود تھا۔ اور نہ ہی کسی طاقت ور بادشاہ کا وجود تھا۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عرب اقوام خاص طور سے شمال میں رہنے والے عرب ان پڑھ تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کوئی تاریخ ترتیب نہیں دی۔ تاریخ تحریر کرنے کی ابتدا بنوامیہ کے آخری عہد میں کی گئی، اس سے پہلے ان کی ترسیل کا ذریعہ صرف زبان تھی، جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے تک خبر پہنچانے پر یقین رکھتے تھے، کیوں کہ نہ کوئی مضبوط بنیادوں پر قائم معاشی وسیاسی نظام تھا اور نہ ہی اعلیٰ اقدار پر مبنی کوئی سماجی ڈھانچہ، البتہ جزیرہ نما کے کچھ حصے اس سے مستثنیٰ ہیں، جن میں سلطنت سبا ومعین کو شامل کیا گیا ہے، جس کے حالات وکوائف کے نقوش آج بھی باقی ہیں۔

ان کی زندگی کا مقصد اونٹوں اور بکریوں کو چرانا، ان کے چارے کی تلاش میں صحراؤں کا چکر لگانا اور قحط وخشک سالی کا سامنا کرنے کی صورت میں دوسرے قبائل پر حملہ اور غارت کرکے ان کے مال واسباب پر قبضہ کر لینے کے سوا کچھ نہ تھا، ظاہر ہے کہ جب زندگی کی راہ اس نہج پر گامزن ہو تو اس صورت حال میں کسی حالات وکوائف کو محفوظ رکھنے کی دراصل کوئی بات نظر نہیں آتی اور اگر ہو بھی تو اسے کرتا کون اور کیوں؟ لہٰذا جن حالات وواقعات کو جاہلی دور کے عرب محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے، جیسے حسب ونسب پر فخر کرنا، قبیلہ یا افراد کی بہادری کے قصے، کہانی یا

جنگوں میں فتح وکامرانی کے واقعات ،انھیں قبیلہ کے افراد زبانی یاد رکھتے تھے اور اپنے بعد کی نسل کو بھی یہ واقعات زبانی یاد کرادیتے تھے، تاکہ اپنی عظمت ،شان وشوکت کا بھی انہیں احساس رہے اور خاندانی وقبائلی عصبیت ہنوز زندہ رہے، تاکہ کسی موقع پر شکست وریخت سے دوچار ہونے کی صورت میں غیروں سے انتقام لیا جاسکے۔

البتہ جنوب کے عرب، جو یمن میں رہائش پذیر تھے، شمالیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے،لیکن انہوں نے بھی اپنی کوئی تاریخ مدون نہیں کی، جس سے ان کی کوئی صحیح اور مستند تصویر ابھر کر سامنے آسکے۔مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ماہرین آثار قدیمہ نے یمن میں جو کھدائیاں کرائی ہیں، ان میں بہت سی عبادت گاہیں، ستون، یادگاری مینار یں، چہار دیواریاں، گنبد اور قلعے برآمد ہوئے ہیں، جن پر کچھ عبارتیں او رنقوش کندہ ہیں، اسی طرح کے مختلف نقوش شمالی حجاز میں بھی قوم ثمود اور لحیانیوں کے رہنے کی جگہوں میں اور شام کے حدود میں بھی ملے ہیں۔ان نقوش اور کندوں کو پڑھنے کے بعد لسانیات کے علمانے یہ بات تحقیق کے ساتھ معلوم کرلی ہے کہ جنوبی عربوں (یعنی یمن کے باشندوں)اور شمال کے عربوں میں (یعنی حجاز کے شہروں) کی زبان میں اچھا خاصا فرق تھا،لیکن ان اکتشافات اور آثار کے تانے بانے سے عربوں کی کوئی سلسلے وار اور مربوط انداز میں سیاسی یا سماجی تاریخ کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔

قدیم عرب یا زمانۂ جاہلیت کے دور کے عربوں کے بارے میں خود عرب مؤرخین ابن ہشام ،طبری، ابن خلدون اور یونانی ویہودی مؤرخین نے بھی لکھا ہے، توراۃ میں بھی مختصراً ذکر آیا ہے، لیکن ان سبھی روایتوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، نہ تو بادشاہوں کے نام ایک دوسرے سے میل کھاتے ہیں اور نہ ہی واقعات کو مرتب انداز میں پیش کیا گیا ہے، نہ ہی ان میں کوئی مطابقت یا یکسانیت پائی جاتی ہے، جن کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی اپنی کتاب ’تاریخ عربی ادب جلد اول‘ میں رقمطراز ہیں: ’’اس زمانے کی تاریخ اور حالات وکوائف کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ، سوائے ان واقعات اور تذکروں کے جن کا ذکر قرآن کریم اور حدیث شریف میں آیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کے علماء آثار نے قرآن وحدیث میں ان قوموں کے تذکروں سے فائدہ اٹھا کر ان مخصوص جگہوں پر کھدائیاں کرائی ہیں، جن کے نتیجے میں قدیم عربوں کی تاریخ سے متعلق بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں‘‘، ان میں اصحاف کہف اور قیم کی بستیوں کا تعین، جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصے میں واقع، مدین وصالح کے بارے میں جہاں قوم عاد وثمود رہا کرتی تھیں، خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جن سے متعلق کئی مضامین بھی عربی اور اردو کے مجلّات میں شائع ہوچکے ہیں۔

2.3 قحطانی عرب

یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ یمنی عربوں کا سلسلۂ نسب قحطان سے جاملتا ہے، قحطانیوں کا قیام یمن میں تھا اور یمن واطراف یمن بلکہ پورا جنوبی جزیرۃ العرب قحطانیوں کا اصل وطن بنا اور عام طور پر قحطانی نسلیں بعد تک یمن ہی میں رہیں، البتہ سبا کا مشہور بند ’سد مآرب‘ ٹوٹ جانے اور ملک کے مشہور تجارتی امتیازات کھودینے کے بعد ان کی بعض نسلوں کو رزق کی تلاش میں جزیرہ نما عرب کے دوسرے حصوں کی طرف کوچ کرنا پڑا۔اس طرح ان کی کچھ نسلیں جزیرۃ العرب کے شمالی علاقوں میں بھی جا کر قیام پذیر ہوگئیں۔

2.3.1 قحطانی عرب کا طرز زندگی:

یمن میں رہنے والے یہ قحطانی عرب گروہوں کی شکل میں مختلف خطوں میں محلے بنا کر جنھیں ’مخلاف‘ کہتے ہیں، رہا کرتے تھے۔ان بستیوں کے آس پاس ان کے کھیت، کھلیان اور چراگاہیں ہوتی تھیں، ان کا ایک سردار ہوتا تھا، جسے ’قیل‘ جمع ’اقیال‘ کہتے تھے، ہر قیل اپنے افعال

واعمال کا بذات خود ذمہ دار اور اپنی قلم رو میں آزاد اور خود مختار ہوتا تھا، ان گروہوں میں آپسی تعلقات کوئی خاص نہیں تھے، بلکہ ان میں اکثر جنگ وجدال، لوٹ مار اور غارت گری ہوتی رہتی تھی، جس میں طاقتور، کمزور کو ہڑپ لیتا تھا۔ یہ لوگ ایک لمبی مدت تک اسی طرح رہتے رہے یہاں تک کہ ان کے یہاں رفتہ رفتہ تہذیب وتمدن نے جنم لیا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ یمن میں مختلف حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں دو تین حکومتیں اہم تھیں، اور ان کے حالات وکوائف قدرے وضاحت، صحت اور مستند طریقے سے ہم تک پہنچ پائے ہیں۔

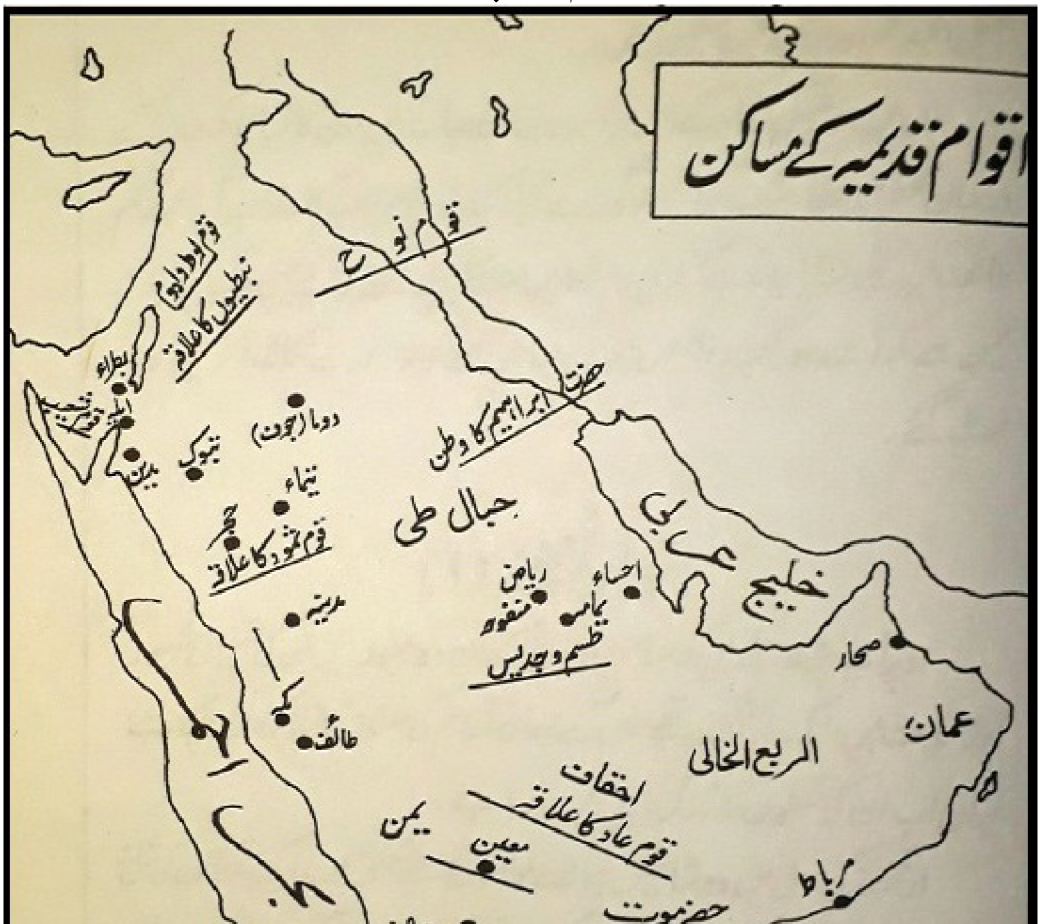

نقشہ: کتاب ''جزیرۃ العرب''، مولانا محمد رابع ندوی

2.4 عاد

قدیم عرب کی سب سے مشہور قوم عاد شمار کی جاتی ہے جو کہ اصلاً قبیلہ ارم کی ایک شاخ تھی اسی بنیاد پر اس کو عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قوم حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ طاقتور اور عظیم الشان قوم سے معروف ومشہور ہے۔ عاد حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں ارم کی ایک نسل تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی نافرمان اولاد کی تباہی کے بعد عرب میں ان کی نجات یافتہ اولاد میں سے جو سب سے پہلی مقتدر اور نمایاں قوم ظاہر ہوئی قرآن میں اس کا نام عاد بتایا گیا ہے۔ عاد کی عظمت وجلالت اور سیاسی تفوق اور قوت جسمانی مسلم تھی، قرآن کریم کی آیات

میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔خوبصورت اور بڑی عالیشان عمارتیں بناتے اور باغات لگاتے تھے۔ان کا علاقہ بھی ایسا تھا کہ اس کا مشرقی پہلو صحرائی اور ریگستانی تھا اور مغربی وجنوبی پہلو میں یمن اور حضرموت کے شاداب پہاڑ اور سبزہ زار تھے،لہٰذا ایک طرف کے حالات ان میں جفاکشی اور محنت کا مزاج بناتے اور دوسری طرف کے حالات ان کے لیے عیش وعشرت کے ذرائع مہیا کرتے تھے۔

قوم عاد کو کسی زمانے میں عروج تھا اور جزیرہ نما کے بیشتر حصوں پر اقتدار رکھتے تھے اور وہ پورے علاقے کی زبردست قوم سمجھے جاتے تھے، ان کا اصل مستقر یمن اور اطراف یمن تھا،قرآن مجید میں اس کا ذکر احقاف کے نام سے کیا گیا ہے جو معنی کے لحاظ سے صحرائی ریگستان کو کہتے ہیں اور اس سے تقریباً الربع الخالی کا وہ کنارہ مراد ہے جو یمن کے مشرقی پہلو میں واقع ہے اور اس کے جنوب میں حضرموت کا علاقہ ہے۔

جب قوم عاد نے اپنے نبی ہود علیہ السلام کی دعوت کو ٹھکرایا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اڑے رہے اور ان کے ہی نبی حضرت ہود علیہ السلام ان کو دعوت دیتے دیتے تھک گئے اور ان کی اصلاح سے مایوس ہوگئے تو اللہ نے ان پر عذاب بھیجا جس سے وہ تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ یہ عذاب آندھی کی شکل میں آیا، جو سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی، جس میں ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی جس کا نقشہ قرآن مجید نے بڑے اچھے انداز میں کھینچا ہے،آندھی آجانے کے بعد ان کی لاشیں کھجور کے تنوں کی طرح پھیلی ہوئی پڑی تھیں۔عاد اولیٰ جزیرہ نما عرب کی پرانی قوم تھی اور وہ غالباً اپنے زمانے میں پورے جزیرۃ العرب کی تنہا با اقتدار قوم تھی اور شاید اس وقت تک یمن اور اطراف یمن میں قحطانیوں کا بھی پتہ نہ تھا،ان کے بعد جزیرہ العرب میں جو قومیں ابھریں وہ عموماً ان کے بنی اعمام تھے یا عاد ثانیہ۔

2.4.1 عاد ثانیہ:

حضرت ہود اور ان کے ماننے والوں نے اللہ کے رحم و کرم سے عذاب سے نجات پائی اور امن واطمینان کے ساتھ زندگی گزاری، یہی لوگ غالباً عاد ثانیہ ہیں۔ان میں لقمان نامی ایک نیک بادشاہ گزرے ہیں جس کو اب لوگ لقمان حکیم کہتے ہیں اور جن کی طرف حکیمانہ روایات اور تمثیلات کثرت سے منسوب ہیں۔قرآن میں بھی لقمان کا تذکرہ ہے۔عرب میں لقمان بہت مشہور تھے۔عاد ثانی کے متعلق مؤرخین کچھ زیادہ قطعی اور تفصیلی بات نہیں بتا سکتے ہیں،ان کا اندازہ ہے کہ یہی لوگ عاد ثانیہ تھے اور جس طرح قوموں کا عروج وزوال ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی عروج وزوال کی منزلوں سے گزرے۔

2.5 سلطنت معین

جنوبی عرب کی سلطنتوں میں ایک 'معین' کی سلطنت تھی اور یہ ملک یمن کے شمال میں واقع تھی اور شہر حضرموت اس کے مشرق میں تھا،عربی کی کچھ کتابوں میں 'معین' کا ذکر آیا ہے اسی طرح موجودہ دور میں جزیرہ نمائے عرب میں کچھ نقوش کی دریافت اور تورات کی کچھ روایتوں کے ذریعے ہمیں اس کے بارے میں جانکاری حاصل ہوسکی ہے۔ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق اس حکومت کا قیام یمن کے جوف جنوبی اور صنعا کے مشرقی علاقے میں عمل میں آیا۔یونانی اسے 'کارنا' یا 'قارنا' کے نام سے پکارتے تھے۔معین کی سلطنت 'قتبان' حضرموت اور 'ملخ' (Melukh) صوبہ پر مشتمل تھی۔گلیزر (Glazer) کے مطابق معین کی سلطنت تاریخی اور تمدنی اعتبار سے 'سبا' سے زیادہ پرانی تھی،اس دعویٰ کی علمی تائید علما کے کچھ گروپ نے بھی کی ہے، جب کہ کچھ نے اس کی مخالفت کی ہے۔البتہ یونان کے تاریخ داں کے نزدیک معین کے بادشاہوں اور ان کے ناموں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے، جب کہ ماہرین آثار قدیمہ نے یمن کے جوف یعنی (جوف ارحب) کے علاقے میں جو کہ نجران اور حضرموت کے درمیان واقع ہے۔معین کی حکومت کے بادشاہوں کے ناموں کی دریافت کی ہے،ان کے مطابق 'جوف' میں ایک مقام ہے جسے 'معین' کہتے ہیں اور عرب ملکوں میں دوسرے

خطوں کے مقابلے یہ سب سے قدیم خطہ ہے، تاریخی اعتبار سے پائے جانے والے اہم نقوش میں ان مقامات کا ذکر ہے، جسے ہمیشہ معین یا مآرب کے نام سے پکارا گیا ہے۔

معینیوں کے نقوش اور آثار کے مطابق معین سلطنت کی حکومت ایک موروثی حکومت تھی جو باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوا کرتی تھی، بالفاظ دیگر اقتدار میں دونوں کی شراکت داری تھی بعض محققوں نے اس سلطنت کے چھتیس بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔آثار وعلامات اورنقوش کی روشنی، تورات کی روایت اور بعض یونانی تاریخ داں کی تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معین کی حکومت 650 قبل مسیح میں ظہور پذیر ہوئی۔اور وہ عظیم قوت اور ثروت کے مالک تھے، محققین نے ان کی سیاسی واجتماعی حالت کے بارے میں بھی رہنمائی کی ہے۔اسی طرح ان کے افراد کے ناموں اور معبودوں سے متعلق معلومات بھی فراہم کی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق دراصل عراق کے عمالقہ سے تھا، جو دوسرے قبائل کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے یمن آ گئے اور انھوں نے 'جوف' نامی صوبے کو اپنا ماویٰ و مسکن بنایا اور بابل کے طرز پر بڑے بڑے عالیشان محلات اور چراگاہیں تیار کرتے تھے۔معین کی بالادستی ان کی تجارتی سرگرمیوں کے باعث خلیج فارس اور بحر احمر سے متصل حجاز کے اونچے علاقوں میں قائم تھی، اس بات کا ثبوت وادی القریٰ صنعا اور جوزان میں دریافت کیے گئے نقوش وآثار سے ہوتا ہے۔معین کی حکومت جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے شمالی حصے تک طرح طرح کے بخور پہنچاتے تھے۔

اس سلسلے میں مولانا محمد رابع حسنی ندوی اپنی کتاب 'جزیرۃ العرب' میں لکھتے ہیں: ''یمن میں حضرموت کے قریب ایک قدیم شہر کے آثار ہیں جس کا نام معین بتایا جاتا ہے، جغرافیہ دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ یہاں ایک متمدن قوم آباد تھی، جس کو ایک زمانے تک عروج رہا، بعض لوگوں کی تحقیق یہ ہے کہ عاد ثانیہ یہی لوگ تھے اور بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ عمالقہ ان ہی کی نسل سے تھے''۔

بہر حال اہل معین کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے، بعض مؤرخین ان کو عاد ثانیہ کہتے ہیں اور بعض ان کو عمالقہ کے اجداد بتاتے ہیں اور بعض لوگ ان کو ایک مستقل نسل قرار دیتے

ہیں۔

2.6 مملکت سبا 750 تا 115 ق م

سلطنت سبا معین اور قتبان کے درمیان واقع تھی، اس کا اثر ورسوخ اور بالادستی مشرق میں خلیج فارس کے ساحل اور مغرب میں بحر احمر تک پھیلی ہوئی تھی، معین کے بادشاہ کی وراثت سبا کی طرف منتقل ہوتی ہے، جس کی طاقت وقوت کے آثار معین کے آخری زمانے میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ڈاکٹر حسین ابراہیم کے مطابق: ''ان کی بالادستی تقریباً 950 ق م سے 115 ق م تک قائم رہی، حالاں کہ تقریباً 650 ق م میں وہ معین کے وارث ہو گئے، ان کی بالادستی اور قوت واقتدار جزیرہ نما عرب کے جنوبی حصے میں قائم تھی''۔جب کہ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی نے ان کے اقتدار کی مدت 750 ق م سے 115 ق م تحریر کی ہے۔بہر حال اس زمانے میں سبا کے حکام کا رعب ودبدبہ تھا، اور وہ اپنے زمانے کی ایک نہایت ہی خوشحال قوم تھی، ان کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور میں وہ ایک چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے۔البتہ رفتہ رفتہ ان کی بالادستی قرب وجوار کی ریاستوں تک قائم ہو گئی اس کے بعد انہوں نے تالاب کھودے، بند تعمیر کیے اور عظیم الشان محلات بنائے البتہ ان کے آثار وعلامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے فتوحات اور جنگوں سے گریز کیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔دراصل اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ ایک ایسی ریاست تھی، جسے صرف تجارت سے دلچسپی تھی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سب سے پہلے ملک سبا کا تذکرہ تورات اوراس کے بعد جغرافیہ میں لکھی گئی یونانی اور رومانی کتابوں میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔اس کے بعد قرآن مجید اس کا ذکر جس پیرایہ میں کیا ہے،اس سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ ملک سبا اپنے زمانے کی نہایت ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کا مثالی نمونہ تھا۔قرآن کریم کے مطابق:''اہل سبا کے لیے ان کے رہنے کی جگہ میں نشانی تھی،ان کے دائیں بائیں دودو باغ تھے''۔سلطنت سبا اس عروج کو حضرت مسیح سے کئی صدی پہلے ہی پہنچ چکی تھی،علماء آثار کو ان سے متعلق جو کتبے ملے ہیں،ان سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ سلطنت انیسویں صدی قبل مسیح میں تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھی۔مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے مطابق:''سبا نامی نسل اپنے زمانے میں یمن کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور نسل تھی''۔

اس حکومت کا دارالسلطنت شہر''مآرب''اوراپنے عروج کے زمانے میں یہ شہرانتہائی فارغ البال اور متمول شہر تصور کیا جاتا تھا۔اس کا سبب یہ تھا کہ ایک زمانے میں ہندوستان،مصروشام اور حبشہ کے درمیان جوتجارت ہوا کرتی تھی،وہ بحری راستوں سے ہوتی تھی،لیکن ایک عرصہ گزرجانے کے بعد جب سمندری ڈاکوؤں اور لٹیروں کی سرگرمیوں کی بدولت سمندری راستہ پرخطرے کا سایہ منڈلانے لگا تو تجارت کا سلسلہ خشکی کے راستے سے شروع ہوگیا اور ہندوستان وحبشہ سے تجارت کا ساز وسامان جزیرہ عرب کے بندرگاہوں پرآنے لگا اور وہاں سے سبا کے باشندے اسے شام،مصراور عراق کی منڈیوں اور بازاروں میں پہنچانے لگے،اس کے بعد تجارتی قافلے جزیرہ نمائے عرب کے ساحلی علاقے سے مآرب ہوکر شمال کی جانب مکہ پہنچنے لگے اور وہاں سے مقام''بطرہ''میں پھر بحر روم کے ساحلی علاقہ غزہ میں رسائی ہونے لگی۔لہٰذا سامان تجارت کے اس دوطرفہ آمدورفت کے نتیجے میں یمنیوں کو بہت فائدہ پہنچا اوران کا اثر ورسوخ اور حیثیت مزید بڑھ گئی۔روپے پیسے کی فراوانی اور ریل پیل ہوگئی،عیش وعشرت،فارغ البالی اور خوشحالی کا ایک ایسا سنہرادورآیا،جس کی نظیر نہیں ملتی،چناں چہ انہوں نے تالاب کھودے بند باندھے،پرشکوہ وعظیم الشان محلات بنوائے اور امن وسکون کی زندگی گزارتے رہے۔

ان کا اقتدار پہلی صدی عیسوی تک رہا،اس کا پایۂ تخت مآرب تھا جو کہ صنعاء سے تقریباً ساٹھ میل مشرق میں تقریباً چار ہزار فٹ بلند سطح زمین پرواقع ہے۔سبا ایک تاجر قوم تھی،اس وقت کی عالمی تجارت کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھوں میں آگئی تھی،ان کی نگرانی میں تجارتی قافلے مشرق میں سندھ اور مشرق اقصیٰ تک اور مغرب میں مصراور دومۃ الکبریٰ کے بازاروں تک رسائی حاصل کرلی تھی،یمن سے غزہ تک یہ قافلے خشکی کے راستے چلتے تھے،اس تجارتی شاہراہ کا مرکز'مآرب'تھا،خشکی میں یہ اپنا تجارتی سفر حضرموت کے شہر'شبوہ'سے شروع کرتے،راستے میں ان کے بڑے بڑے اسٹیشن،مآرب،صنعا،مکہ،مدینہ،بطرااورغزہ ملتے تھے۔اس کے بعد ان میں سے کچھ قافلے مصر کی طرف چلے جاتے اور کچھ فلسطین اور شام کی طرف چلے جاتے اور مشرق میں شبوہ سے نکل کر سمندری سفر شروع کرتے اور کچھ قافلے افریقہ کے مشرقی ساحلوں تک جاتے اور کچھ سندھ وہندوستان اور مشرق اقصیٰ کی بندرگاہوں تک جاتے۔

2.6.1 تجارت وزراعت کا کرشمہ:

اللہ تعالیٰ نے سبا کو اس کے تجارتی کاروبار میں بڑی برکت عطا فرمائی،شام تک ان کا راستہ شاداب خطوں سے گزرتا تھا،لہٰذا ان کے قافلوں کو اس تجارتی سفر میں کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔''جزیرۃ العرب''میں مولانا محمد رابع حسنی ندوی فرماتے ہیں:غالباً راستے کی اسی شادابی کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ملتا ہے''**وجعلنا بینھم وبین القریٰ التی بارکنا فیھا قری ظاھرۃ**''یہاں''**القریٰ التی بارکنا فیھا** ''سے غالباً شام مراد ہے،جہاں ان کے قافلے جایا کرتے تھے،یہی وجہ ہے کہ ان کے اس تجارتی راستے کو قرآن مجید میں ایک جگہ'امام

مبین' کہا گیا ہے۔یمن کا ملک چوں کہ ایک سرسبز وشاداب ملک ہے، جہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے، اس لیے ملک کو زرخیز بنانے کے امکانات وہاں بہت ہیں۔قوم سبا نے اس سے بھی پورا فائدہ اٹھایا اور شہر مآرب میں ایک زبردست بند بنایا، جس کی مدد سے وہ ایک بڑی وادی کا پانی روک لیتے تھے، اس پانی سے ملک کے تقریباً تین سو مربع میل علاقے کی آب پاشی کی جاتی تھی، جن میں انواع واقسام کے میوے اور خوشبودار درخت پیدا ہوتے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: ''وجنتان عن یمین و شمال ''(ان کے دائیں بائیں دو باغات تھے) تجارت اور زراعت کے ان دونوں ذرائع کی بدولت سبا ایک بڑی دولت منداور ترقی یافتہ قوم بن گئی اور بڑی شان وشوکت سے اس نے حکومت کی، قرب و جوار میں اس کا بڑا شکوہ و دبدبہ تھا۔

2.6.2 سد مآرب:

سد مآرب یعنی مآرب کا بند، یہ ایک نہایت ہی مضبوط اور کشادہ بند تھا، جس کی مدد سے یمن کے باشندے پانی کو روکتے تھے، اگر دیکھا جائے تو اسکی شکل پوری طرح آج کل کے ''ڈیم'' کی سی تھی، مآرب کا یہ بند شہر کے جنوب مغرب میں باندھا گیا تھا، اسی علاقے میں بڑے بڑے پہاڑ اور گہری وادیاں بڑی تعداد میں موجود تھیں، جب پانی برستا اور سیلاب آتا تو مختلف وادیوں کا پانی بہہ کر ایک بڑی وادی میں جسے ''اذنہ'' کہتے تھے، جمع ہوجاتا تھا، جب یہ وادی بھر جاتی تو پھر پانی کا رخ ایک درہ کی طرف ہوجاتا جو مآرب سے تین گھنٹے کی دوری پر واقع تھا، اور اس درہ کے ذریعہ پانی صحرا میں پھیل جاتا تھا، لہٰذا یمنیوں نے اس درہ پر یہ مشہور بند باندھ کر پانی کو اپنے قبضے اور تصرف میں کرلیا تھا، اس بند کے دونوں سروں پر انہوں نے دریچے اور کھڑکیاں بنا رکھی تھیں جنھیں کھول کر حسب ضرورت پانی لیتے پھر اس کو بند کردیتے۔بند کے دونوں کناروں کے پیچھے ان کے باغات اور کھیتیاں تھیں، جو اسی پانی سے سیراب ہوکر تیار ہوا کرتی تھیں، عرصۂ دراز تک اہل یمن اس بند سے فائدہ اٹھاتے رہتے۔مگر اس کی دیکھ بھال چھوڑ دی اور اس پر توجہ نہ دی۔لہٰذا ایک زبردست طوفانی سیلاب کے نتیجے میں یہ بند ٹوٹ گیا، جس کے سبب کئی بستیاں بہہ گئیں۔شہر تباہ ہوگئے اور مکانات منہدم ہوگئے، سینچائی کا ذریعہ ختم ہوگیا، وہاں مسلسل قحط پڑنے لگا، خشک سالی اور قحط کی وجہ سے جب لوگ موت کا شکار ہونے لگے تو مجبوراً انھوں نے شمال کا رخ کیا اور یہیں سے عربوں کے شمال یعنی حجاز کی طرف ہجرت کا آغاز ہوتا ہے۔اس کا آغاز تیسری صدی عیسوی میں ہوا، ان ہجرت کرنے والے قبائل میں ''ازد'' کا قبیلہ بھی تھا، جس کی نسل سے مدینہ کے اوس وخزرج کے قبائل نے جنم لیا۔کہتے ہیں کہ مآرب کے بند بعض حصے آج بھی موجود ہیں۔یمنی اس حادثے کے بعد ایسے تتر بتر ہوئے کہ عربی زبان میں منتشر ہونے کے لیے ضرب المثل بن گئے۔چناں چہ کہتے ہیں کہ: ''تفرقوا ایدی سبا''، یعنی ایسے بکھرے جیسے سبا کے لوگ، علماء آثار قدیمہ کو یمن اور اس کے گردونواح میں جو کتبے اور نقوش ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بادشاہوں کے نام اور ان کی زبان، اس کے لکھنے کا طریقہ اور اس کے اصول وقواعد ان عربی ناموں اور عربی زبان سے بالکل مختلف ہیں جسے ہم آج عربی زبان سمجھتے ہیں۔

2.6.3 مملکت سبا کے زوال کے اسباب:

سلطنت سبا کے زوال پذیر ہونے کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، عرب مؤرخین کا کہنا ہے کہ ان کے زوال کا سب سے بڑا سبب مآرب کے بند کا تباہ ہوجانا ہے، جس کے سبب وہ اپنے کھیتوں کی باقاعدہ طور پر سینچائی سے محروم ہوگئے اور کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی میں پانی کا اہم رول ہوتا ہے، لیکن بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ اس کے انحطاط کا سبب ان کی لاپروائی اور غفلت ہے اور اہل سبا کا زوال بتدریج باندھ کے ٹوٹنے سے بہت پہلے شروع ہوچکا تھا، کیوں کہ یہ بات عقل سے پرے ہے کہ ایک عظیم مملکت اچانک تباہ وبرباد ہوجائے، جب کہ اولیری کا کہنا

ہے کہ بلاشبہ مآرب کے بند کا ٹوٹنا ایک تاریخی واقعہ تھا اور قرآن کریم نے اسی واقعہ کو اہل سبا پر اللہ کی طرف سے نازل ہونے والا ایک عذاب قرار دیا ہے، جسے اللہ نے پے در پے نافرمانی کے نتیجے میں ان پر نازل کیا اور اس قوم سے اس کی نعمتیں سلب کر لی گئیں اور یہ قوم جو کہ مذہباً آفتاب پرست تھی، تجارت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے نکل گئی، جس کے سبب وہ افراتفری کا شکار ہو گئی۔

2.7 سلطنت حمیر

حمیر اور کہلان کا شمار قحطانی عرب میں ہوتا ہے، جو قیادت کے لیے باہم دست گریباں رہتے اور بادشاہت و قیادت کے لیے مقابلہ آرائی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ملکوں کو صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر صوبے کا ایک سردار ہوتا تھا، جسے اپنے صوبے کی طاقت یا کمزوری کے اعتبار سے بڑا اور چھوٹا مانا جاتا تھا، بتایا جاتا ہے کہ قبیلہ حمیر بھی سبا کی ایک شاخ تھی، جس کی سلطنت سبا اور بحر احمر کے درمیان واقع تھی، جس کا دار السلطنت ''ظفار'' تھا۔ مؤرخین کے مطابق حمیر کی سلطنت 115 قبل مسیح میں یا دوسری صدی قبل مسیح میں قائم ہوئی اور تقریباً 640 قبل مسیح یا چھٹی صدی عیسوی کے اوائل تک قائم رہی۔ ''ظفار'' شہر کو 'زیدان' کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ ظفار شہر ایک اندرونی شہر تھا، جو صنعا کے راستے میں 'فخا' کے مشرق میں تقریباً سو میل کی دوری پر واقع تھا، حمیری تجارت اور ثقافت کے میدان میں معین اور سبا کے وارث بنے۔ ان کی زبان بھی وہی جو سبائیوں اور معینیوں کی زبان تھی۔ انھوں نے قبائل سبا کے زوال کے بعد خاصا عروج حاصل کیا۔ یہ یمن کے جنوب مغربی ساحلوں پر آباد تھے، قبائل سبا کے دور ترقی میں قبائل حمیر زیادہ با اقتدار اور ترقی یافتہ نہ تھے، بلکہ اپنی مستقل حکومت رکھنے کے باوجود ایک طرح ان پر مغلوب تھے لیکن سبا کے زوال کے بعد ان کو ترقی ہوئی اور خاص طور سے تجارتی ترقی اور کامیابیوں کے معاملے میں ایک طرح سے ان کو جانشینی حاصل ہوئی، حمیری حکومت کے بادشاہ اولاً حمیر اور بعد میں ''تبع'' کہے جاتے تھے۔ تبع حمیریوں کی ہی ایک نسل تھی، جس نے حمیریوں کے آخری دور میں حکومت کی ہے۔

اپنے دور حکومت میں سلطنت حمیر کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کیوں کہ ان کے درمیان کبھی ایرانیوں سے اور کبھی حبشیوں سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں، جس میں فتح عام طور پر حمیر ہی کو ہوتی رہی، تاریخ سے ان کے بادشاہوں کی تعداد اور ان کے دور حکومت کی تاریخ کا صاف طور سے پتہ نہیں چلتا، یونان کے مؤرخین کے مطابق حمیر کے بادشاہوں کے نام میں مشابہت اور کثرت تعداد کے سبب ایسا ہوا ہے البتہ ان کے مشہور بادشاہوں میں شمر مرعش، اسعد ابو رب، اور یوسف ذی نواس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذونواس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ آخری حکمراں تھا اور سخت قسم کا یہودی تھا۔

مؤرخین عام طور سے اس سلطنت کے بادشاہوں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق پہلے طبقہ کے بادشاہوں کی حکومت تیسری صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہی۔ اور دوسرے طبقہ کے بادشاہوں نے اپنی حدود سلطنت 'شحر' اور حضر موت تک بڑھا لی تھیں۔ اس طبقہ کے بادشاہوں کو تبع جمع تبابعہ کہتے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ ذونواس تھا۔

2.8 عدنانی عرب

جنوب میں رہنے والے قحطانی یمنیوں کے مدمقابل شمال میں عدنانی تھے، عدنانی حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں اور حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقوں میں رہتے تھے، ان میں سے کچھ عراق اور جزیرہ نماء عرب میں بھی رہتے تھے، عدنانیوں اور قحطانیوں میں بہت سی باتوں میں بڑا فرق ہے، ان میں سے چند باتیں قابل غور ہیں:

1. عدنانی عربوں کے اکثر قبائل خانہ بدوش تھے، ان کے برخلاف قحطانی قبائل شہروں میں گھر بنا کر رہتے اور ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن

کے مالک تھے۔

2. عربوں کی ان دونوں قسموں میں زبان کا بڑا اختلاف تھا، چناں چہ قحطانیوں کی زبان اور عدنانیوں کی زبان میں یکسانیت نہ تھی۔

3. اسی طرح عبادت کے طریقوں اور معبودوں میں بھی ان دونوں قبائل کے درمیان بہت اختلاف تھا، یہی وجہ ہے کہ یمنی اپنے جن خاص دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے، عدنانی انہیں نہیں مانتے تھے۔

عدنانی عربوں کی بظاہر مشہور حکومتیں نظر نہیں آتی ہیں نہ ہی ان کی کوئی عدالت تھی اور نہ ہی امن وقانون نافذ کرنے کے لیے پولیس، کسی خارجی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج بھی نہیں تھی، نیز ٹیکس ادا کرنے کا بھی انہیں مکلّف نہیں بنایا گیا تھا ''آرنلڈ'' کے مطابق ان کے یہاں انتظام وانصرام یا عدالت کا مطلقاً کوئی منظّم طریقہ نہیں دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ موجودہ دور میں پایا جارہا ہے، البتہ ہر قبیلہ یا خاندان نے الگ الگ آزاد گروپ بنا رکھے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عدنانیوں کی بہت سی شاخیں ہوگئیں، ان میں سب سے زیادہ اہم اور ممتاز دو شاخیں تھیں۔ ربیعہ اور مضر، اسلام سے 200 سال پہلے تک یہی دونوں قبیلے سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر قبیلے شمار کیے جاتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے ایک ہی آباواجداد کی اولاد تھی، اس کے باوجود ان میں سخت دشمنی چلی آرہی تھی، جن کی وجہ سے ان دونوں میں سخت خون ریز جنگیں ہوئیں، جن میں دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ لڑائیاں جب چھڑ جاتی تھیں تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں، بلکہ برسہا برس تک ان کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، ان جنگوں کو ''ایام عرب'' سے جانا جاتا ہے۔ ان لڑائیوں میں سے چند مشہور درج ذیل ہیں:

2.8.1 جنگ بسوس:

اسلام سے پہلے یہ خون ریز لڑائی قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر وتغلب کے درمیان ہوئی تھی جو 40 سال تک جاری ہی اس کا سبب 'سراب' نامی ایک اونٹنی تھی جس کی مالکن 'بسوس' نام کی ایک عورت تھی۔ ایک دفعہ یہ اونٹنی کلیب بن ربیعہ کی چراگاہ میں جو بنوتغلب کا سردار تھا چلی گئی، یہ چراگاہ ''عالیہ'' نامی مقام پر واقع تھی۔ کلیب کا رعب ودبدبہ اتنا تھا کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی جانور تو کیا کوئی آدمی بھی اس میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا، اسی طرح جس گھاٹ پر اس کے جانور پانی پیتے تھے، وہاں پر دوسرے اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے تھے۔ جہاں اس کی آگ جلتی تھی، وہاں کوئی دوسرا اپنی آگ نہیں جلا سکتا تھا۔ بکر کی ایک شاخ کلیب نے قبیلہ شیبان میں شادی کررکھی تھی، بسوس نامی یہ عورت اس خاندان کے ایک شخص جو جساس بن مرہ الشیبانی کی خالہ تھی، لہٰذا جب کلیب نے شیبانی عورت کی اونٹنی کو اپنی چراگاہ میں دیکھا تو تاک لگا کر اس کی تھن میں تیر مارا، یہ ماجرا جساس دیکھ رہا تھا، خالہ اور اس کی اونٹنی کی بے عزتی اس سے نہیں دیکھی گئی، وہ کلیب پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کرڈالا، اس کے بعد بکر وتغلب میں اس منحوس لڑائی کا سلسلہ چھڑ گیا، جو عربی ادب میں نحوست کی ضرب المثل بن گئی۔

2.8.2 داحس وغبرا کی لڑائی:

یہ جنگ قبیلہ مضر کی دو شاخوں قبیلہ ذبیان اور عبس کے درمیان ہوئی تھی، جس نے بہت زیادہ شہرت پائی، اس کا پس منظر یہ ہے کہ قبیلۂ عبس کے ایک شخص 'قیس بن زہیر العبسی' نے 'حذیفہ بن بدر الفزاری' کے ساتھ جو ذبیان کا آدمی تھا گھوڑ دوڑ کے مقابلے کی شرط باندھی، چنانچہ فزاری نے اپنا گھوڑا 'غبرا' دوڑایا اور عبس نے اپنا گھوڑا 'داحس' چھوڑا، داحس آگے نکل گیا، لیکن نشان تک پہنچنے سے پہلے ایک چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا، اتنے میں فزاری کا گھوڑا 'الغبرا' پالا مار گیا، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بنوفزارہ نے راستے میں کوئی اڑنگا لگا دیا تھا۔ جس سے عبس کا گھوڑا ٹکرا کر گر گیا۔ اس پر ہر ایک قبیلہ اپنے گھوڑے کے جیتنے کا دعویٰ کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ بات بڑھ گئی اور ایسی تباہ کن جنگ کی صورت اختیار کرگئی جو 'حرب بسوس' کی طرح 40

سال تک چلتی رہی۔اسی طرح مضر کے دوسرے قبائل مثلاً قریش اور کنانہ میں مستقل جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا،ان جنگوں کو'حرب فجار' کہتے ہیں۔الغرض عدنانیوں کے مختلف قبائل میں آپس میں اکثر جنگیں جاری رہتی تھیں،جس کی وجہ سے نہ صرف جان و مال کا نقصان ہوتا تھا، بلکہ یہ جنگیں ان قبائل کے لیےایک مستقل عذاب بنی ہوئی تھیں،جس نے ان کا چین وسکون اور زندگی کا لطف چھین لیا تھا۔

2.9 عربوں کا غیر قوموں سے رابطہ اور اس کے ذرائع

عرب بڑی حدتک عزلت پسند قوم تھی، اسکے باوجود حالات کے تقاضوں اور ضروریات کے سبب دوسری قوموں سے بھی اپنا رشتہ جوڑا اور ان تعلقات اور میل جول سے عربی ادب کو بہت فائدہ ہوا۔ نئے نئے الفاظ،نت نئی ترکیبیں اور اچھوتے اسالیب بیان سامنے آئے،جس نے عربی ادب کو بہت مالا مال کیا۔عربوں کا تعلق اپنے پڑوسی ملکوں اور قوموں سے مختلف ذرائع سے ہوا،ان میں دو اہم اور نتیجہ خیز مانے جاتے ہیں۔

2.9.1 تجارت:

تجارت کے معاملے میں یمن کے باشندے ایک زمانے میں بہت مشہور تھے،ان کے بعد اس میدان میں قریش مکہ بھی داخل ہوگئے۔ چنانچہ قدیم زمانے میں یمنی حضر موت،ظفار، ہندوستان،افریقہ اور بحرین سے سامان تجارت لاکر مصر وشام کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔اس طرح ان کا ربط وضبط ان ملکوں اور وہاں کے باشندوں سے ہوا۔قریش سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر پر جاتے تھے،ایک جاڑے میں اور دوسرا گرمی میں کرتے تھے۔جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر ہے:''لاِیلاف قریش، اِیلافهم رِحْلَةَ الشّتَآءِ والصّيْف''(سورۃ قریش:2-1)،(اس لیے کہ قریش کو مانوس کردیا۔ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے باعث)۔جاڑے میں ان کے تجارتی قافلے یمن اور گرمیوں میں شام، اس سے عربی زبان کو زبردست فائدہ ہوا اور دوسرے ممالک کے باشندوں کی زندگی، رہن سہن، اور گھر بار دیکھ کر ان کے ذہن میں وسعت اور فکر میں

جلا پیدا ہوئی۔

2.9.2 سرحدی ریاستیں:

عربوں کا دوسری قوموں سے ملنے کا ذریعہ وہ عربی ریاستیں بھی بنیں، جنھیں انہوں نے سرحدوں پر قائم کی تھیں، ان ریاستوں میں 'حیرہ' اور غسانیوں کی ریاستوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، چوں کہ عربوں کی سرحدیں ایرانی اور روسی سلطنتوں کی سرحدوں سے متصل تھیں، لہٰذا عرب کے لوگ موقع پا کر ان پر برابر حملے اور لوٹ مار کرتے تھے۔ اس لیے عربوں کے اس ناگہانی حملوں سے بچنے کے لیے ایرانیوں نے اپنی سرحدوں سے متصل ''حیرہ'' اور رومیوں نے اپنی سرحدوں کے قریب 'غسانیوں' کی عربی ریاستیں قائم کیں، تاکہ یہ ریاستیں عربوں سے نمٹ لیا کرے اور انھیں ان جھگڑوں سے واسطہ نہ پڑے۔

2.9.2.1 حیرہ کی ریاست:

اس ریاست کو ایرانیوں نے قائم کیا تھا، یہ کوفہ سے تقریباً 3 میل کے فاصلے پر واقع تھی، اس کی باگ ڈور قبیلہ لخم (یمنی۔کہلانی) کو سونپی گئی تھی، جس کا والی ایران کا بادشاہ مقرر کرتا تھا، جو ایک معمولی رقم خراج کے طور پر ایران کو دیتا تھا، ریاست کا والی اکثر معاملات میں آزاد ہوتا تھا، حیرہ کا سب سے بڑا والی عمرو بن عدی رہا ہے، جسے ساپور اول بن اردشیر نے 268 عیسوی میں مقرر کیا تھا۔ حیرہ کی یہ عربی ریاست 633 عیسوی تک قائم رہی۔ اسکے بعد مشہور اسلامی سپہ سالار خالد بن ولید نے اسے فتح کر کے اسلامی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔ حیرہ کے یہ عرب حکام عربوں اور ایرانیوں کے درمیان واسطہ کا کام بھی کرتے تھے۔ جن کے اس میل جول سے عربی ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ والیان حیرہ نے اس ریاست میں 'خورنق' اور 'سدیر' نامی دو بہت عظیم الشان قلع تعمیر کرائے تھے۔ عربی ادب میں ان دونوں قلعوں کا ذکر، مضبوطی، شان وشوکت اور عظمت کے نشان کے طور پر بکثرت آتے ہیں۔ کیوں کہ ان عربوں نے اتنے پرشکوہ قلعے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

2.9.2.2 غسانی ریاست:

یہ ریاست رومیوں نے شام کی اپنی سرحدوں پر قائم کی تھی، اس ریاست کا پایہ تخت یا دارالسلطنت دمشق کے قریب ایک بستی تھی، جس کا نام 'جلق' قرار پایا تھا، مشہور صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غسان اور جلق کی تعریف بڑے دلچسپ اور والہانہ انداز سے کیا ہے۔ اس ریاست کے والیوں میں سب سے زیادہ مشہور الحارث بن جبلہ گزرا ہے، اس کو شہنشاہ کوستنیان نے 529 عیسوی میں والی مقرر کیا تھا۔ حارث مذہباً عیسائی تھا، یہی وہ حارث ہے جو 563 عیسوی میں امرؤالقیس کو لے کر قسطنطنیہ گیا تھا اور قیصر سے سفارش کی تھی کہ باپ کے قتل کے بعد امرؤالقیس پر جو مصیبت پڑی ہے، اس میں اس کی مدد کرے۔ غسانی ریاست کے والیوں میں آخری والی جبلہ بن الایہم تھا، جب مسلمانوں نے شام کو فتح کیا تو مشرف بہ اسلام ہو گیا، لیکن بعد میں حضرت عمر نے ایک معمولی مسلمان بنوفزارہ کے ایک فرد کے ساتھ زیادتی کرنے پر جبلہ کے خلاف فیصلہ صادر کیا تھا تو خفا ہو کر بھاگ گیا۔ اور قسطنطنیہ پہنچ گیا اور پھر عیسائی ہو گیا اور اسی سال 20 ھجری میں مر گیا۔

غسانی والیان ریاست بھی والیان حیرہ کی طرح عربوں اور رومیوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتے تھے۔ ان کے ذریعے عربوں میں رومی تہذیب وتمدن کے اثرات آئے، ان کے الفاظ، تراکیب اور تعبیرات آئیں، غسانی ریاست کے والیان بھی بڑے مہمان نواز، علم دوست اور شاعر وادیب نواز تھے، ان کے دربار میں اس زمانے کے جلیل القدر اور نامور شعرا آتے تھے اور انعام واکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ غسانیوں کی حکومت اسلام کے آنے کے بعد 13 ہجری میں جنگ یرموک کے بعد ختم ہو گئی۔

2.10 اکتسابی نتائج

- با قاعدہ تاریخ تحریر کرنے کی ابتداء بنوامیہ کے عہد میں کی گئی اس سے پہلے ان کی ترسیل کا ذریعہ صرف زبان تھی جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے تک خبر پہنچانے پر یقین رکھتے تھے۔
- ان کی زندگی بدویانہ اور خانہ بدوشانہ تھی، جس میں مضبوط بنیادوں پر قائم نہ کوئی معاشی وسیاسی نظام تھا اور نہ ہی اعلیٰ اقدار پر مبنی کوئی سیاسی ڈھانچہ البتہ جزیرہ نما کے کچھ حصے اس سے مستثنیٰ ہیں۔
- وہ حسب ونسب پر فخر کرنا، قبیلہ یا افراد کی بہادری کے قصے کہانی یا جنگوں میں فتح وکامرانی جیسے واقعات کو محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے، جسے قبیلہ کے افراد زبانی یاد رکھتے تھے، ورنہ ان کی زندگی کا مقصد صحرا نوردی کرنا اور دوسرے قبائل پر حملہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔
- ہاں پہلی جنگ عظیم کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے یمن میں جو کھدائیاں کرائی ہیں، اس سے بہت سے آثار ونقوش برآمد ہوئے ہیں۔
- یمنی عربوں کا سلسلۂ نسب قحطان سے جاملتا ہے، قحطانیوں کا قیام یمن میں تھا، بلکہ پورا جنوبی جزیرۃ العرب قحطانیوں کا اصل وطن تھا۔
- البتہ ''سد مآرب'' کے ٹوٹ جانے کے بعد بعض نسلوں کو رزق کی تلاش میں جزیرہ نما کے دوسرے خطوں کی طرف کوچ کرنا پڑا اور اس کی کچھ نسلیں شمالی علاقوں میں بھی قیام پذیر ہوگئیں۔
- قحطانی عرب گروہوں کی شکل میں مختلف خطوں میں محلات بنایا کرتے، جنھیں مخلاف کہتے ہیں، ان کا ایک سردار ہوتا تھا، جسے 'قیل' کہتے تھے۔
- ان کے یہاں رفتہ رفتہ تہذیب وتمدن نے جنم لیا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ یمن میں مختلف حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں دو حکومتیں بہت اہم تھیں۔
- حضرت نوح علیہ السلام کی نافرمان اولاد کی تباہی کے بعد عرب میں ان کی نجات یافتہ اولاد میں ل جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمراں قوم ظاہر ہوئی قرآن میں اسے عاد کے نام سے پکارا گیا ہے۔
- جنوبی عرب کی سلطنتوں میں ایک 'معین' کی سلطنت تھے اور یہ ملک یمن کے شمال میں واقع تھی اور شہر حضرموت اس کے مشرق میں واقع تھا، یہ سلطنت قتبان، حضرموت اور ملخ پر مشتمل تھی اور سلطنت سبا سے زیادہ قدیم سلطنت تھی۔
- سلطنت سبا معین اور قتبان کے درمیان واقع تھی، اس کا اثر ورسوخ اور بالا دستی مشرق میں خلیج فارس کے ساحل اور مغرب میں بحر احمر تک پھیلی ہوئی تھی، اس حکومت کا دارالسلطنت شہر 'مآرب' تھا۔
- 'مآرب' کا بند ایک نہایت ہی مضبوط اور کشادہ بند تھا، جس کی مدد سے یمن کے باشندے پانی کو روکتے تھے اس کی شکل پوری طرح آج کل کے 'ڈیم' کی سی تھی۔
- سبا کے زوال کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کے زوال کا سبب مآرب کا ٹوٹ جانا ہے کچھ مستشرقین کا کہنا ہے کہ انحطاط کا سبب ان کی غفلت اور لاپروائی ہے اور اہل سبا کا انحطاط بتدریج باندھ کے ٹوٹنے سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔
- حمیر اور کہلان کا شمار قحطانی عرب میں ہوتا ہے، جو قیادت کے لیے باہم دست بگریباں تھے رہتے اور بادشاہت وقیادت کے لیے مقابلہ

آرائی کیا کرتے تھے،حمیر سبا کی ایک شاخ تھا،جس کی سلطنت سبا اور بحر احمر کے درمیان واقع تھی،جس کا دارالسلطنت ''ظفار'' تھا۔اس شہر کو زیدان کے نام سے بھی جانتے ہیں۔

- عدنانی حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں اور حجاز،تہامہ اور نجد کے علاقوں میں رہتے تھے جو جزیرہ نما عرب کے شمال میں ہے، عدنانیوں اور قحطانیوں میں بہت سی باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔
- اسلام سے پہلے جنگ بسوس نامی لڑائی قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر وتغلب کے درمیان ہوئی تھی جو چالیس سال تک جاری رہی،جس کا سبب 'سراب' نامی ایک اونٹنی تھی، یہ لڑائی عربی ادب میں نحوست کے لیے 'ضرب المثل بن گئی'۔
- داحس وغبرا کی لڑائی قبیلہ مضر کی دوشاخوں قبیلہ ذبیان اور عبس کے درمیان ہوئی،جس نے سب سے زیادہ شہرت پائی جس کا سبب گھوڑ دوڑ کا مقابلہ تھا۔
- سرحدی ریاستوں میں حیرہ کی ریاست تھی، جسے ایرانیوں نے قائم کیا تھا، یہ کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع تھی جس کا والی ایران کا بادشاہ مقرر کرتا تھا۔
- غسانیوں کی ریاست رومیوں نے شام کی اپنی سرحدوں پر قائم کی تھی،اس ریاست کا پایہ تخت یا دارالسلطنت دمشق کے قریب ایک بستی تھی جس کا نام 'جلق' قرار پایا تھا۔غسانی ریاست کے والیوں میں آخری والی جبلہ بن الایہم تھا۔

2.11 نمونہ امتحانی سوالات

2.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. عربوں کی قدیم تاریخ تحریر کرنے کی ابتدا کس دور میں ہوئی؟

a. اسلامی　b. عباسی　c. اموی　d. تمام غلط

2. جاہلی دور میں کس خطے کے عرب زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے؟

a. جنوبی　b. شمالی　c. مشرقی　d. مغربی

3. عربوں کا سلسلہ نسب کس نسل سے جا ملتا ہے؟

a. عدنان　b. قحطان　c. مضر　d. تمام غلط

4. ''مأرب'' کا بند کس ملک میں واقع تھا؟

a. بحرین　b. عمان　c. یمن　d. تمام غلط

5. قحطانی عرب کے محلے کس نام سے پکارے جاتے تھے؟

a. مخلاف　b. اقیال　c. منزل　d. جندل

6. قرآن مجید میں کس حکیم کا ذکر آیا ہے؟

a. سلیمان　b. لقمان　c. اسماعیل　d. تمام غلط

7. ''معین'' کی سلطنت کتنے صوبوں میں مشتمل تھی؟

a. دو　b. تین　c. چار　d. سات

8. مملکت سبا کا قیام کس سنہ میں ہوا؟

a. 650 ق م　b. 750 ق م　c. 850 ق م　d. 950 ق م

9. ''جنگ بسوس'' کس دو قبیلوں کے درمیان ہوئی تھی؟

a. عبس وذبیان　b. عبس وبکر　c. بکروتغلب　d. قینقاع وقریظہ

10. غسانی ریاست کے آخری والی کا کیا نام تھا؟

a. جبلہ　b. عمرو بن عدی　c. ذونواس　d. تمام غلط

2.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. زمانۂ جاہلیت کے اولین دور میں عربوں کے سیاسی حالات کے بارے میں مکمل عدم معرفت کے کیا کیا اسباب ہیں؟ واضح کیجیے۔
2. قحطانی اور عدنانی عربوں کے درمیان کن چیزوں میں تفاوت پایا جاتا ہے؟ بیان کیجیے۔
3. قحطانیوں کے سلسلۂ نسب، قیام کی جگہ اور طرز زندگی پر روشنی ڈالیے؟
4. قوم عاد کا تعارف کرائیے۔
5. ایام عرب پر ایک نوٹ لکھیے۔

2.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. قحطانی اور عدنانی عرب پر ایک جامع مضمون لکھیے۔
2. مملکت سبا کے عروج، اس کی بالادستی اور طرز زندگی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. عربوں کی سرحدی ریاستوں پر روشنی ڈالیے۔

2.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. عربی ادب کی تاریخ (جلد اول) : عبدالحلیم ندوی
2. جزیرۃ العرب : مولانا محمد رابع ندوی
3. تاریخ الامت : اسلم جیراجپوری
4. تاریخ اسلام : شاہ معین الدین ندوی

-:oOo:-

اکائی 3 : جاہلی دور میں عربوں کے سماجی وتمدنی حالات

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقصد

3.2 جاہلی دور میں عربوں کے سماجی وتمدنی حالات

3.3 اونٹ اور گھوڑے کی اہمیت

3.4 طرز زندگی

3.5 قومی کردار

3.6 شہرت کی خواہش

3.7 شجاعت وجنگ پسندی

3.8 شراب اور جوا

3.9 عورت اور بدویانہ زندگی

3.10 متمدن عرب (شہروں میں رہنے والے عرب)

3.11 معاشی اور تمدنی حالت

3.12 میلے (اسواق العرب)

3.13 اکتسابی نتائج

3.14 نمونہ امتحانی سوالات

3.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.15 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید

اس اکائی میں جاہلی دور میں عربوں کے سماجی وتمدنی حالات پر بحث کی جائے گی، نیز اس دور کے معاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، اس کے علاوہ بادیہ میں رہنے والے عرب اور شہروں میں رہنے والے عرب کے درمیان مختلف معاملات میں جو تفاوت پایا جاتا ہے، اس کا جائزہ

لیا جائے گا اور ان دونوں عرب اقوام کی طرز زندگی اور مختلف اوصاف وعادات پر مفصل بحث کی جائے گی۔

3.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو جاہلی دور میں عربوں کے سماجی، تمدنی اور معاشی صورت حال کے بارے میں واقفیت ہوگی، مختلف خطوں میں رہنے والے قبائل کی طرز زندگی، رہائش، اخلاق وعادات، قومی کردار، شجاعت وجنگ پسندی نیز معاشی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے۔

3.2 جاہلی دور میں عربوں کے سماجی وتمدنی حالات

جاہلی دور میں عربوں کے سیاسی حالات کو سمجھنے کے لیے ان کی قبائلی زندگی پر روشنی ڈالنا ضروری ہوگا، جیسا کہ معلوم ہے کہ قحطانی (یمنی عرب) اور عدنانی (حجازی عرب) قبائل بعد میں بڑھ کر مختلف قبائل میں تقسیم ہوگئے اور قوموں میں قبیلہ افراد کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہم ہوتا تھا، قبیلہ ہی یہ وہ بنیاد تھا، جس پر عربوں کی تہذیب وتمدن کی بنیاد کھڑی ہوتی تھی، یہ ایک بڑا خاندان ہوتا تھا، جس کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں، اس لیے ہم کو دکھ سکھ، رنج وراحت اور مصیبت وپریشانی میں سب کا ساتھ دینا چاہیے۔ عام طور سے قبیلہ اپنے جداعلیٰ کے نام سے پکارا جاتا تھا، جیسے ربیعہ، مضر، اوس وخزرج۔ کبھی کبھی کسی قبیلے کا نام کسی مخصوص حادثے میں شہرت پاجانے یا اس کی طرف منسوب ہوجانے کی وجہ سے اسی کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا، جیسے 'غسان' یہ ایک چشمہ تھا، جہاں پر ایک قبیلہ اترا تھا، چناں چہ اس قبیلے کا نام ہی غسان پڑ گیا۔

ہر قبیلے کا ایک سردار اور شیخ ہوتا تھا، جس پر پورے قبیلے کے افراد کی اطاعت فرض ہوتی تھی، یہ شیخ جنگ وصلح کا فیصلہ کرتا، آپس کے جھگڑوں کو چکاتا، افراد قبیلہ کی خبر گیری اور نگہبانی کرتا تھا، بعض قبیلوں میں یہ رواج بھی تھا کہ شیخ قبیلہ کو افراد قبیلہ کی موت وزندگی پر پورا اختیار ہوتا تھا، اسی طرح ہر قبیلے کا ایک شاعر یا مختلف شعرا ہوتے تھے جو قبیلے کی تعریف میں قصائد کہتے اور اپنے کلام کے ذریعے قبیلے کے شاندار کاموں کا ذکر کرکے فخر کرتے، قبیلے کی بہادری، مہمان نوازی اور سخاوت کے واقعات بیان کرکے دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت اور برتری ثابت کرتے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ عرب قوم قحطانی یعنی یمنی عرب اور عدنانی یعنی حجازی عرب جیسے دو بڑے طبقوں میں تقسیم تھی۔ بعد میں یہ دونوں طبقے مختلف دو بڑی شاخوں میں بٹ گئے، چناں چہ عدنانیوں کی دو بڑی شاخیں تھیں، ربعہ اور مضر۔ پھر ان سے دیگر دوسرے چھوٹے چھوٹے قبیلے پیدا ہوئے، اسی طرح قحطانیوں کی بھی دو بڑی شاخیں تھیں، کہلان اور حمیر اور ان سے پھر دوسرے قبیلے پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ جن کے شجرۂ نسب سے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اجتماعی حالت سے ہم عرب کے باشندوں کا اپنی بیوی، آل واولاد، چچازاد بھائیوں اور مختلف قبائل کا ایک دوسرے سے آپسی رشتہ وتعلق مراد لیتے ہیں، اس طرح جب ہم عربوں کی قدیم تاریخ کے بارے میں چھان بین کرتے ہیں تو ہمیں تین اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:

1. ان کی زبان عربی زبان تھی، اگرچہ بول چال کے طریقے یا لہجے مختلف تھے۔ عربی قدیم آرامی کی ایک ترمیم شدہ صورت ہے جس کا اصل سامی ہے۔
2. وہ ایک ہی دین کے ماننے والے تھے، جسے بت پرستی کہتے ہیں۔
3. نسلی اعتبار سے وہ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

چنانچہ مذکورہ بالا عربوں کو ان کی طرز رہائش اور معیشت کے لحاظ سے سماجی ومعاشرتی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. بادیہ (دیہات میں رہنے والے) عرب، بدوی عرب، جو اہل العربہ کہلاتے ہیں۔

2. شہروں میں رہنے والے عرب (اہل المدر)

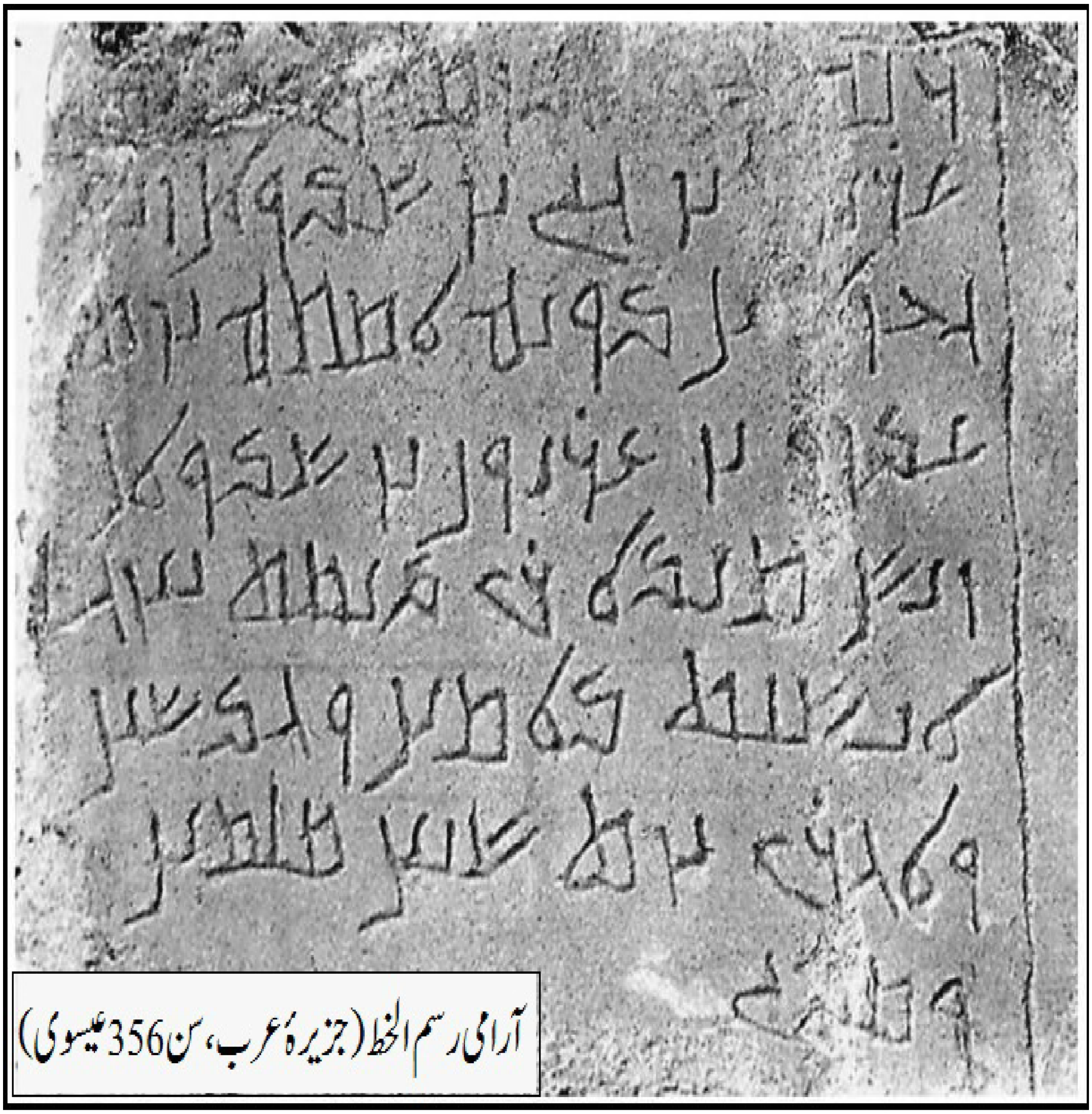

آرامی رسم الخط (جزیرۂ عرب، سن 356 عیسوی)

شکل: www.rattibha.com

بادیہ (دیہات میں رہنے والے) عرب، بدوی عرب۔ دونوں عربوں کی زندگیاں اور خصوصیات الگ الگ ہیں۔ بدوی عرب کو اہل المدر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خیموں میں زندگی گزارتے تھے، جو عام طور پر اون (وبر) سے بنے ہوتے تھے۔ جہاں عام طور پر خشک و بنجر، بے آب و گیاہ اور ریگستانی علاقوں کی موجودگی کے باعث حضری (شہری) اور غیر انتقالی رہائش کم ملتی تھی۔ پانی کی قلت اور نہروں اور دریاؤں کی عدم موجودگی کی وجہ سے، وہاں نہ کھیتی باڑی ہوسکتی تھی اور نہ ہی مستقل بستیاں اور شہر بسائے جاسکتے تھے، لہٰذا زیادہ تر عرب انتقالی اور بدویانہ زندگی گزارنے پر مجبور تھے،

کیوں کہ حضری (شہری) زندگی صرف انھی علاقوں میں گزاری جاسکتی ہے، جن میں زراعت، تجارت، صنعت یا اس سے متعلق کوئی کاروبار کیا جاسکتا ہو اور اس کے امکانات جزیرہ نما عرب میں یمن وعشیر کو چھوڑ کر عام طور پر بہت کم پائے جاتے تھے، جس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب کے زیادہ تر باشندے بدوی زندگی گزارتے تھے، البتہ بدوی عرب، اصل عربی مزاج اور خصوصیات کے حامل رہے ہیں غیر متاثر عربیت انھی لوگوں میں پائی جاتی تھی، اس لیے عرب خصوصیات اور دین وثقافت نیز کردار کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے بدوی عربوں کا مطالعہ ضروری ہے، ان کا مطالعہ حضری (شہری) عربوں کی زندگی کو بھی بڑی حد تک سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔

جزیرہ نمائے عرب میں رہنے والے بدوی عرب عام طور سے صحرائی علاقوں میں رہتے تھے، خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اور کہیں بھی جم کر نہیں رہتے تھے، ان کی زندگی کا دارومدار بارش پر تھا، جہاں بارش ہوتی اور جہاں سبزہ زار، شادابی اور زرخیزی ملتی، وہاں اپنے جانوروں کے ساتھ مقیم ہو جاتے تھے اور خیموں میں زندگی گزارتے تھے۔

ان کی زندگی کا سرچشمہ ان کے جانور تھے۔ جو صرف اونٹ، بکری، اور گھوڑے تک محدود تھے۔ جس کے دودھ، اون اور کھال سے وہ اپنا کام چلاتے تھے۔ نجد کے اونچے علاقوں میں جب سردیوں میں بارش ہوتی اور تھوڑی بہت گھاس پھوس اگ آتی تو یہ لوگ اپنے مویشیوں کے ساتھ وہاں چلے جاتے اور جب یہاں کی گھاس اور ہریالی ختم ہو جاتی تو دوسری جگہ تلاش کرتے، عام طور سے گرمیوں میں جب لوئیں چلنے لگتیں تو اپنے خیمے اپنے مویشیوں پر لاد کر دیہاتوں میں واپس آجاتے۔ اس طرح وہ صحرانوردی کی زندگی گزارتے تھے، ان کے خیمے ان کے جانوروں کی کھالوں کے بنے ہوتے تھے، جن کو نصب کرنے کے بعد دو حصے کر دیے جاتے تھے، ایک حصہ مردانہ اور دوسرا حصہ زنانہ۔ عام طور سے زنانہ حصہ پیچھے ہوتا تھا۔ عربی شاعری میں ان خیموں کو اور جن جگہوں میں وہ نصب ہوتے تھے اور جہاں جہاں قبیلہ رہتا تھا، بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ عربی کی غزلیہ شاعری میں ان خیموں اور ان میں رہنے والی نوجوان پردہ نشیں حسیناؤں اور جن بستیوں میں یہ نصب کیے جاتے تھے، ان کا ذکر عام طور سے بڑے اچھوتے اور دلکش انداز میں آیا ہے۔ ان خانہ بدوش عربوں کی غذا اپنے جانوروں کا دودھ اور کھجور ہوتی تھی، بکریوں اور اونٹوں کا گوشت بھی کھاتے تھے، مگر ان جانوروں کی مہنگائی اور افادیت کے پیش نظر ان کا گوشت سب کو میسر نہ تھا۔

3.3 اونٹ اور گھوڑے کی اہمیت

جہاں تک اونٹ کا تعلق ہے تو یہ ان کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی تھی، اونٹ کا گوشت کھاتے، اس کا دودھ پیتے اور اس کے اون اور کھال سے اپنے کپڑے بناتے، اپنے خیمے تیار کرتے اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرتے، اپنا سامان ڈھوتے اور عام سواری کے طور پر استعمال کرتے۔ اونٹوں کے بدلے میں لین دین کرتے، ان کے بدلے میں اپنے قیدیوں کو چھڑاتے، مقتولین کے فدیہ میں دیتے اور انھی کو مہر کے طور پر دے کر شادیاں کرتے۔ الغرض اونٹ ان کی زندگی کا وہ گراں قدر سرمایہ تھا، جس کے بغیر ان کی زندگی مشکل ہو جاتی۔

اسی طرح عرب گھوڑوں کو بھی بڑے شوق واہتمام سے پالتے تھے، خالص گھوڑوں کی افزائش نسل کے خیال سے ان کے شجرۂ نسب کو یاد رکھتے تھے، اسی دیکھ ریکھ کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اب بھی عربی نسل کے گھوڑوں کی شہرت، سپہ گیری میں مہارت پیدا کرنے اور اس فن کو زندہ رکھنے کے لیے جو تدبیریں عرب کرتے تھے، ان میں گھوڑ دوڑ بھی شامل تھی۔

3.4 طرز زندگی

بدوی عرب عام طور پر قبائلی زندگی بسر کرتے تھے، قبیلہ ان کی سماجی ومعاشرتی زندگی کی وہ اکائی ہوتی تھی، جس پر ان کا پورا معاشرتی نظام

قائم ہوا کرتا تھا، ان قبیلوں میں شدید خاندانی عصبیت ہوتی تھی، جس کے نتیجے میں وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، کوئی بھی قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اقتدار وتفوق آسانی سے نہیں مانتا تھا، البتہ جنگی مصالح کی بنیاد پر بسا اوقات ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے معاہدہ کر لیتا اور دونوں متحد ہو جاتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ذی اثر قبیلہ غیر ذی اثر قبیلہ کے خلاف متحد ہو جانے کے بعد چھا جاتا تھا اور اپنی شہرت کے سامنے کبھی کبھی اس کی شہرت کو مٹا دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے کئی قبیلے دوسرے طاقت ور ومشہور قبیلوں میں ضم ہو گئے اور پھر اسی کے نام سے موسوم کیے جاتے رہے۔ لہٰذا ترقی یافتہ اور مشہور ترین قبیلوں کے افراد کی کثرت سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان کے افراد سو فی صدی اپنے مخصوص قبیلوں کے افراد ہیں۔ مثال کے طور پر قوم سبا اور اس طرح کے بعض دوسرے قبائل۔

قبیلہ کے افراد آپس میں بڑا تعاون رکھتے تھے، ان کے حالات اور ان کی ضرورتیں ان کو اس تعاون پر مجبور کرتی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد وتعاون کرنا ہر فرد اپنا فرض سمجھتا تھا اور اس سلسلے میں دلیل اور وجہ بھی دریافت کیا کرتا تھا۔ قبیلہ کے کسی فرد سے قبیلہ کے باہر اگر کوئی زیادتی یا غلطی ہو جاتی تو پورا قبیلہ اس کے نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہتا تھا اور اس کو اپنی ذمہ داری تصور کرتا۔ اور جب کوئی قبیلہ اپنے کسی فرد کو عاق کر دیتا تو اس کو اپنی حفاظت اور تقویت کے لیے کسی دوسرے قبیلے سے موالات کرنی پڑتی۔ موالات میں بھی آدمی کو اصل جیسے حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ قبیلے میں شیخ قبلہ تقریباً حاکم اعلیٰ ہوتا تھا۔ سارے قبیلے میں اس کی بات مانی جاتی تھی اور اسی کا حکم چلتا تھا گویا وہ قبیلے کا سرپرست اور منتظم اعلیٰ ہوتا تھا، اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر مال غنیمت میں اس کے کچھ مزید حقوق ہوتے تھے۔

یہ سب ارتباط وتعلق اور ربط وضبط اخلاقی طور پر ہوتا تھا، اس کے قائم رکھنے کے لیے کوئی فوج اور پولیس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ قبیلے کا ہر فرد اپنے قبیلے کا فوجی اور سپاہی ہوتا تھا اور اطاعت وعمل کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ قبیلے کے تمام افراد کو اسی تعاون اور اتحاد واتفاق کی بدولت فائدے اور حفاظت حاصل ہوتی تھی۔ قبیلے کا جہاں تک دائرۂ اختیار اور نقل وحرکت ہوتا تھا گویا وہاں تک ان کی حکومت پھیلی ہوئی تھی اور وہیں تک ان کی وطنیت اور سیاست محدود تھی۔ یہ قبائل اپنے اپنے علاقے میں حکومت جیسا اقتدار رکھتے تھے، ان کے علاقے سے کوئی دوسرا قبیلہ بغیر ان کی اجازت کے نہیں گزر سکتا تھا اور کوئی گزرنا چاہتا تو اس کے افراد اور جان ومال کو خطرہ رہتا تھا، اس وجہ سے بیرون ملک کے قافلے یا افراد جزیرۃ العرب میں عام طور پر نہیں آسکتے تھے۔ ایرانی اور رومی حکومت نے اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لیے سرحد پر ان قبائل کو اپنے زیر اقتدار حکومت اور بادشاہت دے رکھی تھی۔ اور ان کو اپنے اور عربوں کے درمیان واسطہ بنا لیا تھا، یہ حکمراں قبائل ان کے قافلوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے تھے، اس کے صلے میں ان کو کچھ رقم ملتی تھی، یہی نہیں بلکہ پیچیدہ مواقع پر یہ ان عجمی سلطنتوں کا ساتھ بھی دیتے تھے۔

بدویوں کی زندگی کا دوسرا ذریعہ لوٹ، مار تھی، یہ بدوی قبائل ہمیشہ جنگ وجدال، لوٹ مار اور قتل وغارت گری میں مصروف رہتے تھے۔ اپنے دشمن قبائل پر حملہ کرتے رہتے۔ ان کے اونٹوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے اور اس طرح دوسرا قبیلہ کبھی تاک میں لگا رہتا اور موقع پا کر اپنی ضرورت پوری کرتا، ان کو لوٹ مار کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ اگر دشمن نہ ملتا تو اپنے عزیز قبیلوں پر ہی حملہ کر دیتے تھے، اس سلسلے میں ان کو معاہدے بھی کرنے پڑتے لیکن یہ معاہدے بھی زیادہ مدت تک قائم نہ رہ پاتے۔

عربوں کی اس جنگجویانہ طبیعت اور ماحول کا اثر زبان پر پڑے بغیر نہ رہ سکا، چنانچہ اس دور کی عربی شاعری جنگ کے حالات، ان کے وصف، معرکہ کارزار کے بیان، انتقام لینے کی خواہش، کامیابی پر فخر، ذلت برداشت کرنے کے مقابلے میں مر جانے کو ترجیح دینے، عزت وناموس کی خاطر جان کی بازی لگا دینے اور اپنے وقار اور خودداری پر پورے مال ومتاع کو قربان کر دینے کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح ان جنگوں

کے نتیجے کے طور پر ہتھیاروں اور آلات جنگ کے نام عربی زبان میں آئے، چناں چہ جو شخص مذکورہ اوصاف پر کھرا اترتا وہ قبیلہ کی آنکھ کا تارا بن جاتا، جس کی عزت صرف قبیلہ کے لوگ ہی نہیں، بلکہ حریف بھی کرتے تھے۔

بدویانہ زندگی گزارنے کی وجہ سے سیر وشکار کا مشغلہ بھی ان عربوں کے یہاں رائج تھا، جس کا ذکر جاہلی شاعری میں خاص طور سے امرؤ القیس، مرقش الاکبر اور علقمہ الفحل کے یہاں بہت ملتا ہے۔ چناں چہ نیل گایوں اور گورخروں کے شکار کے تذکرے سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ ان کے یہاں شیر کے شکار کا بھی رواج تھا اور اس کے لیے یہ بدو لوگ کسی اونچی جگہ پر گڑھا کھود دیتے، جسے 'زبیۃ' جمع 'زبیٰ' کہتے تھے۔ اسی زبیہ سے عربی کی ضرب المثل 'بلغ السیل الزبیٰ' یعنی 'پانی سر سے اونچا ہو گیا' وجود میں آئی۔

3.5 قومی کردار

اخلاق وعادات کے معاملے میں بدویوں کا مطمح زندگی بلند اور کردار مردانہ تھا، جس کو عربی میں 'مروءۃ' کہتے تھے۔ مروءۃ کا لفظ اپنے عربی مفہوم کے لحاظ سے خاصی معیاری خصلتوں کا حامل تھا، اس لفظ کے مفہوم اور معنی کی مکمل طور پر تحدید تو مشکل ہے، البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دو بڑے عنصر تھے، ایک شجاعت، دوسرے سخاوت، شجاعت کا استعمال جنگوں میں اور سخاوت کا مہمانوں کی خاطر داری میں ہوتا تھا۔ مروءۃ کے لفظ کے علاوہ اسی سے ملتے جلتے ایک دوسرے لفظ 'فتوۃ' کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا تھا، جس کے معنی ہیں مردانگی، بہادری اور خودداری کا مفہوم مضمر سمجھا جاتا تھا۔ عرب اس کو اپنی اہم قومی صفت سمجھتے تھے۔ چنانچہ دونوں الفاظ کے مضمرات کے ذکر سے عربی ادب اور شاعری بھری پڑی ہے، حتی کہ عرب کے ڈاکو بھی کوشش کرتے کہ خود کو ان صفات کی طرف منسوب کریں، عربی میں ڈاکو کو صعلوک کہا جاتا تھا، لیکن چوں کہ ڈاکہ ڈالنا عربوں کی نظر میں مذموم فعل نہ تھا، بلکہ اس کے برعکس اس کو بہادری اور باہمتی کا کام سمجھا جاتا تھا، اس لیے صعلوک کی شخصیت بھی عربوں کی نظر میں باہمت اور حوصلہ مند شخصیت سمجھی جاتی تھی۔

3.6 شہرت کی خواہش

شہرت کی طلب عربوں کے مزاج میں بہت کثرت سے پائی جاتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ ان کا تذکرہ اور تعریف وستائش ان کی زندگی میں نہ ہو سکے تو بعد میں ہو، اس لیے وہ سخاوت اور بہادری کو اس کا ذریعہ بناتے تھے اور پھر اپنی شاعری یا اپنے مداح کی شاعری کے ذریعے اس کو مشہور اور جاوداں بنانے کی کوشش کرتے تھے، وہ ضروریات زندگی کی طلب کے سوا، عزت اور نام کی بقا کی جدوجہد میں وقت صرف کرتے یا پھر دل پسند اشعار سے لطف لینے سے دلچسپی رکھتے اور اس طرح ان کی زندگی کے یہ پہلوان کے ذوق وحوصلہ مندی کا میدان بنتے تھے۔

3.7 شجاعت وجنگ پسندی

جود وسخا کی طرح شجاعت کی فکر بھی عربوں کو رہتی تھی، اس کے لیے ان کو لڑائیاں لڑنی پڑتی تھیں، وہ یہ سننے کے لیے تیار نہ ہوتے کہ کمزوری دکھائی، ان کو اپنی آن کی بڑی فکر رہتی، اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہ کرتے، بعض بڑی جنگیں ان کی چھوٹی سی آن کے لیے چھڑ گئیں اور ان میں بے شمار آدمی مارے گئے، ان میں داحس وغبرا کی جنگ قابل ذکر ہے، جو چالیس سال تک جاری رہی، جنگوں کے تسلسل کی وجہ سے جنگ عربوں کا ایک ذوق ومزاج بن گئی تھی، اس لیے وہ تیار رہا کرتے، اسلحہ جمع کرتے، گھوڑے تیار کرتے اور ان سب کا ذکر بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے، جنگ کے نتیجے میں جو کامیابیاں ہوتیں یا حوادث پیش آتے اور جو تاثرات پیدا ہوتے ان کو اشعار میں بیان کیا جاتا، پھر وہ اشعار فخر ومباہات

کے طور پر یا بطور اظہار تاثر پڑھے جاتے اور ہر خاص وعام کی زبان پر آجاتے، ان باتوں کی وجہ سے عربوں میں شاعروں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا، ان کی خاطر وتواضع کی جاتیں، داد ودہش کا سبب بنتے اوران سے خوف بھی کھایا جاتا، دوسری طرف شاعر بھی اپنی طاقت خوب پہچاننے لگے۔ وہ خوب جائز وناجائز فائدے اٹھاتے، کسی کواعزاز تک پہنچاتے، کسی کو بے عزت کردیتے، عربی ادب کی تاریخ میں اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

3.8 شراب اور جوا

شراب، جوااور زنا وغیرہ عرب معاشرے میں خاص طور سے داخل ہوگئے تھے، شرابوں کی بہت سی اقسام اور مختلف نام تھے۔ان کی شاعری میں شراب کا ذکر بہت پرلطف انداز میں اور فخر کے ساتھ کیا جاتا تھا اوراسے عیش وعشرت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، شراب میں اپنا مال گنوانا اوراڑانا بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا اور شعرا اس کا ذکر کرکے فخر محسوس کرتے تھے۔شراب کی باقاعدہ دکانیں ہوتی تھیں، جب کہ دیگر اشیا کی دکانوں کا رواج نہ تھا، اسی لیے دکان کے لیے عربی حانوت کا مطلب شراب خانہ ہی سمجھا جاتا ہے، یہ دکانیں سرراہ ہوتی تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا تھا۔

جوا جاہلی زندگی میں لڑائی اور خوبی کی بات سمجھی جاتی تھی اوراس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی، جوئے سے گریز کرنے والوں کو بخیلی اور تنگ دلی کے طعنے دیے جاتے اور جوئے میں بلا ناغہ شرکت کو کشادہ دلی وسخاوت سے تعبیر کیا جاتا تھا، جوئے کے سبب جھگڑے ہوتے اورلڑائی کی نوبت بھی آجاتی،عورتوں سے قانونی وغیر قانونی تعلقات کی کثرت جاہلی دور کے عربوں کا خاص وتیرہ تھا، اپنی شاعری میں اس کا بھی تذکرہ خوب کرتے تھے۔ جاہلی زندگی میں یہ عادتیں اور گمراہیاں ایسی رچ بس گئی تھیں کہ اسلام نے ان کے مٹانے کے لیے اپنی معنوی طاقت کے ساتھ ساتھ تدریجی حکمت سے بھی کام لیا تھا، چناں چہ شراب کی حرمت میں تدریج کا پہلو اختیار کیا گیا اوراس کے برتن کا استعمال دوسرے کاموں کے لیے بھی روک دیا گیا۔

3.9 عورت اور بدویانہ زندگی

ان صفات کے علاوہ بدویانہ معاشرہ میں عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی، وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں شریک ہوتی تھی،لکڑیاں لاتی تھی، جانوروں کو دوہتی تھی اور کپڑے بنتی تھی، ان کے یہاں پردہ کا رواج نہ تھا،لہٰذا عورتیں مہمانوں کا استقبال بھی کرتی تھیں، الغرض عورت مرد کے لیے مددگار اور معاون تھی، گھر کی رفاقت کے علاوہ عام طور سے جنگ میں بھی ساتھ جاتی، البتہ اس کا مرتبہ مرد کے مقابلے کم تھا، کیوں کہ زندگی کے مختلف کاموں میں مردوں کا کسی نہ کسی حد تک تو ساتھ دے سکتی تھی،لیکن جنگ میں وہ ہنر نہیں دکھا سکتی تھی جو مرد دکھاتا ہے، دوسرے متعدد کاموں میں بھی مردوں کی برابری نہیں کرسکتی تھی، اس کے باوجود اس دور میں عورتوں کو بہت سے معاملات میں پوری آزادی حاصل تھی۔اہم معاملات میں وہ مشورے دیتیں۔مردوں کے ساتھ بہت سے کاموں میں شانہ بشانہ رہتیں،شوہر کے ساتھ اس کا رشتہ اس حد تک تھا کہ ہم وہم وگمان میں بھی نہیں سوچ سکتے، اس کی شہادت آدمی کا اپنی ماں اور باپ دونوں کے حسب ونسب پر فخر کرنے سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصیدے کی شروعات ہی اپنی قوم کی تعریف وتوصیف اوران کے کارہائے نمایاں سے ہوتی تھی۔شادی کے معاملے میں ان کو پوری آزادی حاصل تھی اوراپنے شوہر اپنی مرضی سے پسند کرنے کا اختیار بھی انہیں حاصل تھا۔ان کے یہاں شادی کے سلسلے میں ایک باقاعدہ نظام تھا اور زیادہ تر افراد اپنے اہل خانہ کی رضامندی کے بعد ہی شادی کرتے تھے، اسی طرح بہت سے افراد شادی کے معاملے میں اپنی لڑکیوں سے بھی مشورے لیتے تھے، ان کے یہاں لڑکیاں یا دوشیزائیں شاذ ونادر ہی نظر آتی، جن کی بلوغت کی عمر تک پہنچنے کے باوجود شادی نہ ہوئی ہو۔

اسی طرح ان کے خاندان میں کثرت اولاد کو ضروری سمجھا جاتا تھا، تاکہ مالداری، طاقت وقوت اور عزت واحترام کی نمائندگی ہوسکے۔ ان کے یہاں طلاق کا بھی رواج تھا، جس کا حق عام طور سے مرد کو حاصل تھا، البتہ کچھ عورتیں یہ شرط رکھتی تھیں کہ جدائی کا عمل اس کی طرف سے ہو، ان کی ایک نہایت ہی بری عادت یہ تھی کہ ان میں سے بعض قبائل فقر وفاقہ اور عزت وناموس کی خاطر اپنی لڑکیوں کو زندہ قبر میں دفن کر دیتے تھے، مگر یہ رواج عام نہیں تھا، صرف تیم اور اسد کے بعض قبائل اس مذموم حرکت کے مرتکب ہوتے تھے، قرآن کے مطابق اس کی ایک وجہ غربت بھی تھی۔ یہ قبائل سمجھتے تھے کہ لڑکی ذات صرف بار بڑھائے گی، ہاتھ نہیں بٹائے گی، چناں چہ قرآن کریم نے کہا کہ: ''تم ان کو فقر وفاقہ اور تنگ دستی کے ڈر کی وجہ سے نہ مارو، کیوں کہ ہم تم کو بھی کھلاتے ہیں اور ان کو بھی'' اس خطرے کے علاوہ سب بڑی وجہ ان کا عزت نفس اور خودداری تھی، ان قبائل کو اس میں اپنی ہتک اور توہین محسوس ہوتی تھی کہ کسی کے خسر اور کسی کے سالے کہلائیں، جہاں تک لڑکوں کا تعلق ہے تو اس دور کے عرب ان کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے، مگر بعض قبائل فاقہ کے ڈر سے انہیں بھی مار ڈالتے تھے، لیکن اس دور کے بعض رحم دل بھی تھے، جنھوں نے اس رواج کو روکنے کی کوشش کی۔ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ نے خاصی رقمیں صرف کر کے دو سو لڑکیاں زندہ درگور کرنے سے بچائیں۔

اس کے علاوہ زندگی کے اکثر کاموں میں عورتیں مردوں کی برابری کرتی تھیں۔ جب میدان جنگ میں جاتی تھیں، تو ہاں ان کا کام اپنے مردوں کی ہمت بڑھانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا ہوتا، عورتوں اور مردوں کے تعلقات کسی مذہب یا اخلاق کے پابند نہ تھے، اس سلسلے میں خود ساختہ رواجوں پر عمل تھا اور من مانی چلتی تھی، جنگ میں خواہ وہ محض ڈاکہ اور لوٹ مار ہو، حاصل ہونے والی عورتیں مال ومتاع کی طرح سمجھی جاتیں اور باندی بنائی جاتیں، باقاعدہ تعلق کے لیے چار طریقے رائج تھے، بخاری شریف اور ابوداؤد شریف میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان بدوی عورتوں میں سے بہت سی نے بہادری، قوت ارادہ، عقلمندی اور شعر وادب میں بھی نام پیدا کی ہیں۔ اس بدوی زندگی کے ان سب مظاہر کا ذکر ہمیں جاہلی شاعری میں پوری طرح ملتا ہے، جہاں تک جاہلی شاعری کا تعلق ہے، اس میں تو مرکزی حیثیت عورت کو ہی حاصل ہے، اس دور کے تمام شعرا اپنے کلام کی ابتدا عورت سے اظہار تشبیب سے ہی کرتے تھے، پھر اس کے بعد گریز کر کے اصل مطلب پر آتے تھے۔ عام طور سے یہ شعری محبوبہ اپنی بیوی ہوتی تھی، غیر عورت سے اظہار تشبیب کرنا جاہلی شعرا اور جاہلی معاشرہ میں معیوب بات تھی۔

3.10 متمدن عرب (شہروں میں رہنے والے عرب)

دوسری قسم ان عربوں کی تھی، جو عام طور سے شہروں میں پختہ مکانات بنا کر رہتے تھے اور شہری زندگی کی آسائشوں اور آسانیوں سے بہرہ مند تھے۔ عربوں میں یہ تمدن جزیرۃ العرب کے جنوبی، جنوب مغربی اور کچھ مغربی ساحلوں اور علاقوں میں تھا۔ اور یہ متمدن وشہری عرب یمنی تھے۔ انھوں نے یمن میں بڑے بڑے محلات اور کوٹھیاں بنا رکھی تھیں اور تجارت وزراعت کی کمائی سے عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی تہذیب وتمدن اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ تھی کہ ان کے گھروں میں سونے چاندی کے برتن استعمال ہوتے تھے، یہ لوگ باریک کپڑے زیب تن کرتے تھے اور اپنے محلات وگھروں کو بہت قیمتی ساز وسامان سے سجاتے تھے۔

ظاہر ہے جہاں عیش وعشرت اور شہری زندگی کی اتنی آسانیاں فراہم ہوں، وہاں کے لوگوں میں سخت کوشی، محنت کرنے کی عادت اور جنگ جو قوموں کی صفات مثلاً بہادری، بے خوفی اور بے باکی نہیں پیدا ہو پاتی، چنانچہ یمن کے لوگ شمال کے عربوں کے مقابلے ان صفات میں کم تھے، ان میں سے کچھ کی صنعت بھی تھی اور کسی حد تک سیاسی نظام بھی، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

حجازیوں میں قریش مکہ متمدن، مہذب اور شہری لوگ تھے، ان کی خوشحالی کا سبب ان کی تجارت تھی، جو یمنیوں کے بعد انہیں کی اجارہ داری

بن گئی تھی، اس کے علاوہ کعبہ کی تولیت اور اس کی وجہ سے ان کے احترام کی بدولت بھی یہاں فارغ البالی اور خوشحالی آئی۔

3.11 معاشی اور تمدنی حالت

عربوں کی زندگی گزارنے کا یعنی معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، ان کے کم مایہ اور پسماندہ ہونے، نیز زمین کی عمومی خشکی کی وجہ سے ان کے لیے صنعت وحرفت اور زراعت کے کوئی خاص مواقع میسر نہ تھے، وہ اپنے خاص ذہن کے باعث کاروباری کاموں اور پیشوں کو معیوب سمجھتے تھے، ان کے بدوی نظام، ان کی زندگی کی ضروریات عام طور پر اونٹ، کھجور، تالابوں اور چشموں کا پانی، ان کی زندگی کے لیے کافی ہوتا تھا اور اگر باہر کی یا متمدن علاقوں کی کسی اشیاء کی ضرورت پڑ جاتی تو اس کے حصول کے لیے اپنی طبیعت کے مطابق کوئی طریقۂ کار یا ذریعہ اختیار کر لیتے تھے، اس لیے جزیرۃ العرب کے جن علاقوں کے عرب بدویانہ زندگی بسر کر رہے ہوتے وہاں باقاعدہ کوئی تجارتی نظام نہ ہوتا، اس طرح کا باقاعدہ نظام جنوبی اور جنوب مغربی اور کسی قدر شمالی خطوں میں تھا، جن میں حضرموت، ملک یمن اور حجاز کے بعض شہر واقع ہیں اور جزیرۃ العرب کے متمدن علاقے سمجھے جاتے تھے، کسب معاش کا باقاعدہ نظام نہ ہونے کے باعث بدوی عربوں میں خانہ بدوشی اور صحرا نوردی کا چلن ہوا، خشک اور غیر شاداب خطوں کی تلاش میں ان کو وقتاً فوقتاً اپنی جگہیں بدلنی پڑتی تھیں۔ کیوں کہ عرب کی بے دریا اور کم پانی والی زمین ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں پانی اور سرسبزی وشادابی مہیا نہیں کر سکتی تھی، چناں چہ مناسب جگہوں کی فکر میں وہ لگے رہتے تھے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو پھر اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی غلط اور معیوب نہیں تھی۔

3.12 میلے (اسواق العرب)

بدوی عربوں میں اپنی مختلف ضروریات کے لین دین، تبادلہ اور خرید وفروخت کا یوں تو باقاعدہ کوئی نظام موجود نہیں تھا، البتہ اس طرح حاجات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک کاروباری انتظام تھا اور وہ نظام میلوں کی صورت میں تھا، جس کو عرب ''اسواق العرب'' کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ میلے جزیرہ نما عرب کے مختلف حصوں اور علاقوں میں سال میں ایک بار لگا کرتے تھے، ہر میلے میں اس کے آس پاس کا اور قرب وجوار کا مال آکر فروخت ہوتا تھا اور جب تک یہ میلہ جاری رہتا، ایک جشن سا ماحول قائم رہتا تھا۔ ان کی ترتیب بھی ایسی تھی کہ جزیرۃ العرب کے آبادی والے خطوں میں ایک حلقے کی طرح پھیلے ہوئے تھے، اس طرح اگر کوئی شخص چاہتا تو پورے سال میلوں میں شریک ہو کر جزیرۃ العرب کا پورا چکر لگا سکتا تھا، ان میلوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. دومۃ الجندل:

یہ میلہ یکم ربیع الاول سے نصف ربیع الاول تک شمالی نجد میں واقع 'جوف' کے مقام پر لگتا تھا۔

2. مشعر:

یہ میلہ (حضرموت) میں یکم جمادی الثانی سے مہینہ کے اخیر تک لگتا تھا۔

3. صحار:

(حضرموت) میں یہ میلہ یکم رجب سے پانچ رجب تک لگا کرتا تھا۔

4. دبا:

یہ میلہ موجودہ امارات عربیہ متحدہ کے شہر 'رأس الخیمۃ' میں رجب کے اخیر میں لگایا جاتا تھا۔

5. شحر:

(حضر موت) میں یہ میلہ نصف شعبان میں تقریباً اس پہاڑ کے نیچے لگتا تھا، جس کے اوپر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے۔

6. عدن:

(جنوبی یمن) میں یہ میلہ یکم رمضان سے دس رمضان تک لگا رہتا تھا۔

7. صنعاء:

(شمالی یمن) میں واقع یہ شہر یمن کی راجدھانی ہے، یہ میلہ نصف رمضان سے آخری رمضان تک لگا رہتا ہے۔

8. الرابیۃ:

(حضر موت) میں یہ میلہ پندرہ ذیقعدہ سے آخری ذی قعدہ تک لگا رہتا تھا۔

9. ذوالمجاز:

(شہر مکہ کے نزدیک) یہ میلہ یکم ذی الحجہ سے آٹھ ذی الحجہ یعنی یوم الترویۃ تک لگا کرتا تھا۔

10. منیٰ:

(نزد مکہ) یہ میلہ ایام حج میں لگا کرتا تھا۔

11. نطاۃ:

(خیبر) میں یہ میلہ دس محرم الحرام سے آخر محرم الحرام تک لگا کرتا تھا۔

12. حجر:

(یمامہ نزد ریاض) یہ میلہ بھی دس محرم الحرام سے آخر محرم الحرام تک لگا کرتا تھا۔

13. زبالۃ:

یہ میلہ یثرب کے قریب زبالہ کے نام سے مشہور ایک جگہ میں لگتا تھا۔

14. الجسر:

یہ میلہ بنی قینقاع کے علاقہ میں لگا رہتا تھا۔

15. الصفاصف:

یہ میلہ یثرب کے قریب عصبہ (العصبۃ) کے نام سے مشہور ایک جگہ میں لگا رہتا تھا۔

16. عکاظ:

اس میلے میں ایک بہت بڑا بازار لگا کرتا تھا اور اس میں عرب کے مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے متعدد طبقہ کے لوگ آکر شریک ہوا کرتے تھے اور تجارت و کاروبار کے ساتھ ساتھ ادبی و علمی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں، جن میں چوٹی کے شعرا اپنا کلام سناتے اور حکم ان قصائد کے اچھے یا حسن و قبح کے بارے میں اپنی رائے دیتے، اس کے مشہور حکم کے بور پر جاہلی دور کے مشہور شاعر نابغہ ذبیانی کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ اس میلے میں جو قبائل خاص طور پر شریک ہوتے تھے، اس میں قریش، ہوازن، غطفان، عقیل، اور مطلق قابل ذکر ہیں۔ عکاظ بازار یا میلہ مکہ مکرمہ سے

شمال رخ سے جانے والے راستہ پر واقع اس مقام کے قریب لگا کرتا تھا، جس کو آج کل الحوبۃ کبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میلے میں ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

البتہ اسلام کے آنے کے بعد زیادہ تر میلے مٹ گئے، اس کے ساتھ عکاظ بھی ختم ہوگیا، لیکن اسلام کے ابتدائی زمانے میں بنی امیہ کے آخری عہد تک عکاظ کا بدل بصرہ میں مقام 'مربد' بنا، یہاں بڑے بڑے شعرا آتے اور اپنا کلام سناتے اور یہیں پر جریر و فرزدق کی معرکہ آرائی ہوا کرتی تھی۔

نقشہ: www.alkhaleejonline.net

3.13 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات سیکھے:

- اجتماعی وتمدنی حالات سے کیا مراد ہے، عربوں کی قدیم تاریخ سے جو اثرات ہمیں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، وہ ان کی زبان کا عربی ہونا،

لہجے مختلف، ایک ہی دین کے پیروکار اور نسلی اعتبار سے سامی نسل سے ان کا تعلق ہونا۔

- ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے سماجی، تمدنی اور معاشرتی لحاظ سے عربوں کو بدوی عرب اور مصری عرب یعنی شہر میں رہنے والے عرب جیسے دو گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جس میں ان کی زندگی، طرز رہائش، معاشی وتمدنی صورت حال اور مختلف عادات واطوار شامل ہیں۔
- بدوی عرب عام طور سے صحرائی علاقوں میں رہتے تھے، خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے، کہیں بھی جم کر نہیں رہتے، ان کی زندگی کا دارومدار بارش پر تھا، جہاں بھی ہریالی نظر آتی، اپنے جانوروں کے ساتھ قیام پذیر ہو جاتے اور ان کی زندگی خیموں میں گزرتی تھی۔
- ان کی زندگی کا سرچشمہ ان کے جانور تھے، جس کے دودھ، اون، اور کھال سے وہ اپنا کام چلاتے تھے، اس طرح وہ صحرانوردی کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے خیمے جانوروں کی کھال کے ہوتے تھے، جس کو نصب کرنے کے بعد مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ حصے کر دیے جاتے تھے۔
- عربی شاعری میں ان خیموں کے مقامات، رہائشی صورتحال، جہاں جہاں قبائل رہتے تھے، بڑی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ عربی کی غزلیہ شاعری میں ان خیموں کی تمام صورت حال خصوصاً نوجوان پردہ نشیں حسیناؤں کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔
- ان کے لیے اونٹ ریڑھ کی ہڈی کی طرح تھا، اس کا گوشت کھاتے، دودھ پیتے اور اس کے اون اور کھال سے وہ اپنے کپڑے بناتے اور خیمے تیار کرتے، نیز اس سے سواری کا کام بھی لیتے اور نقل وحمل کے لیے بھی استعمال کرتے۔
- ان کے یہاں گھوڑوں کی بھی اہمیت تھی، وہ اسے بڑے شوق سے پالتے تھے، افزائش نسل کی خاطر ان کے شجرۂ نسب کو یاد رکھتے تھے، اس کی دیکھ ریکھ پر بہت توجہ رکھتے تھے، سپہ گری اور گھوڑ دور میں اس کا استعمال کرتے، جس کی وجہ سے عربی گھوڑے دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔
- بدوی عرب عام طور پر قبائلی زندگی بسر کرتے تھے، قبیلہ ان کی سماجی ومعاشرتی زندگی کی وہ اکائی ہوتی تھی، جس پر ان پورا سماجی نظام قائم ہوا کرتا تھا، ان قبائل میں شدید خاندانی عصبیت بھی تھی، جس کے نتیجے میں وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔
- قبیلہ کے افراد آپس میں بڑا تعاون رکھتے تھے، ان کے حالات اور ان کی ضرورتیں ان کو اس تعاون پر مجبور کرتی تھیں، آپس میں ایک دوسرے کی مدد وتعاون کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں یہ قبائل دلیل اور درجہ بھی دریافت کرتے تھے۔
- قبیلہ میں شیخ قبیلہ تقریباً حاکم اعلیٰ ہوتا تھا، سارے قبیلے میں اس کی بات مانی جاتی تھی اور اسی کا حکم چلتا تھا، وہ قبیلے کا سرپرست اور منتظم اعلیٰ ہوتا تھا، جس کی بنا پر مال غنیمت میں اس کے کچھ مزید حقوق ہوتے تھے۔
- یہ تعلقات اور ربط وضبط اخلاقی طور پر ہوتے تھے اس کے قائم کرنے کے لیے کوئی فوج اور پولیس نہیں ہوتی تھی، بلکہ قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلے کا فوجی اور سیاسی ہوتا تھا اور اطاعت وعمل کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔
- یہ قبائل اپنے اپنے علاقے میں حکومت جیسا اقتدار رکھتے تھے، ان کے علاقے سے کوئی دوسرا قبیلہ بغیر ان کی اجازت کے نہیں گزر سکتا تھا اور کوئی اگر گزرنا چاہے تو اس کے افراد اور جان ومال کو خطرہ لاحق رہتا تھا۔
- بدویوں کی زندگی کا دوسرا پہلو لوٹ مار تھا، یہ بدوی قبائل ہمیشہ جنگ وجدال، لوٹ مار اور قتل وغارت گری میں لگے رہتے تھے، ان کو لوٹ مار کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ اگر دشمن نہ ملتا تو اپنے عزیز قبیلوں پر ہی حملہ کر دیتے، اس سلسلے میں انہیں معہدے بھی کرنے پڑتے تھے۔
- بدویانہ زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ سیر وشکار بھی کرتے تھے، جس کا ذکر جاہلی دور کی شاعری میں خصوصاً امرؤالقیس، مرقش الاکبر اور علقمہ

الفحل کے یہاں ملتا ہے، چناں چہ نیل گایوں اور گورخروں کے شکار کے تذکرے سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔

- اخلاق وعادات کے معاملے بدویوں کا کردار بلند اور مردانہ تھا، وہ سجاعت وسخاوت جیسے کردار کے حامل تھے، وہ شجاعت کا استعمال جنگوں میں اور سخاوت کا مہمانوں کی خاطر مدارات میں کرتے تھے۔
- جود وسخا کر طرح عربوں کو شجاعت کی بھی فکر رہتی تھی، وہ یہ سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ انھوں نے کمزوری یا بزدلی کا مظاہرہ کیا، ان کو اپنے آن کی بڑی فکر رہتی تھی، اسکے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہ کرتے۔
- شراب، جوا اور زنا وغیرہ عرب معاشرے میں سرایت کر چکا تھا، شرابوں کے بہت سے اقسام اور مختلف نام تھے، ان کی شاعری میں شراب کا ذکر بڑے پر لطف انداز اور نہایت ہی فخر کے ساتھ کیا جاتا تھا، وہ اسے عیش وعشرت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔
- بدویانہ معاشرے میں عورتوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں شریک ہوتی تھیں، ان کے یہاں پردے کا رواج نہ تھا، لہٰذا عورتیں مہمانوں کا استقبال بھی کرتی تھیں، مختصر یہ کہ عورت مرد کے لیے مددگار تھی۔
- متمدن عرب عام طور سے شہروں میں پختہ مکانات بنا کر رہتے تھے اور شہری زندگی کی آسائشوں اور آسانیوں سے واقف تھے، عربوں میں یہ تمدن جزیرۃ العرب کے جنوبی، جنوب مغربی اور کچھ مغربی ساحلوں اور علاقوں میں بھی تھا۔
- عربوں کے معاش کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، ان کے کم مایہ اور پسماندہ ہونے، نیز زمین کی خشکی کی وجہ سے ان کے لیے صنعت وحرفت اور زراعت کے ذرائع میس رنہ تھے، وہ اپنےخاص ذہن کے سبب کاروبار اور کاموں کو معیوب سمجھتے تھے۔

نقشہ: کتاب ''جزیرۃ العرب''، مولانا محمد رابع ندوی

3.14 نمونۂ امتحانی سوالات

3.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. عربوں کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے کتنے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں؟

a. چار　b. پانچ　c. دو　d. تین

2. سماجی و معاشرتی اعتبار سے عربوں کو کتنے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

a. دو　b. تین　c. چار　d. پانچ

3. عرب کس جانور کے شجرۂ نسب کو یاد رکھتے تھے؟

a. اونٹ　b. گھوڑا　c. گائے　d. شیر

4. عربی لفظ 'زبیۃ' کے کیا معنی ہیں؟

a. اونچی جگہ　b. پست جگہ　c. پتھریلی جگہ　d. سب صحیح

5. ''مرقش الاکبر'' کس دور کے شاعر تھے؟

a. جاہلی　b. اسلامی　c. اموی　d. عباسی

6. داحس وغبرا کی جنگ کتنے سال تک جاری رہی؟

a. پچاس　b. ساتھ　c. چالیس　d. تیس

7. وہ کون سے قبائل ہیں جو لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے؟

a. تیم واسد　b. بنی نضیر و قریظہ　c. قزاعہ و قریش　d. عبس و ذبیان

8. ''اھل الوبر'' کسے کہتے ہیں؟

a. بادیہ میں رہنے والے　b. جنگل میں رہنے والے　c. صحرا میں رہنے والے　d. شہر میں رہنے والے

9 ''دومۃ الجندل'' کا میلہ کہاں لگتا تھا؟

a. مکہ میں　b. جوف میں　c. مدینہ میں　d. حضرموت میں

10. مشہور شاعر نابغہ ذبیانی کو کس چیز کا حکم بنایا تھا؟

a. شراب　b. جوا　c. شاعری　d. گھوڑسواری

3.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. جاہلی دور میں عربوں کے سماجی و اجتماعی حالات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. عربوں میں اونٹ کی کیا اہمیت تھی؟ واضح کیجیے۔
3. عربوں کے مزاج میں شہرت کی طلب کیوں پائی جاتی تھی؟ بیان کیجیے۔
4. جاہلی دور میں جوا کی کیا اہمیت تھی؟ بیان کیجیے۔

5. عکاظ کے میلے پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

3.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. بدوی عرب کی طرز زندگی اور خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. بادیہ میں رہنے والے عرب کی قبائلی زندگی کی سچی تصویر پیش کیجیے۔
3. بدویانہ زندگی میں عورتوں کے کردار پر مفصل بحث کیجیے۔

3.15 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	عربی ادب کی تاریخ (جلد اول)	:	عبدالحلیم ندوی
2.	جزیرۃ العرب	:	مولانا محمد رابع ندوی
3.	تاریخ الامت (جلد اول)	:	اسلم جیراجپوری
4.	تاریخ اسلام (جلد اول)	:	شاہ معین الدین ندوی

-:oOo:-

اکائی 4 : جاہلی دور میں عربوں کے مذہبی حالات

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقصد
4.2 جاہلی دور میں عربوں کے مذہبی حالات
4.3 یہودیت
4.4 عیسائیت
4.5 مجوسیت
4.6 صابئیت
4.7 بت پرستی
4.8 جاہلی دور کی شاعری میں بتوں کا ذکر
4.9 عربوں کی ذہنی وفکری صورت حال
4.10 کہانت
4.11 فال
4.12 فراست وعرافت
4.13 قیافہ شناسی
4.14 اکتسابی نتائج
4.15 نمونہ امتحانی سوالات
4.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید

اس اکائی میں جاہلی دور میں عربوں کے دینی و مذہبی اور ذہنی وفکری حالات کی عکاسی کی جائے گی، مختلف قبائل میں پرستش کیے جانے

والے بتوں اور دیوتاؤں کا تذکرہ بھی کیا جائے گا، بت پرستی کے ساتھ اس دور میں جنم لینے والے مختلف ادیان ومذاہب کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا اور اخیر میں عربوں کی دینی وفکری سطح پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

4.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد آپ جاہلی دور میں رونما ہونے والے مختلف ادیان ومذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے، مختلف قبائل میں پوجے جانے والے بتوں دیوی دیوتاؤں اور ان کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔ کعبہ میں نصب کردہ بتوں کی تعداد کا پتہ لگاسکیں گے، نیز عربوں کی دینی وفکری حالت کا مطالعہ کرنے کے بعد مجوسیت، عرافت، کہانت اور قیافہ شناسی وغیرہ جیسے علوم وفنون سے روشناس ہوسکیں گے۔

4.2 جاہلی دور میں عربوں کے مذہبی حالات

دور جاہلی میں عربوں کی دینی کیفیت اور رجحانات کے حوالے سے تاریخ سے ہمیں کوئی خاطر خواہ مدد نہیں ملتی البتہ جو کچھ بھی ہمارے پاس معلومات ہیں، مختصر شکل میں موجود ہیں، ان سے ہم اس زمانے کی دینی صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ زیادہ تر عرب بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ عربوں میں بت پرستی کو رواج دینے والا عمرو بن لحی الخزاعی ہے۔ عین ممکن ہے کہ عمرو بن لحی نے خطۂ شام سے بعض بتوں کو کعبے میں منتقل کیا ہو۔

ابن کلبی کی روایت ہے کہ عمرو بن لحی کو ایک مرتبہ کوئی سخت بیماری لاحق ہوئی اس سے کہا گیا کہ شام کے خطے بلقا میں ایک جگہ ہے، اگر تو وہاں چلا جائے تو تجھے شفا مل جائے گی۔ چناں چہ عمرو وہاں گیا، وہاں پر اس نے غسل کیا اور شفایاب ہوگیا، اس نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اس نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے، لوگوں نے جواب دیا، ہم ان بتوں سے بارش کی التجا کرتے ہیں اور دشمنوں کے خلاف مدد طلب کرتے ہیں، اس نے لوگوں سے گزارش کی کہ ایک آدھ مجھے بھی دے دو، چناں چہ وہ وہاں سے ایک بت لے کر آیا اور مکے میں کعبے کے ارد گرد اسے نصب کردیا۔

قریش کے بھی اپنے بت تھے، جو عین کعبے کے اندر اور اس کے ارد گرد رکھے ہوئے تھے، ہبل ان میں سب سے زیادہ مرتبے کا مالک تھا، سرخ عقیق پتھر سے ایک انسانی شکل میں بنایا گیا تھا، جس کا داہنا ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا، قریش نے اس ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو سونے کا بنادیا اور سب سے پہلے جس شخص نے اس کو نصب کیا، اس کا نام خزیمہ بن مدرکہ بن یاس بن مضر تھا۔ اسی وجہ سے اسے ہبل خزیمہ بھی کہا جاتا تھا۔

بدوی عربوں میں بدویت جس قدر زیادہ اور غالب ہوتی تھی، اسی قدر ان کا مذہب محدود و ناپائیدار تھا، کیوں کہ مذہبی معاملات یہ بدوی عرب گہرائی تک جانے اور غور وفکر کرنے کے عادی نہ تھے، براہ راست جو باتیں ان کو معلوم ہوجاتیں یا جو چیز وہ سیکھ لیتے پختگی کے ساتھ اس کے پابند ہوجاتے، کسی کی دلیل یا تاویل کی انہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ نیز اپنے مزاج اور نسلی خصوصیات کی بنا پر جس چیز کو وہ مانتے، اس پر وہ پوری طرح قائم ودائم رہتے تھے، اس سے پیچھے ہٹنا یا تغیر پذیر ہونا ان کے لیے آسان نہ ہوتا، یہی وجہ ہے کہ وہ عام طور پر اپنے قبیلے کے اعتقادات ورسم ورواج کے سخت پابند ہوتے اور ان کو ترک کرنا ان کے لیے سخت مشکل ہوتا، وہ اس کے علاوہ دوسری باتوں کو توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش ہوکر بہت کم سنتے اور ان پر بہت مشکل سے ایمان لاتے تھے، جس کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ملتا ہے: ''بدوی کفر ونفاق کے معاملے میں نہایت ہی سخت تھے''۔ یہی وجہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں مذہب کی سب سے زیادہ سطحی شکل یعنی بت پرستی عام طور پر رائج تھی اور اس کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی

تعداد نسبتاً کم تھی اور وہ کمزوری کا شکار تھے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں پورے عربوں کا ایک مشترک مذہب نہ تھا، بلکہ ہر قبیلہ اور قبیلہ کی ہر ایک شاخ الگ الگ مذہب کے ماننے والی اور اس پر عمل کرنے والی تھی۔ چناں چہ ان میں سے بعض سورج کی پوجا کرتے تھے اور اس کے نام پر 'عبد شمس' یعنی سورج کا بندہ جیسے نام رکھتے تھے، بعض قبائل چاندی کی پرستش کرتے تھے، قبیلہ لخم، خزاعہ اور قریش 'شعری سیارة' کو اپنا معبود سمجھتے تھے، ان میں سے بعض قبائل فرشتوں کی اور بعض جنات کی بھی عبادت کرتے تھے۔ قریش کے کچھ لوگ دو خدا کے ماننے والے تھے، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت (تاریکی) کا۔ خدائے ظلمت کو فتنہ وفساد اور برائیوں کی اصل جڑ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے تھے، جنھوں نے سرے سے مذہب کا انکار کر دیا تھا، ان کے چھوٹے موٹے خداؤں کے علاوہ عام طور سے سارے عرب میں بت پرستی کا رواج تھا۔ قرآن کریم نے ان تمام بتوں کے نام شمار کرائے ہیں، جنھیں عرب کے لوگ پوجتے تھے، ان میں سب سے ممتاز اور مشہور ومعروف بت 'لات'، 'منات'، عزی، یغوث، یعوق، نسر، ود اور سواع تھے۔ ان میں سے قدیم بت ''منات'' تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام پر رکھا تھا، یہاں پہنچ کر عرب کے سبھی افراد اس کی عبادت کیا کرتے۔ جب کہ قبیلۂ ثقیف کا مقدس ومحترم بت 'لات' تھا، جس کا طائف میں انہوں نے مندر تعمیر کر رکھا تھا، عربوں میں ان بتوں کے نام پر نام رکھنے کا بھی رواج عام تھا، چناں چہ 'عبد مناف'، زید منات، زید اللات اور تیم اللات جیسے نام عام طور سے عربوں میں پائے جاتے تھے۔ ''عزی'' قریشیوں کا اہم ترین بت تھا، اسکے علاوہ قریش خانہ کعبہ میں بھی کئی بت نصب کر رکھتے، ان میں سب سے بڑا بت 'ہبل' تھا، جو انسان کی شکل کا عقیق ہیرے کا بنا ہوا تھا۔

ان بتوں کے اثرات اور کارفرمائی اس دور کے عربوں پر پوری طرح نمایاں تھی، یہ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے، مدد مانگتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے، فال نکالتے، تقدس کی نگاہ سے دیکھتے، ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے، اپنے درد کا مداوا سمجھتے، سفر میں جاتے وقت اور واپس آکر ان کو چھوتے اور اپنے جسم پر ملتے، بسا اوقات سفر وحضر میں اس کی مورتی یا پتھر بھی ساتھ رکھتے تھے۔ الغرض بت پرستی اور اس کے اثرات عربوں کی زندگی اور معاشرت کا جزء لاینفک بن گئے تھے۔ اور ان کے رگ رگ میں سرایت کر چکے تھے، دین ابراہیمی، جس کا پیروکار اپنے آپ کو سمجھتے تھے، ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا تھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے جزیرۃ العرب میں بت پرستی کے علاوہ ایک حد تک جن چار مشہور مذاہب کا رواج تھا، ان میں عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابئیت شامل ہیں۔

4.3 یہودیت

جزیرہ عرب کے شمالی اور جنوبی علاقے دور جاہلیت میں دینِ ابراہیمی سے وابستہ تھے۔ دور جاہلی کا حجاز بین الاقوامی تجارتی کوریڈور پر واقع تھا، جو شام کے ذریعے روم اور بازنطین سے اور یمن کے ذریعے ایک جانب حبشہ اور ہند سے اور دوسری جانب فارس سے جڑا ہوا تھا۔

حجاز میں مکہ اور یثرب توحید الٰہی اور دینِ ابراہیمی کے دو بڑے مرکز تھے۔ یثرب میں دو جنوبی عرب کے قبیلے، اوس وخزرج، وہاں آباد تھے اور وہ بھی رواجی دین عرب کے ساتھ دین ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہودیت اور عیسائیت کا رشتہ جزیرہ عرب سے کافی قدیم تھا۔ یہودیوں کے متعدد قبیلے یثرب اور اس کے اطراف کے علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔ گو کہ وہ دین ابراہیمی کی شاخیں تھیں انہوں نے اصل دین میں انحرافات پیدا کر کے اس کی اصل صورت بگاڑ کر اسے یہودیت بنا دیا تھا۔

اس دور کا جزیرہ عرب ان یہودی اور عیسائی آبادی کے مذہب اور ثقافت سے کچھ حد تک متاثر تھا۔ یہود و نصاریٰ کے کئی مذہبی رسوم و رواج کا مقامی عرب کو علم تھا۔ یہ تجارت اور دیگر قسم کے میل ملاپ کا نتیجہ تھا۔ مثال کے طور پر اہل یثرب کو یہود کے روزہ اور نماز کا علم تھا، کیونکہ وہ ان کے درمیان موجود تھے۔ عراق اور شام کے عربوں کو نصاریٰ کے مذہبی طقوس کا علم تھا، کیونکہ ان میں ایسے عرب قبائل موجود تھے جو عیسائی ہو گئے تھے۔

اس تعریف کے ساتھ ہم اب یہودیت کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

یمن اور مدینہ منورہ جسے پہلے یثرب کہا جاتا تھا، جس میں وادی القریٰ، تیما اور خیبر کے علاقے آتے ہیں، کچھ لوگ یہودی مذہب اختیار کیے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مدینہ منورہ سے لے کر شام تک کے خطے کی سرسبز و شاداب بستیوں میں یہودی مذہب کے ماننے والے پائے جاتے تھے، یہودی عام طور پر یا تو زراعت کے پیشہ سے وابستہ تھے یا کاریگری اور صناعی کے فن سے جڑے ہوئے تھے، نیز ان کے ماننے والوں میں بہت سے افراد سودی کاروبار بھی کرتے تھے، اس سے وہ بڑے شہروں اور زراعتی مقامات پر رہائش پذیر تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کے تین قبائل آباد تھے، بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع، ہجرت کے بعد ان تینوں قبائل نے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو ایذا و تکلیف پہنچائی اور بربادی کے ذرائع مہیا کرنے میں بالکل دریغ نہیں کیا اور بارہا تنبیہ کے باوجود وہ اپنی چالوں اور عادتوں سے باز نہیں آئے تو مسلمانوں نے انہیں مدینہ منورہ میں کچل کر رکھ دیا اور وہاں سے نکال باہر کر دیا، تب انہیں امن و چین حاصل ہوا، مدینہ منورہ میں یہودیوں کا ایک تعلیمی مرکز 'بیت المدارس' بھی تھا، جس میں دین کی تعلیم کا نظام تھا۔

یمن کے یہودیوں نے نجران کے عیسائیوں کو نیست و نابود کرنے کی بھرپور کوشش کی، ان کو بڑی تکلیف پہنچائی، اسی طرح بعض غسانی، قبیلہ طیٔ اور حیرہ کے لوگ عیسائیت کے ماننے والے تھے، مشہور جاہلی شاعر السموئل بن عادیا بھی یہودی مذہب کا پیرو تھا۔

ندلکہ کا کہنا ہے کہ: ''دراصل یہ یہودی جزیرہ نمائے عرب کے ہی رہنے والے تھے اور بعد میں انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، وہ اپنے دین پر سختی سے عمل کرنے والے تھے، البتہ انہیں توحید کے بارے میں وافر معلومات نہیں تھیں''۔ جب کہ مؤرخین کے ایک دوسرے فریق کا خیال ہے کہ جزیرہ نما کے یہودی فی الحقیقت فلسطین سے آئے تھے، اس کے بعد یہ یہودی جزیرہ نما میں تورات کی تعلیم کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔

☆ یہودی عقائد:

یہودی عقائد کی بنیاد خدا کی وحدانیت ہے۔ تورات میں یوں مذکور ہوا ہے: ''سنو! اے اسرائیل! ادونائے (یعنی: رب) ہمارا خدا ہے، ادونائے ایک ہے''۔

خدا کے اوصاف: ''میں ہوں جو ہوں سو ہوں'' موسیٰ کی زبان سے خدا کہتا ہے کہ دوسری ساری مخلوق بالکلیہ اس کی محتاج ہے، ساری نیکیاں اسی سے نکلتی ہیں، وہ بذاتہٖ خدا ہے، اس معنی میں نہیں کہ اس کا جسم ہے، وہ انسان کے ساتھ اپنی مرضی سے عمل کرتا ہے، عدل، انصاف اور محبت سے۔

انسان کی حیثیت: انسان مشت خاک ہے، لیکن اس میں نور الٰہی کی تجلی ہے، انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے، یعنی اس میں آزادی اور خود مختاری ہے، وہ قدرت کے تحت زندگی بسر کرتا ہے، لیکن ہر وقت اس کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

دیوار گریہ: مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کو ویلنگ وال (دیوار گریہ) کہتے ہیں، یہ دیوار حضرت سلیمان کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے، اور یہودیوں کے یہاں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

یہودیوں کے دوسرے عقائد: یہودی اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے آخرت، حشر ونشر، جنت وجہنم وغیرہ کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔

☆ مذہبی رسوم:

شابات (سبت): یعنی ہفتہ کا دن یہودیوں کے یہاں عبادت وآرام کے لیے خاص ہے۔ یہ دن جمعہ کے روز سورج کے غروب سے شروع ہوتا ہے اور دوسرے دن سورج کے غروب پر (یا رات گو تین ستارے نظر آنے پر) ختم ہوتا ہے، اس دن تورات کی تلاوت ثواب میں داخل ہے۔

پاسوور (Passover): یہ اہم عید ہے جو 7/روز منائی جاتی ہے، یہ فرعون کی غلامی سے اسرائیلیوں کی خلاصی پانے کی یادگار ہے۔

یوم کپور: اس کو بخشائش کا دن تصور کیا جاتا ہے، جو سالِ نو کے سات دن بعد آتا ہے، اس میں یہود ۲۴/ گھنٹے روزہ رکھتے ہیں، گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور دُعا مانگتے ہیں۔

ہنوخہ: یہ چراغوں کی عید ہے، جو نومبر یا دسمبر میں منائی جاتی ہے۔

روز کی عبادت: تین عبادات مقرر ہیں جن میں سے فجر اور دوپہر کی فرض ہیں اور مغرب کی اپنے آپ پر واجب کی جاسکتی ہے۔

☆ مذہبی کتاب:

عہد نامہ عتیق: یعنی بائبل کا وہ حصہ جو عہد نامۂ عتیق کے نام سے شامل ہے، یہ عبرانی زبان میں 39/ کتابیں ہیں، ان میں قانون اور پیغمبروں وغیرہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

اپاکریفا: یہ وہ مذہبی تحریرات ہیں جن کا وجود عبرانی زبان کے عہد عتیق میں نہیں پایا جاتا، مگر یہودی اور عیسائی اس کو مانتے ہیں، وہ صرف یونانی زبان کے سپٹواجنٹ اور لاطینی ولگیٹ میں پائی جاتی ہیں، ان تحریرات میں مطالب کو مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔

سپٹواجنٹ: عبرانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ہے، جس کو تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں اسکندریہ میں یہودی علمانے مرتب کیا تھا۔

ولگیٹ: بائبل کا لاطینی ترجمہ ہے، جس کو جروم نے چوتھی صدی عیسوی میں لکھا تھا۔

تالمود: ربیین (حاخامات) کی مختلف تحریرات کے مجموعہ کا نام ہے، ''ربی'' عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: میرا مالک، ربی سے مراد وہ عالم ہے جو یہودی قانون اور رسم ورواج کی نسبت فتویٰ دیتا ہے۔ تالمود کے دو حصے ہیں:

(1) مشنا: اس میں قواعد اور فرائض کا ذکر ہے۔ یہ فقہ یہود (ہالاخا) کا سب سے اولین مجموعہ ہے۔

(2) جمارا: یہ مشنا کی شرح ہے جو یہودی علمانے لکھی۔

4.4 عیسائیت

عیسائی مذہب حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں عیسائیت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وہ مذہب جو اپنی اصلیت کو ناصرہ کے باشندے یسوع کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسے خدا کا منتخب (مسیح) مانتا ہے۔

اس مذہب کی چاشنی عربوں میں رومی حکومت کے اثر ورسوخ سے آئی تھی اور زیادہ تر شام اور شمالی نجد کے بعض قبائل میں، حیرہ کے حکمرانوں میں اور یمن کے علاقہ نجران میں پائی جاتی تھی۔ نجران ان کا ایک مرکز بھی تھا، جس میں ان کا بڑا گرجا گھر اور اس وابستہ دوسرے شعبے تھے۔ اور اسی کے اثر سے عیسائیت جزیرۃ العرب کے دوسرے باشندوں میں بھی پہنچی تھی، قبائل ربیعہ، تغلب، غسان اور قضاعہ کی بعض شاخوں میں عیسائیت کا رواج

تھا۔ حیرہ میں عرب کے مختلف قبائل جن کو' 'العباذ' ' کہتے تھے۔ عیسائی مذہب کے پیرو تھے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یمن کا شہر 'نجران' عیسائی مذہب کا گڑھ تھا، عیسائی شعرا میں قس بن ساعدہ الایادی، امیہ بن ابی الصلت اور عدی بن زید کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

عربوں میں عیسائیت کا ظہور چوتھی صدی عیسوی میں ہوا، البتہ یہ لوگوں کی بڑی تعداد کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہی، ہاں اگر روم کی حکومت اس دین کے پھیلانے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہوتی تو صورت حال کچھ اور ہوتی، عرب کی کسی حد تک عیسائیت سے اس لیے متاثر ہوئے کیوں کہ عربوں اور بازنطینیوں کے درمیان روابط بہت گہرے تھے۔ جنوب میں عیسائیت حبشے کے راستے سے پھیلی، جب کہ شام اور جزیرہ سینا کے راستے سے آئی تھی۔ بعد میں عیسائی کئی شقوں میں تقسیم ہوگئے اور جزیرہ نما میں دو فرقے وجود میں آئے، اس میں ایک فرقہ، جس کا نام نسطوریہ تھا، حیرہ میں وجود میں آیا، جب کہ دوسرے فرقے یعقوبیہ نے غسان اور شام کے قبائل میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا اور جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عیسائیوں کا عرب میں سب سے بڑا مرکز نجران میں تھا، جہاں کی زمین زرخیز اور سرسبز و شاداب تھی اور وہ ایک آباد علاقہ تھا، یہاں کے عیسائی باشندوں کا پیشہ زراعت تھا، وہ ریشمی کپڑے تیار کرنے میں مہارت رکھتے اسی طرح وہ اسلحہ اور ہتھیار کی تجارت بھی کرتے تھے۔

☆ عیسائی عقائد:

عیسائی خدا پر ایمان، آخرت پر ایمان، حشر ونشر پر ایمان اور جنت وجہنم پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کے کچھ دوسرے قابل ذکر عقائد ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

عقیدۂ تثلیث (Trinity): یہ مسیحیت کا لازمی جز ہے۔ یہ لفظ بائبل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم سے مرکب ہے، تین اقانیم سے کون مراد ہیں؟ بعض عیسائی حضرات کے نزدیک تین اقانیم سے مراد خدا (باپ) عیسیٰ (بیٹا) اور روح القدس ہے۔ روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفتِ حیات اور صفت محبت ہے، جس کی وجہ سے بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے محبت کرتا ہے، یہ صفت ایک جوہری وجود رکھتی ہے۔ اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور جاودانی ہے، اس لیے ایک مستقل اقنوم ہے۔ بعض عیسائیوں کے نزدیک تین اقانیم سے مراد خدا، (باپ) عیسیٰ (بیٹا) اور کنواری مریم ہے۔

توحید در تثلیث: اکثر عیسائی حضرات تینوں اقانیم کو مستقل مان کر بھی ایک ہی سمجھتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں تثلیث کی تعبیر اس طرح پیش کی گئی ہے: کہ باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے، اور روح القدس خدا ہے، لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی خدا ہے۔

عقیدۂ حلول وتجسم: اکثر عیسائیوں کا خیال ہے کہ خدا کی صفت کلام ایک جوہر ہے، جو خدا کی ماہیت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے، اسی صفت کے ذریعہ تمام اشیاء پیدا ہوئی ہیں، خدا کی یہی صفت ' 'یسوع مسیح' ' کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی، جس کی وجہ سے یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

عقیدۂ مصلوبیت: عیسائی مذہب کے مطابق حضرت عیسیٰ کو یہود کے اصرار پر رومی گورنر پیلاطوس (Pontius Pilate) کے حکم سے گولگوتھا (Golgotha) کے مقام پر سولی پر چڑھا دیا تھا، اور اس سے ان کی وفات ہوگئی، تاہم عیسائیوں کے اکثر فرقوں کے نزدیک پھانسی اقنوم: ' 'ابن' ' کو نہیں دی گئی، جو ان کے نزدیک خدا ہے، بلکہ اس اقنوم ابن کے انسانی مظہر یعنی حضرت مسیح کو دی گئی، جو اپنی انسانی حیثیت میں خدا نہیں تھا، بلکہ مخلوق تھا۔

بہر حال عیسائیوں کے مطابق حضرت مسیح سولی پر وفات پانے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد تیسرے دن پھر زندہ ہو گئے تھے اور حواریوں کو

کچھ ہدایات دینے کے بعد آسمان پر تشریف لے گئے۔

عقیدۂ کفارہ (Atonement): عیسائیوں کا ماننا ہے کہ حضرت آدم نے شجرۂ ممنوعہ کھا کر ایک گناہِ عظیم کیا اور وہ گناہ انسان میں منتقل ہوتا رہا، نیز ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ حضرت عیسیٰ نے سولی پر چڑھ کر تمام انسانیت کے گناہ کو دھو دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق: ''کفارہ'' سے مراد یسوع مسیح کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ ایک گناہ گار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے، اس عقیدے کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں، ایک تو یہ کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دور ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ خدا کی صفت کلام (بیٹا) اس لیے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے۔

بپتسمہ (Baptism): یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی غسل کے ہیں، یہ عیسائی مذہب میں داخل ہونے والے کو دیا جاتا ہے، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ بپتسمہ لینے سے انسان یسوع مسیح کے واسطے سے ایک بار مر کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے، موت کے ذریعہ اسے ''اصلی گناہ'' کی سزا ملتی ہے اور نئی زندگی سے اسے آزاد قوت ارادی حاصل ہوتی ہے۔ مورخین کے مطابق حضرت عیسیٰ نے یوحنا سے بپتسمہ دریا میں لیا تھا۔

عشائے ربانی (Lord's Supper / Eucharist): ہر اتوار کو کلیسا میں ایک اجتماع ہوتا ہے، جس میں دعا کے بعد صدر مجلس روٹی اور شراب کو لے کر باپ، بیٹے اور روح القدس سے برکت کی دُعا کرتا ہے، پھر یہی روٹی اور شراب کو تمام حاضرین میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس عمل سے فوراً روٹی مسیح کا بدن بن جاتی ہے اور شراب مسیح کا خون، اور تمام حاضرین اسے کھا پی کر اپنے عقیدۂ کفارہ کو تازہ کرتے ہیں۔

☆ مذہبی کتاب:

عیسائیوں کی بنیادی مذہبی کتاب انجیل (انگریزی: بائبل) ہے۔ موجودہ بائبل دو حصوں میں منقسم ہے عہد نامہ جدید اور عہد نامہ عتیق۔ عہد نامہ جدید میں چار بنیادی انجیلیں شامل ہیں انجیل یوحنا، انجیل مرقس، انجیل لوقا اور انجیل متی، ان کے علاوہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور ان حواریوں کے تلامذہ کے مکتوبات، مکاشفات اور الہامات پر مشتمل صحائف بھی ہیں۔ بائبل کے عہد عتیق پر بھی عیسائی ایمان رکھتے ہیں، جس کا یہودیوں کی مذہبی کتابوں کے ضمن میں ذکر آچکا ہے۔

4.5 مجوسیت

مجوسیت عربوں میں کم پائی جاتی تھی اور جو کچھ بھی تھی وہ ایران کے زیر سایہ آتی تھی، نجد میں کندہ خاندان کے آخری بادشاہ نے ایرانی حکومت کے تعاون کو حاصل کرنے کے لیے مجوسیت اختیار کر لی تھی، مجوسی دو خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں، ایک خدائے نور یعنی روشنی کا خدا اور دوسرے خدائے ظلمت یعنی تاریکی کا خدا، ایک کو ''یزدان'' اور دوسرے کو ''اہرمن'' کہتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے نزدیک ان آیات میں جس میں اللہ تعالیٰ کو الوہیت کے اثبات کے ضمن میں نور و ظلمات کا ذکر ملتا ہے، مجوسیوں کے عقیدے کا رد اور اس کے باطل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

4.6 صابئیت

یہ ایک ایسا مبہم اور پیچیدہ مذہب ہے، جس کی صحیح تعیین و تشریح نہیں کی جا سکتی، لیکن مجموعی طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ مذہب ستارہ پرستی پر مبنی تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مذہب تقریباً وہی مذہب ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا تھا، عہد عباسی میں صابئیوں نے اپنے اس مذہب کو ترقی یافتہ اور عالمی بنانے کی کوشش کی اور انہوں نے اپنی ایسی شکل بنائی کہ جس کے ذریعے وہ اپنی ساری خرافات کے ساتھ ساتھ مؤحد اور اہل کتاب بھی معلوم ہوتے تھے، چناں چہ عہد عباسی میں چند مشہور صابئی گزرے ہیں، مثلاً ابو اسحاق صابئی جو ایک اچھا اہل قلم تھا، نیز عہد جاہلیت

میں بدمذہب ہوجانے کو صابئیت سے تعبیر کرتے تھے، اسی لیے اسلام لانے والے کو وہ لوگ اسلام کے بجائے صبا کہتے تھے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ سمجھے بوجھے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر کسی غیر واضح مذہب کو اختیار کیا گیا ہے۔

4.7 بت پرستی

ان کے علاوہ بقیہ اہل عرب کا مذہب جاہلی دور میں بت پرستی تھا اور جزیرۃ العرب میں اکثریت انہی کی تھی اور انہی کا غلبہ و بول بالا تھا، کہا جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں بت پرست نہ تھے، ان میں بت پرستی سب سے پہلے اس وقت آئی، جب ان میں کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا ،کسی غرض سے ملک کے باہر کے سفر پر گیا، جہاں سے وہ بت پرستی دیکھ کر اور پسند کر کے آیا اور اس نے پھر یہاں بت پرستی کی شروعات کی جو رفتہ رفتہ سارے عرب میں پھیل گئی، قبیلے قبیلے میں بت نصب ہونے لگے اور بعد میں اس نے بت خانے کی شکل اختیار کر لی، کعبہ چوں کہ عربوں کا مقدس عبادت خانہ تھا، اس لیے ہر قبیلے نے اپنے مخصوص بت وہاں رکھنا ضروری سمجھا، جس کی وجہ سے کعبہ بتوں سے بھر گیا، کعبہ میں بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ بتائی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس میں رکھے گئے بت مختلف قبائل کے دیوتاؤں کی نمائندگی کرتے تھے۔ عمرو بن لحی نے جو بت لا کر مکہ میں نصب کیا تھا۔ اس کا نام 'ہبل' تھا۔

جہاں تک بنی اسماعیل میں بت پرستی کے آنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ان میں سے کوئی شخص مکہ سے ہجرت کرتا تو اپنے ساتھ بطور احترام و تقدس کعبہ کا ایک پتھر لے لیتا اور مکہ کے باہر جا کر اس کی عبادت اور طواف کرتا، پھر بعد کی نسلوں نے پتھروں کی عبادت کو مستقل اپنا مذہب بنالیا اور ان کی بت پرستی صرف پتھروں تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ وسیع پیمانے پر مختلف طریقوں سے عام ہوگئی، بعض لوگ اپنے جذبۂ عبادت کی تسکین کے لیے ہر جا و بے جا چیزوں کی عبادت کر کے حاصل کر لیا کرتے تھے، ہر قبیلہ نے اپنا الگ الگ بت بنا رکھا تھا، سفر سے پہلے اس کے افراد کعبہ میں اسی بت کے پاس جا کر عبادت کرتے تھے، عدنانی قبائل کے تین بڑے بت تھے، کنانہ و قریش کا ایک الگ مشترک بت تھا، جس کا نام عزی تھا، دوسرا خاص بت قریش کا تھا جسے 'ہبل' کے نام سے پکارا جاتا تھا، تیسرا ثقیف کا ایک بت تھا، جسے لات کا نام دیا گیا تھا، قریش کا اصل بت 'ہبل' تھا، وہ کعبہ کے اندر نصب تھا اور قرب و جوار کے بتوں میں سب سے بڑا مانا جاتا تھا، وہ سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا اور اس کی شکل انسان کی طرح تھی، دایاں ہاتھ ٹوٹ گیا تھا، جسے قریش نے سونے کا بنا کر لگا دیا تھا، قریش و کنانہ کا مشترک بت عزیٰ تھا، عزیٰ مکہ سے ایک رات کی مسافت کی دوری پر مقام نخلہ میں ایک درخت تھا، اس علاقے میں 'النخلہ' دو تھے، ایک النخلہ الشامیہ دوسرے النخلہ الیمانیہ، مذکورہ النخلہ ،النخلہ الشامیہ کہلاتا ہے، قبیلۂ ثقیف کا بت لات تھا، جو طائف میں نص تھا، جب کہ اوس و خزرج وغیرہ کا بت منات تھا، جو مقام قدید میں نصب تھا، قدید مکہ و مدینہ کے درمیانی راستے پر ایک ہرا بھرا گاؤں تھا۔

اسی طرح کعبہ کے سامنے زمزم کے پاس دو مشہور بت اساف و نائلہ تھے، ان کے علاوہ مکہ میں ایک چھوٹا بت تھا، جس کو مناف کہا جاتا تھا، ان بتوں کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے مختلف قبائل میں خاص بت متعین تھے، وہ یہ ہیں: یمن میں اہل قریش کا یغوث، خیوا میں حمدان کا یعوق، قبیلہ ذوالکلاع حمیری کا نسر اور دومۃ الجندل میں ہذیل کا سواع، بتوں کی عبادت و پوجا سیٹی اور تالیاں بجا کر کی جاتی تھی، جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ بعض بتوں کا طواف ہوتا، ایسے بت ذوار کہلاتے تھے، بتوں کے لیے قرآن مجید میں اصنام، اوثان، اور تماثیل جیسے تین الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اصنام صنم کی جمع ہے، جس کے معنی عبادت کی جانے والی مورتی کے ہیں اور اوثان وثن کی جمع ہے، جس کے معنی عبادت کیے جانے والے پتھروں کے ہیں۔ جب کہ تماثیل تمثال کی جمع ہے، جس کے معنی شکل و مجسمہ کے ہیں، آلہۃ کا لفظ الہ کی جمع ہے جس کے معنی لائق عبادت اور

برتر و بالا ذات کے ہیں۔جس کو اردو میں معبود کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، عرب کے مشرک اپنے بتوں کو آلہتہ کہتے اور سمجھتے تھے۔اس دور میں عربوں کو بتوں کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ جب انہیں کوئی بت نہیں ملتا، یا سفر کی حالت میں ہوتے تو کسی بھی چیز کا بت بنا لیا کرتے تھے۔مثلاً ریت پر بکری کا دودھ ڈال کر گولہ بنا لیتے اور بعض تو پیشاب سے یہ کام لیتے، کام نکالنے کے بعد اسے پھینک دیا کرتے تھے۔کبھی مٹھائی سے بنا لیتے اور بعد میں اسے کھا لیتے تھے۔کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو پتھر لے آتا اور جو پتھر اچھا معلوم ہوتا اسے معبود قرار دے دیتا، وہ ان بتوں کو محدود طاقت وقدرت والا خدا سمجھتے تھے، جب کہ اصل اور سب سے بڑی قدرت کا مالک وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے، لیکن اس کی قدرت وخدائی میں اپنے بتوں کو شریک اور معاون ونمائندہ سمجھتے تھے، قرآن مجید کی کئی آیات سے اس کی شہادت ملتی ہے، بتوں کے علاوہ فرشتوں اور جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزیمہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی، جو جنوں کی پرستش کرتی تھی، فرشتوں کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے ان سے شفاعت کے طلب گار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے، اس کے علاوہ بعض بعض قبائل میں ستارہ پرستی کا بھی رواج تھا۔صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتے تھے۔کنانہ کا قبیلہ چاند کی پوجاری تھا، بنوتمیم دبران ستارہ کی لخم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعری اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا، بنو حنفیہ نے اپنا ایک بت حیس (کھجوروں اور گھی سے ملا کر) بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ایک سال جب قحط پڑا تو وہ اس کو کھا گئے، جس کے بارے میں ایک شاعر نے کہا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''بنی حنفیہ نے قحط سالی کے ایام میں اپنے رب کو کھا لیا اور اپنے خدا کا مطلق اندیشہ نہ کیا کہ اس انجام کار کی انہیں کیا سزا ملے گی''۔

قدیم عربوں کے درمیان کچھ ایسے روشن خیال لوگ تھے جو اپنی بڑی مذہبی صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ لوگ بت پرستی سے اونچے اٹھ کر اپنے عقائد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جو اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہو، یہ تبدیلی ان کے اندر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رہنے اور ان سے اختلاط کے سبب آئی تھی، ان کے درمیان کچھ ایسے لوگ موجود تھے، جو توحید پر مبنی ایک نئے دین کی دعوت دیتے جس کا عیسائیت سے کوئی رشتہ یا واسطہ نہیں تھا، یہ لوگ بت پرستی کو ترک کرنے اور جاہلی عادات واطوار سے چھٹکارا پانے کی دعوت دے رہے تھے جن میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، شراب پینا اور جوا کھیلنا جیسی عادتیں شامل تھیں، یہ وہ جماعت تھی، جو صرف ایک خدا کی عبادت کرتی تھی اور بت پرستی، یہودیت یا نصرانیت کی قائل نہ تھی۔یہ لوگ 'حنفی' (یعنی خالصۃً صرف ایک خدا کو ماننے والے) کہلاتے تھے۔ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہی وہ خدا ہے، جو ان کے اچھے اور برے عمل کا حساب وکتاب لے گا، انہیں حنفی کے علاوہ توبہ کرنے والے یا اللہ کا اعتراف کرنے والوں کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے، جس کی نسبت دین حنیف کی طرف کی گئی ہے۔

اور جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ آل عمران میں آیا ہے، اسی طرف سورہ انعام کی آیت نمبر 76 سے آیت نمبر 79 تک میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔یہ لوگ قریشیوں کی بت پرستی کو خام خیالی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے تھے۔ان کے چڑھاوے کے جانوروں کے گوشت کو یہ لوگ حرام سمجھتے تھے، اس کے ماننے والوں میں مشہور شاعر امیہ بن الصلت کا نام آتا ہے، جسے یہ امید تھی کہ نبی منتظر وہی ہوگا، اسی طرح آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کا نام بھی اسی فہرست میں شامل ہے، جو ایک بوڑھے اور ضعیف انسان تھے، جنھوں نے انجیل حفظ کر رکھی تھی اور یہ وہی ورقہ ہیں، جنھوں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی کا مطلب بتایا تھا، اس کے علاوہ عرب کے مشہور قاضی وخطیب قس بن ساعدہ الایادی بھی اسی زمرے میں شامل ہیں، جو عکاظ کے میلے میں اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب کر رہے تھے، جس میں وہ عربوں کو رائج شدہ رسم ورواج کو چھوڑنے پر آمادہ کر رہے تھے اور انہیں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی خبر بھی دے

رہے تھے۔

بالجملہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو عربوں میں بت پرستی کا عقیدہ کمزور پڑنے لگا اور یہ مذہب زوال کا شکار ہوگیا اور رفتہ رفتہ کچھ لوگ آخرت کی زندگی پر ایمان لانے لگے، اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے ایسے گروہ تھے، جو عقیدۂ توحید پر ایمان رکھتے تھے۔

ان سب کے باوجود ان مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب ملک عرب پر غالب نہیں ہوسکا اور نہ ہی اسے اس راستے میں کامیابی ملی، کیوں کہ عیسائیت اس وقت ایک مبہم مذہب بن کر رہ گیا تھا، جس کے نتیجے میں خطوں میں کئی فرقوں میں تقسیم ہوگئے، جن میں آپسی اختلاف پایا جاتا تھا، جب کہ یہودیت ایک چنندہ قوم کا دین بن کر رہ گئی، جس کو عربوں نے خود ہی قبول نہیں کیا، اس طرح دین توحید بھی دین زرداشت سے اجڑ گئے، کچھ عناصر کے پائے جانے کے سبب زوال کا شکار ہوگیا، البتہ عیسائیت، یہودیت اور فارسی جیسے مذاہب اور ان کے افکار و خیالات نے نبی منتظر حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی راہ ہموار ہوگئی۔

4.8 جاہلی دور کی شاعری میں بتوں کا ذکر

یہ تو عام معاشرے کی دینی حالت تھی، جس کے بارے میں بحث کی گئی، لیکن اگر ہم جاہلی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس دور کے شعرا نے دین اور اس کے معتقدات ونظریات کو دینی حیثیت سے اپنی شاعری کا موضوع عام طور سے نہیں بنایا اور نہ انہوں نے ان مسائل پر گفتگو کی، البتہ بعض شعرا ایسے نظر آتے ہیں، جن کے یہاں 'لات وعزیٰ' کی قسم ملتی ہے، مگر اول تو یہ سب کم ہے اور جہاں ہے بھی تو غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ شاید مخاطب اس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو، جو ان بتوں کی پرستش کرتا ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوئی ہے کہ جاہلیت میں عام عرب اور خاص طور سے شعرا دین کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسری بات یہ بھی ممکن ہے کہ اسلامی عہد میں جب ان شعرا کا کلام مرتب ہوا تو شعر کے زوالوں سے جان بوجھ کر ایسے اشعار مرتب نہیں کیے، جن میں غیر اسلامی عقائد یا بت پرستی کا ذکر تھا، کیوں کہ ان کے خیال میں اس سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقائد کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔

4.9 عربوں کی ذہنی وفکری صورت حال

جاہلی دور میں عربوں کی ذہنی فکری وثقافتی زندگی کچھ زیادہ وسیع نہ تھی، ان کی ثقافت وعلم کا انحصار صرف زبان دانی، شاعری، امثال اور کہانیوں پر تھا، فی الحقیقت یہی ان کی فکری زندگی کا دائرہ عمل تھا، علم وفلسفہ کا ان کی زندگی پر کوئی اثر نہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ابتدائی اجتماعی زندگی تہذیب وتمدن سے بہت دور اور دوسری قوموں سے مستفید ومتاثر ہونے سے بھی عام طور پر محروم تھی، ایسے میں علم وتعلیم اور فلسفے کا کیا گذر ہوسکتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں پڑھے لکھے لوگ خال خال نظر آتے تھے اور جو بھی لکھنے پڑھنے والا پایا جاتا تھا، وہ باہر سے سیکھ کر آیا ہوتا تھا، جس کی گنجائش جزیرۃ العرب کی مخصوص زندگی میں بہت کم ہوتی تھی، پڑھے لکھے آدمی کو اس وقت کی اصطلاح میں کاتب کہتے تھے، اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں زبان علم اچھا خاصا تھا، جس کا تعلق پڑھنے لکھنے سے نہ تھا، بلکہ صرف روایت اور حفظ سے تھا، اس علم کا دائرہ بھی محدود تھا اور جزیرۃ العرب میں ان کی مخصوص زندگی کے ساتھ وابستہ تھا، لہٰذا علم انساب کو جاننے والے اور موسمیاتی تبدیلیوں واثرات کو سمجھنے والے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تاریخ وطب سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے پائے جاتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کی واقفیت اس قدر ابتدائی اور سادہ تھی کہ ان میں سے کسی واقفیت کو بھی مستقل علم کہنا مشکل تھا۔ اور جہاں تک تجربے اور مشق کا تعلق تھا تو اس سلسلے میں اپنی حفظ اور اپنی سمجھ سے انہوں نے کافی

فائدہ اٹھایا، ان کی ثقافت کے بنیادی عناصر، جن پر ان کے ادب میں زیادہ زور ملتا ہے، وہ چار تھے، یعنی زبان دانی، شاعری، امثال اور کہانیاں۔

جب کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا طریقۂ کار اور نہج وہ ہو، جس پر عربوں اور خاص طور سے عدنانیوں کی معاشرتی زندگی چل رہی تھی تو علم اور علمی کام کرنے والے لوگ، نیز اس کو منظم اور منضبط کرنے والے علماء نہیں ابھر پاتے اور خصوصاً ایسے معاشرے میں جہاں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہو یا صفر کے برابر ہو، کیوں کہ علمی کام کے لیے دلی سکون کے ساتھ معاشی و مالی سکون کے علاوہ ایک ایسی تہذیب وتمدن کی ضرورت پڑتی ہے، جہاں اس کی قدر اور اس سے مستفید ہونے کے مواقع اور اس کو آگے بڑھانے یا ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے امکانات موجود ہوں، اور یہی وہ چیزیں تھیں جو بڑی حد تک اس معاشرے میں مفقود تھیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس زمانے میں کوئی ایسا علمی کارنامہ یا کام اور تصنیف نہیں ملتی جو خالصۂ عربوں کی رہین منت ہو، یا اس کی دین ہو اور جس نے علمی دنیا میں کوئی مقام حاصل کیا ہو یا کوئی جگہ بنائی ہو۔

مگر کتابوں اور منضبط و منظم یافتہ علوم وفنون کی عدم موجودگی میں بھی ان عربوں نے اور خاص طور سے عدنانیوں نے ضرورت کے تقاضے کے مطابق زندگی کے بہت سے مسائل اور اس سے متعلق کئی علوم وفنون میں اپنے تجربات کی روشنی میں یک گونہ دسترس حاصل کرلی تھی، جنگ میں لگے رہنے کی وجہ سے جانوروں کے علاج ومعالجہ میں ان کو خاصی مہارت حاصل ہوگئی تھی، فن سپہ گری میں یہ لوگ یکتائے روزگار مانے جاتے تھے، بارش اور گھاس پھونس پر ان کے جانوروں کی زندگی کا دارومدار تھا، چناں چہ وہ ان تاروں کو پہچانتے تھے جن سے بارش کی اطلاع ملتی تھی، یا تارو ں کے ذریعے ملکوں اور جگہوں کے محل وقوع معلوم کرلیتے تھے، یا بری اور بحری اسفار میں تاروں کی مدد سے تاریک راتوں میں رہنمائی حاصل کرلیتے تھے۔ ان عربوں نے اپنی نسلوں کی بقا اور قومی تعصب کو زندہ رکھنے کے لیے علم غیب، اپنے قابل فخر کارناموں اور واقعات کو بیان کرنے اور ہو بہو محفوظ رکھنے کے لیے قصہ گوئی اور کارناموں کو دوام بخشنے کے لیے شاعری میں اچھا خاصا ملکہ پیدا کرلیا تھا۔

اس کے علاوہ فراست اور قیافہ شناسی وغیرہ میں بھی اس کو مہارت حاصل تھی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحیح علم کے فقدان کے سبب ان لوگوں کے یہاں عرصہ سے کہانت، عرافت اور چڑیوں کو اڑا کر فال لینے اور ان سے فیصلہ کرنے کا رواج بہت عام تھا، بیماری آزاری میں صحرا کی بعض جڑی بوٹیوں کے استعمال کے علاوہ یہ لوگ اپنے کاہنوں سے مشورے لیتے تھے۔ اسی طرح اپنے مشورہ طلب اور پیچیدہ مسائل میں عرافوں کی طرف رجوع کرتے تھے، ذیل میں ان میں سے چند مشہور علوم وفنون پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

4.10 کہانت

یہ عربوں میں کہانت یعنی علم غیب کی باتیں بتانے کا بھی ایک سلسلہ تھا، بعض مرد اور عورتیں یہ کام کرتی تھیں اور ان کی شہرت ہو جاتی تھی، زیادہ تر عرب چوں کہ جاہل تھے، لہٰذا وہ ان کاہنوں کے پاس آتے اور اپنے کسی اہم کام یا سفر وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ لیتے کہ اس میں خیر رہے گا، یا خطرے کی نشاندہی کررہے ہیں، یہ کاہن یا کاہنہ عموماً مقفّٰی و مسجع عربی میں مختصر جوابی جملے کہتے، جن سے سوال کرنے والا کچھ اور مطلب نکال لیتا اور اس طرح غلط مطلب نکالنے پر بھی کاہن اپنی ذمہ داری سے بچ جاتا، یہ کاہن اصلاً نجومیوں کا طریقہ اختیار کرتے تھے، جنوں اور شیاطین سے مدد لیتے اور اس سلسلے میں ان کے جوٹونے ٹوٹکے ہوتے اسے کرتے تھے۔ یہ بات ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ عرافت و کہانت، غیب کی باتیں معلوم کرنے، نیز گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات کو بتانے کو کہتے ہیں، مگر دونوں میں کچھ فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ کاہن آنے والے واقعات کو بتانے کو کہتے ہیں، جس کا مادہ تکہن یتکہن ہے۔ جس کا مطلب پیش گوئی کرنا ہے اور عراف اس شخص کو کہتے ہیں جو گزشتہ زمانے کے حالات کو بتائے۔

ان کاہنوں کے جملوں سے بسا اوقات صحیح مطلب بھی نکلتا، مثلاً بعض جملے ان کے ایسے سنے گئے، جن سے غزوۂ بدر میں قریش کی شکست ومصیبت کی پیش گوئی ہوتی تھی، جیسے یہ جملہ: ''ادر ما ادر یوم عقر ونحر'' جس کا مطلب ہے جانو، وہ دن جو کاٹنے اور ذبح کرنے کا ہے۔

اسی لیے جب قرآن کا نزول شروع ہوا اور کفار پریشان ہونے لگے تو کاہنوں کے مسجع ومقفیٰ جملوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ قرآن بھی کہانت ہے، لیکن پھر خود ہی اس کی تردید کردی، کیوں کہ مسجع ومقفیٰ ہونے میں مماثلت پائے جانے کے علاوہ کوئی دوسری مماثلت نہ تھی، عربوں کے جاہل ہونے کی بنا پر ان کاہنوں کا بڑا اثر تھا۔

4.11 فال

کہانت سے ہی ملتی جلتی بات عربوں میں فال خیر وبد لینے کی تھی، وہ بعض وقت تیز روں سے اور بعض وقت پرندہ کو اڑا کر تو بسا اوقات اچانک کان میں پڑنے والے الفاظ سے یا ان تک نظر آنے والی چیزوں سے لیتے تھے۔ فال کے لیے متعدد تیر ہوتے تھے اور وہ ان کو ''ازلام'' کا نام دیتے تھے۔ قرآن مجید میں ازلام سے کام لینے پر شدید تنکیر وممانعت آئی ہے۔ ازلام میں سے کسی پر ہاں لکھا ہوتا، کسی پر نہیں اور کوئی خالی ہوتا، وہ ان کو پھینکتے اور اٹھاتے تھے پھر فال نکالتے تھے۔

حضرت سراقہ بن جعشم نے بھی اسلام کی آمد سے پہلے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کیا اور بار بار اس کے پیر دھنس رہے تھے تو وہ تیروں سے فال نکالتے تھے۔ ازلام کا رواج عربوں میں بڑے غلو کے ساتھ تھا۔ جب کہ پرندہ سے فال نکالنے کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بیٹھے ہوئے پرندے کو اڑایا جاتا اور دیکھا جاتا کہ یہ کس رخ پر پرواز کرتا ہے، اگر دائیں طرف پرواز کیا تو سانح کہلاتا اور اسے اچھی فال کہی جاتی اور اگر بائیں جانب اڑتا تو بری فال مراد لی جاتی اور بارح کہلاتا، عرب شاعری میں دونوں طریقوں کے فال کا اچھا خاصا تذکرہ ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بات سے اچھا مطلب نکالنے کی اجازت تو دی ہے، لیکن برا مطلب لینے سے ممانعت فرمائی ہے۔

4.12 فراست وعرافت

اس کے معنی عقل ودانائی کے ہیں، عرب جاہل ہونے کے باوجود اچھے ہوش وگوش کے مالک تھے، ان پڑھ انسانوں میں جو عقل ودانائی ہوسکتی ہے، وہ ان میں بھی موجود تھی اور ان میں سے بعض تو امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے افراد کے پاس لوگ جھگڑوں یا سنجیدہ مشوروں کے لیے جاتے تھے اور ان کے فیصلے کو آپس میں جھگڑنے والے افراد بھی مان لیتے تھے۔ یہ افراد حکم کے نام سے پکارے جاتے تھے، ان میں سے ایک کا نام عامر بن الظرب تھا، ان کا یہ دلچسپ واقعہ بھی منقول ہے کہ جب وہ بوڑھے ہوئے اور نسیانیت یا بھول کا اثر ان کے فیصلہ پر بھی پڑنے لگا تو اپنی بیٹی کو یہ سکھایا کہ جب میں کسی کے فیصلے کے لیے بیٹھوں تو تم پس پردہ سب باتیں سنا کرو اور جب مجھ سے بھول سرزد ہوتے سنو تو ڈنڈا بجادو میں ہوشیار ہوجاؤں گا اور فیصلہ کو درست کرلوں گا۔ اس بات پر عربی میں کہاوت چل پڑی کہ: ''ان العصا قرعت لذی حلم'' (ڈنڈا صاحب عقل کے لیے بجایا جاتا ہے) بہر حال اس کے معنیٰ بھی غیب کی باتیں معلوم کرنے والے کے ہیں، مگر عراف اس شخص کو کہتے ہیں جو گزشتہ زمانے کے حالات بتائے۔

4.13 قیافہ شناسی

عربوں میں جو ذہین وفطین اور تجربہ کار لوگ ہوتے تھے، وہ قیافہ شناسی کیا کرتے تھے، خاندان وقبیلہ کا اندازہ پیر کے نشان سے بلکہ بسا اوقات برتن میں منہ لگنے کی بو یا جسم کی بو کو سونگھ کر خاندان کا اندازہ لگالیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں متعدد دلچسپ واقعات کتابوں میں ملتے ہیں۔ حضور

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ بدر میں اونٹ کی مینگنی سے اس بات کا پتہ لگایا تھا کہ ان اونٹوں کے پیٹ میں فلاں جگہ کی کھجوریں قریبی وقت میں گئی ہیں اور اس سے دشمن کے قریب ہونے کا انھوں نے اندازہ لگایا تھا۔

کتابوں میں قیافہ شناسوں کے عجیب وغریب واقعات ملتے ہیں، مثلاً ایک نظر سے دیکھ کر فاصلہ پر ریت میں دفن کیے جانے والے مال کی جگہ بتادی، پانی کے برتن میں پانی لیتے وقت یہ بتادیا کہ اس سے قبل کس طرح کے شخص نے اس میں پانی پیا تھا، کسی عملی کمزوری یا صفت سے یا قدم کے معمولی نشان سے قبیلہ کا پتہ لگالیا۔

الغرض عربوں کا اجتماعی و دینی نظام صرف قبائل تک محدود تھا، زبان، سیاست اور معاشی اعتبار سے ان میں آپس میں کوئی یگانگت نہ تھی، البتہ خلقت، ذہنیت اور ادب کے لحاظ سے ان میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا تھا، اگر ان کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان میں بلند، عالی دماغ، ذہین و فطین اور طباع ہستیاں ملیں گی، دور بینی و دور اندیشی، تجربہ کاری اور وسعت نظری کی ایسی مثالیں بھی ملیں گی جو تمام تر ان کی جودت فکر اور طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی زبان نے جو درحقیقت ان کی اجتماعی و دینی زندگی کی ترجمان ہے، روحانی، مادی، فکری وخیالی، اجتماعی و دینی اور انفرادی بھی، الغرض آسمان وزمین کی کسی بھی چیز کو ایسا نہ چھوڑا جس کے معانی کے اظہار کے لیے اپنے اندر کوئی لفظ نہ بنایا یا وضع کیا ہو، جس کا اظہار ان کے خطبات، ان کی امثال اور حکیمانہ مقولوں اور انداز بیان سے بخوبی ہوتا ہے۔

جن عرب کا ذکر اوپر ہوا ہے، وہ عربی زبان بولتے تھے، عربی زبان دنیا کی ان وسیع مالا مال شیریں، سلیس، پاکیزہ اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے، جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے، اس کے الفاظ کے مخارج بڑے سامعہ نواز، پیرایۂ بیان بڑا بلیغ، تراکیب بڑی دل آویز اور صوتی اثرات بڑے وقیع اور مؤثر ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک ہی مادے سے (یعنی اکثر صرف تین حروف سے) مختلف قسم کے افعال نکلتے ہیں، جن میں بسا اوقات سات حروف تک ہوتے ہیں، اور جن کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ صلات کے بدلنے سے بھی معنی کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں۔ بات کو پراثر بنانے کے لیے مجاز وکنایہ اور تشبیہ واستعارہ وغیرہ کا اور معانی میں وسعت اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے لیے مترادفات کا استعمال ہوتا ہے۔

اس کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر خدا نے اپنے کلام کے لیے اسی زبان کا انتخاب فرمایا اور قرآن کریم جیسی معجزنما کتاب اس زبان میں اتاری، جو بلا اختلاف عربی زبان وادب کی واحد کتاب ہے، جس کی ایک سورت کی مثال بھی عرب کا بڑے سے بڑا شاعر وادیب اب تک پیش کرنے سے قاصر رہا۔

4.14 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- عربوں کے دینی و مذہبی حالات کی عکاسی کی گئی ہے، بدوی عربوں پر غالب بدویت، مذہبی معاملات میں گہرائی تک نہ جانے، غور وفکر نہ کرنے، جس چیز کو وہ مانتے تھے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے اور براہ راست جو معلومات حاصل کر لیتے، پختگی کے ساتھ اس کے پابند ہوجاتے، جیسی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔
- بدوی عرب اپنے قبیلہ کے اعتقادات اور رسم ورواج کے سخت پابند تھے، اس کے علاوہ دوسری باتوں پر توجہ نہیں دیتے، نہ ہی ایمان لانے کے لیے تیار ہوتے تھے، وہ کفر ونفاق کے معاملے میں نہایت ہی سخت تھے، ان میں بت پرستی کا عام رواج تھا، دوسرے مذاہب کیا نتے

والوں کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ اس دور میں پورے عربوں کا یاک مشترک مذہب نہ تھا۔

- چھوٹے موٹے خداؤں کے علاوہ عام طور پر عرب میں بت پرستی کا رواج تھا، قرآن کریم میں ان تمام بتوں کے نام گنائے گئے ہیں، جنھیں عرب کیلوگ پوجتے تھے، ان میں سب سے ممتاز و معروف لات، منات، عزی، یغوث، یعوق، نسر، وداور سواع ہیں۔
- عیسائیت کی چاشنی عربوں میں رومی حکومت کے اثر ورسوخ سے آئی تھی، یمن کا شہر نجران اس کا اہم مرکز تھا۔
- یہودیت کے ماننے والے یمن، مدینہ منورہ جسے یثرب کہا جاتا تھا اور جن میں وادی القری، تیما اور خیبر کے علاقے آتے ہیں، رہتے تھے، مدینہ منورہ میں ان کے تین قبائل آباد تھے، جن میں بنو نظیر بنو قریضہ اور بنو قینقاع ہیں۔
- مجوسیت عربوں میں ایران کے زیر سایہ آئی تھی، البتہ عربوں میں یہ کم پائی جاتی تھی، مجوسی دو خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں، ایک خدائے نور ،یعنی روشنی کا خدااور دوسرا خدائے ظلمات یعنی تاریکی کا خدا، ایک کو' یزدان' اور دوسرے کو' اہرمن' کہتے ہیں۔
- صائبیت یہ ایک ایسا پیچیدہ اور مبہم مذہب ہے، جس کی صحیح تعیین و تشریح نہیں کی جا سکی، لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ مذہب ستارہ پرستہ پر مبنی تھا اور ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مذہب تقریباً وہی مذہب ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا تھا۔
- بتوں کے لیے قرآن مجید میں اصنام، اوثان اور تماثیل جیسے تین الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اصنام کے معنی پوجنے والی مورتی کے ہیں، اوثان کے معنیٰ پوجا کیے جانے والے پتھروں کے ہیں، جب کہ تماثیل کے معنیٰ شکل و مجسمے کے ہیں۔ عرب کے مشرک اپنے بتوں کو آلہتہ کہتے تھے۔
- بتوں کے علاوہ فرشتوں اور جنوں کی بھی پوجا کی جاتی تھی، قبیلۂ خزیمہ کی ایک شاخ بنو ملخ، جنوں کی پرستش کرتی تھی، فرشتوں کے بارے میں عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے وہ ان سے شفاعت کے طلب گار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے تھے۔
- حنفی وہ لوگ تھے جو توحید پر مبنی ایک نئے دین کی دعوت دیتے تھے۔ یہ لوگ بت پرستی کو ترک کرنے اور جاہلی عادات واطوار سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی دعوت دے رہے تھے، یہ جماعت صرف ایک اکیلے خدا کی عبادت کرتی تھی۔
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد عربوں میں بت پرستی کا عقیدہ کمزور پڑتا چلا گیا اور یہ مذہب زوال کا شکار ہو گیا اور رفتہ رفتہ لوگ آخرت کی زندگی پر ایمان لانے لگے، نیز ان مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب ملک عرب پر غالب نہ ہو سکا۔

4.15 نمونۂ امتحانی سوالات

4.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. قبیلۂ اوس وخزرج کے محبوب ترین بت کا کیا نام تھا؟

a. یعوق　b. منات　c. سعاع　d. ود

2. قبیلۂ ثقیف کا مقدس ومحترم بت کون تھا؟

a. لات　b. عزیٰ　c. یغوث　d. نسر

3. عیسائیوں کا مذہبی مرکز کس شہر میں تھا؟

a. حضرموت b. صنعاء c. نجران d. مآرب

4. جاہلی دور کے عربوں میں بت پرستی کے علاوہ کتنے مذاہب کا رواج تھا؟

a. دو b. تین c. چار d. پانچ

5. شاعر قس بن ساعدہ الایادی کس مذہب کے ماننے والے تھے؟

a. عیسائیت b. یہودیت c. اسلام d. مجوسیت

4.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. کیا جاہلی دور میں سارے عربوں کا ایک مشترک مذہب تھا؟ بحث کریئے۔
2. عرب قوم میں عیسائیت کیسے آئی تھی اور کن قبائل وعلاقوں میں اس کا وجود تھا؟ بیان کیجیے۔
3. عربوں میں مجوسیت کے وجود کے بارے میں ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. کہانت کسے کہتے ہیں؟ روشنی ڈالیے۔
5. قیافہ شناسی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

4.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. جاہلی دور میں عربوں کے دینی ومذہبی حالات کا جائزہ لیجیے۔
2. عرب سماج کے مختلف قبائل میں موجود بت پرستی پر مفصل بحث کریئے۔
3. قدیم دور میں عربوں کی ذہنی وفکری حالت پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

4.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. عربی ادب کی تاریخ (جلد اول) : عبدالحلیم ندوی
2. جزیرۃ العرب : مولانا محمد رابع ندوی
3. تاریخ الامت : اسلم جیراجپوری
4. تاریخ اسلام : شاہ معین الدین ندوی

-:oOo:-

اکائی 5 : بعثت سے پہلے کی زندگی

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقصد
5.2 ولادت باسعادت
5.3 رضاعت
5.4 مدینہ کا سفر اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی وفات
5.5 دادا عبدالمطلب کی آغوش محبت میں
5.6 چچا ابوطالب کی کفالت میں
5.7 شام کا سفر اور بحیرا راہب کا واقعہ
5.8 حرب فجار
5.9 حلف الفضول
5.10 شام کا دوسرا سفر
5.11 حضرت خدیجہؓ سے نکاح
5.12 خانہ کعبہ کی تعمیر
5.13 نبوت سے پہلے خدائی تربیت
5.14 اکتسابی نتائج
5.15 نمونہ امتحانی سوالات
5.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید

اس اکائی میں سیرت رسول اللہ ﷺ کے بالکل ابتدائی حصہ کو بیان کیا گیا ہے۔ بچپن اور جوانی میں آپ ﷺ کی زندگی کیسی تھی؟ کن حالات

میں آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گذارے؟ آپ ﷺ کو کن خواتین نے دودھ پلایا؟ آپ ﷺ نے بچپن کہاں گذارا؟ بچپن اور جوانی میں آپ ﷺ کے ساتھ کیا خوارق عادات چیزیں پیش آئیں؟ آپ ﷺ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اورسب سے بڑھ کر آپ ﷺ کے اس دور میں اخلاق وکردار وغیرہ پر بھی اس اکائی میں روشنی ڈالی جائے گی۔

5.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ابتدائی ایام یعنی بعثت سے پہلے کی زندگی پر روشنی ڈالنا ہے۔اس میں آپ ﷺ کے بچپن کا مفصل جائزہ لیا جائے گا کہ آپ ﷺ نے کن خواتین کا دودھ پیا؟ کن لوگوں کی پرورش میں رہے؟ اور آپ ﷺ کا بچپن کہاں گذرا؟ وغیرہ پر روشنی ڈالنا اس اکائی کے مقاصد میں سے ہیں۔ پھر جب آنحضور ﷺ کچھ بڑے ہوئے تو ذریعہ معاش کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے جو کوششیں کیں ان کا بھی جائزہ لینا، نبوت ورسالت کے سلسلہ میں مختلف افراد کی پیشین گوئیوں کا بھی تذکرہ کرنا، اس کے ساتھ ہی نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی کیسی تیارکرائی تھی؟ ان اہم عنوانات سے متعلق معلومات فراہم کرنا اس اکائی کے مقاصد میں داخل ہے۔

5.2 ولادت باسعادت

اوپر کی اکائیوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس دنیا میں تشریف لانے کے وقت عرب بلکہ پوری دنیا کس قدر بے دینی، جہالت اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کی تاریکی اور جہالت کو دور کرنے کے لیے اپنے ایک نبی اور رسول کو اس دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا، اوراس کے لیے نبی کریم محمد عربی ﷺ کا انتخاب فرمایا۔ یہ وہی نبی اور رسول تھے جن کی آمد کی خوش خبری سابقہ آسمانی کتابوں میں دی جاتی رہی تھی، اور سابقہ انبیاء اور رسل اپنی قوم کو جس کی بشارتیں دیتے رہے تھے، اور جس کی بعثت کی دعائیں حضرت ابراہیمؑ نے مانگی تھی۔

اس نبی آخرالزماں نے صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے اس دنیا میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں مختلف رائیں ہیں، ایک مشہور روایت کے مطابق آنحضور ﷺ کی ولادت 12/ربیع الاول کو ہوئی تھی، لیکن زیادہ صحیح اور معتبر روایت کے مطابق آپ ﷺ کی پیدائش 9/ربیع الاول واقعہ فیل کے سال مطابق 20/اپریل 571ء میں پیر کے دن ہوئی تھی۔ جب آنحضور ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو والدہ ماجدہ نے دادا عبدالمطلب کو خبر بھجوائی۔ عبدالمطلب اپنے جوان اور سب سے محبوب بیٹے کے انتقال سے کافی رنجیدہ تھے، انہیں جب اپنے اُس محبوب بیٹے کی اِس اہم نشانی کی خبر ملی تو بہت زیادہ خوش ہوئے، وہ آئے اور آپ ﷺ کو خانہ کعبہ لے گئے اور اللہ سے دعائیں کیں۔ پیدائش کے ساتویں دن دادا عبدالمطلب نے آپ ﷺ کا عقیقہ کیا، اور قریش کے تمام لوگوں کو دعوت دی۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے عبدالمطلب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے جس پوتے کے نام پر یہ عقیقہ اور دعوت وغیرہ کا انتظام کیا تھا اس کا آپ نے کیا نام رکھا ہے؟ عبدالمطلب نے جواب دیا: 'محمدؐ'۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ نام اس وقت کے مروجہ تمام ناموں سے بالکل مختلف تھا، چنانچہ انہوں نے عبدالمطلب سے اس کا سبب جاننا چاہا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے اس پوتے کی تعریف وتوصیف دونوں جہاں میں کی جائے، اس لیے میں نے اس کا نام 'محمدؐ' رکھا ہے۔ دادا کے رکھے گئے اس نام کے علاوہ والدہ ماجدہ نے آپ ﷺ کا نام 'احمدؐ' رکھا تھا، پھر جب آپ ﷺ خود صاحب اولاد ہوئے تو اپنے صاحبزادہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے 'ابوالقاسمؐ' کنیت اختیار فرمائی تھی۔

آپ ﷺ کی پیدائش سے چند مہینے پہلے ہی والد ماجد حضرت عبداللہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت عبداللہ تجارت کے سلسلہ میں ملک شام کی

طرف گئے تھے۔ راستہ میں طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے مدینہ میں اپنی ننھیال قبیلہ بنونجار میں قیام فرمانے کے لیے رک گئے تھے۔ لیکن اقامت اختیار کر لینے کے بعد بھی طبیعت بحال نہ ہوسکی اور وہیں آپ کا انتقال ہو گیا تھا۔

5.3 رضاعت

عربی زبان میں 'رضاعت' کے معنی دودھ پینا ہوتا ہے۔ جب آنحضور ﷺ کی پیدائش ہوئی تو شروع میں تین چار دنوں تک آپ ﷺ نے والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا دودھ پیا۔ اس کے بعد پھر تین چار دنوں تک چچا ابولہب کی باندی 'ثوبیہ' نے آنحضور ﷺ کو دودھ پلایا۔

شرفائے مکہ کا یہ دستور تھا کہ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ اس کی بہتر پرورش و پرداخت کے لیے عرب کے قصبات اور دیہاتوں میں بھیج دیتے تھے، تاکہ وہاں کی صاف اور صحت بخش آب و ہوا میں وہ پروان چڑھے تاکہ جسم طاقتور اور اعصاب مضبوط ہوں۔ ساتھ ہی ان کے پیش نظر یہ بات بھی ہوتی تھی کہ چونکہ شہر مکہ مکرمہ میں مختلف علاقوں سے لوگ آتے جاتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے وہاں مختلف قبائل کے لوگوں کا اختلاط ہوتا رہتا تھا، چنانچہ وہاں کی زبان میں دوسری زبانوں کی آمیزش ہو جاتی تھی۔ اس لیے اپنے بچوں کو دیہات و قصبات میں بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ عرب کی خالص اور فصیح زبان پر کمال حاصل کر لیں۔ اس غرض کے لیے اطراف کے قبیلوں کی عورتیں وقتاً فوقتاً مکہ مکرمہ آتی رہتی تھی، اور شرفائے مکہ کے بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ جس سے انہیں بہتر معاوضہ بھی مل جاتا تھا اور آئندہ بہتر سلوک کی بھی امید رہتی تھی۔

قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ بنوسعد اس معاملہ میں خاص شہرت رکھتی تھیں، ان کی زبان بھی پورے عرب میں سب سے زیادہ فصیح مانی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کی پیدائش کا ایک ہفتہ گذر گیا، تو اسی دستور کے مطابق بنوسعد کی کچھ عورتیں نوزائدہ بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ آئیں۔ آپ ﷺ ان کے سامنے پیش کیے گئے، لیکن یتیم ہونے کے وجہ سے سب نے منع کر دیا۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ جس بچے کا باپ موجود نہیں اس کی پرورش پر انھیں فراخ دلانہ بدلہ بھی نہیں ملے گا اور آئندہ بہتر سلوک اور انعام و اکرام کی امید ہی کیا۔ ان عورتوں کے ساتھ حلیمہ سعدیہ بھی آئی تھیں۔ اتفاق سے انہیں کوئی بچہ نہیں ملا، اور خالی ہاتھ واپس بھی نہیں ہونا چاہتی تھیں، لہٰذا انہوں نے آنحضور ﷺ کو دودھ پلانا قبول کر لیا۔

اس واقعہ کو خود حضرت حلیمہ سعدیہؓ بیان کرتی ہیں کہ اس سال بہت سخت قحط پڑا تھا، ہمارے پاس کھانے پینے کے سامان بھی نہ تھے، مجھے دودھ اتنا بھی نہ آتا تھا کہ میرے بچوں کو ہی کافی ہو جائے۔ ہمارے ساتھ ایک دبلی پتلی گدھی تھی جس پر میں سوار تھی، اور ایک اونٹی بھی ہمارے ساتھ تھی، یہ بھی بہت دبلی پتلی تھی، اور اس کا دودھ بھی سوکھا ہوا تھا۔ چنانچہ جب میں مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئی تو سب سے پیچھے رہ گئی جس کی وجہ سے ہمیں کوئی بچہ نہ ملا۔ بالآخر مجھے حضرت محمد ﷺ کو لینا پڑا، جنہیں یتیم ہونے کی وجہ سے دوسری عورتوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے آنحضور ﷺ کو اپنی گود میں لیا تو مجھے دودھ اس کثرت سے آیا کہ خود آپ ﷺ نے پیٹ بھر کر پیا، پھر میرے اپنے بچوں نے خود سیر ہو کر پیا اور وہ سو گئے۔ اس کے بعد وہ اونٹنی جس کا تھن بالکل سوکھا ہوا تھا، اس میں بھی اتنا دودھ اتر آیا کہ ہم نے خوب سیر ہو کر پیا اور اس رات ہم اس قدر پرسکون نیند ہوئے کہ ایسی نیند پہلے کبھی میسر نہ آئی تھی۔ راستہ میں جس میں گدھی پر میں سوار تھی اس قدر تیز رفتار ہو گئی کہ قافلہ کی ساری عورتوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ خیر و برکت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ساتھ ہی کئی خوارق عادات واقعات بھی پیش آئے۔

جب عمر دو سال کی ہوئی تو آپ ﷺ کا دودھ چھڑا دیا گیا، اور مکہ مکرمہ میں وبا پھیلی ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس مقیم رہے۔ اس کے تقریباً دو سالوں بعد چار سال کی عمر میں شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ جنگل میں بکریاں چرا رہے تھے کہ دو آدمی آئے، انہوں نے آپ ﷺ کا سینہ مبارک چاک کیا، اور اس میں سے کوئی سیاہ چیز نکال کر پھینک دی، پھر آپ ﷺ کا

دل اچھی طرح دھویا اور صاف کر کے اس کی جگہ واپس رکھ دیا، اور پھر آپ ﷺ کا سینہ مبارک اسی طرح درست کر دیا جیسے پہلے تھا۔

حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے پاس آپ ﷺ تقریباً پانچ سالوں تک مقیم رہے۔ اس دوران ہر سال دو مرتبہ حضرت حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سے ملاقات کرانے کے لیے مکہ مکرمہ لے جایا کرتی تھیں۔

آپ ﷺ کے رضاعی والد کا نام حضرت حارث بن عبد العزیٰ تھا۔ عبداللہ، حذیفہ، انیسہ اور شیما آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بہن تھے۔ ان میں سے والدہ حلیمہ سعدیہ، والد حارث، بھائی عبداللہ اور بہن شیما نے اسلام قبول کیا تھا۔

حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت سفیانؓ بن حارث کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اور آپ ﷺ پہلی رضاعی ماں حضرت ثوبیہ نے اپنے صاحبزادہ حضرت مسروحؓ کے علاوہ حضرت حمزہؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت ابوسلمہؓ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ لہٰذا یہ سب آپ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔

5.4 مدینہ کا سفر اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی وفات

جب آپ ﷺ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے پاس سے واپس والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے پاس آئے، تو آپ ﷺ کو تندرست و توانا دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں اور آپ ﷺ کے ساتھ نہایت ہی محبت و شفقت اور لاڈ پیار کا معاملہ کیا، چنانچہ آپ ﷺ کی دیکھ بھال اور ضرورتوں کا خیال رکھنے کے لیے اپنی خادمہ حضرت ام ایمن کو مقرر فرما دیا تھا۔

جب چھ سال کی عمر ہوئی تو والدہ ماجدہ آپ ﷺ کو لے کر مدینہ طیبہ دادا عبد المطلب کے ننہالی رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئیں۔ مدینہ طیبہ میں آپ ﷺ کے والد ماجد کا مقبرہ بھی تھا، لہٰذا مدینہ کے اس سفر سے اپنے محبوب شوہر حضرت عبداللہ کے مقبرہ کی زیارت کرنا بھی حضرت آمنہ کے پیش نظر تھا۔ آپ ﷺ کے دادا کا ننہال خاندان نجار میں تھا، لہٰذا آنحضور ﷺ، حضرت آمنہ اور حضرت ام ایمن کا قیام وہیں ہوا۔ اس دوران وہاں مدینہ طیبہ میں مختلف مقامات کی زیارت کی، والد ماجد کے انتقال ہونے والی جگہ اور مقبرہ وغیرہ دیکھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اس سفر کے حالات اور ان پرانی یادوں مثلاً اس دوران کے دوست احباب جن کے ساتھ آپ ﷺ نے کھیلا کودا تھا، کھیل کود کے مقامات، تیراکی کی مشق وغیرہ کا تذکرہ صحابہ کرام سے کیا کرتے تھے۔ وہاں تقریباً ایک مہینہ تک مقیم رہنے کے بعد واپسی ہوئی۔ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی طبیعت سخت خراب ہوئی اور مقام ابواء میں مالک حقیقی سے جا ملیں۔ حضرت ام ایمن نے آنحضور ﷺ کو کسی طرح سنبھالا اور حضرت آمنہ کی تدفین فرما کر آپ ﷺ کو لیے ہوئے مکہ مکرمہ میں دادا عبد المطلب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ ﷺ کو ان کے حوالہ کر دیا۔

5.5 دادا عبد المطلب کی آغوش محبت میں

والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی وفات کے بعد آپ ﷺ دادا عبد المطلب کے زیر سایہ پرورش پانے لگے۔ عبد المطلب کو اپنے پوتے سے بیحد محبت اور لگاؤ تھا۔ وہ آپ ﷺ کو ہر وقت اپنے ساتھ اور اپنے قریب رکھتے تھے۔ اپنے قریب بٹھاتے تھے، ساتھ سلاتے تھے، جب کھاتے تو ساتھ کھاتے، اگر آپ ﷺ موجود نہ ہوتے تو انتظار کرتے، اپنے کندھوں پر بٹھا کر خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے، آپ ﷺ خود جب چاہتے اپنے دادا کے پاس آتے جاتے تھے، خواہ دادا تخلیہ میں آرام کر رہے ہوں، حالانکہ ان کی دوسری اولاد یہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ خانہ کعبہ کے سایہ میں عبد المطلب کے لیے مخصوص نشست لگتی تھی، جس پر بڑے سے بڑے سرداران مکہ کو بھی قدم رکھنے کی ہمت نہ تھی، یہاں تک عبد المطلب کی اولاد بھی اس

سے دور ہٹ کر بیٹھتی تھی۔لیکن رسول اللہ ﷺ کو عام اجازت تھی اور آپ ﷺ بلا جھجک اور بلا تکلف وہاں دادا کے ساتھ بیٹھتے تھے۔اگر عبدالمطلب کی کوئی اولاد اس سے روکنے کی کوشش کرتی تو اسے ایسا کرنے سے عبدالمطلب خود منع کر دیتے تھے کہ محمد ﷺ کو میرے پاس آنے دو، اور پھر آپ ؐ کو اپنے ساتھ بیٹھا لیتے، اور آپ ؐ کی پیٹھ اور سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرتے تھے۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران جب آپ ﷺ دادا عبدالمطلب کے زیر پرورش تھے عرب کے بعض مشہور قیافہ شناسوں نے آنحضور ﷺ کے نشان قدم دیکھ کر یہ خبر دی تھی کہ اس بچہ کی خاص حفاظت کرنا کیونکہ ہم نے کسی اور کے نشان قدم اس قدر مشابہ نہیں دیکھے ہیں جتنا محمد ﷺ کے نشان قدم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشان قدم کے مشابہ ہیں۔ اس موقع پر چچا ابوطالب بھی موجود تھے، چنانچہ دادا نے اس سلسلہ میں چچا کو ہوشیار رہنے آنحضور ﷺ کی حفاظت کرنے کی تاکید کی۔

دادا عبدالمطلب کے سایہ عاطفت میں آنحضور ﷺ نے ابھی دو سال ہی گذارے تھے کہ ان کا بھی وقت آخر قریب آ گیا اور چند دن بیمار رہنے کے بعد 82 سال کی عمر میں اس دار فانی سے چل بسے۔جب دادا بیمار تھے اور بستر پر پڑے ہوئے تھے تو آنحضور ﷺ ان کے سرہانے کھڑے رو رہے تھے، پھر جب ان کا جنازہ اٹھا اور ان کو تدفین کے لیے لے جایا جانے لگا تو آنحضور ﷺ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور زار وقطار روتے جاتے تھے۔دادا کو اپنے آخری وقت میں بھی اپنے محبوب پوتے کا ہی خیال تھا۔چنانچہ انہوں نے چچا ابوطالب کو آپ ﷺ کی پرورش کی ذمہ داری سونپی، اور خصوصیت سے آپ ﷺ کی حفاظت وصیانت اور حسن سلوک کی وصیت کی۔

5.6 چچا ابوطالب کی کفالت میں

عبدالمطلب کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق چچا ابوطالب نے آنحضور ﷺ کو اپنے زیر پرورش لے لیا۔چچا نے دادا کی یادوں کو بھلانے اور آنحضرت ﷺ کے غم کو ہلکا کرنے میں کوئی قصر نہ چھوڑی۔چنانچہ آنحضور ﷺ کے مقابلے میں ابوطالب اپنی سگی اولاد کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔جب سوتے تو اپنے پہلو میں آپ ﷺ سلاتے، اور اگر کہیں باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے تھے۔چچا کے علاوہ چچی حضرت فاطمہ بنت اسد بھی آپ ﷺ سے بیحد محبت کرتی اور لطف وکرم سے پیش آتی تھیں۔جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو گویا ماں باپ کا پیار ملتا رہا۔ساتھ ہی ابوطالب نے دایہ ام ایمن کو بھی آپ کی پرورش کے سلسلہ میں خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں۔اسی بچپنے میں جب آپ ﷺ دس بارہ سال کے تھے، آپ ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں۔چنانچہ اس وقت کی یادوں کا تذکرہ نبوت کے بعد صحابہ کرام سے کیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ جب آپ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ جنگل میں تھے اور لوگ پیلو کے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے، تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ان میں جو پھل زیادہ سیاہ ہیں وہ زیادہ ذائقہ دار ہوں گے، یہ میرا اس وقت کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔

بعض لوگوں نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ چچا ابوطالب آنحضور ﷺ ذلیل رکھتے تھے اس لیے آپ ﷺ سے بکریاں چرواتے تھے۔ لیکن دراصل اہل عرب کے نزدیک بکریاں چرانا کوئی معیوب اور کسی کو ذلیل کرنے والا کام نہ تھا، اس لیے آنحضور بکریاں چرایا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ہی چونکہ چچا مالی اعتبار سے زیادہ مضبوط حالت میں نہ تھے، اس لیے آپ ﷺ کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ چچا کی مالی استعانت کی جائے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے خود بکریاں چرانے کا فیصلہ فرمایا تھا۔چنانچہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے: ''**ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون** ''(نحل:6) یعنی جس وقت تم شام میں ان کو چرا کر واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو تو تمہارے لیے ان میں رونق کا سامان ہے۔اور آنحضور ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ ''کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں''۔(بخاری:5453)

چچا ابوطالب کی یہ شفقت ومحبت تادیر قائم رہی۔نبوت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔جب تک آپ زندہ رہے کفار ومشرکین کو آنحضور پر کبھی

زیادتی کرنے کی ہمیت نہ ہوئی۔ تقریباً 45 سالوں تک آپ ﷺ کو قوت پہنچاتے رہے، جب آنحضور ﷺ 53 سال کی عمر میں تھے چچا کا انتقال ہوا۔

5.7 شام کا سفر اور بحیرا راہب کا واقعہ

چچا ابو طالب پیشہ کے اعتبار سے ایک تاجر تھے۔ اس وقت اہل عرب کا عموماً یہ معمول تھا کہ سال میں ایک مرتبہ تجارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آنحضور ﷺ بارہ سال کے تھے چچا نے تجارت کے لیے ملک شام جانے کا ارادہ کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔ سفر کی دشواریوں اور تکلیفوں کی وجہ سے چچا اپنے بھتیجہ کو نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن جب نکلنے کا وقت ہوا تو آنحضور ﷺ چچا کی محبت میں ان سے لپٹ گئے اور رونے لگے اور ضد کیا کہ آپ ﷺ بھی ساتھ چلیں گے۔ چچا نے اپنے بھتیجے کا دل دکھانا کسی طرح گوارا نہ کیا اور آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے لیا۔

جب یہ تجارتی قافلہ ملک شام کے مقام بُصری پہنچا تو وہاں انہوں نے آرام کرنے کے لیے رک گئے۔ اس جگہ کے قریب عیسائیوں کی ایک عبادت گاہ تھی جس کا راہب بحیرا نامی تھا (بعض لوگوں نے اس کا اصل نام جرجیس لکھا ہے)۔ جب اس قافلہ نے وہاں اقامت اختیار کی تو وہ پادری اس قافلہ کی ضیافت میں اپنی عبادت گاہ سے باہر نکل آیا، حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی وہاں سے باہر نہ آتا تھا۔ پھر اس کی نظر محمد ﷺ پر پڑی تو وہ قریب آیا اور آپ ﷺ کو غور سے دیکھنے لگا، اور نبوت و رسالت کی ان علامتوں اور نشانیوں کی مطابقت آپ ﷺ سے کرنے لگا جن کا علم اسے پہلے سے تھا، پھر وہ آپ ﷺ کے جسم کے مختلف اعضاء کو بھی دیکھنے لگا، اس کی نظر مہر نبوت پر بھی پڑی۔ جس کے نتیجہ میں اس نے ابو طالب سے کہا کہ یہ تمہارا بھتیجہ آخری نبی کے طور پر مبعوث ہونے والا ہے۔ یہ سید العالمین اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا جانے والا ہے۔ ابو طالب نے پوچھا تمہیں کیسے معلوم؟ اس نے جواب دیا کہ تم لوگ جب اس گھاٹی میں اترے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا نہیں تھا جو سجدہ میں جھک نہ گیا ہو، اور یہ چیزیں صرف کسی نبی کے لیے ہی سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ سابقہ آسمانی کتابوں میں آخری نبی کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی ان میں موجود ہیں اور ساتھ ہی ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت بھی ثبت ہے۔ لہٰذا اسے ابھی لیکر واپس وطن چلے جاؤ، اور یہودیوں سے اس کی ہمیشہ حفاظت کرتے رہو، کیونکہ اگر انہیں ان میں نبوت کی نشانیوں کے ہونے کا علم ہو گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ اسے نقصان پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ابو طالب آپ ﷺ کو لیکر مکہ مکرمہ واپس ہو گئے۔

تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ مختلف انداز میں بیان ہوا ہے۔ بہت سے غیر مسلم مصنفین اس واقعہ کی بناء پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بحیرا راہب کے ساتھ آپ ﷺ کی یہ جو مختصر ملاقات ہوئی تھی، اسی دوران اس نے رسول اللہ ﷺ کو مذہب کے اسرار و رموز کی تعلیم دے دی تھی۔ آپ ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد جو بھی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق حسنہ اور دیگر قرآنی تعلیمات سے امت کو نوازا وہ سب اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جو بحیرا راہب نے آنحضور ﷺ کو اس مختصر ملاقات میں دی تھی۔ عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض مختلف وجوہات کی بے بنیاد ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں کسی بھی جگہ بحیرا راہب کا آنحضور ﷺ کو تعلیم دینا مذکور نہیں ہے۔ پھر اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس فرضی بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ بات کسی طرح عقل و فہم میں نہیں آتی کہ ایک دس بارہ سال کے بچہ کو قیامت تک کے تمام حقائق و اسرار سے واقف کرا دیا جائے، اور وہ ان تمام تعلیمات کو بعینہٖ یاد رکھے اور پھر اپنے اصحاب و اخلاف تک اسے پہنچائے۔ اس اعتراض کے بے بنیاد ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ جن لوگوں نے بیان کیا ہے ان میں سے کوئی بھی بذات خود اس سفر میں شامل نہیں تھا۔ گویا یہ واقعہ مرسلاً بیان ہوا ہے یعنی کوئی ایسا شخص جو اس سفر میں شامل تھا، اس نے پہلے یہ واقعہ بیان کیا، پھر اسے سننے والوں میں سے کسی نے بیان کیا۔ لیکن یہ پہلا شخص کون تھا اس کی نشاندہی کسی نے نہیں کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض وجوہات کی نشاندہی سیرت کی کتابوں میں کی گئی ہے، ان کا مطالعہ ان کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

5.8 حرب فجار

جب آنحضور ﷺ کی عمر 15 سال کی ہوئی تو قبیلہ قریش اور بنو قیس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی جو بعد میں 'حرب فجار' کے نام سے مشہور ہوئی۔ چونکہ یہ جنگ اشہرحرم یعنی جن مہینوں میں جنگ کرنی حرام ہے ان میں ہوئی تھی اس لیے اس کو فجار (یعنی: گناہ، قصور، جرم) کہا جاتا ہے۔

اس جنگ میں قریش کی ساتھ بنو کنانہ تھے اور ثقیف وہوازن بنو قیس کے حامی تھے۔ اس جنگ کی وجہ یہ ہوئی کہ مکہ مکرمہ میں 'عکاظ' نامی ایک مشہور میلہ ہر سال لگا کرتا تھا، جس میں شعر وشاعری اور گھوڑ دوڑ کا مقابلہ ہوتا تھا، پہلوانوں کی کشتیاں اور فنون سپاہ گری کے دنگل بھی ہوتے تھے۔ اس موقع پر بنو ہوازن کا ایک سردار 'عروۃ الرحال' نے 'نعمان بن منذر' کے تجارتی قافلہ کو اپنی امان عطا کر کے عکاظ کے میلے میں خرید وفروخت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ بنو کنانہ کے ایک سردار 'براص بن قیس' نے اس سے کہا کہ کیا تم اسے بنو کنانہ کے مقابلے میں بھی امان دیتے ہوں۔ اس نے کہا: ہاں، بلکہ پوری دنیا کے مقابلے میں اسے امان دیتا ہوں۔ عروہ کے اس جواب سے براص کو بڑا تاؤ آیا۔ چنانچہ اس نے موقع دیکھ کر عروہ پر حملہ کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ہوازن کے حامی قبائل ثقیف اور بنو قیس اسلحہ لے کر میدان میں نکل آئے اور بنو کنانہ کی حمایت میں قبیلہ قریش آ گئے۔ اور پھر ان دونوں فریقوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ یہ اس وقت کی بہت ہی زبردست اور خطرناک جنگ تھی۔ چنانچہ اس میں بعض سرداروں نے خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوائی تھیں، تاکہ میدان چھوڑ کر بھاگنے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔

اس جنگ میں قبیلہ قریش کے ہر ہر خاندان کا الگ الگ دستہ تھا جس کا سپہ سالار اس خاندان کا سب سے بارسوخ فرد بنا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے خاندان بنو ہاشم کے سپہ سالار آپ ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب تھے۔ وہی اس جنگ میں بنو ہاشم کے علمبردار تھے۔ اور قبیلہ قریش کا سپہ سالار یعنی سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھے جو ابوسفیان کے باپ اور امیر معاویہ کے دادا تھے۔ اس جنگ میں قریش کے تمام خاندان اور افراد شریک ہوئے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ آنحضور ﷺ بہت اچھے نشانہ باز، تیرانداز، شمشیرزن اور پہلوانی کے کرتب جانتے تھے۔ آپ کی یہ معلومات بعد میں کفار کے خلاف کام آئی۔ آپ کے جنگی منصوبوں کی آج بھی اہل فن داد دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تربیت آپ ﷺ نے جوانی ہی میں حاصل کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس جنگ میں کسی پر ہتھیار سے حملہ نہیں کیا۔ بلکہ اس میں آپ ﷺ کی شمولیت بس اس قدر رہی کہ گرے ہوئے تیروں کو اٹھا اٹھا کر آپ ﷺ اپنے چچاؤں کو تھما دیتے تھے۔ اس سے زیادہ آپ ﷺ کی شمولیت اس جنگ میں نہیں رہی۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں قبیلہ قریش حق پر تھے۔ لیکن اس واقعہ کی تفصیل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنگ کا آغاز بنو کنانہ کی جانب سے ہوا تھا جو قبیلہ قریش کے حامی ومددگار تھے۔ لہٰذا اس کی یہ توضیح ہوسکتی ہے کہ نعمان بن منذر جسے عروہ نے امان دے کر عکاظ کے میلے میں خرید وفروخت کی اجازت دی تھی وہ اس اجتماعی فیصلہ کے خلاف ہوگا جسے شرفائے مکہ نے آپس میں مل کر طے کیا ہوگا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بنو کنانہ کے سردار براص بن قیس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا اور عروہ کو قتل کر دیا تھا۔

5.9 حلف الفضول

زمانہ جاہلیت میں جنگ وجدال اور قتل وغارت گری عام بات تھی، جن سے عوام میں بڑی بے چینی رہتی تھی، عزیز واقارب اور رشتہ دار کو مرتے ہوئے دیکھنا ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی، ان کی وجہ سے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ وبے سہارا ہو جاتی تھیں، گھر بار اجڑ جاتے تھے، جو طاقتور ہوتے وہ کمزوروں پر ظلم کرتے تھے، ان کا مال ہڑپ کر جاتے، غریبوں اور کمزوروں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ چنانچہ عرب کے بعض نیک مزاج لوگوں نے مل کر چند قبائل کو اس کے خلاف اکٹھا کیا اور آپس میں مل کر یہ معاہدہ کیا کہ وہ سب مل کر مظلوموں کی مدد کریں گے، اور ظالموں کو ظلم سے روکیں گے۔

اس تجویز اور معاہدہ کا خیال جن لوگوں کے دلوں میں سب سے پہلے آیا ان میں سے بیشتر افراد کے نام فضل کے مادہ سے مشتق تھے۔اس لیے اس عہد و پیمان کو ''فضل والوں کا معاہدہ'' کا نام دیا گیا۔عربی میں معاہدہ کے لیے 'حلف' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لہٰذا فضل والوں کا معاہدہ کی عربی 'حلف الفضول' ہوئی۔لیکن یہ معاہدہ زیادہ دن باقی نہ رہ سکا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔

مکہ مکرمہ کے لوگ جب حرب فجار سے فارغ ہوئے تو اس کی وجہ سے وہ لوگ کافی تھکے ہوئے تھے کئی گھرانے برباد ہو گئے تھے، کئی خاندان بے سہارا ہو گئے تھے۔چنانچہ ان چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنو ہاشم کے سرخیل اور آپ ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے کوشش کر کے لوگوں کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا اور تجویز پیش کی کہ گزشتہ ہوئے معاہدہ یعنی حلف الفضول کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔چنانچہ بعض نیک مزاج قبائل نے اسے قبول کیا اور انہوں نے آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ مظلوم خواہ مکہ مکرمہ کا ہو یا باہر کا ہر حال میں وہ لوگ اس کی مدد کریں گے، اور اسے اس کا حق دلا کر رہیں گے۔اور مکہ مکرمہ میں کوئی ظالم رہنے نہ پائے گا۔اس معاہدہ میں خاندان بنو ہاشم، تیم اور زہرہ کے افراد پیش پیش تھے۔

اس معاہدہ کا محرک اور سبب یہ ہوا کہ ایک یمنی شخص جو قبیلہ زبید سے تعلق رکھتا تھا کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ مکرمہ آیا۔مکہ مکرمہ میں وہاں کے ایک سردار عاص بن وائل نے اس کا سامان خرید لیا، لیکن اس کی قیمت ادا نہ کی۔چنانچہ اس یمنی شخص نے اپنے حلیف قبائل بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم اور بنی عدی میں سے ہر ایک کے پاس جا جا کر فریاد کی، لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔لہٰذا وہ یمنی شخص جبل ابوقبیس میں صبح کے وقت چڑھ گیا اور بلند آواز میں اشعار کی شکل میں اپنی مظلومیت کی داستان مکہ والوں کے سامنے پیش کی اور ان سے فریاد کی۔چنانچہ اسی کے نتیجہ میں حلف الفضول کی تجدید ہوئی تھی۔اور اس معاہدہ کے بعد سب سے پہلے اسی یمنی شخص کو اس کا حق دلایا گیا۔

اس معاہدہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ عرب جو اپنی عصبیت کے لیے مشہور تھے، یعنی اپنا قبیلہ اور قوم خواہ ظالم ہی کیوں نہ ہو وہ ہر حال میں اسی کی حمایت کرتے تھے۔اس معاہدہ کے ذریعہ انہوں نے اپنی عصبیت کو چھوڑ کر اس بات کو ترجیح دی تھی کہ مظلوم خواہ مکہ مکرمہ کا ہو یا کسی دوسری جگہ کا وہ ہر حال میں اس کی مدد کریں گے اور اسے اس کا حق دلا کر رہیں گے۔

اس معاہدہ میں حضور نبی اکرم ﷺ نے بھی بڑے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی تھی۔اس کا تذکرہ آپ ﷺ مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے پاس کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے: **''لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفاً لو دعيت به في الاسلام لا جبت، تحالفوا ان يردوا الفضول على اهلها والا يعد ظالم مظلوماً''**۔(البدایہ والنہایہ، ج:ص:307) یعنی میں عبداللہ بن جدعان کے مکان میں ایسے معاہدہ میں شریک تھا کہ اگر اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدہ کے لیے مجھے بلایا جائے گا تو میں لبیک کہوں گا۔ان لوگوں نے اس بات پر معاہدہ کیا تھا کہ حقدار تک اس کا حق پہنچائیں گے، تا آنکہ ظالم مظلوم کا حق دے دے۔بعض روایات میں یہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس معاہدہ کے بدلہ مجھے سرخ اونٹ بھی دیا جاتا تو میں نہ لیتا۔

5.10 شام کا دوسرا سفر

آنحضور ﷺ کی عمر جب تقریباً 25 سال ہو چکی تو اس وقت تک آپ ﷺ کی صداقت و دیانت داری، حسن معاملگی اور ایفائے عہد کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔آپ ﷺ کو صادق و امین کے القاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔آپ ﷺ کے ایک تجارتی ساتھی عبداللہ بن ابی الحمساء کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آنحضور ﷺ کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا، اور تقریباً پورا معاملہ طے ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا تو میں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ ابھی واپس آ کر اسے پورا کر لیتا ہوں۔چنانچہ میں اپنے گھر چلا گیا اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔حتی کہ میں تین دنوں تک وعدہ

بھولے رہا۔ تین دنوں کے بعد جب مجھے وہ وعدہ یاد آیا تو میں بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ انتظار کر رہے ہیں، اور جب میں وہاں پہنچا تو آپ ﷺ نے ذرا بھی خفگی کا اظہار نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ تم نے مجھے بڑی زحمت میں ڈال دی، تین دنوں سے میں یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

آپ ﷺ کے ایک اور تجارتی ساتھی حضرت سائبؓ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ آپ ﷺ میرے ساتھ تجارت میں شریک تھے لیکن ہمیشہ اپنے معاملات صاف رکھتے تھے۔ ان میں کسی طرح کی کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی بناء پر قریش کے لوگ بلا تامل اور بلا جھجک تجارت کے لیے آپ ﷺ کو اپنا سرمایہ دے دیتے تھے۔ بہت سے لوگ اپنی قیمتی اشیاء آپ ﷺ کے پاس بطور امانت بھی رکھتے تھے۔

عرب میں عموماً مالدار طبقہ کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنا سرمایہ ایسے تاجروں کو دیتے تھے جن کے پاس تجارت کے لیے سرمایہ نہیں ہوتا تھا، جس سے وہ تجارت کرتے تھے اور جو منافع حاصل ہوتے تھے انہیں وہ آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔

قریش میں خدیجہ نامی ایک خاتون بہت مالدار تھیں۔ آپ نہایت ہی پاکباز اور شریف خاتون تھیں۔ مکہ مکرمہ میں اپنی پاکبازی کے باعث 'مطہرۃ' کے معزز لقب سے معروف تھیں۔ پورے قبیلہ میں ان کی عقلمندی و سمجھداری اور بہتر اخلاق و اوصاف کی وجہ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ قریش کی عورتوں میں سب سے زیادہ مالدار تھیں۔ بسا اوقات ان کی تجارتی اشیاء اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ بعض تجارتی قافلوں کا آدھا حصہ صرف ان کے سامانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ مالدار خاتون بھی اپنا سرمایہ دوسروں کو تجارت کے لیے دیا کرتی تھیں، اور جو نفع حاصل ہوتا تھا اس کا ایک حصہ اسے دے دیتی تھیں۔ جب آنحضرت ﷺ کی صداقت و امانت کی شہرت حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ تک پہنچی، تو انہوں نے آنحضور ﷺ کو پیغام بھجوایا اور خود یہ پیش کش کی کہ آپ میرے سرمایہ سے تجارت کیجیے، جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں، آپ کو اس کا دوگنا دوں گی۔ محمد ﷺ نے اسے منظور فرما لیا، اور مال تجارت لے کر روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت انہوں نے اپنا ایک غلام جس کا نام میسرہ تھا آپ ﷺ کے ساتھ لگا دیا تھا۔ اس سفر میں جب ملک شام کے مقام بصری پہنچے، تو وہاں پر نسطورا نامی راہب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنے پاس موجود صحیفہ میں آخری نبی سے متعلق علامات کا مطالعہ کر کے انہیں آخری نبی ہونے کی خبر دی۔ اس کے علاوہ پورے سفر کے دوران میسرہ خیر و برکت کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا رہا۔ اس تجارتی سفر سے جب واپسی ہوئی تو پہلے کے مقابلے دوگنا یا اس سے بھی زیادہ منافع حاصل ہوا۔ جس پر حضرت خدیجہ بہت متاثر ہوئیں۔ ساتھ ہی میسرہ نے پورے سفر کے دوران جو کچھ مشاہدہ کیا تھا اسے بھی حضرت خدیجہ سے بیان کر دیا۔ چنانچہ اسی کے نتیجہ میں حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔

5.11 حضرت خدیجہؓ سے نکاح

حضرت خدیجہ بنت خُویلدؓ (لقب: الطاہرہ، الکبریٰ) کی پہلے دو شادیاں ہو چکی تھیں، ان کے پہلے شوہر ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی تھے، ان کی وفات کے بعد آپ نے دوسری شادی عتیق بن عابد مخزومی سے کی تھی۔ ان دونوں شوہروں سے آپؓ کی تین اولاد ہوئیں۔ بعد میں سبھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ دوسرے شوہر کی وفات کے بعد آپ بیوہ ہی رہیں۔ قریش کے کئی معزز اشخاص اور سرداروں نے انہیں نکاح کا پیغام بھجوایا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ لیکن آنحضور ﷺ کے ساتھ تجارتی معاملات کے بعد آپؓ اس طرح متاثر ہوئیں کہ چند مہینوں کے بعد ہی انہوں نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ اور آنحضور ﷺ نے اپنے چچا وغیرہ کے ساتھ مشورہ کے بعد اسے قبول کر لیا۔ پھر آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ آپ ﷺ کے ہمراہ حضرت خدیجہؓ کے گھر گئے اور آپس میں مل کر نکاح کی ایک تاریخ متعین کر لی۔ پھر متعینہ تاریخ کو ابو طالب اور دوسری روسائے خاندان حضرت خدیجہؓ کے مکان پر گئے اور نکاح کی ادائیگی ہوئی، پانچ سو طلائی درہم مہر قرار پایا۔ اس وقت آنحضور ﷺ کی عمر مبارک 25 سال اور حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی 40

سال تھی۔

5.12 خانہ کعبہ کی تعمیر

جب آنحضورﷺ 35 سال کی عمر کو پہنچے تو قریش کے لوگوں نے آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ خانہ کعبہ کو از سرنو تعمیر کیا جائے۔اس موقع پر یہ بھی متفقہ طور پر طے کیا گیا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں صرف حلال رقم ہی استعمال کیا جائے گا۔اس میں حرام کمائی مثلاً رنڈی کی اجرت،سود کی دولت اور کسی کا ناحق لیا ہوا مال کی آمیزش نہیں ہوگی۔

سیرت نگاروں نے اس کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں۔بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ خانہ کعبہ نشیب میں واقع تھا اور اس کی دیواریں چھوٹی تھیں اور دیواروں پر چھت بھی نہ تھی، جس کی وجہ سے بارش کے دنوں میں شہر کا پانی اس کے اندر گھس جاتا تھا۔دوسری رائے یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں اور اس کے اوپر چھت بھی نہ تھی اس لیے بعض چوروں نے وہاں رکھے خزانہ کو چوری کر لی تھی۔ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ بداحتیاطی کے سبب خانہ کعبہ کے اندر آگ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی دیواریں بھی کافی متاثر ہوئی تھیں۔جس کے نتیجہ میں لوگوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا فیصلہ کیا تھا۔بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو،اس واقعہ کے جس حصہ کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے وہ آگے آرہا ہے۔جب قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا تو ضروری تھا کہ پہلے کی تعمیر کو منہدم کیا جائے،لیکن تعمیر کھڑی عمارت کو منہدم کرنے کی ہمت کوئی نہ کر پاتا تھا۔بالآخر ایک سردار ولید بن مغیرہ مخزومی نے ہمت کر کے اس کام کو شروع کیا، پھر جب لوگوں نے دیکھا کہ اس پر کوئی مصیبت نہیں آئی ہے تو دھیرے دھیرے ہمت کر کے دوسرے لوگ بھی اس میں جڑتے گئے۔جب خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں تک منہدم ہو گیا تو پھر لوگوں نے تعمیر نو کا آغاز کیا۔

تعمیر کے لیے قریش نے کعبہ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا تھا،تاکہ آپس میں کسی قسم کی لڑائی اور جھگڑا نہ ہو۔چنانچہ دروازہ کا حصہ بنوعبدمناف اور بنوزہرہ سے متعلق ہوا،رکن الاسود سے رکن الیمانی تک بنومخزوم تیم اور دوسرے قریش کے قبائل جو ان میں شامل ہو گئے تھے متعلق کیا گیا۔کعبہ کی پشت بنوجمح اور بنوسہم کے متعلق ہوئی۔حجر کا حصہ جو کہ حطیم ہے، بنوعبدالدار بن قصی، بنواسد بن عبدالعزیٰ بن قصی اور بنوعدی بن کعب کے متعلق ہوا۔

عمارت کی تعمیر میں تو سب ہی شامل رہے۔مگر جب حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا وقت آیا تو سخت اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا شرف و امتیاز کسے حاصل ہو۔یہ جھگڑا کئی دنوں تک جاری رہا،اور رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ایسا لگتا تھا کہ حرم کے اندر ہی آپس میں تلواریں چل جائیں گی کہ تبھی ابوامیہ بن مغیرہ مخزومی جو کہ قریش میں سب سے بڑا اور معمر شخص تھا،اس نے یہ رائے دی کہ کل صبح جو کوئی سب سے پہلے حرم میں داخل ہوگا، وہی سب کا حکم سمجھا جائے گا۔اس رائے کو سبھی نے پسند کی اور اسی پر اتفاق ہوا۔اتفاق سے دوسرے دن حرم میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا وہ حضور اقدسﷺ تھے۔آپﷺ کو دیکھتے ہی لوگوں نے کہا: یہ امین ہیں، یہ فیصلہ امانت داری سے کریں گے،انہیں کو حکم بناؤ۔ چنانچہ رسول اللہﷺ نے ایک چادر منگوائی،اسے بچھایا، پھر اس پر پتھر اپنے ہاتھوں سے رکھ دیا،اس کے بعد ہر ایک قبیلہ کے سردار کو کہا کہ چادر کو پکڑ کر اٹھائیں۔اس طرح اس پتھر کو وہاں تک لائے جہاں قائم کرنا تھا،اور پھر آپﷺ نے خود بڑھ کر اس کو اس کے مقام پر لگا دیا۔یہ بڑا معقول فیصلہ تھا۔ اس پر ساری قوم راضی ہو گئی،اور اس طرح ایک سخت لڑائی آپﷺ کے حسن تدبیر سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔

لیکن ابھی خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ قریش کے پاس مال حلال کی کمی پڑ گئی،اس لیے انہوں نے شمال کی طرف سے خانہ کعبہ کی لمبائی تقریباً چھ ہاتھ کم کر دی۔یہی ٹکڑا آج حطیم کہلاتا ہے۔اس دفعہ قریش نے کعبہ کا دروازہ زمین سے خاصا بلند کر دیا،تاکہ اس میں وہی شخص داخل ہو سکے جسے وہ اجازت دیں۔جب دیواریں پندرہ ہاتھ بلند ہو گئیں تو اندر چھ ستون کھڑے کر کے اوپر سے چھت ڈال دی گئی۔اب خانہ کعبہ کی بلندی

پندرہ میٹر ہے۔

5.13 نبوت سے پہلے خدائی تربیت

حضرت محمد ﷺ کی پیدائش اس دنیا میں اس لیے ہوئی تھی، تا کہ آپ ﷺ لوگوں کو ہزاروں لاکھوں معبودوں کی عبادت سے ایک خدا کی عبادت کی طرف لائیں۔ دنیا کے ظلم وستم سے نکال کرانہیں آخرت کی بے پناہ وسعتوں کی طرف لے جائیں۔ زمانہ جاہلیت کی جہالت اور تاریکی سے اسلامی تعلیمات اور تہذیب وتمدن کی روشن دنیا میں لے آئیں۔ رشتہ داروں اور قرابتداروں کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیں۔ قتل وغارت گری سے باز رکھیں۔ حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں انہیں باتوں کا اقرار کرتے ہوئے تقریر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

> ''ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اسی اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی شرافت اور صدق ودیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں پھر واپس آجائیں''۔ (سیرۃ النبی۔ ج:1،ص:144)

ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندہ کی پیدائش کا مقصد یہ مقرر کیا ہو اس کو اسی قدر اچھی باتوں اور اچھی تعلیمات سے نوازا ہوگا، اس کے اخلاق وکردار بھی اسی قدر بلند ہوں گے، اس کی شان اور عظمت بھی عظیم اور برتر ہوگی۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے بچپن ہی میں ہمیں اس کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

آنحضور ﷺ بچپن ہی سے بہت نیک، اچھے اور برائی سے بچنے والے تھے۔ دوسرے بچوں کی طرح لغویات میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے دل ودماغ کو ان امور سے پاک رکھا تھا، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ بچپن میں اپنے ہم عمر آوارہ بچوں سے نہ صرف دور رہتے تھے بلکہ اس کے مقابلے میں تنہائی کو پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آنحضور ﷺ بچپن میں کسی شادی میں شریک ہونے کے لیے مجبور ہوگئے جہاں ناچ گانا اور ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن جونہی آنحضور ﷺ اس شادی کی جگہ پر پہنچے، آپ ﷺ پر نیند طاری ہوگئی، آپ ﷺ رات بھر سوتے رہے۔ پھر صبح ہوئی اور آپ ﷺ نیند سے اٹھے تو دیکھا کہ سارے لوگ جا چکے ہیں۔ اس طرح آنحضور ﷺ اس شادی کے موقع پر ناپسندیدہ چیزوں سے محفوظ رہے۔

زمانہ جاہلیت میں سارے ہی لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے سینکڑوں خداؤں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ قریش بھی ان میں شامل تھے وہ بھی بتوں کے آگے سجدہ کیا کرتے اور پوجا کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ جو ایک خدا کی عبادت کا رجحان رکھتے ہوں انگلیوں میں گنے جا سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ غیر اللہ کی عبادت سے ہمیشہ بچے رہے، بلکہ سارے معبودان باطل سے آپ ﷺ سخت نفرت کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی قسمیں کھانا اور دوسروں کو ان کی قسمیں کھاتے دیکھنا بھی آپ ﷺ کو سخت ناپسند تھا۔ عرب میں داستان گوئی اور شعروشاعری کی محفلیں بہت جاندار ہوا

کرتی تھیں، یہ محفلیں رات رات بھر چلتی تھیں۔ آپ ﷺ ان محفلوں سے بھی ہمیشہ دور رہے، کیونکہ ان داستانوں اور اشعار میں بے حیائی کی باتیں ہوتی تھیں اور ان سے سوائے رات کی نیند خراب ہونے اور وقتی لطف اندوزی کے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ شراب جو اس وقت کے لوگوں کا بہت محبوب مشروب تھی اسے بھی کبھی ہاتھ نہ لگایا، غیر اللہ کے نام سے قربان کیے جانے والے جانوروں کا گوشت بھی کبھی نہیں کھایا، اور نہ ہی اس وقت کے مختلف مذہبی تہواروں اور میلوں وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ہمیشہ ان سے بچتے رہے۔

برائیوں سے بچنے کے ساتھ ہی آپ ﷺ بہت ہی نیک اور اخلاق حمیدہ سے آراستہ تھے۔ عرب میں سب سے زیادہ شرم وحیاء کے پیکر، سچی اور اچھی گفتگو کرنے والے اور امانت دار تھے۔ بچپنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ جب آپ ﷺ قبیلہ بنوسعد میں اپنے رضاعی بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ بکریاں چرا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بھیج کر آپ ﷺ کے دل کی صفائی کرا دی، پھر جب کچھ بڑے ہوئے حرب فجار کا واقعہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی شخص کے خون سے آنحضور ﷺ کے ہاتھ آلودہ ہونے سے بچالیا، اور آپ ﷺ کی شرکت بس اس قدر رہی کہ نیچے گرے ہوئے تیر اور دوسرے ہتھیار اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے تھے۔ پھر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور مظلوم کی حمایت کے جذبہ سے آپ ﷺ نے حلف الفضول میں شرکت کی اور اس کی بھرپور تائید کی۔ آپ ﷺ رشتہ داروں کا خیال رکھتے، کمزوروں کا بوجھ اٹھا دیتے، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کر دیتے، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے، اچھائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق کے حوالہ سے بعض سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ:

> 'محمد ﷺ جوانی کے مرحلہ میں اس طرح داخل ہوئے کہ اللہ آپ ﷺ کی نگرانی کر رہا تھا تاکہ جاہلیت کی کوئی گندگی آپ ﷺ کو نہ لگ سکے۔ آپ ﷺ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ کا حال یہ تھا کہ مکہ کے لوگوں میں آپ ﷺ سب سے بہتر اخلاق والے اور سب سے زیادہ شریف اور سنجیدہ انسان کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ سے کبھی کسی کو بدکلامی یا وعدہ خلافی کا تجربہ نہیں ہوا۔ حتی کہ آپ کے جاننے والے آپ ﷺ کو امین کہنے لگے''۔

آنحضور ﷺ جوں جوں عمر کی منزلیں طے کرتے گئے آپ ﷺ کے غور وفکر سنجیدہ اور خیالات پختہ ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ نبوت سے پہلے آنحضور ﷺ کا دل اس دنیا کے بھاگ دوڑ اور اس کی سرگرمیوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے مکہ معظّمہ سے کچھ فاصلہ پر واقع 'غار حرا' نامی پہاڑی پر جانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں تنہائی میں آپ ﷺ قیام فرماتے، اِس کائنات کے عجائب پر غور کرتے اور اس کے خالق کے متعلق سوچتے، معبود حقیقی کی جستجو میں لگے رہتے، مراقبہ کرتے، اور اسی غور وفکر میں کئی کئی دنوں تک اسی پہاڑی پر مختصر خورد ونوش پر مقیم رہتے اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جاتیں تو واپس آ کر لے جاتے اور پھر اسی غور وفکر اور جستجو میں لگ جاتے تھے۔ اسی دور میں آپ ﷺ کو اکثر سچے خواب آنے لگے تھے جو دراصل نبوت سے سرفراز کیے جانے کی خدائی تربیت چل رہی تھی۔

5.14 اکتسابی نتائج

- آنحضور ﷺ کی پیدائش 9 / ربیع الاول واقعہ فیل کے سال مطابق 20 / اپریل 571ء میں ہوئی تھی۔
- آپ ﷺ کی پیدائش سے چند مہینے پہلے ہی والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔
- آپ ﷺ کی پیدائش کے بعد نام رکھائی اور عقیقہ کی رسم دادا عبد المطلب نے ادا کی تھی۔
- رسول اللہ ﷺ کا نام 'محمد' دادا نے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ والدہ ماجدہ نے آپ ﷺ کا نام 'احمد' رکھا تھا، اور بعد میں اپنے صاحبزادہ کی طرف

نسبت کرتے ہوئے آپ 'ابوالقاسم' کنیت اختیار کرتے تھے۔

- حضور ﷺ کو سب سے پہلے ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے دو تین دنوں تک دودھ پلایا تھا۔ ان کے بعد باقاعدہ رضاعت کی مدت حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے پاس شروع ہوئی تھی۔
- حضور ﷺ چار سال کے تھے جب شق صدر کا واقعہ پیش آیا تھا۔
- چھ سال کی عمر میں آپ ﷺ اپنی ماں کے ساتھ مدینہ گئے تھے۔ مدینہ سے واپسی کے دوران آپ ﷺ کی ماں حضرت آمنہ کا مقام ابواء میں انتقال ہو گیا تھا۔
- آٹھ سال کی عمر میں دادا عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا تھا۔
- تیرہ سال کی عمر میں آپ ﷺ نے اپنے چچا کے ساتھ شام کا پہلا سفر کیا تھا۔ اسی سفر میں عیسائی راہب بحیرا سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی تھی جس نے آپ ﷺ میں علامات نبوت بتائی تھیں۔
- دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ چچا ابوطالب کے زیر پرورش آ گئے تھے۔
- عرب میں رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے چار مہینے میلوں کے لیے مخصوص تھے۔ یہ مہینے اشہر حرم یعنی محترم مہینوں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہیں مہینوں میں حرب فجار واقع ہوئی تھی جو قبیلہ قریش اور قیس کے درمیان لڑی گئی تھی۔
- بیس سال کی عمر میں حلف الفضول کا معاہدہ ہوا تھا۔
- پچیس سال کی عمر میں آپ ﷺ نے شام کا دوسرا سفر کیا تھا۔ اس مرتبہ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے تجارت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر میں بھی آپ ﷺ کی ملاقات 'نسطورا' نامی ایک راہب سے ہوئی تھی، جس نے آپ ﷺ میں نبوت کی علامتیں دیکھی تھیں اور آپ ﷺ کی رسالت کی پیشین گوئی کی تھی۔
- خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے دوران قریش کے خاندانوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا اس میں آپ ﷺ نے ثالثی کے طور پر فیصلہ کیا تھا جسے سبھی نے خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔

5.15 نمونہ امتحانی سوالات

5.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کس سال ہوئی تھی؟

a. 571ء b. 572ء c. 570ء d. 569ء

2. رسول اللہ ﷺ کا نام 'محمد' کس نے رکھا تھا؟

a. چچا نے b. دادا نے c. والدہ نے d. پھوپھی نے

3. آپ ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ کا تعلق کس قبیلہ سے تھا؟

a. مخزوم b. ثقیف c. بنوبکر d. ہوازن

4. درج ذیل میں سے کون حضور ﷺ کے رضاعی بھائی نہیں ہیں؟

a. حمزہ b. خالد c. عبداللہ d. ابوسلمہ

5. مدینہ کے سفر میں آپ ﷺ کے خادمہ کون تھیں؟

a. حلیمہ سعدیہ b. ثویبہ c. ام ایمن d. سب غلط

6. حرب فجار میں کن کے درمیان لڑی گئی تھی؟

a. کفار اور مشرکین b. بنوبکر اور قریش c. اوس اور خزرج d. قریش اور قیس

7. حلف الفضول کی تجدید کے لیے کس نے سب سے پہلے تجویز پیش کی تھی؟

a. زبیر بن عبدالمطلب b. ابوطالب بن عبدالمطلب c. حرب میں امیہ d. عبداللہ بن جدعان

8. نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے تجارتی ساتھی کون تھے؟

a. عمر b. سائب c. خالد d. عثمان

9. آنحضور ﷺ سے پہلے حضرت خدیجہؓ کی کتنی نکاح ہوچکی تھی؟

a. ایک b. دو c. تین d. سب غلط

10. شام کے دوسرے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ کون تھا؟

a. عبداللہ b. سائب c. میسرہ d. نعمان

5.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. آنحضور ﷺ کے ایام رضاعت کے اہم واقعات پر روشنی ڈالئے۔
2. حضرت آمنہ اور عبدالمطلب کے دروان پرورش پر گفتگو کیجیے۔
3. حرب فجار سے متعلق اپنی معلومات تحریر کرتے ہوئے اس میں آنحضور ﷺ کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
4. حلف الفضول پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
5. ملک شام کے دوسرے سفر کے حالات لکھیے۔

5.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. ملک شام کے پہلے سفر کا مفصل جائزہ لیجیے۔
2. خانہ کعبہ کی تعمیر نو اور اس میں آپ ﷺ کے کردار پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
3. نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی کس طرح تربیت فرمائی؟ مفصل تحریر کیجیے۔

5.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. سیرۃ النبی : علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2. رحمۃ للعالمین : قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری
3. نبی رحمت : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

4.	مختصر سیرت نبوی	:	عبدالملک بن ہشام حمیری (ترجمہ و تلخیص: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)
5.	سیرت رسول عالم	:	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
6.	الرحیق المختوم	:	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری (اردو ترجمہ)
7.	ضیاء النبی	:	پیر محمد کرم شاہ ازہری
8.	سیرت رسول اکرم	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
9.	رحمت عالم	:	علامہ سید سلیمان ندوی

-:oOo:-

اکائی 6 : بعثت اور تبلیغ اسلام

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید
6.1 مقصد
6.2 بعثت
6.3 مقصد بعثت
6.4 رسالت کی مختصر تاریخ
6.5 تبلیغ اسلام
6.5.1 دارارقم
6.6 کوہِ صفا پر اعلان حق
6.7 مختلف قبائل میں تبلیغ اسلام
6.7.1 سوید بن صامت
6.7.2 ایاس بن معاذؓ
6.7.3 ضمادِ بن ثعلبہ ازدیؓ
6.7.4 طفیل بن عمرو دوسیؓ
6.7.5 ابوذر غفاریؓ
6.8 اکتسابی نتائج
6.9 نمونہ امتحانی سوالات
6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید

اس اکائی میں مکی زندگی کا جو دوسرا دور ہے یعنی نبوت ملنے کے بعد کا 13 سالہ دور، اس کو مفصلاً بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تبلیغ دین کے وقت

جو مشکل حالات پیش آئے ،اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی کیسے نبرد آزما ہوئے ، اسلام کے لیے کتنی قربانیاں پیش کیں ، اسلام کی دعوت کو پھیلانے کے لیے کن مراحل کو عبور کرنا پڑا، عزیز واقارب کو جب دعوت اسلام پیش کی گئی تو ان کا کیا ردعمل رہا، دارارقم جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو اسلامی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرتے تھے، ان کو بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

6.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ جان سکیں کہ نبوت کسبی و اختیاری مقام نہیں ہے، جسے کوئی انسان اپنی محنت سے حاصل کر لے بلکہ وہبی وعطائی مقام ہے کہ اللہ رب العزت نبی ورسول کا انتخاب خود ہی فرماتے ہیں۔اس اکائی میں آپ دیکھیں گے بعثت کی امتیازی شان غلبہ دین حق ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، اور آپ یہ بھی پڑھیں گے کہ رسول پاک نے جب اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے ان لوگوں نے لبیک کہا بیوی خدیجہؓ، بھائی حضرت علیؓ، دوست ابوبکرؓ، آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ جو آپ کے سب سے قریبی تھے۔ مکہ، جہاں بتوں کے پاسبان بھی تھے اور کعبہ کے نگہبان بھی اس کا تعارف آپ کے سامنے لانا اس اکائی کے مقصدوں میں سے ہے۔

6.2 بعثت

محمد عربی ﷺ کی عمر مبارک جب چالیس سال ہوگئی تب آفتاب ہدایت طلوع ہوتا ہے یعنی وہ روحانی قوتیں جو اللہ رب العزت نے آپ کی فطرت میں ودیعت کی تھیں، عبادت وریاضت اور خلوت سے نشو ونما پا کر تحمل وحی اور برداشت منصب نبوت کے قابل ہوگئی تو ایک روز جبل نور کے ایک غار حرا میں آپ کے سامنے ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے اور آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ''اقرأ'' (پڑھ) آپ نے فرمایا ''ما انا بقاری'' (میں تو پڑھنا

نہیں جانتا) پھراس نے آپ کو پکڑ کرزور سے دبایااور پھر کہا''اقرأ'' آپ نے پھروہی جواب دہرایافرشتہ نے پھرتیسری مرتبہ آپ کوزور سے دبایااور پھر چھوڑ کر کہا''**اقرأ باسم ربک الذی خلق. خلق الانسان مِنْ عَلَق اِقرأ وربُک الأکْرم الّذی علّم بالقلم علّم الاِنسان مالم یعلم**''،(پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے ہرشی کو پیدا کیااورانسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے پڑھ اور تیرارب بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایاانسان کووہ سکھایاجووہ نہ جانتا تھا)۔

اس کے بعدفرشتہ غائب ہوگیا۔آپ وہاں سے خوفزدہ ہوکر گھر تشریف لائے اور گھر آ کر زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو پورا واقعہ بتایا تب حضرت خدیجۃ الکبری نے وہ تاریخی الفاظ کہے کہ''نہیں آپ کوخوش ہونا چاہیے واللہ خدا آپ کوکبھی رسوانہیں کرے گا کیوں کہ آپ ہمیشہ صلہ رحمی کرتے ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اورآپ میں وہ تمام اخلاقی خوبیاں موجود ہیں جوعام لوگوں میں نہیں ہوتی ہیں نیز اگرکسی پرکوئی مصیبت آجائے تو آپ اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔ان تسلی بخش جملوں کے بعد حضرت خدیجہ آپ کواپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئی جوعبرانی زبان جانتے تھےاورتوریت وانجیل کے ماہر تھے۔اگرچہ اب بوڑھے ہوگئے تھے،آپ نے ان کے سامنے تمام کیفیت بیان کی ورقہ بن نوفل نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا یہ وہی ناموس اکبر ہے جوموسیٰ علیہ السلام پراترا تھا کاش میں جوان ہوتااوراس وقت زندہ رہتا جب قوم آپ کونکالے گی رسول اللہ نے پوچھا وہ مجھے نکالیں گے ورقہ بن نوفل نے جواب دیاہاں جب جب دنیا میں کوئی رسول آیااوراس نے لوگوں کے سامنے توحید کی تعلیم پیش کی تولوگوں نے اس کے ساتھ عداوت ودشمنی کا برتاؤ کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہوگا۔اس کے بعد آپ بدستور غارحرا میں تشریف لے جاتے رہےاورورقہ کی باتوں کا آپ کویقین ہوگیااورآپ نے اس کااعتراف کیا۔

6.3 مقصد بعثت

اللہ رب العزت نے اس دنیامیں جوکچھ بھی پیدا کیا ہے وہ سب حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔ پہاڑ، زمین، ندی، نالے، چرند وپرند کوئی بھی چیز بے فائدہ اور بے مقصد نہیں ہے۔لہٰذاانسان کی تخلیق بھی بغیرکسی مقصد کے نہیں ہےاور جب عام انسانوں کی تخلیق بے مقصد نہیں ہے تو جوانسان تمام انسانوں سے اعلیٰ واشرف ہے اس کا مقصد تخلیق اور مقصد بعثت کتنا اعلیٰ ہوگا۔اللہ رب العزت نے آپ کے مقصد بعثت کوقرآن کریم میں اس طرح سے بیان کیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّیِّیْنَ رَسُولاً مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمْ آیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (الجمعۃ:2)(وہی ہے جس نے بھیجاان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں کا پڑھ کرسناتا ہےان کواس کی آیتیں اوران کوسنوارتا ہےاورسکھلاتا ہےان کوکتاب اورعقلمندی)۔

آپ ؐکی بعثت کا پہلا مقصد تلاوت قرآن بتلایا ہے۔خوداللہ کے نبی نے تلاوت کے بڑے فضائل بیان کیے ہیں۔اس لیے کہ اس سے دل کی صفائی ہوتی ہےاوردل میں ایمان کا نور پیدا ہوتا ہے۔ایک موقع پراللہ کے رسول نے فرمایا کہ قلوب زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسا کہ پانی لگ جانے سےلوہازنگ آلود ہوجاتا ہےسوال کیا گیا کہ یارسول اللہ پھراس کی صفائی کا ذریعہ کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یادکرنااور قرآن کریم کی تلاوت کرناغرض اللہ کے رسول نے ان لوگوں کے سامنے تلاوت کی جوقرآن کریم کی تلاوت کوسننے کوتیار نہ تھے۔مجمع میں بھی سنایااور تنہائی میں بھی سنایا،آبادی میں بھی سنایااورآبادی سے باہرراستوں پربھی، دن کی روشنی میں بھی رات کی تاریکی میں بھی،عرب کا کوئی مشہور بازاراور میلہ ایسانہ تھاجہاں جاکراللہ کےرسول نے اللہ کاپیغام نہ سنایاہو۔

آپ ﷺ کی بعثت کادوسرامقصد مذکورہ بالاقرآن کریم کی آیت میں تعلیم کتاب بیان فرمایا گیا ہے۔یعنی اللہ کے رسول کے واسطے کے بغیر

قرآن کریم سمجھ میں نہیں آسکتا اگر ایسا ہوسکتا تو رسول کو بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی پھر تو یہ ہوتا کہ جبرئیل علیہ السلام آتے اور کسی مقدس مقام پر کتاب اللہ کو رکھ دیتے اور اعلان فرمادیتے کہ اس کتاب کو پڑھ لو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر عمل کرلو لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کتاب اللہ بھی آئی اور رسول اللہ بھی آئے۔صحابہ کرام کی زبان عربی تھی ذہین اور ذکی بھی زبردست تھے حافظہ بھی عجیب وغریب تھا کہ ہزاروں اشعار یاد تھے لیکن اس کے باوجود معلم اعظم کی رہنمائی اور سرپرستی کے محتاج تھے وہ حضرات آپ ﷺ کے ارشادات سنتے تھے اور آپ ﷺ کی سیرت وعملی زندگی کو دیکھتے تھے اور اس کتاب ہدایت کو سمجھتے تھے۔

اللہ رب العزت نے اپنے کلام میں آپ ﷺ کی بعثت کا تیسرا مقصد تعلیم حکمت بتلایا ہے۔حکمت کے معنی بصیرت کے ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے عمل سے اپنے کردار سے اپنے فرمودات سے بصیرت اور دانائی سکھائی ہے بایں طور کہ مکہ میں ظلم وتشدد اور جور وجفا کی فضاء تھی مدینہ آئے تو مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا، منافقین سے بھی نبرد آزمائی تھی، بدر، احد اور خندق سب کے تقاضے الگ الگ تھے۔حدیبیہ میں بالکل ہی خلاف توقع صورت حال تھی۔ایسے ہی اس نئی مملکت کو نئی بنیادوں پر کھڑا کرنے کا مسئلہ تھا۔بڑے طاقتوں اور ہمسایوں سے تعلقات کے معاملات تھے مگر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کتابوں میں مرقوم ہے کہ اللہ کے نبی نے ان مشکل مواقع میں کیا رویہ اختیار کیا اور کیسے یہ مسائل حل ہوئے۔لہٰذا نبی ﷺ کی سیرت میں غور وفکر آج بھی ہمیں دعوت ملاحظہ دیتا ہے کہ ایک مسلمان مظلومیت کے دور میں، جنگ کے دور میں، صلح وامن کے دور میں، ہجرت اور نصرت کے دور میں، سیادت وقیادت کے دور میں مختلف حالات کو کیسے حل کرے۔

سرکار دوعالم ﷺ کی بعثت کا چوتھا مقصد تزکیہ ہے ویزکّیھم کہ اللہ کا نبی ان کا تزکیہ کرتا ہے یعنی ان کو سنوارتا ہے بایں طور کہ ان کے دلوں میں کفر تھا، شرک تھا، حسد تھا، بخل تھا، دنیا کی محبت تھی، غرور وتکبر تھا، اللہ کے نبی نے ان کو سنوارا کہ ان کے قلوب سے ہر غلاظت نکل گئی اور جب تمام گندیوں سے پاک ہوگئے تو پھر ان کو سنوارا ایثار سے، احسان سے، استغناء اور قناعت سے تواضع اور انکساری سے اور یہ تزکیہ آج بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر دل میں ریا ہے تو نماز جیسی عبادت ورزش بن جاتی ہے روزہ بغیر تزکیہ کے بھوک پڑتال ہوجاتا ہے، حج سیر وتفریح کا سبب بن جاتا ہے، زکوٰۃ مالداری کے دکھلانے کا سبب قرار پاتی ہے جبکہ تزکیہ کے ساتھ کیے گئے دنیوی اعمال بھی دین بن جاتے ہیں۔غرض یہ بعثت کے وہ چار مقاصد ہیں جن کو اللہ رب العزت نے خود قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے۔

6.4 رسالت کی مختصر تاریخ

اللہ تبارک وتعالیٰ جو بڑا رحمان ورحیم ہے اور جس نے انسانوں کے لیے وہ سب چیزیں پیدا کی ہیں جن کی انسانوں کو اپنی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے، اس نے انسانوں کی اس سب سے بڑی ضرورت کو بھی ہمیشہ پورا کیا ہے یعنی جب سے اس دنیا میں انسانوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسی وقت سے نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس انسان کو سب سے پہلے اس دنیا میں اتارا ہے اسی کے سر پر پیغمبری کا تاج بھی رکھا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی نسل کو اسلام کی تعلیم دیں یعنی بتائیں کہ اس کائنات کا خالق مالک ایک ذات ہے، اسی کی عبادت کرو، اسی کی مرضی کے مطابق زندگی گذارو، ایسا کروگے تو انعام پاؤگے اور اس کی اطاعت سے منھ موڑوگے تو سزا ملے گی۔

اب حضرت آدم علیہ السلام کی نسل بڑھی اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی اور رفتہ رفتہ ان تعلیمات سے دور ہوگئی جو ان کے والد نے ان کو دی تھی۔بلکہ طرح طرح کی برائیاں ان میں پیدا ہوگئیں اور حقیقی خالق کو چھوڑ کر کائنات کی مختلف اشیاء کو اپنا معبود بنالیا۔اب اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجنے شروع کیے جو انسانوں کو وہی بھولا ہوا سبق یاد دلاتے تھے جو آدمؑ سکھا کر گئے تھے۔

الغرض ضرورت اور وقت کے مطابق مختلف زمانوں، ملکوں اور علاقوں میں رسول وپیغمبر آتے رہے ہیں۔ کسی قرآنی آیت یا حدیث صحیحہ میں تعداد کی صراحت نہیں ہے لیکن یہ صاف صاف بتلایا گیا ہے کہ کوئی قوم اور مقام ایسا نہیں ہے جہاں رسول نہ بھیجا ہو، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:''ولکل اُمَّة رسول ''،(اور ہر قوم کے واسطے پیغمبر آئے ہیں) دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:''**ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبد اللہ و اجتنبوا لطاغوت**''،(اور ہم نے ہر ایک امت میں رسول بھیجے کہ لوگ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچیں)۔ایسے ہی سورۂ فاطر میں فرمایا گیا:''**واِنْ مِن اُمّة اِلّا خلا فیھا نذیر**''،(کوئی قوم ایسی نہیں ہے جن کے پاس ہمارا رسول نہ پہنچا ہو)۔

ابتداءً ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آتے تھے اور ان کی تعلیم انہیں کی قوم کے اندر محدود رہتی تھیں کیوں کہ ہر قوم اپنے وطن کی حدود میں گویا مقید تھی ایسی حالت میں کوئی عام اور مشترک تعلیم تمام قوموں میں پھیلنی بہت مشکل تھی۔ پھر زمانہ جیسے ہی آگے بڑھا تجارت وصنعت اور حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کے تعلقات ایک دوسرے سے قائم ہو گئے چین وجاپان سے لیکر یورپ اور افریقہ کے دور دراز ملکوں تک جہاز رانی اور خشکی کے سفروں کا سلسلہ قائم ہو گیا، علوم وفنون پھیلے اور قوموں کے درمیان خیالات اور علمی مضامین کا تبادلہ ہونے لگا اس طرح سے وہ دوری اور جدائی جو پہلے انسانی اقوام میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت تمام دنیا کے لیے بھیجی جائے۔

یہ وقت تھا جب تمام دنیا اور اقوام کے لیے ایک پیغمبر یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو عرب کی سرزمین میں پیدا کیا گیا اور آپکو اسلام کی پوری تعلیم اور منسوخ نہ ہونے والا قانون دیکر اس خدمت پر مامور کیا کہ اسے سارے جہاں میں پھیلا دیں پھر ان مقدس ہستیوں کے بارے میں ایمانی اصول یہ ہے کہ یہ حضرات شریعت ساز نہیں بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں جیسا کے ایک موقع پر باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: کہ جب کفار حضور سے آکر کہتے تھے کہ آپؐ جو باتیں بیان کرتے ہیں ان میں کچھ ہم کو ناپسند ہوتی ہیں اگر آپؐ ان میں سے کچھ تبدیلی کریں تو ہم بھی آپؐ کے ساتھ ہو جائیں گے، تو آپؐ جواب دیتے ہیں کہ میرا کام صرف پہنچا دینا ہے کسی ترمیم وتبدیلی کا اختیار نہیں ہے:''**قل مایکون لی أن أُبدله من تلقائی نفسی اِنْ اتبع اِلّا ما یو حیٰ اِلیَّ**''۔

اللہ رب العزت نے خود کچھ جلیل القدر انبیاء کا تذکرہ قرآن کریم میں کیا ہے۔ کچھ نفوس قدسیہ کا ذکر احادیث رسول ﷺ میں ہے مگر ایک بڑی تعداد وہ جن کا ذکر ان دونوں میں نہیں ہے لیکن ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم سب پر ایمان لائیں اور سب کو یکساں طور پر پاک باز بندے سمجھیں، اس کے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہیں۔قرآن کریم میں اہل ایمان کا عقیدہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:''**لانُفَرِّقُ بین أحد مِن رسله**''، کہ (ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرتے) بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

6.5 تبلیغ اسلام

آپ ﷺ نے تبلیغ وتوحید کا حکم پاتے ہی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ لوگوں کو شرک سے باز رکھنے اور توحید الٰہی کی طرف بلانے کا کام اول آپ ﷺ نے اپنے گھر ہی سے شروع کیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائیں۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت زید بن حارثؓ بھی پہلے ہی دن آپ پر ایمان لے آئے۔ یہ سب آپ کے گھر کے آدمی تھے۔ حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ بھی جو آپ کے دوست تھے، پہلے ہی دن ایمان لے آئے۔ ان سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ایک آپ ﷺ کی بیوی، ایک آپ ﷺ کے چچازاد بھائی، ایک آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام، ایک آپ ﷺ کے خالص ومخلص دوست تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب آپ ﷺ کے اخلاق وخصائل سے بخوبی واقف تھے۔ اور آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی بھی پہلو ان سے پوشیدہ ومحجوب نہیں تھا۔ ان کا سب سے پہلے ایمان لانا آپ ﷺ کی صداقت وراست بازی کی ایک زبردست

دلیل ہے۔ آپ ﷺ نے ابتداءً اپنی تعلیم کی تبلیغ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں تک محدود رکھی۔

تبلیغِ اسلام کے اس اولین عہد میں سب سے زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا رسوخ اور حلقہ احباب قریش مکہ میں بہت وسیع تھا۔ اُن کے اثر اور ترغیب سے حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت طلحہ بن عبداللہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، وغیرہ ایمان لائے پھر حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت ابوسلمہؓ، عبدالاسد بن ہلالؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت فاطمہؓ ہمشیرہ حضرت عمر بن الخطابؓ، زوجہ حضرت سعیدؓ وغیرہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔

ان حضرات کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بھائی حضرت عمیرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جعفر بن ابوطالبؓ وغیرہ ایمان لائے اور مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تیار ہوگئی جس میں عورت، مرد، جوان، بوڑھے اور بچے سب شامل تھے۔ ابتداء میں مشرکینِ مکہ کے خوف سے مسلمان مکہ سے باہر پہاڑ کی گھاٹی میں جا کر نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ تین سال تک اسلام کی تبلیغ اسی طرح چپکے چپکے ہوتی رہی اور لوگ رفتہ رفتہ شرک اور بت پرستی سے بیزار ہوہوکر اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ اس تین سال کے عرصہ میں قریش کی ہر مجلس اور ہر ایک صحبت میں اس نئے دین کا چرچا اور تذکرہ ہوتا تھا۔ مسلمان چوں کہ خود اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا بہت سے مسلمانوں کو آپس میں بھی ایک دوسرے کے مسلمان ہونے کا علم نہ ہوتا تھا۔

قریش ابتداءً اس تحریکِ اسلام کو کچھ زیادہ اہم اور خطرناک نہیں سمجھتے تھے لہٰذا تمسخر، استہزاء، اور زبانی طور پر ایذا رسانی کرتے تھے۔ بحیثیت مجموعی قوم کی قوم ابھی درپے استیصال نہیں ہوئی تھی، قریش میں بعض بعض ایسے شرارت پیشہ لوگ تھے کہ وہ قابو پا کر مسلمانوں کو ایذاء جسمانی بھی پہنچاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سعد بن وقاص مع چند مسلمانوں کے کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک چند مشرکین مکہ اُس طرف کو آ نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو سختی و درشتی کے ساتھ اس عبادتِ الٰہی سے روکنے لگے تب سعد بن وقاص نے مزاحمت کی۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً ابوطالب اُس طرف آ نکلے اور خاموش کھڑے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب آپ نماز ختم کر چکے تو پوچھا کہ یہ کیا مذہب ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے کہا کہ یہ دینِ ابراہیمی ہے ساتھ ہی ابوطالب سے کہا کہ آپ بھی اس دین کو قبول کرلیں۔ ابوطالب نے کہا کہ میں تو اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑوں گا، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ بیٹا! تم محمد ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ مجھ کو یقین ہے کہ محمد ﷺ تم کو نیکی کے سوا کسی بُرائی کی ترغیب ہرگز نہ دیں گے۔ غرض اسی طرح نزولِ وحی سے لے کر تین سال تک اسلام کی تبلیغ خاموشی کے ساتھ ہوتی رہی اور سعید روحیں کھنچ کھنچ کر اسلام کی طرف آتی رہیں۔

چندروز کے بعد" وانذر عشیرتک الأقربین "،(یعنی قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ) نازل ہوئی۔ آپ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ ایک ضیافت کا انتظام کرو چنانچہ انہوں نے ضیافت کا انتظام کیا اور آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت دی۔ چالیس کے قریب آپ ﷺ کے رشتہ دار آئے۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ ﷺ نے کچھ تقریر فرمانا چاہی، مگر ابولہب نے ایسی بے ہودہ باتیں شروع کردیں کہ آپ ﷺ کو تقریر کا موقع نہ ملا اور لوگ منتشر ہوگئے۔ دوسرے روز آپ ﷺ نے پھر ضیافت کا انتظام کیا اور اپنے رشتہ داروں کو پھر بلایا جب سب کھانا کھا چکے تو آپ ﷺ نے ان کو اس طرح مخاطب کیا کہ دیکھو میں تمہاری طرف وہ بات لے کر آیا ہوں کہ جس سے زیادہ اچھی بات کوئی شخص اپنے قبیلہ کی طرف نہیں لایا۔ بتاؤ اس کام میں کون میرا مددگار رہوگا؟

یہ سن کر سب خاموش تھے۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ اگر چہ میں کمزور اور سب سے چھوٹا ہوں مگر میں آپ ﷺ کا ساتھ دوں گا۔ یہ سن کر سب ہنس پڑے مذاق اڑاتے ہوئے چل دیئے۔ تین سال تک اسلام کی خفیہ تحریک پھلتی پھولتی رہی قریش کو اس خبر کا اندازہ ہو چکا تھا لیکن اہل قریش نے اس کو خاص اہمیت نہ دی کیونکہ ان کا گمان تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت والوھیت کی تعلیم دیتے ہیں لیکن اس درمیان ایمان والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو ایک دوسرے تک اسلام اور اس کی تعلیمات سے عرب کی گلیوں کو منور کر رہی تھی۔ یہ جماعت اسلام کی تبلیغ کے لیے کوشاں رہتی تھی کہ کس طرح اسلام کو سماج کے اندر ایک حیثیت حاصل ہو۔

اب آنحضرت ﷺ نے عام طور پر لوگوں کو توحید اور اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔ اور اسی زمانہ سے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی کمزور قلیل جماعت پر عام مصائب کا نزول شروع ہوگیا۔ مجلسوں میں میلوں میں، بازاروں میں، نشست گاہوں میں اور لوگوں کے گھر جا جا کر آپ توحید کی خوبی سمجھاتے اور بتوں کی پوجا سے لوگوں کو منع فرماتے تھے۔ زنا، قمار بازی، دروغ گوئی، خیانت، چوری، ڈاکہ زنی وغیرہ رذائل سے لوگوں کو روکتے۔ قریش کی قوم بڑی مغرور تھی۔ اپنے اور اپنے آباء واجداد کے مذہب اور طریقِ عمل کی مذمت سُننا ان کے لیے آسان کام نہ تھا۔ ان لوگوں میں غلام اور آقا کا امتیاز بھی ایک ضروری چیز تھی۔

اسلام ایک عام اخوت قائم کر کے غلام اور آقا کو ایک ہی صف میں جگہ دیتا تھا۔ یہ مساوات بھی ان کو گوارا نہ تھی قریش اور اہل مکہ کی عزت و تعظیم جو تمام ملکِ عرب میں مسلم تھی وہ ان بتوں کی وجہ سے تھی جن کی پرستش کے لیے تمام قبائل عرب مکہ میں آتے اور مراسمِ بت پرستی بجالاتے تھے۔ اسلام بت پرستی کو روا نہیں رکھتا ہے جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی جھوٹی شان وشوکت کا زوال ہوگیا، بڑے بڑے سردارانِ قریش یہ کسی طرح گوارا کرنے کو تیار نہ تھے کہ اپنی سرداری کے مقام سے دستبردار ہو کر کسی اور ذات کی اطاعت کا بار اپنی گردنوں پر ڈال لیں۔ ویسے بھی قریش کے اکثر قبائل بنو ہاشم سے عداوت رکھتے تھے اس لیے ان کو یہ پسند نہ تھا کہ ایک حریف اور دشمن قبیلے کے شخص کو نبی مان کر اس کی اطاعت اختیار کریں۔ اس اعلانیہ تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہی قریش مخالفت پر مستعد ہوگئے اور پے درپے استیصال پر اتر آئے۔ کفر واسلام کی یہ علانیہ کش مکش نبوت کے چوتھے سال ہی زور وشور سے شروع ہوئی جس کے نتیجہ کے طور پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرام کو ہجرت کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

6.5.1 دارارقم:

یہ گھر حضرت ارقمؓ کا تھا جو اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنا گھر اسلامی تعلیمات کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور چونکہ عربی میں گھر کو 'دار' کہتے ہیں اس لیے حضرت ارقمؓ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اسے 'دارِارقم' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان چھپ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں عبادتیں کیا کرتے تھے، اسی دوران ایک مرتبہ مشرکین مکہ کا ایک گروپ پہنچ گیا، جس نے مزاحمت کی، اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی۔ سعد بن ابی وقاص نے بڑھ کر ایک ایسی ضرب لگائی کہ خون نکل پڑا یہ پہلا خون تھا جو اسلام میں بہایا گیا۔ اس سے بچنے اور اسلامی احکام پر سکون کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ مسلمانان مکہ دارارقم میں جمع ہوتے، اور وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے ارکان سیکھتے اور اس کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے۔ دارارقم مکہ مکرمہ میں کوہ صفا کے قریب واقع تھا، یہ گھر پہاڑی علاقے میں ہونے کی وجہ سے کفار مکہ کی نگاہوں سے دور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کا حکم ملنے کے بعد بھی صحابہ کرام سے چھپ کر ملتے تھے، تاکہ کفار مکہ کو مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہو سکے، وہ ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ نہ بنا سکیں اور مسلمان کفار مکہ کے درمیان ٹکراؤ کی صورت کم سے کم پیدا ہو۔ اس گھر میں مسلمان سکون کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے، اس گھر میں صحابہ کرام اپنے معاملات، اپنی تبلیغ اور باہمی اجتماعات غرض تمام امور سے متعلق خفیہ

طور پر آپس میں تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔حضرت عمرؓ نے دارارقم ہی میں کلمہ توحید کا اقرار کیا تھا اور اسلامی تاریخ کا ایک نیا دریچہ کھل گیا تھا۔تاریخ اسلام میں مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی لکھتے ہیں:

''دارارقم میں مسلمان ہونے والوں کی فہرست میں حضرت عمر فاروقؓ آخری شخص ہیں۔ان کے مسلمان ہونے پر مسلمانوں کو بڑی تقویت پہنچی اور دارارقم سے باہر نکل آئے''۔

6.6 کوہِ صفا پر اعلانِ حق

جب حکم الٰہی نازل ہوا''فاصدع بما تؤمر ''(تم کو جو کچھ حکم دیا گیا ہے اسے کھول کر سناؤ) اس حکم کے نازل ہونے پر آپ کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے ایک ایک قبیلہ کا نام لے لے کر بلانا شروع کیا۔اس آواز کو سن کر ملکِ عرب کے دستور کے موافق لوگ آ آ کر جمع ہونے شروع ہوئے۔جب تمام لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا:''اِن أخبرتكم أنّ العدوّ مصبحكم أو ممسيكم أما كنتم تصدقونني '' (اے قریش! اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ صبح کو یا شام کو تم پر دشمن حملہ کرنے والا ہے۔تو کیا تم لوگ مجھ کو سچا جانو گے) سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ہاں! ہم نے ہمیشہ تجھ کو صادق القول پایا ہے، یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اچھا تم کو خبر دیتا ہوں کہ اللہ کا عذاب نزدیک ہے۔اُس پر ایمان لاؤ تا کہ عذابِ الٰہی سے بچ جاؤ۔یہ سنتے ہی عام قریش ہنس پڑے۔ابولہب نے کہا کہ''تَبًّا لکَ''تجھ کو ہلاکت ہو، کیا تو نے اس لیے ہم کو جمع کیا تھا۔اس کے بعد مجمع منتشر ہوگیا۔اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو باتیں بناتے ہوئے چلے گئے۔ابولہب کے اٹھتے ہی سورہ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی۔

شروع شروع میں ایمان لانے اور مسلمان ہو جانے والوں میں کچھ لوگ غلام تھے اور کچھ ایسے تھے جو اپنے قبیلہ کا زور اور رشتہ داروں کی جماعت نہ رکھنے کے سبب بہت ہی کمزور سمجھے جاتے تھے۔ایسے لوگوں کو اسلام سے مرتد بنانے کے لیے جسمانی ایذائیں شروع کی گئیں۔جو لوگ کسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کو عام لوگوں کا ایذا پہنچانا اس لیے مشکل نظر آتا تھا کہ کہیں اُن کے قبیلہ والے حمایت پر اُٹھ کھڑے ہوں تو اُن کے رشتہ داروں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ خود اپنے مسلمان ہو جانے والے رشتہ دار کو سزا و ایذا دے کر مرتد بنائیں۔مسلمانوں کا تمسخر اُڑانے اور ان کو برا کہنے کے لیے عام طور پر تیاری کی گئی کہ دوسروں کو اسلام میں داخل ہونے کی جرأت نہ رہے۔ادھر آنحضرت ﷺ نے اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کی۔اُدھر قریش نے پوری سرگرمی کے ساتھ مخالفت پر کمر باندھی۔حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔اُن کے اسلام لانے کا حال معلوم ہوا تو امیہ بن خلف نے اُن کو قسم قسم کی تکلیفیں دینی شروع کیں۔گرم ریت پر لٹا کر چھاتی کے اوپر گرم پتھر رکھ دیا جاتا۔مشکیں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا جاتا۔بھوکا رکھا جاتا۔گلے میں رسّی باندھ کر لڑکوں کے سپرد کیا جاتا وہ شہر مکہ کے گلی کوچوں میں اور شہر کے باہر پہاڑیوں میں لیے لئے پھرتے اور مارتے پیٹتے تھے۔

ان تمام ایذا رسانیوں کو حضرت بلالؓ برداشت کرتے اور اَحد اَحد کا نعرہ لگائے جاتے تھے۔حضرت عمارؓ اپنے والد یاسرؓ اور اپنی والدہ سمیہؓ کے ہمراہ مسلمان ہوگئے تھے۔ابو جہل ان کو گونا گوں عذاب پہنچاتا تھا۔حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ظالم ابو جہل نے نہایت بے دردی سے نیزہ مار کر شہید کر دیا تھا۔حضرت زنیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ابو جہل نے اس قدر مارا کہ مارتے مارتے اندھا کر دیا۔غرض بہت سے غلام اور لونڈیاں تھیں جن کو ایسی ایسی سخت و شدید سزائیں دی گئیں کہ اُن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔مگر اسلام ایسی زبردست طاقت کا نام ہے کہ سنگدل کسی کو بھی مرتد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔حضرت عثمان بن عفانؓ قبیلہ بنو امیہ کے ایک امیر آدمی تھے۔مسلمان ہو جانے کے سبب اُن کے چچا نے اُن کو رسیوں سے باندھ کر خوب مارا اور قسم قسم کی جسمانی ایذائیں پہنچائیں۔حضرت زبیر بن العوامؓ کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک

میں دھواں دیا کرتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کو قریش نے قرآن پڑھتے ہوئے سن کر اس قدر مارا کہ مارتے مارتے بیہوش کر کے زمین پر ڈال دیا۔قریب تھا کہ وہ اُن کو جان سے مار ڈالتے۔مگر حضرت عباس بن عبدالمطلب نے قریش کو یہ کہہ کر روکا کہ اس شخص کا قبیلہ بنوغفار تمہارے تجارتی قافلوں کے راستہ میں آباد ہے، وہ تمہارے ناک میں دم کر دیں گے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بھی اسی طرح صحنِ کعبہ میں مارتے مارتے بیہوش کر دیا۔حضرت خباب بن ارتؓ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔

ایک مرتبہ خوب دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھا کر اُن کو اُن انگاروں پر چت لِٹا دیا۔اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر بیٹھ گیا کہ کروٹ نہ بدل سکیں۔اُن کی کمر کی تمام کھال اور گوشت جل کر کباب ہوگیا۔بعض صحابہؓ کو گائے یا اونٹ کے کچے چمڑے میں لپیٹ کر اور باندھ کر ڈال دیتے۔بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتی ہوئی آگ اور جلتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیتے۔خود آپ ﷺ کو بے پناہ تکالیف پہنچائی جیسا کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ کے گلے میں چادر ڈال کر اس قدر اینٹھا کہ آپ ﷺ کا دم رُکنے لگا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خبر ہوئی تو آپ دوڑے ہوئے آئے۔آپ ﷺ کو اس کے شر سے بچایا۔اور قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلاً اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللهُ (کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟) کفار نے آنحضرت ﷺ کو تو چھوڑ دیا۔مگر حضرت ابوبکرؓ کو لپٹ پڑے اور خوب زدوکوب کیا۔ایک مرتبہ صحنِ کعبہ میں قریش نے آپ ﷺ کو گھیر لیا اور آپ ﷺ کی شان میں گستاخی سے پیش آنا چاہا۔حضرت حارث بن ابی ہالہ کو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے آئے اور آپ ﷺ کو اشرار کے ہجوم و شرارت سے بچانا چاہا۔کفار نے حضرت حارثؓ کو وہیں شہید کر دیا۔مگر آپ ﷺ پر دست درازی کی جرأت اُن کو نہ ہوسکی۔آپ ﷺ کے راستہ میں جہاں سے آپ ﷺ رات کے وقت گزرنے والے ہوتے کانٹے بچھا دیئے جاتے کہ آپ ﷺ کو اذیت پہنچے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ صحنِ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، قریش بھی وہاں بیٹھے تھے۔ابوجہل نے کہا کہ فلاں مقام پر اونٹ ذبح ہوا ہے اس کی اوجھڑی پڑی ہوئی ہے،کوئی اس کو اُٹھا کر لائے اور محمد ﷺ کے اوپر ڈال دے۔یہ سن کر عقبہ بن ابی معیط اُٹھا اور وہ اوجھڑی اُٹھا لایا۔جب آپ ﷺ سجدہ میں گئے تو آپ ﷺ کی پشت پر رکھ دی۔آنحضرت ﷺ کو تو توجہ الی اللہ میں خبر بھی نہ ہوئی مگر کفار ہنسی کے مارے ٹوٹے جاتے تھے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی وہاں موجود تھے مگر کفار کا ہجوم دیکھ کر اُن کو کچھ جرأت نہ ہوئی۔اتفاقاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو بچی تھیں آ گئیں اور انہوں نے آگے بڑھ کر باپ کی پشت پر سے اُس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو برا بھلا کہا۔آنحضرت ﷺ کے مکان پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔گندگی وغیرہ بھی آپ ﷺ کے گھر پھینک دیتے تھے۔ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اے بنوعبد مناف، یہ اچھا ہمسائیگی کا حق ادا کر رہے ہو''۔کبھی آپ ﷺ کا نام شاعر رکھا جاتا تھا،کبھی آپ ﷺ کو ساحر کہہ کر پکارا جاتا تھا۔کبھی آپ ﷺ کو کاہن کہتے اور کبھی مجنون کا خطاب دیتے۔

غرض کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کی جماعت کو تکلیف پہنچانے اور آپ ﷺ کے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ادھر آنحضرت ﷺ بھی پورے عزم و استقلال اور ہمت و جرأت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔جب قریش کو اس امر کا یقین ہوگیا کہ ہماری کوششوں سے کوئی حسب منشا نتیجہ پیدا نہیں ہوا تو انہوں نے مجبوراً دوسرا پہلو اختیار کیا۔جو یہ تھا کہ قریش نے جمع ہو کر مشورہ کیا اور عتبہ بن ربیعہ کو اپنی طرف سے پیغام دے کر آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا۔عتبہ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور بڑی نرمی کے ساتھ کہنے لگا کہ ''محمد (ﷺ) تم شریف ہو۔تمہارا خاندان بھی شریف و معزز ہے۔مگر تم نے قوم کے اندر فتنہ ڈال رکھا ہے۔یہ بتاؤ کہ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ اگر تم کو مال و دولت کی

خواہش ہے تو ہم تمہارے واسطے اس قدر مال جمع کیے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔ اگر تم کو حکومت اور سرداری کی خواہش ہے تو ہم سب تم کو اپنا سردار بنا لینے اور تمہاری حکومت تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر تم کو شادی کرنی منظور ہے تو ہم سب سے اعلیٰ گھرانے کی سب سے زیادہ حسین لڑکی سے تمہاری شادی کرا دیتے ہیں۔ اور اگر ان سب چیزوں کی خواہش ہے تو یہ سب تمہارے لیے فراہم کیے دیتے ہیں۔ تم اپنا دلی منشا صاف صاف بیان کر دو۔ ہم تمہاری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں''۔

عتبہ جب اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت ﷺ نے جواباً سورہ حٰم سجدہ تلاوت فرمانی شروع کی، جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے کہ ''فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَة عَادٍ وَّثَمُوْدَ'' تو عتبہ کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ ایسا نہ کہو۔ پھر آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور سجدہ سے فارغ ہو کر کہا کہ تم نے میرا جواب سن لیا؟ عتبہ وہاں سے اٹھا اور قریش کے پاس آ کر کہا کہ یہ میری رائے ہے کہ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور تم بالکل غیر جانبدار ہو جاؤ۔ اگر یہ ملک عرب پر غالب ہو گیا تو چونکہ یہ تمہارا بھائی ہے اس کی کامیابی تمہاری کامیابی ہوگی اور اگر یہ تباہ ہو گیا تو تم سستے چھوٹ جاؤ گے۔ یہ سن کر قریش نے عتبہ سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے محمد (ﷺ) نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا جو تمہارا جی چاہے کرو اور کہو، میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

اس کے بعد سردارانِ قریش کا ایک وفد ابوطالب کی خدمت میں پہنچا اور شکایت کی کہ تمہارا بھتیجا ہمارے بتوں کو برا کہنے سے باز نہیں آ رہا ہے، تم اس کو سمجھاؤ اور اس حرکت سے باز رکھو۔ ابوطالب نے اس وفد کو معقول جواب دیا اور ان کو توجہ دلائی کہ تم لوگ بھی ایذا رسانیوں میں حد سے بڑھے جاتے ہو۔ اُس روز تو یہ لوگ ابوطالب کے پاس سے اُٹھ کر چلے آئے۔ لیکن دوسرے روز مشورہ کر کے پھر پہنچے۔ اُن کے آنے پر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو اپنے مکان پر اُن کے سامنے بلوایا اور آپ ﷺ کی موجودگی میں گفتگو شروع ہوگئی۔ قریش کے سرداروں نے وہی باتیں اس مجلس میں آپ ﷺ کے سامنے پھر پیش کیں جو اس سے پہلے عتبہ تنہا حاضر ہو کر پیش کر چکا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) ہم نے آپ (ﷺ) کو اس وقت بعض ضروری باتوں کے لیے بلوایا ہے۔ بخدا کوئی شخص اپنی قوم پر اتنی مشکلات نہیں لایا ہوگا جس قدر مشکلات میں تم نے قوم کو مبتلا کر دیا ہے۔ اگر تم اپنے اس نئے دین کے ذریعہ مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کیے دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کے پاس نہ نکلے۔ اگر شرف و عزت کی خواہش ہے تو ہم ابھی تم کو اپنا سردار تسلیم کیے لیتے ہیں۔ اگر حکومت و سلطنت کی خواہش ہے تو تم کو ملک عرب کا بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تم کو کوئی جن یا آسیب دکھائی دیتا ہے اور اُس کے اثر سے تم ایسی باتیں کرتے ہو تو ہم اپنے کاہنوں اور حکیموں کے ذریعہ علاج کرانے کو تیار ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ باتیں سن کر جواباً قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو تمہاری طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے خدا تعالیٰ کے احکام تم کو پہنچا دیئے ہیں اگر تم میری تعلیمات کو قبول کر لو گے تو تمہارے لیے دین و دنیا کی بہتری کا موجب ہوگا۔ اگر انکار پر اصرار کرو گے تو میں خدا تعالیٰ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ تمہارے لیے کیا حکم صادر فرماتا ہے۔ یہ سن کر کفار نے کہا کہ اچھا اگر تم خدا کے رسول ہو تو ان پہاڑوں کو ملکِ عرب سے ہٹا دو اور ریگستان کو سرسبز بنا دو۔ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دو اور اُن میں قصی بن کلاب کو ضرور زندہ کرو۔ اگر قصی بن کلاب نے زندہ ہو کر تم کو سچا مان لیا اور تمہاری رسالت کو قبول کر لیا تو ہم بھی تم کو رسول تسلیم کر لیں گے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ان کاموں کے لیے رسول نہیں بنایا گیا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ تم کو خدائے تعالیٰ کے احکام جو مجھ پر نازل ہوتے ہیں سنا دوں اور اچھی طرح سمجھا دوں۔ میں اپنے اختیار سے خود کچھ نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی باتیں ہونے کے بعد سردارانِ قریش ناراض اور برافروختہ ہو کر اُٹھے اور ابوطالب کو بھی مقابلہ اور مخالفت کے لیے چیلنج دے کر چل

دیئے۔سردارانِ قریش کے چلے جانے پر ابوطالب نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ بھتیجے میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اپنے اندر قریش کے مقابلے کی طاقت نہیں پاتا۔تم مجھے ایسی محنت میں مبتلا نہ کرو جو میری طاقت واستطاعت سے بڑھ کر ہو۔مناسب یہ ہے کہ تم اپنے دین کا اعلان اور بتوں کی علانیہ برائیاں بیان کرنا ترک کردو۔آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ چچا، اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے باز نہیں رہ سکتا۔ابوطالب کی باتوں سے آپ ﷺ کو یہ شبہ گذرا کہ اب یہ میری حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں۔

ابوطالب سردارانِ مکہ میں سب سے زیادہ عزت ووجاہت رکھتے اور قبیلۂ بنی ہاشم کے مسلمہ سردار سمجھے جاتے تھے۔ان کی وجہ سے مخالفین حملہ کرتے ہوئے جھجکتے تھے اور ان کو خطرہ تھا کہ اگر بنو ہاشم سب کے سب آنحضرت ﷺ کی امداد پر اُٹھ کھڑے ہوئے تو معاملہ بہت ہی نازک ہو جائے گا، لہٰذا ابوطالب کی حمایت سے آنحضرت ﷺ کو بہت کچھ تقویت حاصل تھی۔اب یہ مایوسانہ باتیں سن کر آپ ﷺ کا دل بھر آیا۔پھر آپ ﷺ یہ کہہ کر ابوطالب کے پاس سے چشم پُر آب اُٹھے اور چل دیئے کہ ''چچا! میں اپنے کام کو اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ خدا کا کام پورا نہ ہو جائے یا یہی کام کرتے ہوئے میں ہلاک نہ ہو جاؤں''۔ابوطالب پر اس کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے آپ ﷺ کو پھر واپس بلا کر کہا کہ اچھا تم ضرور اپنے کام میں مصروف رہو۔جب تک میرے دم میں دم ہے میں تمہاری حمایت سے باز نہ رہوں گا اور تم کو کبھی دشمنوں کے سپرد نہ کروں گا۔

6.7 مختلف قبائل میں تبلیغ اسلام

مکہ والوں سے ناامید ہو کر آپ ﷺ نے طائف کا قصد کیا تھا۔وہاں والوں نے مکہ والوں سے بھی بدتر نمونہ دکھایا۔مکہ والوں کی نفرت اور ضد دن بدن ترقی پر تھی۔اور ان کی شرارتیں اپنی کیفیت اور کمیّت میں پہلے سے زیادہ اور سخت ہوتی جاتی تھیں۔مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمت نہیں ہاری۔طائف سے واپس آ کر آپ ﷺ اُن قبائل میں جو مکہ کے اردگرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے، برابر جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے رہے۔چنانچہ قبیلۂ بنوکندہ اور قبیلۂ بنوعبداللہ کی اقامت گاہوں میں پہنچے۔بنوعبداللہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے بنوعبداللہ! تمہارا باپ عبداللہ تھا۔تم بھی اسم بامسمیٰ یعنی اللہ کے بندے بن جاؤ۔قبیلۂ بنوحنیفہ کی بستی میں بھی آپ ﷺ گئے۔اُن ظالموں نے سارے عرب میں سب سے زیادہ نالائق طریق پر آپ ﷺ کا انکار کیا۔

باہر سے جو مسافر مکہ میں آتے یا ایام حج میں دوردراز مقامات کے قافلے آتے، آپ ﷺ ان کے پاس چلے جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے۔مگر ابولہب کو آپ ﷺ سے جو مخالفت تھی اس کی وجہ سے وہ ہر جگہ آپ ﷺ کے پیچھے پہنچ جاتا اور مسافروں کو آپ ﷺ کی باتیں سننے سے روکتا۔

بنوعامر، بنوشیبان، بنوکلب، بنومحارب، فزارہ، غسان، سلیم، عبس، حارث، عذرہ، ذھل، مرہ وغیرہ قبائل کو بھی آنحضرت ﷺ نے دعوتِ اسلام دی۔

جس وقت آپ ﷺ نے بنوعامر کے سامنے اسلام پیش کیا تو ان میں سے ایک شخص فراسؔ نامی نے کہا کہ اگر ہم مسلمان ہو جائیں اور آپ (ﷺ) کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو تو کیا تم اپنے بعد ہم کو اپنا خلیفہ بناؤ گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کام تو خدائے تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہے گا وہی میرا خلیفہ ہو جائے گا۔یہ سن کر اس شخص نے کہا کہ کیا خوب! اس وقت تو ہم آپ (ﷺ) کے مطیع وحامی بن کر اپنی گردنیں کٹوائیں اور جب تم کامیاب ہو جاؤ تو دوسرے لوگ حکومت کا مزا اُڑائیں۔جاؤ ہم کو تمہاری ضرورت نہیں۔

6.7.1 سوید بن صامت:

نبوت کا گیارہواں سال شروع ہو چکا تھا۔مدینہ کا رہنے والا قبیلۂ اوسؔ کا ایک شخص سوید بن صامت مکہ میں آیا جو اپنی قوم میں کاملؔ کے لقب سے مشہور تھا۔اس کی ملاقات اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔آپ ﷺ نے اُس کو اسلام کی دعوت دی۔اس نے کہا شاید آپ

(ﷺ) کے پاس بھی وہی ہے جو میرے پاس ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا تیرے پاس کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ حکمتِ لقمان۔آپ ﷺ نے فرمایا سناؤ۔اُس نے کچھ اشعار پڑھے۔آپ ﷺ نے سن کر فرمایا کہ یہ اچھا کلام ہے لیکن میرے پاس قرآن مجید ہے جو اس سے بہتر و افضل ہے، اور ہدایت و نور ہے۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن مجید اس کو سنایا۔اُس نے قرآن مجید سن کر اقرار کیا کہ واقعی یہ ہدایت اور نور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا، بعض میں ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا۔مگر آپ ﷺ کی مخالفت بالکل نہیں کی۔مدینہ منورہ میں جا کر وہ ایک لڑائی میں جو اوس و خزرج کے درمیان ہوئی، مارا گیا۔

6.7.2 ایاس بن معاذؓ:

انہیں ایام میں انس بن رافع اپنی قوم بنو عبد الاشہل کے چند لوگوں کو ہمراہ لے کر مدینہ سے مکہ میں اسلئے آیا کہ قریش مکہ سے قوم خزرج کے مقابلے میں معاہدہ کرے اور قریش کو اپنی قوم کا ہم عہد بنائے۔اس وفد کے آنے کی خبر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اُن کے پاس پہنچ گئے۔ابھی وہ سردارانِ قریش سے ملنے اور اپنا مقصد بیان کرنے نہ پائے تھے۔آپ ﷺ نے جاتے ہی اُن سے کہا کہ میرے پاس ایسی چیز ہے جس میں تم سب کی بہتری مضمر ہے۔اگر تم چاہو تو میں پیش کروں۔انہوں نے کہا، بہت اچھا، آپ (ﷺ) پیش کریں۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں لوگوں کی ہدایت و رہبری کے لیے رسول مبعوث ہوا ہوں۔شرک سے منع کرتا ہوں اور صرف خدا ہی کی عبادت کا حکم دیتا ہوں۔مجھ پر خدائے تعالیٰ نے کتاب نازل کی ہے۔پھر آپ ﷺ نے اسلام کے اُصول بتائے اور قرآن مجید پڑھ کر سنایا۔مدینہ کے اُس وفد میں انس بن رافع کے ہمراہ ایک نوجوان ایاسؔ بن معاذ بھی تھا۔ایاس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اور قرآن مجید کی آیتیں سن کر بے تابانہ کہا کہ ''اے میری قوم تم جس مقصد کے لیے مدینہ سے آئے ہو بخدا یہ چیز اُس سے اچھی ہے''۔امیرِ وفد انسؔ بن رافع نے ایاسؔ بن معاذ کو ڈانٹا اور کہا ہم اس کام کے لیے نہیں آئے۔ایاس خاموش ہو گئے۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے خاموش اُٹھ کر چلے آئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کا یہ وفد نا کام مکہ سے واپس آ گیا اور کوئی معاہدہ قریش سے نہ ہو سکا۔مدینہ میں جا کر چند روز کے بعد حضرت ایاسؔ بن معاذ کا انتقال ہوا، اور انہوں نے مرنے سے پہلے اسلام اور ایمان کا اظہار فرمایا۔

6.7.3 ضمادِ بن ثعلبہ ازدیؓ:

ضماد ازدیؓ ایک مرتبہ مکہ میں آیا۔ یہاں قریش سے سنا کہ محمد ﷺ پر جنات کا اثر ہے۔بولا کہ میں اپنے منتر سے ابھی اس شخص کا علاج کیے دیتا ہوں۔چنانچہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں تم کو اپنا منتر سناتا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے مجھ سے سن لو پھر تم سنانا۔چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے خطبہ کے ابتدائی کلمات اس طرح شروع کئے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. امّابعد آپ ﷺ نے اسی قدر الفاظ ابھی بیان فرمائے تھے کہ ضمادؔ بے اختیار بول اُٹھا۔یہی کلمات پھر دوبارہ بیان کیجئے۔چنانچہ کئی مرتبہ اس نے یہی کلمات آپ ﷺ سے پڑھوائے اور پھر کہا کہ میں نے بہت سے کاہن، ساحر، شاعر دیکھے اور اُن کا کلام سنا لیکن ایسا جامع اور مانع، لطیف و بلیغ کلام کبھی نہیں سنا۔پھر آپ ﷺ سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، میں مسلمان ہوتا ہوں اور اسلام کے لے بیعت کرتا ہوں۔

6.7.4 طفیل بن عمرو دوسیؓ:

یمن میں قبیلہ ٔ دوس آباد تھا۔اس قبیلہ کا سردار طفیل بن عمرو رؤساءِ یمن میں شمار ہوتا تھا۔طفیل علم ودانشمندی کے علاوہ بہت مشہور اورزبردست شاعر بھی تھا۔اسی سال یعنی سنہ ۱۱ نبوی میں وہ اتفاقاً مکہ کی طرف آیا۔طفیل بن عمرو کے آنے کا حال سن کر سردارانِ قریش استقبال کے لیے مکہ سے باہر نکلے اور بڑی عزت وتعظیم کے ساتھ شہر میں لائے۔قریش کواس بات کا اندیشہ ہوا کہ کہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے طفیل کی ملاقات نہ ہوجائے اور طفیل پراُن کا جادو نہ چلے۔چنانچہ انہوں نے مکہ میں داخل ہوتے ہی طفیل سے کہا کہ آج کل ہمارے شہر میں ایک ایسا جادوگر پیدا ہوگیا ہے جس نے تمام شہر کو فتنہ میں ڈال دیا ہے۔باپ بیٹے سے، بیٹا باپ سے، بھائی بھائی سے اورخاوند بیوی سے جدا ہوگیا ہے۔آپ چونکہ ہمارے معزز مہمان ہیں لہٰذا آپ بھی احتیاط رکھیں اور کوئی کلمہ اس ساحر یعنی محمد (ﷺ) کی زبان سے نہ سنیں۔قریش کے باربار اور باصرار خوف دلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ طفیل نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ کہیں ایسا نہ ہوا کہ اچانک محمد (ﷺ) کی آواز اس کے کانوں میں پڑجائے۔

ایک روز علی الصبح طفیل اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر خانۂ کعبہ میں پہنچے۔وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر پڑھ رہے تھے۔نماز پڑھنے کا طریقہ جوآنکھوں سے نظر آتا تھا طفیل کو اچھا معلوم ہوا۔اوروہ آپ ﷺ کے قریب چلے گئے۔وہاں آپ ﷺ کی قرأت کی آواز بھی کچھ کچھ سنائی دینے لگی۔اب طفیل کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آخر میں بھی شاعر ہوں،عقلمند ہوں۔اگراس شخص کی باتیں اچھی ہوں گی تو مان لوں گا۔اگر بُری ہیں تو انکار کردوں گا۔یہ خیال آتے ہی روئی کانوں سے نکال کر پھینک دی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز ختم کر کے اپنے گھر کی طرف چلے توطفیل بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے ہولئے اورکہا کہ مجھ کوآپ (ﷺ) اپنی باتیں سنائیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید پڑھ کرسنایا۔طفیل اُسی وقت مسلمان ہوگئے اورکہا کہ ’’آپ (ﷺ) دعا کریں کہ خدا تعالیٰ میرے ذریعہ میرے قبیلہ والوں کواسلام قبول کرنے کی توفیق دے‘‘۔طفیل مکہ سے اپنے گھر آئے اورتبلیغ اسلام شروع کردی۔حضرت طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مکہ والے آپ (ﷺ) کو بہت ستاتے ہیں۔آپ (ﷺ) ہجرت فرمائیں اورمیرے گھر چل کر رہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب خدائے تعالیٰ مجھ کوہجرت کا حکم دے گا تب ہی ہجرت کروں گا۔اورجس جگہ کے لیے حکم ہوگا،اُسی جگہ ہجرت کر کے جاؤں گا۔

6.7.5 ابوذر غفاریؓ:

حضرت ابوذر غفاریؓ قبیلہ ٔبنی غفار سے تعلق رکھتے اورمدینہ (یثرب) کے نواحی علاقے میں رہتے تھے۔مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سوید بن صامت اورایاسؔ بن معاذ کے ذریعہ پہنچی اوراُڑتی ہوئی حضرت ابوذرؓ کے کانوں تک پہنچی توانہوں نے اپنے بھائی انیسؔ کو جوشاعر بھی تھے تحقیق حال کے لیے مکہ روانہ کیا۔انیس نے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اورمدینہ واپس جا کر حضرت ابوذرؓ سے ذکرکیا کہ میں نے محمد ﷺ ایک ایسا شخص پایا جونیکی کی ترغیب اوربدی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔حضرت ابوذرؓ کواس بات سے کچھ تسلی نہ ہوئی۔مدینہ سے پیدل چل کرمکہ پہنچے۔یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوتے ہی اسلام قبول کیا۔اوراُسی وقت خانۂ کعبہ میں آکر جہاں قریش کا مجمع تھا بلند آواز سے کلمۂ توحید پڑھا اورقرآن مجید کی جوآیات یاد کرلی تھیں سنائیں۔قریش نے کہا اس بے دین کو مارو۔چنانچہ چاروں طرف سے لوگ پل پڑے اورمارتے مارتے بیہوش کردیا۔جان سے مارڈالنے پرآمادہ تھے کہ اتنے میں حضرت عباسؓ جوابھی تک کفار ہی میں شامل تھے،آگئے انہوں نے دیکھ کرکہا کہ یہ قبیلۂ غفار کا آدمی ہے جہاں سے تم تجارت کے لیے کھجوریں لایا کرتے ہو۔لوگ یہ سن کرہٹ گئے۔یہ ہوش میں آکر اوراُٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے اوراگلے دن پھراسی طرح اعلان کیا۔قریش نے پھرزدوکوب کیا۔غرض مکہ میں اپنے اسلام

کا اعلان کر کے واپس آئے۔

6.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات پڑھے:

- نبوت سے قبل کی زندگی بھی اللہ کے رسول ﷺ کی آئیڈیل زندگی ہے۔40 سال کی عمر میں آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے۔
- بعثت رسول ﷺ کے چار مقاصد قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں۔تلاوت، تعلیم، حکمت، وتزکیہ۔
- مقام نبوت اختیاری واکتسابی چیز نہیں ہے۔
- تبلیغ اسلام کا ابتدائی دور مخفی دور ہے جو شروع کے تین سال ہیں۔
- 4 نبوی سے 5 نبوی تک کا دور اعلانیہ دور ہے۔
- 5 نبوی سے 10 نبوی تک کا دور نو مسلمانوں پر ظلم وستم کا دور ہے۔
- 10 نبوی سے 12 نبوی تک کا دو سنگین مخالفتوں کا دور ہے۔

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. آپ ﷺ پر پہلی وحی کہاں نازل ہوئی تھی؟

a. غار ثور میں   b. غار حرا میں   c. وادی نخلہ میں   d. اپنے گھر میں

2. آپ ﷺ پر پہلی وحی میں جو آیتیں اتری تھیں وہ کس سورہ کی ابتدائی آیتیں ہیں؟

a. سورہ فاتحہ   b. سورہ بقرہ   c. سورہ علق   d. سورہ یٰسین

3. پہلی وحی کے بعد جب آپ ﷺ خوفزدہ تھے تو حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو کن کے پاس لے کر گئی تھیں؟

a. خالہ زاد بھائی کے پاس   b. ماموزاد بھائی کے پاس   c. پھوپھی زاد بھائی کے پاس   d. چچازاد بھائی کے پاس

4. آپ ﷺ پر عورتوں میں سے سب سے پہلے کس نے ایمان لایا تھا؟

a. حضرت خدیجہؓ   b. حضرت امّ ہانیؓ   c. حضرت امّ ایمنؓ   d. حضرت امّ سلمہؓ

5. حضرت علیؓ آپ ﷺ پر کب ایمان لائے تھے؟

a. پہلے ہی دن   b. دوسرے دن   c. تیسرے دن   d. چوتھے دن

6. تبلیغ اسلام کا پہلا تین سالہ دور کیا کہلاتا ہے؟

a. مخفی دور   b. اعلانیہ دور   c. ظلم وستم کا دور   d. سب صحیح

7. تبلیغ اسلام کا اعلانیہ دور کون سا ہے؟

a. 1-3 نبوی   b. 3-5 نبوی   c. 5-10 نبوی   d. 10-12 نبوی

8. مخفی دور میں تبلیغ اسلام کا مرکز کہاں تھا؟

a. دارابوبکرؓ b. دارعثمانؓ c. دارارقمؓ d. دارابی ابن کعبؓ

9. طفیل بن عمرو دوسی کہاں کے رؤساء میں سے تھے؟

a. عمان b. عراق c. نجد d. یمن

10. تبلیغ اسلام کے اولین عہد میں جس شخصیت نے نمایاں خدمات انجام دیں وہ کون ہیں؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت قدامہؓ c. حضرت عثمانؓ بن مضعون d. حضرت سعیدؓ

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. بعثت رسول ﷺ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. مقاصد بعثت میں تزکیہ سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجیے۔
3. مقام رسالت پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. رسالت کی مختصر تاریخ لکھیے۔
5. تبلیغ دین کی شروعات اللہ کے رسول ﷺ نے کیسے کی؟ واضح کیجیے۔

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مقاصد بعثت پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. اللہ کے رسول ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد تبلیغ کیسے کی تفصیل سے لکھیے۔
3. اعلانیہ تبلیغ کے وقت اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کیسے حالات پیش آئے؟ وضاحت سے لکھیے۔

6.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. سیرۃ النبی (جلد اول) : علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2. تاریخ اسلام (جلد اول) : شاہ اکبر خاں صاحب نجیب آبادی
3. سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم) : مولانا محمد ادریس کاندھلوی

-:oOo:-

اکائی 7 : بعثت کے بعد کے اہم واقعات

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقصد
7.2 شعب ابی طالب میں محصور ہونا
7.3 عام الحزن
7.4 سفر طائف
7.5 واقعہ معراج
7.6 بیعتِ عقبہ اولیٰ
7.7 بیعتِ عقبہ ثانیہ
7.8 ہجرتِ حبشہ
7.9 اکتسابی نتائج
7.10 نمونہ امتحانی سوالات
7.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید

اس اکائی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے بعد کے اُن اہم ترین واقعات کا ذکر ہے جن کے پڑھنے کے بعد قارئین کو معلوم ہوگا کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اِس دین کی تبلیغ شروع کی تو آپ ﷺ کو کیسے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

7.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اُن اہم گوشوں سے واقف ہونگے اور آپ کے اندر اپنے نبی کریم ﷺ کی سیرت پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا نیز آپ کو سمجھ میں آئیگا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کسی بھی مشکل چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

7.2 شعب ابی طالب میں محصور ہونا (سن 7 تا 10 نبوی)

حضرت عمر فاروق ؓ کے مسلمان ہونے سے قریش کو بڑا صدمہ پہنچا۔ادھر مسلمان علانیہ خانۂ کعبہ میں نمازیں پڑھنے لگے۔بہت سے مسلمان نجاشی کے ملک میں جا چکے تھے جن پر قریش کا کوئی زور نہیں چلتا تھا۔حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کی وجہ سے مکہ کے مسلمانوں پر بھی وہ بلاخطرہ ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ان حالات کو دیکھ کر نبوت کے ساتویں سال کی ابتدا یعنی ماہ محرم میں قریش نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی۔مسلمانوں کی روزافزوں جماعت کے خطرات سے قوم کو آگاہ کیا اور اس خطرہ واندیشہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر پر غور کیا گیا۔بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب اگرچہ سب کے سب مسلمان نہیں ہوئے لیکن وہ محمد ﷺ کی حمایت اور رعایت سے باز نہیں آتے۔لہٰذا اوّل ابوطالب سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ محمد ﷺ کو ہمارے حوالے کر دیں۔اگر وہ انکار کریں تو بنوہاشم اور بنی عبدالمطلب سے شادی بیاہ، میل ملاقات، سلام پیام سب ترک کر دیا جائے۔کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت نہ کی جائے۔اور کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس نہ پہنچنے دی جائے اور اس سخت اذیت رساں مقاطعے کو اُس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کہ محمد (ﷺ) کو ہمارے سپرد نہ کر دیں۔

چنانچہ اس مقاطعے کے متعلق ایک عہد نامہ لکھا گیا۔تمام رؤساءِ قریش نے اس پر قسمیں کھائیں اور عہد نامہ پر دستخط کیے۔یہ دستخط شدہ عہد نامہ خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا اور مقاطعہ شروع ہو گیا۔ابوطالب تمام بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب کو لے کر مکہ کے قریب ایک پہاڑی درّے میں جا کر محصور ہو گئے۔جس قدر مسلمان تھے وہ بھی ان کے ساتھ اُسی درّے میں جو شعبِ ابی طالب اور شعب بنی ہاشم کے نام سے مشہور ہے چلے گئے۔بنوہاشم سے صرف ایک شخص ابولہب اِس قید و نظر بندی سے آزاد رہا۔وہ کفّارِ قریش کے ساتھ تھا۔غلہ وغیرہ جو کچھ بنوہاشم اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ جلد ختم ہو گیا۔اور اُن لوگوں کو کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہونے لگی۔درّے میں جانے کا صرف ایک تنگ راستہ تھا۔کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

تین برس تک بنوہاشم اور مکہ کے ان مسلمانوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اور اذیتیں شعب ابوطالب میں برداشت کیں۔جن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔صرف ایامِ حج میں یہ محصور لوگ باہر نکلتے تھے اور عرب کے دستور کے موافق اُن ایام میں جو امنِ عام ہوتا تھا اس سے فائدہ اُٹھاتے اور اپنے کھانے پینے کا سامان خرید کر ذخیرہ کر لیتے تھے۔انہیں ایام میں آنحضرت ﷺ بھی باہر نکلتے اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں تبلیغ اسلام کرتے تھے۔لیکن قریش آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور جہاں آپ ﷺ جاتے لوگوں کو آپ کی باتیں سننے سے منع کرتے اور آپ ﷺ کو دیوانہ اور جادوگر بتا کر آپ ﷺ کی طرف کسی کو متوجہ نہ ہونے دیتے تھے۔شعبِ ابوطالب کی سہ سالہ سختیوں کا تصور کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قبیلوں کی حمیت اور خاندان و نسل کا پاس و لحاظ بھی ایک بڑی چیز ہے اور اسی نے بنوہاشم کے اُن لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہوئے تھے آنحضرت ﷺ کا ساتھ دینے اور آپ کی مدد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ایک طرف بنوہاشم کی حمیتِ خاندانی نے اُن کو آنحضرت ﷺ کی حمایت پر مجبور کیا۔دوسری طرف شعب ابوطالب کی قید و نظر بندی نے اُن کو آنحضرت ﷺ کے اخلاق کا زیادہ مطالعہ کرنے، زیادہ متاثر ہونے اور اسلام سے زیادہ واقف ہونے کا موقع دیا۔اور اس نسلی امتیاز نے ان کو (بنوہاشم کو) بجا طور پر مستحقِ تکریم بنا دیا۔تین سال کی اس ظالمانہ قید اور بنوہاشم کے مصائب نے بالآخر قریش کے بعض افراد کو متاثر کیا۔

بنوہاشم کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا بھوک کے مارے تڑپنا اور فاقہ زدہ والدین کے سامنے ان کی اولاد کا بلکنا ایسی چیزیں تھیں کہ قریشِ مکہ ان کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔زہیر بن ابی امیہ بن مغیرہ نے بنوہاشم کی مصیبت کو اس لیے سب سے پہلے محسوس کیا کہ ابوطالب اس کے ماموں

تھے۔ زہیر نے اوّل مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف کو رشتہ داری کی طرف توجہ دلا کر عہد نامہ کے توڑنے پر آمادہ کیا۔ پھر ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن الاسود کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ غرض مکہ میں کئی شخص جو بنو ہاشم سے قرابت داری رکھتے تھے۔ بنو ہاشم کو مظلوم سمجھ کر اس ظالمانہ عہد نامہ کی تنسیخ کے متعلق چرچا کرنے لگے۔ انہیں ایام میں آنحضرت ﷺ نے ابوطالب سے کہا کہ مجھ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ اُس عہد نامہ کی تمام تحریروں کو کیڑوں نے کھالیا ہے اس میں جہاں جہاں اللہ کا نام ہے وہ بدستور لکھا ہوا ہے۔ لفظ اللہ کے سوا باقی تمام حروف غائب ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر ابوطالب اپنی گھاٹی سے باہر نکلے، اور انہوں نے قریش سے کہا کہ مجھ کو محمد ﷺ نے ایسی خبر دی ہے۔ تم عہد نامہ کو دیکھو، اگر یہ خبر صحیح ہے اور عہد نامہ کی تحریر معدوم ہو چکی ہے تو مقاطعہ ختم ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ اسی وقت قریش خانہ کعبہ میں دوڑے ہوئے آئے، دیکھا تو دیمک نے تمام حروف چاٹ لیے تھے۔ جہاں جہاں لفظ اللہ لکھا ہوا تھا وہ البتہ بدستور موجود تھا۔ یہ دیکھ کر سب حیران و ششدرر رہ گئے۔ اور اُسی وقت مقاطعے کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ بنو ہاشم اور تمام مسلمان شعب ابوطالب سے تین سال کے بعد نکلے اور مکہ میں آ کر اپنے گھروں میں رہنے سہنے لگے۔ شعب ابوطالب میں مسلمانوں کو بھوک سے بیتاب ہو کر اکثر درختوں کے پتے کھانے پڑتے تھے۔ بعض بعض شخصوں کی حالت یہاں تک پہنچی کہ اگر کہیں سوکھا ہوا چمڑا مل گیا تو اُسی کو صاف اور نرم کر کے آگ پر رکھا اور بھون کر چبالیا۔ حکیم بن حزام کبھی کبھی اپنے غلام کے ہاتھ اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے کچھ کھانا چھپا کر بھجوا دیا کرتے تھے۔ اس کا حال جب ایک مرتبہ ابوجہل کو معلوم ہوا تو اُس نے غلام سے کھانا چھین لیا اور زیادہ سختی سے نگرانی شروع کر دی۔

7.3 عام الحزن (سن 10 نبوی)

جب آنحضرت ﷺ شعبِ ابی طالب سے نکلے ہیں تو نبوت کا دسواں سال شروع ہو چکا تھا۔ قیاس یہ تھا کہ اب مسلمانوں کے ساتھ قریش کی طرف سے رعایت اور نرمی کا برتاؤ ہوگا۔ مگر نہیں، مسلمانوں کی محنتیں اور آنحضرت ﷺ کے مصائب اور بھی زیادہ بڑھ گئے اور جلد ہی ایسے حالات پیش آئے کہ اس سال کا نام ہی عام الحزن یعنی غموں کا سال مسلمانوں میں مشہور ہوا۔ رجب کے مہینے میں ابوطالب جن کی عمر اسّی سال سے اوپر تھی بیمار ہو کر فوت ہوئے۔ ابوطالب کے فوت ہوتے ہی کفارِ مکہ یعنی دشمنانِ دین کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ ابوطالب ہی ایک بااثر اور بنی ہاشم کے ایسے سردار تھے جن کا سب لحاظ کرتے اور ڈرتے تھے، ان کے مرتے ہی بنو ہاشم کا رعب واثر جو مکہ میں قائم تھا، باقی نہ رہا۔ قریش نے آنحضرت ﷺ کو ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے میدان خالی پا کر آزادانہ اور بے باکانہ مظالم کا سلسلہ جاری کر دیا۔

اسی سال ابوبکر صدیقؓ نے بھی مظالم قریش سے تنگ آ کر ہجرت کا ارادہ کیا۔ اور مکہ سے نکلے۔ راستہ میں چار منزل کے فاصلہ پر برک الغماد کے پاس قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ ابن الدغنہ نے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ مجھے میری قوم نے اس قدر ستایا ہے کہ میں نے اب ارادہ کیا ہے کہ مکہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ جا کر رہوں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ آپ تو ایسے شخص ہیں نہ آپ کو خود مکہ سے نکلنا چاہیے نہ آپ کی قوم کو یہ گوارا ہونا چاہئے کہ آپ مکہ سے نکلیں۔ میں آپ کو پناہ میں لیتا ہوں۔ آپ واپس چلئے اور مکہ ہی میں اپنے رب کی عبادت کیجئے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ مکہ میں واپس آئے۔ ابن الدغنہ نے رؤساءِ قریش کو جمع کر کے بہت شرمندہ کیا اور کہا کہ تم ایسی نیک صفات والے شخص کو نکالتے ہو جس کا وجود کسی قوم کے لیے موجبِ فخر ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکان کے آنگن میں ایک چھوٹا سا چبوترہ بطور مسجد بنالیا۔ وہیں قرآن شریف پڑھا کرتے اور عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کی قرآن خوانی کی آواز کا اثر محلّہ کی عورتوں اور بچوں پر بہت ہوتا تھا۔ قریش کو یہ بھی گوارا نہ ہوا اور ابن الدغنہ نے منع کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں تمہاری پناہ سے نکلتا ہوں اور اپنے خدا تعالیٰ کی پناہ کو کافی سمجھتا ہوں مگر قرآن خوانی کو ترک نہیں کر سکتا۔

ابوطالب کی وفات کے تقریباً دو ماہ بعد رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ وہ آنحضرت ﷺ کی تمام مصائب و تکلیف میں رفیق تھیں۔ سب سے پہلے وہی آپ ﷺ پر ایمان لائی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ آپ ﷺ کی ہمت بندھائی اور مصیبتوں میں آپ ﷺ کو تسلی دی تھیں۔ ابوطالب اور خدیجہؓ دونوں ایسے رفیق و ہمدرد تھے کہ ان کی وفات نے آنحضرت ﷺ کو بہت ہی غمگین بنا دیا۔ اور ساتھ ہی قریش کی ایذا رسانیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے کہ کسی شریر نے آپ ﷺ کے سر پر بہت سی کیچڑ اٹھا کر ڈال دی۔ سر ورلیش کے تمام بال آلودہ اور جسم مبارک کے کپڑے ناپاک ہو گئے۔ آپ ﷺ اسی حالت میں اپنے گھر کے اندر تشریف لائے۔ آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ پانی لے کر اٹھیں، وہ آپ ﷺ کا سر دُھلاتی جاتی تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، بیٹی روؤ مت۔ خدا تعالیٰ تمہارے باپ کی خود حفاظت کرے گا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ خانۂ کعبہ میں گئے۔ وہاں بہت سے مشرک بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوجہل (عمرو بن ہشام) نے آپ ﷺ کو دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کہا، عبد مناف والو! دیکھو تمہارا نبی آ گیا۔ عتبہ بن ربیعہ نے کہا ہمیں کیا انکار ہے۔ کوئی نبی بن بیٹھے، کوئی فرشتہ بن جائے۔ آنحضرت ﷺ نے عتبہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تو نے کبھی بھی خدا اور رسول ﷺ کی حمایت نہ کی اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ پھر ابوجہل سے کہا کہ تیرے لیے وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ تو ہنسے گا کم اور روئے گا زیادہ۔ پھر تمام مشرکین سے کہا کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ تم جس دین کا انکار کر رہے ہو اُسی میں داخل ہو جاؤ گے۔

7.4 سفرِ طائف (سن 10/نبوی)

قریش کی ضد دم بدم ترقی کرتی گئی۔ آپ ﷺ نے شعب ابی طالب ہی کے زمانے سے قریش کے سوا باہر کے لوگوں میں جبکہ وہ حج کے لیے مکہ آتے تھے تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا جس کا کوئی معتد بہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اب مکہ والوں کو حد سے زیادہ سخت اور اسلام سے متنفر دیکھ کر آپ ﷺ نے ارادہ کیا تھا کہ طائف والوں کو دعوتِ اسلام دیں۔ طائف مکہ سے تین منزل یعنی ساٹھ میل کے فاصلہ پر مکہ ہی کی برابر بڑا شہر تھا۔ وہاں ثقیف آباد تھے جو لات کی پرستش کرتے تھے۔ وہاں لات کا مندر تھا اور سارا شہر اُسی مندر کا پجاری تھا۔ سنہ ۱۰ نبوی شوال کے مہینے میں یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے ایک مہینہ بعد آپ ﷺ زید بن حارثہ کو ہمراہ لے کر پیدل طائف میں پہنچے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے راستہ میں اوّل آپ ﷺ قبیلہ بنی بکر میں تشریف لے گئے۔ جب ان کو بھی مکہ والوں کا ساتھی اور ہم خیال پایا تو قوم قحطان کے پاس گئے، اُن کو بھی سنگ دلی میں قریش کے ہمسر پایا تو طائف میں پہنچے۔ طائف میں داخل ہو کر اوّل آپ ﷺ وہاں کے روٴسا سے ملے۔ طائف کے سرداروں میں عبد یا لیل بن عمرو بن عمیر اور اُس کے دونوں بھائی مسعود و حبیب سب سے زیادہ با اثر اور بنی ثقیف کے رئیس سمجھے جاتے تھے۔ آپ ﷺ تینوں سے ملے اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ یہ بڑے مغرور و متکبر تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر تجھ کو خدا اپنا رسول بناتا تو یوں ہی پیدل جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ دوسرے نے کہا کیا خدا کو کوئی اور آدمی نہ ملا جو تجھ کو رسول بنایا۔ لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (الزخرف:31)۔ تیسرا بولا، میں تجھ سے کلام کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اگر تو اپنے قول کے موافق خدا کا رسول ہے تو تیرے کلام کا رد کرنا خطرناک بات ہے اور اگر تو خدا پر جھوٹ بولتا ہے تو مناسب نہیں کہ ایسے شخص سے کلام کیا جائے۔

جب آپ ﷺ کو عبد یا لیل اور اس کے بھائی کی طرف سے مایوسی ہوئی تو آپ ﷺ نے اُن سے کہا کہ اچھا آپ اپنے ان خیالات کو اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں اور دوسروں تک ان باتوں کی اشاعت نہ کریں۔ وہیں سے اٹھ کر آپ ﷺ طائف کے اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے میں مصروف ہوئے لیکن عبد یا لیل اور اس کے بھائیوں نے اپنے غلاموں اور شہر کے لڑکوں، اور اوباشوں کو آنحضرت ﷺ کے پیچھے لگا دیا۔ آپ ﷺ

جہاں جاتے، بدمعاشوں، اوباشوں اور لڑکوں کا ایک انبوہ آپ ﷺ کے پیچھے گالیاں دیتا اور ڈھیلے مارتا ہوا آتا۔ آپ ﷺ کے وفادار خادم زیدؓ بن حارثہ آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ وہ آپ ﷺ کو بچاتے اور آپ ﷺ کی حفاظت کرنے میں مصروف رہتے۔ پتھروں اور ڈھیلوں کی بارش میں آنحضرت ﷺ اور زید بن حارثؓ دونوں زخمی ہو گئے۔ آپ ﷺ کو طائف میں ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔ وہاں سے چلے۔ بازار میں اوباشانِ طائف کا ہجوم گالیاں دیتا اور پتھر برساتا ہوا آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ طائف سے باہر نکل آئے مگر بدمعاشوں کے ہجوم نے آپ ﷺ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان بدمعاشوں کے ہجوم نے تین میل تک شہر سے باہر بھی تعاقب کیا۔ آپ ﷺ کی پنڈلیاں پتھروں کی بارش سے لہولہان ہو گئیں اور اس قدر خون بہا کہ جوتیوں میں خون بھر گیا۔

اسی طرح تمام جسم زخموں سے لہولہان تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ میں طائف سے تین میل تک بھاگا اور مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ کہاں سے آ رہا ہوں اور کدھر جا رہا ہوں۔ طائف سے تین میل کے فاصلے پر مکہ کے ایک رئیس عتبہ بن ربیعہ کا باغ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس باغ میں آ کر پناہ لی اور طائف کے اوباشوں کا ہجوم طائف کی طرف واپس ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اس باغ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے اور اپنی بے کسی و بے چارگی دیکھ کر جناب الٰہی سے دعا کی کہ الٰہی، بے کسوں اور ضعیفوں کا تو ہی محافظ و نگہبان ہے اور میں تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں۔

عتبہ بن ربیعہ اس وقت باغ میں موجود تھا۔ اس نے آپ ﷺ کو دور سے اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام عدّاس کے ہاتھ ایک رکابی میں انگور کے خوشے رکھ کر آپ ﷺ کے پاس بھجوائے۔ یہ غلام نینوا کا باشندہ عیسائی تھا۔ آپ ﷺ نے وہ انگور کھائے اور عداس کو اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ عداس کے قلب پر آپ ﷺ کی باتوں کا اثر ہوا اور اس نے آپ ﷺ کے ہاتھ کو جھک کر چوما۔ عتبہ نے دور سے غلام کی اس حرکت کو دیکھا۔ جب عداس واپس گیا تو عتبہ نے اس سے کہا کہ اس شخص کی باتوں میں نہ آ جانا۔ اس سے تو تیرا ہی دین بہتر ہے۔ تھوڑی دیر آپ ﷺ نے عتبہ کے باغ میں آرام کیا پھر وہاں سے اُٹھ کر چل دیئے۔ وہاں سے روانہ ہو کر آپ ﷺ مقام نخلہ میں پہنچے اور رات کو کھجوروں کے باغ میں قیام فرمایا۔ اسی جگہ بعض جنات کے سرداروں نے آپ کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے سنا اور آپ ﷺ پر ایمان لائے۔

نخلہ سے روانہ ہو کر آپ کوہِ حرا پر تشریف لائے۔ اور یہاں مقیم ہو کر آپ ﷺ نے بعض سردارانِ قریش کے نام پیغام بھیجا۔ مگر کوئی شخص آپ ﷺ کو اپنی ضمانت اور پناہ میں لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ مطعم بن عدی کے پاس جب آپ ﷺ کا پیغام پہنچا تو وہ بھی اگرچہ مشرک اور کافر تھا مگر عربی شرافت اور قومی حمیت کے جذبہ سے متاثر ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور آنحضرت ﷺ کے پاس سیدھا کوہِ حرا پر پہنچ کر اور آپ ﷺ کو اپنے ہمراہ لے کر مکہ میں آیا۔ مطعم کے بیٹے ننگی تلواریں لے کر خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اس کے بعد مطعم اور اس کے بیٹوں نے ننگی تلواروں کے سائے میں آپ ﷺ کو گھر تک پہنچا دیا۔ قریش نے مطعم سے پوچھا کہ تم کو محمد (ﷺ) سے کیا واسطہ ہے؟ مطعم نے جواب دیا کہ مجھ کو واسطہ تو کچھ نہیں لیکن میں محمد (ﷺ) کا حمایتی ہوں۔ جب تک وہ میری حمایت میں ہیں کوئی نظر بھر کر ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ مطعم کی یہ ہمت اور حمایت دیکھ کر قریش کچھ خاموش سے ہو کر رہ گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ طائف میں اُس مذکورہ بالا حالت میں تھے تو ایک فرشتہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر آپ حکم دیں تو میں پہاڑ اٹھا کر اہلِ طائف پر ڈال دوں۔ یہ سب کے سب فنا ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر یہ لوگ اسلام نہ لائے تو ان کی اولاد ضرور خادمِ اسلام بنے گی۔ اور ان کی آئندہ نسلیں سب مسلمان ہوں گی۔ میں ان کی ہلاکت کو پسند نہیں کرتا۔

7.5 واقعہ معراج (سن 10 نبوی)

ایک رات نبی کریم ﷺ حضرت ام ہانی کے مکان میں آرام فرما رہے تھے، نیم خوابی کی حالت میں یکا یک چھت شق ہوئی اور جبرائیلؑ تشریف لائے جبکہ آپ کے ہمراہ اور بھی فرشتے تھے، آپ ﷺ کو جگایا اور مسجد حرام کی طرف لے گئے ۔حطیم میں لے جا کر سینہ مبارک کو چاک کیا اور آبِ زمزم سے قلب اطہر کو دھویا اور پھر ایمان وحکمت قلب میں بھر کر سینہ مبارک ویسا ہی کر دیا اور دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ثبت کر دی اس کے بعد براق لایا گیا جو ایک بہشتی سواری تھی جس کا قدم منتہا نگاہ پر پڑتا تھا، اللہ کے رسول ﷺ اس کی پشت پر سوار ہوئے جبرائیل امینؑ نے کہا اے براق تیری پشت پر آج تک حضور ﷺ سے زیادہ کوئی محترم ومکرم بندہ سوار نہیں ہوا تب اللہ کے رسول ﷺ اس شان سے روانہ ہوئے کہ جبرائیلؑ آپ کے ہمرکاب تھے۔

شداد بن اوسؓ کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ راستہ میں ایک ایسی زمین پر گذر ہوا جس میں کھجور کے درخت بکثرت تھے، جبرائیل امینؑ نے کہا کہ یہاں آ کر نماز پڑھ لیجئے میں نے اتر کر نماز پڑھی پھر جبرائیلؑ نے بتایا کہ یہ مدینہ ہے جہاں آپ (ﷺ) ہجرت کرینگے اس کے بعد آگے بڑھے پھر جبرائیلؑ نے کہا کہ یہاں بھی اتر کر آپ (ﷺ) نماز پڑھ لیجئے میں نے اتر کر نماز پڑھی اور جبرائیل امینؑ نے بتایا کہ آپ (ﷺ) نے وادی سینا میں شجرہ موسیٰؑ کے قریب نماز پڑھی ہے۔ جہاں اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا پھر اور آگے بڑھے اور جبرائیلؑ نے پھر ایک جگہ نماز کے لیے کہا میں نے وہاں بھی نماز پڑھی اور بتایا جبرائیلؑ نے کہ یہ مدین ہے جو شعیبؑ کا مسکن تھا وہاں سے روانہ ہوئے ایک اور زمین پر جبرائیلؑ نے نماز کے لیے کہا یہ مقام ''بیت اللحم'' تھا، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی جبکہ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اس شان میں بیت المقدس پہنچے اور اتر کر براق کو ایک حلقہ سے باندھ دیا اور بعد ازاں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے جہاں انبیاء کرامؑ پہلے ہی سے آپ ﷺ کے انتظار میں صف باندھے کھڑے تھے۔ جبرائیلؑ نے اللہ کے رسول ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا، آپ ﷺ نے سب کو نماز پڑھائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے جبرائیل امینؑ اور دیگر ملائکہ کی معیت میں آسمانوں کی طرف عروج فرمایا، جب آپ ﷺ پہلے آسمان پر پہنچے، جبرائیلؑ نے دروازہ کھلوایا، آسمان کے دربان نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟ جبرائیلؑ نے کہا کہ محمد ﷺ ہیں، فرشتے نے دریافت کیا کہ کیا ان کے پاس بلانے کا پیغام گیا ہے؟ جبرائیلؑ نے ہاں میں جواب دیا۔ فرشتے نے یہ سن کر مرحبا کہہ کر دروازہ کھولدیا، آپ ﷺ داخل ہوئے اور ایک بزرگ آدمی کو دیکھا، جبرائیلؑ نے بتایا یہ آپ کے والد آدمؑ ہیں پھر دوسرے آسمان پر تشریف لے گئے اور وہی پہلے آسمان والے سوالات وجوابات یہاں بھی ہوئے۔

یہاں آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہ السلام سے ملاقات کی، اس کے بعد تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے اور پانچویں پر حضرت ہارونؑ سے اور چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو ہوئی، ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ آپ ''بیت المعمور'' سے پشت لگائے بیٹھے ہیں (بیت المعمور قبلہ ملائک ہے جو ٹھیک خانہ کعبہ کے محاذات میں ہے) اس کے بعد آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ گئے یہیں آپ ﷺ نے جبرائیلؑ کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا اور حق تعالیٰ کی عجیب وغریب تجلیات کا مشاہدہ کیا، نیز جنت وجہنم کا مشاہدہ کر کے آپ ﷺ دیدار خداوندی اور بلاواسطہ کلام ایزدی سے مشرف ہوئے۔

اللہ رب العزت نے اس مقام قرب میں حضور ﷺ کو گونا گوں الطاف وعنایات سے نوازا اور طرح طرح کی بشارات سے مسرور کیا اور خاص حکایات دیئے، سب سے اہم حکم یہ تھا کہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو پچاس نمازوں کا حکم ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ ان احکام وہدایات

کو لے کر بصد ہزار مسرت واپس ہو رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ کیا حکم ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا دن رات میں پچاس نمازوں کا حکم ہوا ہے، موسیٰ نے فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کا خوب تجربہ کر چکا ہوں۔

آپ (ﷺ) کی امت ضعیف اور کمزور ہے لہٰذا وہ اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکے گی، اس لیے آپ (ﷺ) پروردگار کے پاس واپس جائیں اور اپنی امت کے لیے تخفیف کی درخواست کریں، چنانچہ رسول ﷺ واپس گئے اور تخفیف کی درخواست کی، حق تعالیٰ نے پانچ کم کر دیں پھر واپس ہوئے، موسیٰ نے پھر وہی بات دھرائی، آپ ﷺ پھر گئے اور پھر تخفیف کی درخواست کی اور پھر جب پانچ رہ گئی موسیٰ نے پھر بھی یہی مشورہ دیا کہ جایئے اور تخفیف کی درخواست کیجئے تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے بار بار درخواست کی اب اور شرم آتی ہے یہ جواب موسیٰ کو دے کر آپ ﷺ روانہ ہو گئے، واپسی پر غیب سے آواز آئی کہ یہ پانچ ہیں مگر ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ اس طرح آسمانوں سے واپسی ہوئی اور اولاً بیت المقدس میں آ کر اترے اور وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچے، صبح کو جب قریش کو اس واقعہ کا علم ہوا تو سن کر حیران ہوئے اور ازراہِ تعجب کہنے لگے کہ ایک ہی رات میں بیت المقدس جا کر واپس آ گئے۔ جو لوگ بیت المقدس دیکھے ہوئے تھے، انہوں نے بطور امتحان بیت المقدس کی کچھ علامتیں دریافت کرنا شروع کیں، حق تعالیٰ نے بیت المقدس کو آپ ﷺ کی نظروں کے سامنے کر دیا وہ سوالات کرتے جاتے اور آپ ﷺ جواب دیتے جاتے تھے یہاں تک کہ جب کوئی بات پوچھنے سے باقی نہ رہی تو کہا کہ اچھا راستہ کا کوئی واقعہ بتاؤ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ راستہ میں مجھے فلاں جگہ ایک تجارتی قافلہ ملا جو شام سے مکہ واپس آ رہا ہے، اس کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا جو بعد میں مل گیا تین دن میں وہ قافلہ مکہ پہنچ جائے گا انشاء اللہ اور ایک خاکستری رنگ کا اونٹ سب سے آگے ہوگا جس پر دو بورے لدے ہونگے اور ٹھیک تیسرے دن یہی ہوا۔

7.6 بیعتِ عقبہ اولیٰ (سن 12/ نبوی)

سنہ ۱۲ نبوی بھی آنحضرت ﷺ کا مکہ میں اسی طرح مصائب و مشکلات میں گذرا جیسا کہ سنہ ۱۱ نبوی گذرا تھا۔ قریش کی مخالفت بدستور ترقی پذیر تھی۔ ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کو یہ پورا سال سخت امید و بیم کی حالت میں گزرا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو مدینہ کے ان چھ مسلمانوں کا بہت خیال تھا جو تبلیغ اسلام کا وعدہ کر گئے تھے۔ آپ ﷺ کو اس عرصہ میں کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی کہ مدینہ میں تبلیغِ اسلام کا کیا نتیجہ نکلا۔ آخر سنہ ۱۲ نبوی کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں آپ ﷺ مقام منیٰ کے پاس اُسی مقام عقبہ میں جا جا کر یثرب کے قافلہ کی تلاش کرنے لگے۔ اتفاقاً آپ ﷺ کی نظر اُن لوگوں پر پڑی جو پہلے سال بیعت کر گئے تھے۔ انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ کو دیکھا اور بڑے شوق سے بڑھ کر ملے۔ اب کی مرتبہ یہ کل بارہ آدمی تھے۔ ان میں کچھ تو وہی پچھلے سال کے مسلمان تھے۔ کچھ نئے آدمی تھے۔ جو اوس و خزرج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان بارہ بزرگوں کے نام یہ تھے: (1) ابوامامہ (2) عوف بن حارث (3) رافع بن مالک بن العجلان (4) قطبہ بن عامر بن حدیدہ (5) عقبہ بن عامر۔ یہ پانچ شخص تو پچھلے سال کے چھ مسلمانوں میں سے تھے۔ باقی نئے سات یہ تھے: (6) معاذ بن حارث برادر عوف بن حارث (7) ذکوان بن عبد قیس (8) خالد بن مخلد بن عامر بن زریق (9) عبادہ بن صامت (10) عباس بن عبادہ۔ یہ دس حضرات قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ (11) ابوالہیثم بن التیہان (12) عویم بن ساعدہ آخر کے دونوں بزرگ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔

ان بارہ حضرات نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت عقبہ اولیٰ گویا ان چھ سابقہ مدنی مسلمانوں کی تبلیغ کا نتیجہ تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس مسلم جماعت نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ ایک قاری یعنی مبلغ بھیجا جائے۔ آپ ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ مصعب بن عمیرؓ نے مدینہ پہنچ کر اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر قیام کیا اور اسی مکان کو تبلیغی مرکز بنا کر تبلیغ اسلام کے کام میں

ہمہ تن مصروف ہوگئے عقبہ اولیٰ میں آپ ﷺ نے یہ اقرار کرائے تھے:

(1) ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے، (2) چوری اور زناکاری کے پاس نہ بھٹکیں گے، (3) اپنی لڑکیوں کو قتل نہیں کریں گے (4) کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگائیں گے، (5) چغل خوری نہ کریں گے، (6) ہر بات میں نبی کی اطاعت کریں گے۔

مصعبؓ بن عمیر نے مدینہ میں پہنچ کر نہایت کوشش و جانفشانی اور قابلیت کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدینہ کے لوگوں کی سعادتِ ازلی کا اظہار ہوا اور قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ ادھر مصعب بن عمیر کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ ادھر مکہ میں قریش کے مظالم مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتے جاتے تھے۔ سنہ 13 نبوی کا ماہ ذی الحجہ آیا تو مدینہ سے مصعب بن عمیرؓ 73 مرد اور دو عورتوں کے مسلم قافلہ کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ کے مسلمانوں نے اس قافلہ کو اس لیے بھی بھیجا تھا کہ زیارت نبی ﷺ سے مشرف ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ والوں کی طرف سے مدینہ میں تشریف لانے کی درخواست پیش کرے۔

7.7 بیعتِ عقبہ ثانیہ (سن 13/نبوی)

آنحضرت ﷺ کو اس قافلے کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ رات کے وقت آپ ﷺ مکان سے نکلے۔ حضرت عباسؓ اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے لیکن ہمیشہ سے اُن کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہمدردی تھی۔ قریش کی عام مخالفت میں بھی اُن کے در پردہ ہمدردانہ طرزِ عمل سے آنحضرت ﷺ واقف تھے۔ وہ اتفاقاً راستہ میں مل گئے۔ آنحضرت ﷺ نے اُن کو اپنے ہمراہ لے لیا اور اپنے ارادہ سے مطلع فرما دیا تھا۔ چنانچہ دونوں رات کی تاریکی میں وادی عقبہ میں پہنچے۔ وہاں مدینہ سے آیا ہوا مؤمنوں کا قافلہ آپ ﷺ کا منتظر تھا۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مدینہ سے صرف مسلمان ہی نہیں آئے تھے بلکہ مشرکین حسبِ دستورِ قدیم حج کے لیے آئے تھے۔ ان لوگوں نے مکہ سے باہر ہی ایک جگہ قیام کیا تھا۔ مگر عقبہ کی گھاٹی آنحضرت ﷺ کی ملاقات کے لیے تجویز کر دی گئی تھی۔ اس لیے مدینہ کے مسلمان اور بعض غیر مسلم بھی جو اسلام کو پسند کرتے اور مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے اس گھاٹی میں آ کر آپ ﷺ کے منتظر تھے۔ باقی مشرکینِ مدینہ کو عقبہ کی اس ملاقات کا علم نہ تھا۔ وہ سب اصل قیام گاہ پر سو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے عقبہ میں پہنچ کر منتظر مسلمانوں سے ملاقات کی۔ مدینہ میں تشریف لے جانے کی خواہش سن کر حضرت عباسؓ نے ایک مناسب اور ضروری تقریر کی۔ انہوں نے فرمایا:

''مدینہ والو! محمد (ﷺ) اپنے خاندان میں ہے۔ اُن کا خاندان اس کی حفاظت کرتا ہے تم اُن کو اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہو۔ یہ یاد رکھو، تم کو اُن کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ ان کی حفاظت کوئی آسان کام نہیں۔ اگر تم عظیم الشان اور خوں ریز لڑائیوں کے لیے تیار ہو تو بہتر ہے ورنہ محمد ﷺ کے لے جانے کا نام نہ لو''۔

براء بن معرور الخزرجیؓ نے کہا: عباس! ہم نے تمہاری بات سن لی۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خود اپنی زبان سے کچھ فرمائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تقریر فرمائی اور قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ آپ ﷺ کی تقریر میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بیان تھا۔ آپ ﷺ نے ان ذمہ داریوں کو بھی بیان فرمایا جو مدینہ میں آپ ﷺ کے لے جانے سے مدینہ والوں پر عائد ہوتی تھیں۔ براء بن معرورؓ نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا، ہم سب باتوں کے لیے تیار ہیں۔ ابوالہیثم بن تیہانؓ نے کہا: آپ یہ تو وعدہ کریں کہ ہم کو چھوڑ کر واپس تو نہیں آ جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں، میرا جینا اور مرنا تمہارے ہی ساتھ ہوگا۔ عبداللہ بن رواحہ بولے: یارسول اللہ ﷺ ہم کو اس کے معاوضہ میں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جنت اور خدا تعالیٰ کی رضامندی۔ عبداللہ نے کہا: بس سودا ہو چکا۔ اب نہ آپ اپنے قول سے پھریں نہ ہم پھریں گے۔ اس کے بعد سب

نے بیعت کی۔اس بیعت میں براء بن معرورؓ سب پر سابق تھے۔اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ مشہور ہے۔جب بیعت ہوچکی تو اسعد بن زرارہ نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ لوگو! آگاہ رہو کہ اس قول وقرار کا یہ مطلب ہے کہ ہم ساری دنیا کے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہاں،ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو ساری دنیا کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔اس کے بعد آنحضرت صلعم نے ان لوگوں میں سے بارہ بزرگوں کو منتخب فرمایا۔اوران کو تبلیغ اسلام کے متعلق ہدایات دے کر اپنا نقیب مقرر کیا۔اوران کا کام اسلام کی تبلیغ کرنا مقرر فرمایا۔

ان بارہ سرداروں میں نو آدمی قبیلہٗ خزرج کے تھے اور تین قبیلہ اوس کے۔ان بارہ آدمیوں سے مخاطب ہوکر آپ نے فرمایا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ذمہ دار تھے۔اسی طرح میں تم کو تمہاری قوم کی تعلیم کا ذمہ دار بناتا ہوں اور میں تم سب کا ذمہ دار ہوں۔جس وقت عقبہ کی گھاٹی میں یہ بیعت ہورہی تھی اس وقت پہاڑ کی چوٹی پر سے ایک شیطان نے زور سے اہل مکہ کو آواز دی اور کہا کہ دیکھو،محمدؐ اوراس کی جماعت کے آدمی تمہارے خلاف مشورے کررہے ہیں۔آپؐ نے اور مومنوں کی اس جماعت نے اُس طرف کوئی التفات نہیں کیا۔جب تمام مراتب طے ہوچکے تو آپ نے مدینہ کی طرف تشریف لے جانے کی تاریخ کا تعین اذن الٰہی پر موقوف رکھا۔اس کے بعد ایک ایک دو دو کر کے سب آدمی خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گئے تاکہ اس جلسہ کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔آنحضرت ﷺ اور حضرت عباسؓ دونوں مکہ میں چلے آئے مگر صبح ہوتے ہی قریش کو رات کے اس اجتماع کا حال معلوم ہوا۔وہ اسی وقت مدینہ والوں کی قیام گاہ پر پہنچے اور دریافت کیا کہ رات تم لوگوں کے پاس محمد (ﷺ) آئے تھے۔مدینہ والوں میں جو لوگ غیر مسلم یعنی بت پرست تھے ان کو خود رات کے اس اجتماع کا حال معلوم نہ تھا۔انہیں میں عبداللہ بن اُبی بن سلول بھی تھا جو بعد میں منافقوں کا سردار بنا۔اُس نے قریش سے کہا: بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مدینہ والے کوئی اہم معاملہ کریں اور مجھ کو اُس کی اطلاع نہ ہو۔قریش کا شک جاتا رہا اور وہ واپس چلے گئے۔اُسی وقت اہلِ مدینہ نے کوچ کی تیاری کی،اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔قریش کو مکہ میں آکر پھر کسی دوسرے معتبر ذریعہ سے رات کی اس مجلس کا حال معلوم ہوا اور مسلح ہوکر دوبارہ آئے لیکن قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔صرف سعد بن عبادہؓ اور منذر بن عمروؓ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔منذر تو قریش کو دیکھ کر چل دیئے اوران کے ہاتھ نہ آئے۔لیکن سعد بن عبادہؓ قریش کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے۔قریش ان کو مارتے ہوئے مکہ میں لائے۔سعد بن عبادہ کا بیان ہے کہ جب قریش مجھے مکہ میں لاکر زدوکوب کررہے تھے تو میں نے دیکھا کہ سرخ وسفید رنگت کا خوبصورت شخص میری طرف آرہا ہے۔میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر کسی شخص سے اس قوم میں مجھ کو بھلائی کی توقع ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہوگا مگر جب میرے پاس آیا تو اُس نے نہایت زور سے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔اس وقت مجھ کو یقین ہوا کہ ان لوگوں میں کوئی بھی نہیں ہے جس سے مروت ورعایت کی توقع ہوسکے۔اتنے میں ایک اور شخص آیا،اس نے کہا کہ قریش کے کسی شخص سے تیری شناسائی نہیں؟ میں نے کہا کہ جبیر بن مطعم اور حارث بن اُمیہ کو جو عبدمناف کے پوتے ہیں جانتا ہوں۔اُس نے کہا کہ پھر تو انہیں دونوں کا نام لے کر کیوں نہیں پکارتا۔مجھ کو یہ تدبیر بتا کر وہی شخص ان دونوں کے پاس گیا اور کہا کہ ایک قبیلہ خزرج کا شخص پٹ رہا ہے،اور وہ تمہارا نام لے لے کر دہائی دے رہا ہے۔انہوں نے پوچھا: اس کا کیا نام ہے۔اس شخص نے بتایا کہ اس کا نام سعد بن عبادہ ہے۔وہ بولے: ہاں اس کا ہم پر احسان ہے۔ہم تجارت کے لیے اس کے یہاں جاتے اوران ہی کی حفاظت میں اس کے یہاں ٹھہرتے رہے ہیں۔چنانچہ ان دونوں نے مجھے چھڑایا اور میں چھٹتے ہی مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

7.8 ہجرتِ حبشہ (سن 5/نبوی)

کفار قریش کو جب ان تمام کوششوں میں ناکامی ہوئی اور تبلیغ توحید کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ان کو اب فکر ہوئی۔انہوں نے دیکھا کہ جس تحریک کو ہم بچوں کا کھیل سمجھ رہے تھے وہ اب نشوونما پا کر اس قدر طاقتور ہوتی جاتی ہے کہ اس کا انسداد آسان کام نہیں رہا۔انہوں نے اب متفقہ طور پر

کمر باندھی۔آنحضرت ﷺ کو خانہ کعبہ کے اندر آنے سے روک دیا۔شہر کے لڑکوں اور اوباشوں کو متعین کیا کہ جہاں کہیں آنحضرت ﷺ یا مسلمانوں میں سے کسی کو دیکھیں تالیاں بجائیں، گالیاں دیں، راستوں اور گلی کوچوں میں چلنے پھرنے سے باز رکھیں۔باہر سے آنے والے مسافروں کو آنحضرت ﷺ سے نہ ملنے دیں اور جس طرح قابو چلے اور موقع ملے ستائیں۔ضعیف مسلمانوں کو اب پورے جوش وہمت کے ساتھ تنگ کرنا اور ستانا شروع کردیا۔یہاں تک کہ شہر مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہوگئی اور مسلمانوں کی زندگی وبال بن گئی۔یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ ملکِ حبش میں (جہاں عیسائی حکومت تھی) چلے جاؤ۔چنانچہ نبوت کے پانچویں سال رجب کے مہینہ میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے حبش کے ارادہ سے مکہ چھوڑا۔یہ پندرہ آدمیوں کا قافلہ رات کے وقت چھپ کر مکہ سے نکلا۔جدہ کی بندرگاہ پر اتفاقاً جہاز تیار مل گیا اور یہ لوگ جہاز میں سوار ہوکر ملکِ حبش میں پہنچ گئے۔ان مہاجرین میں قابلِ تذکرہ حضرات یہ تھے:

حضرت عثمان بن عفانؓ۔ان کی بیوی رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ۔حضرت حذیفہ بن عتبہؓ۔حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت عامر بن ربیعہؓ، حضرت سہیل بن بیضاؓ۔

یہ لوگ عموماً قریش کے مشہور اور طاقتور قبائل سے تعلق رکھنے والے تھے جو دلیل اس امر کی ہے کہ اب قریش کے مظالم صرف غلاموں اور ضعیفوں تک ہی محدود نہ تھے بلکہ وہ ہر ایک مسلمان کو خواہ وہ کیسے ہی طاقتور قبیلہ کا آدمی کیوں نہ ہو نشانہ مظالم بنانے میں متامل نہ تھے۔نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کمزور اور بے کس لوگوں میں اتنی بھی استطاعت نہ تھی کہ سامانِ سفر ہی حاصل کرسکیں۔کفار کو جب ان مسلمانوں کے ہجرت کرنے اور حبش کی طرف روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ تعاقب میں روانہ ہوئے۔لیکن کفار کے پہنچنے سے پیشتر جہاز بندرگاہِ جدہ سے حبش کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔حبش میں پہنچ کر مسلمان اطمینان اور فراغت کے ساتھ رہنے لگے۔ان کے بعد مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے حبش کی طرف ہجرت کا سلسلہ جاری رکھا۔حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی حبش میں اپنے مسلمان بھائیوں سے جا ملے۔اب مسلمانوں کی تعداد ملکِ حبش میں تراسی (83) تک پہنچ گئی تھی۔

مسلمانوں کو ملکِ حبش میں گئے ہوئے ابھی چند مہینے ہی گذرے تھے کہ وہاں انہوں نے یہ افواہ سنی کہ قریش مکہ تمام مسلمان ہوگئے یا اُن سے مصالحت ہوگئی۔اور اب مسلمانوں کو مکہ میں کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔اس خبر کو سن کر بعض مسلمان حبش سے مکہ کو واپس ہوئے اور بعض نے اس افواہ کی تصدیق اور قابلِ قبول ذریعہ سے خبر کے پہنچنے کا انتظار ضروری سمجھا۔جو لوگ مکہ کو واپس آگئے تھے انہوں نے مکہ کے قریب پہنچ کر سنا کہ وہ افواہ غلط تھی۔لہٰذا اُن میں سے بعض تو راستے ہی سے واپس حبش کی جانب چلے گئے اور بعض کسی بااثر اور طاقتور قریشی کی ضمانت حاصل کرکے مکہ میں واپس آگئے۔یہ لوگ مکہ میں آکر اور مسلمانوں کو بھی اپنے ہمراہ لے کر پھر حبش کی طرف روانہ ہوگئے۔یہ حبش کی دوسری ہجرت کہلاتی ہے۔اب ملکِ حبش میں مسلمانوں کی تعداد ایک سو کے قریب پہنچ گئی۔

کفارِ مکہ نے جب دیکھا کہ مکہ کے آدمی مسلمان ہوکر حبش کی طرف چلے جارہے ہیں اور وہاں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں تو ان کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس طرح تو ممکن ہے کہ ہماری بڑی طاقت بتدریج اسلام میں تبدیل ہوکر باہر کسی مرکز میں جمع ہوجائے اور پھر ہم پر یہ کوئی آفت باہر سے نازل ہو۔لہٰذا انہوں نے مکہ میں آنحضرت ﷺ اور ان کے ساتھیوں پر مظالم کو اور زیادہ کردیا اور عمرو بن العاص وعبداللہ بن ربیعہ دو معزز شخصوں کو سفیر بنا کر نجاشی شاہ حبش کے دربار میں بھیجا۔قریشِ مکہ اور نجاشی شاہِ حبش کے درمیان پہلے سے ایک تجارتی معاہدہ تھا اور اُسی کے موافق قریش مکہ کی ملکِ حبش کے ساتھ تجارت قائم تھی۔ان دونوں سفیروں کو شاہِ حبش کے لیے نہایت گراں بہا تحفے اور ہدایا سپرد کیے گئے۔نہ صرف شاہِ حبش بلکہ اُس کے

درباریوں کے لیے بھی قیمتی تحفے دیئے گئے۔قریش کے اس وفد نے دربارِحبش میں حاضر ہوکر یہ ہدایا پیش کئے۔شاہِ حبش کے درباریوں کواپنی طرف مائل ومتوجہ کیا۔اور پھر یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہمارے کچھ غلام باغی ہوکر آپ کے ملک میں آگئے اوراپنا آبائی دین چھوڑ کرایک نئے دین کے تابع ہو گئے ہیں جوسب سے نرالا ہے۔لہٰذا اُن غلاموں کو ہمارے حوالے کیا جائے۔بادشاہ نے اس درخواست کوسن کر کہا کہ میں پہلے تحقیق کرلوں پھر تمہاری درخواست پر غور کیا جائے گا۔درباریوں نے بھی قریش کے ان سفیروں کی حمایت وتائید کی۔مگر نجاشی نے مہاجر مسلمانوں کواپنے دربار میں بلوایا اور کہا کہ وہ کون سا مذہب ہے جوتم نے اختیار کیا ہے؟ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفرؓ بن ابوطالب نے سب سے آگے بڑھ کر نجاشی کی خدمت میں اس طرح اپنی تقریر شروع کی۔

''اے بادشاہ! ہم لوگ جاہل تھے۔بت پرست تھے،مردہ خور تھے، بدکار تھے،قطع رحمی اور پڑوسیوں سے بدمعاملگی کرتے تھے۔ہم میں جوطاقتور ہوتا تھا وہ کمزور کا حق دبالیتا تھا۔یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے حسب نسب اورصدق وامانت سے ہم سب واقف تھے۔اُس نے ہم کوموحد بنا کر بت پرستی سے روکا۔راست گفتاری،امانت اورصلہ رحمی کا حکم دیا۔ہمسایوں کے ساتھ نیک برتاؤ کی تعلیم دی۔ بدکاری،دروغ گوئی اوریتیموں کا مال کھانے سے منع کیا۔قتل وغارت سے باز رکھا اورعباداتِ الٰہی کا حکم دیا۔ہم اُس رسول پر ایمان لائے اوراس کی فرماں برداری کی۔اس لیے ہماری قوم ہم سے ناراض ہوگئی۔ہم کوانواع واقسام کی اذیتیں پہنچائیں۔یہاں تک کہ ہم مجبور ہوکراپنے وطن سے نکل آئے اورآپ کے ملک میں پناہ گزیں ہوئے۔ہم کویقین ہے کہ آپ کے ملک میں ہم کوستایا نہ جائے گا''۔

نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ تمہارے رسول (ﷺ) پر خدا کا جوکلام نازل ہوا ہے اس میں سے کچھ سناؤ۔چنانچہ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی۔قرآن کریم کی آیات سن کر نجاشی اورتمام درباریوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔جب حضرت جعفرؓ سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرما چکے تو نجاشی نے کہا اس کلام میں وہی رنگ ہے جوحضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت میں ہے۔یہ دونوں ایک سے ہی کلام معلوم ہوتے ہیں۔قریش کے ایلچیوں نے کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی مخالف ہیں۔اس بات کے کہنے سے اُن کا یہ مدعا تھا کہ نجاشی شاہِ حبش جوعیسائی ہے مسلمانوں سے ناراض ہوجائے گا۔حضرت جعفر بن ابوطالبؓ نے فوراً جواب دیا کہ ہرگز نہیں بلکہ هُوَ عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ وَكَلِمَةٌ اَلْقَاهَا اِلىٰ مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ۔نجاشی نے کہا تمہارا یہ عقیدہ بالکل درست ہے۔انجیل کا بھی یہی مفہوم ہے۔نجاشی نے قریش کے ایلچیوں کو ناکام واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہ کروں گا۔ساتھ ہی نجاشی نے قریش کے تمام تحفے اور ہدایا واپس کر دیئے جس سے اُن کی اوربھی تذلیل ہوئی۔یہ واقعہ نبوت کے چھٹے سال کا ہے۔قریش کو جب نجاشی کے دربار میں بھی ناکامی ہوئی تو اُن کی دشمنی مسلمانوں کے ساتھ اوربھی زیادہ بڑھ گئی۔

7.8.1 حضرت امیر حمزہؓ کا اسلام لانا (سن 6/نبوی):

قریش مکہ عداوتِ نبوی میں دیوانے ہورہے تھے۔ایک روز آنحضرت ﷺ کوہِ صفا کے دامن میں بیٹھے تھے کہ ابوجہل اُس طرف کو آنکلا۔اُس نے آپ ﷺ کو دیکھ کر اول تو بہت سخت وسست اورناپسندیدہ الفاظ کہے۔آپ ﷺ نے جب اُس کی بیہودہ سرائی کا کوئی جواب نہ دیا تواس نے ایک پتھر اٹھا کر مارا جس سے آپ ﷺ زخمی ہوئے اورخون بہنے لگا۔آپ ﷺ خاموش اپنے گھر چلے آئے۔ابوجہل صحنِ کعبہ میں جہاں لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے آبیٹھا۔حضرت امیر حمزہ بن عبدالمطلبؓ آنحضرت ﷺ کے چچا تھے۔ان کو آنحضرت ﷺ سے بہت محبت تھی مگر وہ ابھی تک شرک پر قائم اورمشرکوں کے شریکِ حال تھے۔اُن کی عادت تھی کہ تیر کمان لے کر صبح جنگل کی طرف نکل جاتے۔دن بھر شکار مارتے اورشکار

کی تلاش میں مصروف رہتے۔شام کو واپس آ کر اوّل خانۂ کعبہ کا طواف کرتے پھر اپنے گھر جاتے۔وہ حسبِ معمول شکار سے واپس آئے تو اوّل راستے میں ابوجہل کی لونڈی ملی۔اُس نے ابوجہل کا آنحضرت ﷺ کو گالیاں دینا اور پتھر مارنا اور آپ ﷺ کا صبر وشکر کے ساتھ خاموش رہنا سب بیان کردیا۔

حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ کے چچا ہونے کے علاوہ رضائی بھائی بھی تھے۔خون اور دودھ کے جوش نے اُن کو از خود رفتہ کردیا۔وہ اوّل خانہ کعبہ میں گئے۔وہاں طواف سے فارغ ہوکر سیدھے اُس مجمع کی طرف متوجہ ہوئے جہاں ابوجہل بیٹھا ہوا باتیں کررہا تھا۔حضرت حمزہؓ بہت بڑے پہلوان، جنگ جو اور عرب کے مشہور بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔انہوں نے جاتے ہی ابوجہل کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ اُس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔پھر کہا کہ میں بھی محمد (ﷺ) کے دین پر ہوں اور وہی کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔اگر تجھ میں کچھ ہمت ہے تو اب میرے سامنے بول۔ابوجہل کے ساتھیوں کو غصہ آیا اور وہ اُس کی حمایت میں اُٹھے۔مگر ابوجہل حضرت حمزہؓ کی بہادری سے اس قدر متاثر ومرعوب تھا کہ اُس نے خود ہی اپنے حمایتوں کو بھی یہ کہہ کر روک دیا کہ واقعی مجھ ہی سے زیادتی ہوگئی تھی۔اگر حمزہؓ مجھ سے اپنے بھتیجے کا انتقام نہ لیتے تو بے حمیت شمار ہوتے۔غالبًا ابوجہل کو حضرت امیر حمزہؓ کا کلام سن کر یہ اندیشہ بھی پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں یہ اس طیش وغضب کی وجہ سے ضد میں آکر مسلمان ہی نہ ہوجائیں۔اور اسی لیے اس نے ایسی بات حضرت حمزہؓ کو سنانے کے لیے کہی کہ بات یہیں ختم ہوکر رہ جائے اور حمزہؓ اسلام کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔

حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ''بھتیجے! تم یہ سن کر خوش ہوگے کہ میں نے ابوجہل سے تمہارا بدلہ لیا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''چچا میں ایسی باتوں سے خوش نہیں ہوا کرتا۔ہاں اگر آپ مسلمان ہوجائیں تو مجھ کو بڑی خوشی حاصل ہوگی''۔یہ سن کر حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُسی وقت اسلام قبول کرلیا۔حضرت امیر حمزہؓ کے مسلمان ہونے سے مسلمانوں کی آفت رسیدہ جمعیت کو بڑی قوت اور امداد حاصل ہوئی۔یہ نبوت کے چھٹے سال کا واقعہ ہے۔اس وقت آنحضرت ﷺ دارِ ارقم میں تھے۔قریشِ مکہ آنحضرت ﷺ کی شان میں بہت ہی گستاخ اور بے باک ہوگئے تھے۔اب حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے نے ان کو کسی قدر محتاط اور مؤدب بنادیا۔اور لوگ آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرنے میں کچھ تامل کرنے لگے۔

7.8.2 حضرت عمر فاروقؓ کا اسلام لانا (سن 6/نبوی):

حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر قریش کے فکر وتردد اور بغض وعداوت نے اور بھی ترقی کی اور آپس میں مشورے ہونے لگے۔حضرت عمر فاروقؓ حضرت حمزہؓ کی طرح مشہور پہلوان اور عرب کے نامور بہادروں میں سے تھے۔مسلمانوں کو ایذا پہنچانے اور آنحضرت ﷺ کے خلاف کوشش کرنے میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔وہ مسلمانوں کو پکڑ کر لاتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو دم لیتے اور پھر اُٹھ کر مارتے۔غرض کہ انہوں نے مسلمانوں کو دینِ اسلام سے مرتد بنانے کی بے حد کوشش کی اور ناکام رہے۔آخر ایک روز انہوں نے فیصلہ کیا اور کفار کی مجلس میں وعدہ کیا کہ میں تنہا قریش کے اوپر وارد ہونے والے اس فتنہ کو مٹائے دیتا ہوں۔یعنی اس فتنہ کے بانی محمد (ﷺ) کا کام تمام کیے دیتا ہوں۔

ابوجہل نے سن کر کہا کہ اگر تم نے یہ کام پورا کردیا تو سو (100) اونٹ اور ہزار اوقیہ چاندی نذر کروں گا۔چنانچہ حضرت عمرؓ مسلح ہوکر شمشیر بدست نکلے اور آنحضرت ﷺ کی تلاش وجستجو کرنے لگے۔راستہ میں نُعیم بن عبداللہؓ نے پوچھا کہ عمر اس طرح کہاں جاتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جاتا ہوں۔کیوں کہ میرا ارادہ ہے کہ آج قریش کی مصیبت اور اُن کی بیسیوں تدبیروں کو سہل کردوں۔حضرت سعد نے کہا کہ تم بنی ہاشم کے انتقام سے نہیں ڈرتے؟ اور یہ نہیں جانتے کہ محمد (ﷺ) کا قتل کوئی آسان کام نہیں ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب تک میرے ہاتھ میں

تلوار ہے مجھ کو کسی کا بھی کچھ خوف نہیں ہے۔ پھر نُعیمؓ سے کہا کہ تم بھی اس کے حمایتی ہو، لاؤ پہلے تمہارا ہی کام تمام کر دوں۔ حضرت نُعیمؓ نے کہا کہ تم مجھ کو اور محمد ﷺ کو تو بعد میں قتل کرنا پہلے اپنے گھر کی خبر لو کہ تمہاری بہن مسلمان ہو چکی ہے اور اسلام تمہارے گھر میں داخل ہو چکا ہے۔

حضرت عمرؓ یہ نشتر زن جواب سن کر اُسی وقت اپنی بہن کے گھر کی طرف چل دیئے۔ وہ آنحضرت ﷺ کے قتل کی نیت سے چلے تھے۔ راستے میں اپنی بہن کے گھر کی طرف اُن کا رخ پھرنا گویا اسلام کی طرف رخ پھرنا تھا۔ بہن کے گھر پہنچتے، وہاں حضرت خباب بن الارتؓ، حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ اور اُن کے شوہر حضرت سعیدؓ بن زیدؓ کو قرآن شریف کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان کے آنے کی آہٹ سن کر حضرت خبابؓ تو وہیں گھر میں کسی جگہ چھپ گئے اور قرآن کریم جن اوراق پر لکھا ہوا تھا اُن کو بھی فوراً چھپا دیا۔ انہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔ پھر فوراً اپنے بہنوئی سعید بن زیدؓ کو پکڑ کر گرا دیا اور مارنا شروع کر دیا کہ تم کیوں مسلمان ہوئے؟ بہن اپنے شوہر کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھی اور بھائی سے لپٹ گئی، اس کشتم کشتا میں ان کی بہن فاطمہؓ کے ایسی چوٹ لگی کہ اُن کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے بہن اور بہنوئی دونوں کو مارا۔ بہن نے آخر دلیری سے کہا کہ: قَدْ اَسْلَمْنَا وَتَابَعْنَا محمداً اِفْعَلْ مَابَدَالَکَ (ہاں عمرؓ! ہم مسلمان ہو چکے اور محمد (ﷺ) کے فرماں بردار بن چکے ہیں۔ اب جو کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے کر لے) بہن کا یہ دلیرانہ جواب سنا اور نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اُن کو خون میں تر بتر پایا۔ اس نظارہ کا اُن کے قلب پر کسی قدر اثر ہوا اور طیش وغضب کے طوفان میں قدرے دھیما پن ظاہر ہونے لگا۔

حضرت عمرؓ نے بہن سے کہا کہ اچھا تم مجھے وہ کلام دکھلاؤ یا سناؤ جو تم ابھی پڑھ رہے تھے اور جس کے پڑھنے کی آواز میں نے گھر میں داخل ہوتے سنی تھی۔ حضرت عمرؓ کا یہ کلام چونکہ کسی قدر سنجیدہ لہجے میں تھا۔ اس لیے ان کی بہن کو اور بھی جرأت ہوئی اور انہوں نے کہا کہ پہلے تم غسل کر و تو ہم تم کو اپنا صحیفہ پڑھنے کے لیے دے سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اُسی وقت غسل کیا۔ غسل سے فارغ ہو کر قرآن مجید کی آیات جن اوراق پر لکھی ہوئی تھیں لے کر پڑھنے لگے۔ ابھی چند ہی آیات پڑھی تھیں کہ بے اختیار بول اُٹھے:

’’کیا شیریں کلام ہے۔ اس کا اثر میرے قلب پر ہوتا جاتا ہے‘‘۔

یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ جو اندر چھپے ہوئے تھے، فوراً باہر نکل آئے اور کہا: ’’اے عمرؓ مبارک ہو۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی۔ میں نے کل آنحضرت ﷺ کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا ہے کہ الٰہی عمرؓ بن الخطاب یا ابوجہل دونوں میں سے ایک کو ضرور مسلمان کر دے۔ پھر خبابؓ نے سورۂ طٰہٰ کا پہلا رکوع پڑھنا شروع کیا حضرت عمرؓ سورہ طٰہٰ کی آیات سن رہے تھے اور رو رہے تھے۔ عمرؓ نے خبابؓ سے کہا کہ اسی وقت مجھے آنحضرت ﷺ کے پاس لے چلو۔ چنانچہ وہ اُسی وقت حضرت عمرؓ کو دارِارقم کی طرف لے کر چلے۔ اُس وقت بھی ننگی تلوار حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر اب یہ تلوار حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں اُس ارادے سے نہ تھی جو بہن کے گھر تک اُن کے دل میں تھا۔

دارِارقم کے دروازے پر پہنچ کر حضرت عمرؓ نے دستک دی۔ صحابۂ کرامؓ جو اندر تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ دیکھ کر دروازہ کھولنے میں تامل کیا۔ اور آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ عمرؓ ننگی تلوار لے کر دروازہ پر کھڑا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دروازہ کھول دو۔ حضرت حمزہؓ بھی موجود تھے، انہوں نے کہا آنے دو۔ اگر ارادہ نیک ہے تو خیر، ورنہ اُسی کی تلوار سے اُس کا سر اُڑا دیا جائے گا۔ چنانچہ دروازہ کھولا گیا۔ حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے۔ آنحضرت ﷺ اُن کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور فرمایا کہ اے عمرؓ کیا تو باز نہ آئے گا۔ حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنتے ہی جوشِ مسرت میں بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے جو اس وقت دارِارقم میں موجود تھے اس زور سے اللہ اکبر کہا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج گئیں۔ حضرت

حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوگئی۔حضرت عمرؓ مسلمان ہونے کے بعد سیدھے ابوجہل کے گھر پہنچے۔دروازہ پر دستک دی۔وہ باہر آیا اور بہ خندہ پیشانی اھلاً وسھلاً ومرحباً کہا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں۔محمد (ﷺ) کو رسول اللہ مانتا ہوں۔یہ سنتے ہی ابوجہل جھلا کر اندر چلا گیا اور یہ بھی واپس چلے آئے۔مدعا ان کا یہ تھا اس سب سے بڑے دشمنِ اسلام کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر دے کر جلاؤں۔

حضرت عمرؓ نے مسلمان ہوتے ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم کو اب پوشیدہ طور پر گھروں میں نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ علانیہ خانۂ کعبہ میں نمازیں پڑھنی چاہئے۔چنانچہ قریش میں سے اول اول جو کوئی مانع ہوا، حضرت عمرؓ نے اُس کا مقابلہ کیا۔پھر بلا روک ٹوک مسلمان خانۂ کعبہ میں نماز پڑھنے لگے اور اسلام مکہ میں علانیہ اور آشکارا طور پر ظاہر ہوگیا۔یہ نبوت کے چھٹے سال کے آخری مہینے کا واقعہ ہے۔حضرت عمرؓ کی عمر اس وقت 33/سال کی تھی۔حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کے وقت مکہ میں مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی۔ملک حبش میں جو مسلمان تھے، وہ اس تعداد کے علاوہ تھے۔

7.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شعب ابی طالب (شعب بنی ہاشم) کا مقاطعہ مسلمانوں کی سخت ترین آزمائش تھی۔
- چونکہ 10/نبوی میں حضور ﷺ کے دو بڑے سہارے چچا اور اہلیہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے، اس لیے اسے عام الحزن کہا گیا۔
- طائف کے سفر میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔
- شب معراج میں نمازوں کی فرضیت ہوئی۔
- شب معراج میں انبیاء کرام سے ملاقات سے ان خاص حالات کی طرف اشارہ تھا جو بعد میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ پیش آئے۔
- شب معراج کے واقعہ کو کفار قریش کی ناقص عقلیں بعید سمجھ رہی تھیں مگر خدا تعالیٰ کی لامحدود قدرت اور مشیت کے سامنے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔
- حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ مسلمان ہوجانے پر نبی ﷺ کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔
- حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد مسلمان بلا روک ٹوک خانۂ کعبہ میں نماز پڑھنے لگے تھے اور اسلام مکہ میں علانیہ اور آشکارا طور پر ظاہر ہوگیا۔

7.10 نمونۂ امتحانی سوالات

7.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. شعب ابی طالب کا مقاطعہ رہا تھا؟

a. 2/سال　b. 3/سال　c. 4/سال　d. 5/سال

2. نبوت کے کون سے سال کو عام الحزن کہا جاتا ہے؟

a. پانچویں سال　b. ساتویں سال　c. دسویں سال　d. بارہویں سال

3. عام الحزن میں آپ ﷺ کی جن دو قریبی شخصیتوں کا انتقال ہوا؟

a. عبدالمطلب اور ابو طالب   b. عبدالمطلب اور خدیجہ   c. ابو طالب اور خدیجہ   d. خدیجہ اور حمزہ

4. حضرت خدیجہؓ کی وفات کے کتنے ماہ بعد آپ ﷺ نے طائف کا سفر کیا تھا؟

a. ایک ماہ بعد   b. دو ماہ بعد   c. تین ماہ بعد   d. چار ماہ بعد

5. طائف سے واپسی پر آپ ﷺ جس باغ میں رُکے تھے وہ کس کا تھا؟

a. عبدیالیل   b. عبدیالیل کے بھائی   c. عتبہ بن ربیعہ   d. عداس

7.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. نبوت کے دسویں سال کو ’’عام الحزن‘‘ کیوں کہتے ہیں؟ بیان کیجیے۔
2. شعب ابی طالب کا واقعہ کب اور کیوں پیش آیا؟ مختصراً لکھیے۔
3. سفر طائف میں آپ ﷺ کے ساتھ کیا کیا پیش آیا؟ بیان کیجیے۔
4. سفر معراج میں موسیٰ علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ اس واقعہ پر روشنی ڈالیے۔
5. ’’بیت المعمور‘‘ پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

7.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. واقعہ معراج تفصیل سے لکھیے؟
2. مکی دور میں سماجی مقاطعہ کا سبب لکھ کر اس کی مدت اور واقعہ کی تفصیل لکھیے۔
3. ہجرت حبشہ کی روداد تفصیل سے لکھیے۔

7.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. سیرۃ النبی (جلد اول) : علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2. تاریخ اسلام (جلد اول) : شاہ اکبر خاں صاحب نجیب آبادی
3. سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم) : مولانا محمد ادریس کاندھلوی
4. الرحیق المختوم : مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

-:oOo:-

اکائی 8 : ہجرت کے بعد نبی ﷺ کے ابتدائی اقدامات

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقصد
8.2 ہجرت
8.3 قبا میں قیام
8.4 مسجد نبوی کی تعمیر
8.5 رشتہ مواخات کا قیام
8.6 دینی درسگاہ کا قیام
8.7 اذان کی ابتداء
8.8 پہلی دستاویز
8.9 منافق کی سرداری کا خاتمہ
8.10 اکتسابی نتائج
8.11 نمونہ امتحانی سوالات
8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید

اس اکائی میں آپ ﷺ کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جانے کے بعد کے ابتدائی اقدامات کا تذکرہ ہے کہ وہاں جا کر اللہ کے رسول ﷺ نے پہلے سال میں کون کون سے اقدامات کیے جن کے ذریعہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو استحکام نصیب ہوا۔

8.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے سے آپ جان سکیں گے کہ سفر ہجرت کن حالات میں پیش آیا۔ نیز سفر ہجرت کے مفصل حالات، اور پھر ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ کے ابتدائی اقدامات سے متعلق واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ مسلمانوں کے رشتہ اخوت سے بھی آگاہی حاصل ہوگی۔

8.2 سفرہجرت

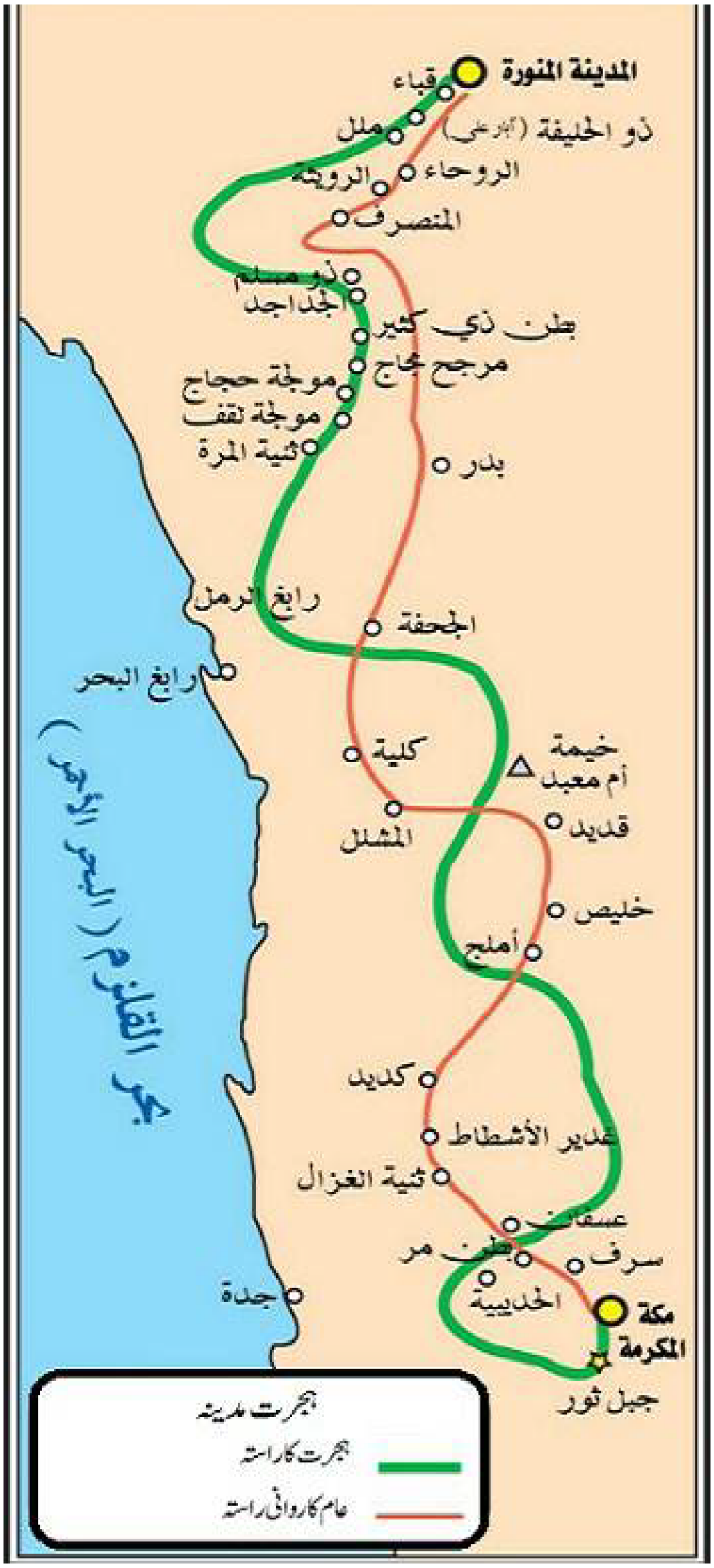

نبوت کے تیرھویں سال میں پیغمبر اسلام ﷺ اوران کے صحابہ کی طرف سے مکہ سے یثرب (مدینہ) منتقل ہوجانے کے عمل کو ہجرت کہتے ہیں۔ان دنوں مکہ کا حال یہ تھا کہ ہرطرف دعوت حق کے جواب میں تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔سرداران قریش دارالندوہ میں سر جوڑ کرغور وفکر میں محو تھے کہ کیسے مسلمان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے روکا جائے،اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یثرب قریش کا محفوظ تجارتی شاہراہ تھی جس راستے سے وہ بلا خوف وخطر شام تجارت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔اس لحاظ سے مدینہ میں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنا اور اہل مدینہ کے مقامی ومضافاتی قبائل کو متحد ہونے کا موقع دینا، اسلامی تحریک کو نیا مرکز فراہم کرنا گویا اپنے لئے مقتل گاہ تیار کرنا تھا چنانچہ سرداران قریش نے دارالندوہ میں متعدد رائیں پیش کی گئیں بالآخر ابوجہل کی تجویز پر اتفاق طے پایا، ابوجہل نے کہا:"میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے سے ایک مضبوط، صاحب نسب اور بانکا جوان منتخب کرلیں، پھر ہر ایک کو تیز تلوار دیں، اس کے بعد سب کے سب اس شخص کا رخ کریں اور اس طرح یکبارگی تلوار مار کر قتل کردیں جیسے ایک ہی آدمی نے تلوار ماری ہو۔یوں ہمیں اس شخص سے راحت مل جائے گے اور اس طرح قتل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شخص کا خون سارے قبائل میں بکھر جائے گا اور بنوعبد مناف سارے قبیلوں سے جنگ نہ کرسکیں گے۔لہٰذا دیت لینے پر راضی ہوجائیں گے اور ہم دیت ادا کردیں گے۔" (الرحیق المختوم)

اکثر صحابہ آپ کے حکم کے مطابق ہجرت کر چکے تھے لیکن خود اپنے لیے اللہ کے رسول ﷺ حکم خدا کے منتظر تھے جب اللہ رب العزت کی طرف

سے حکم ہو گیا تب اللہ کے رسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بیتابی سے کہا کیا مجھے بھی ہم راہی کا شرف حاصل ہوگا؟ ارشاد ہوا ہاں! حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کر رکھی تھیں، عرض کیا کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمالیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیمۃً لوں گا" حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مجبوراً قبول کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دارالندوہ میں جس تجویز پر سرداران قریش متفق ہوئے تھے اس کی خبر ہو چکی تھی۔ آپ کے پاس اہل مکہ کی امانتیں تھیں جس کو آپ نے حضرت علیؓ کے سپرد کیا آپ نے حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ "مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں واپس کر دینا" کفار مکہ نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ رات میں اللہ کے رسول ﷺ کعبہ پر حسرت کی نگاہ ڈال کر باہر آئے یہ فرماتے ہوئے کہ "مکہ تو مجھے تمام شہروں میں سب سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے رہنے والے لوگوں نے مجھے یہاں رہنے نہ دیا" قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدّاً وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدّاً فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لاَ يُبْصِرُونَ (سورہ یٰسین: ۹)

ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کر دی جس سے ہم نے ان کو گھیر دیا سو وہ نہیں دیکھ سکتے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پہلے بات طے ہو چکی تھی۔ دونوں حضرات پہلے جبل ثور کے غار میں ٹھہرے اور تین راتیں اس جگہ گزاریں۔ اور آپ کی بیٹی حضرت اسماء نے سامان سفر تیار کیا آپ سامان باندھنے کا بندھن بھول گئیں انہوں نے اپنا کمر بند کھولا جس کے دو ٹکڑے کئے ایک حصہ سے سامان باندھا اور دوسرا کمر میں باندھ لیا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب ذات النطاقین پڑ گیا۔

چوتھے دن اللہ کے رسول ﷺ غار سے نکلے اور عبداللہ بن اریقط کو راستہ کی رہنمائی کے لیے اجرت طے کر کے ساتھ لیا اور ایک رات ایک دن برابر چلتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب جب دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے چاہا کہ کہیں سایے میں آرام فرمالیں۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا۔ سواری سے اُتر کر زمین صاف کی اور اپنی چادر بچھا دی اللہ کے رسول کے آرام فرمانے کے لیے اور خود تلاش میں نکل گئے کہ کچھ کھانے کو مل جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک چرواہا بکریاں چرا رہا ہے اس سے بکری کا دودھ پیا اور آکر اللہ کے رسول ﷺ کو پیش کر دیا چنانچہ آپ نے نوش فرمایا اور پھر یہاں سے روانہ ہوئے۔ ادھر قریش مکہ نے یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیا جائے گا سراقہ بن جعشم نے سنا تو انعام کے لالچ میں نکلا اور آپ کا تعاقب کرتے ہوئے آپ کے قریب پہنچ گیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا سراقہ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا تیر وہ نکلا جو سراقہ کو ناپسند تھا پھر بھی دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا تو گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ پھر سے سراقہ نے تیر نکالا تیر وہی نکلا جو ناپسند تھا اس کے بعد سراقہ نے امان چاہی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کو امان کا پروانہ دے دیا۔ آٹھ روز کے سفر کے بعد اللہ کے رسول 8/ربیع الاول 14 نبوی کو دوپہر کے وقت قبا پہنچے۔

8.3 قبا میں قیام

قبا مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے اور یہ مدینہ کا ہی ایک محلّہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے لوگ بکثرت آباد تھے اور یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مکہ سے آپ ﷺ کی روانگی کی خبر مدینہ پہلے ہی آ گئی تھی اس لیے انصار مدینہ روزانہ صبح سے دوپہر تک بستی سے باہر آکر آپ ﷺ کا انتظار کیا کرتے تھے جب دھوپ تیز اور ناقابل برداشت ہو جاتی تو واپس اپنے گھروں کو لوٹ جایا کرتے تھے جس روز اللہ کے رسول ﷺ کی یہاں آمد ہوتی ہے اس دن بھی لوگ انتظار کر کے واپس جا چکے تھے۔

ایک یہودی روزانہ مسلمانوں کے اس جم غفیر کو بستی سے باہر آکر انتظار کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آپ ﷺ مکہ سے یہاں آنے والے ہیں جن کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں وہ اتفاق سے اس وقت اپنی چھت پر تھا اور جب دور سے اللہ کے رسول ﷺ کے اس مختصر قافلہ کو آتے ہوئے دیکھا تو اس نے زور سے آواز دی اے گروہ عرب تمہارا مطلوب آ پہنچا۔ یہ آواز سنتے ہی لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے اور قبا میں خوشی و مسرت کا ایک شور ہو گیا۔ صحابہؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور یہ فخر اسی قبیلہ بنی عمرو بن عوفؓ کے مقدر میں تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں کی مہمانی قبول فرمائی۔ انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوش عقیدت سے سلام عرض کرتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے یہاں چودہ دن قیام فرمایا، اسی چودہ روز کے قیام میں اللہ کے رسول نے یہاں صحابہ کرام کے ساتھ اللہ کے گھر (مسجد قبا) کی تعمیر کرائی حضرت کلثوم بن ہدمؓ کی ایک افتادہ زمین پر جس پر کھجوریں سکھائی جایا کرتی تھیں۔ اس مسجد کی شان میں قرآن کریم گویا ہے:

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُواْ وَاللّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ۔ (التوبہ:108)

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

چودہ دن کے بعد اللہ کے رسول ﷺ بنی عمرو بن عوف اور قبا کے دوسرے لوگوں سے رخصت ہو کر شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں ہی نماز کا وقت ہو گیا، یہ جمعہ کا دن تھا اور اس وقت آپ ﷺ بنی سالم کے محلّہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے یہاں اپنے صحابہ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کی یہ مدینہ میں اللہ کے رسول کا پہلا جمعہ تھا۔

قبا سے چلتے وقت آپ ﷺ کے دونوں طرف جاں نثاروں کی صفیں تھیں اور مدینہ کا ہر خاندان یہ چاہتا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ اس کے گھر مقیم ہوں چنانچہ ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے اللہ کے رسول ﷺ دعائے خیر دیتے اور آگے بڑھ جاتے روایات میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے آپ ﷺ کی سواری کی نکیل پکڑ کر اس کو بیٹھانے کی کوشش کی تب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو جہاں اسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یہ وہاں خود ہی رک جائے گی۔ چنانچہ یہ شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مقدر میں تھا کہ آپ ﷺ کی اونٹنی ان کے مکان کے پاس ٹھہری اور اس طرح اللہ کے رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مہمان بنے ان صحابی کا مکان دو منزلہ تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہؓ کی ملاقات کی سہولت کی غرض سے نیچے والے حصے کو پسند فرمایا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کو اللہ کے رسول ﷺ سے کس درجہ محبت تھی اس کا اندازہ اس ایک مختصر سے واقعہ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک رات برتن میں سے پانی چھت پر گر گیا اندیشہ ہوا کہ پانی نیچے نہ چلا جائے اور اللہ کے رسول ﷺ کو پریشانی ہو، گھر میں جو اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا اُسے پانی پر ڈال دیا اور ساری رات سب گھر والوں نے سخت سردی میں ایسے ہی گزار دی۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ سے عشق تھا یہی وجہ تھی کہ جب تک آپ ﷺ ان صحابی کے گھر رہے دونوں وقت آپ ہی کے یہاں سے کھانا آتا تھا۔ سات مہینے نبی ﷺ نے ان کے یہاں قیام فرمایا۔

8.4 مسجد نبوی کی تعمیر

جب اللہ کے رسول ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو یہاں قیام کے بعد سب سے پہلا کام خانہ خدا کی تعمیر تھی۔ ابھی تک نمازوں کا مسئلہ یہ تھا کہ جہاں جسے موقع ملا وہیں ادا کر لی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے قریب ہی ایک افتادہ زمین پڑی ہوئی تھی جس پر کھجور کے کچھ درخت

تھے اللہ کے رسول ﷺ نے جب بنی نجار کے لوگوں کو بلا کر ان سے یہ زمین بقیمت لینا چاہی تو اولاً انہوں نے کہا کہ ہم قیمت خدا سے ہی لیں گے آپ ﷺ ایسے ہی لے لیں پھر آپ ﷺ نے ان دونوں یتیم بچوں کو بلوایا جو اس زمین کے اصل مالک تھے۔ابتداء میں تو انہوں نے بھی اپنی یہ کائنات نذر کرنا چاہی لیکن آپ ﷺ نے گوارا نہ کیا اور حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اس زمین کی قیمت ان بچوں کو ادا کی۔گویا مسجد نبوی ﷺ جس جگہ تعمیر ہوئی وہ زمین حضرت ابوایوبؓ نے خرید کر دی اور اس طرح انہوں نے اپنے لیے جنت دنیا میں ہی خرید لی تھی اس فرمان رسول ﷺ کے مطابق جس میں ہے کہ ''جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بناتے ہیں'' بہرحال اب اس جگہ تعمیر شروع ہوئی اور اللہ کے رسول ﷺ خود صحابہ کرام کے ساتھ پتھر اٹھا کر لاتے تھے اگرچہ صحابہ اصرار کرتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ آپ رہنے دیں مگر آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ابتداء میں اللہ کے اس گھر کے ستون کھجور کے تھے اور دیواریں بھی کچی تھیں اور چھپر کھجور کی شاخوں کا تھا اور سادگی کی یہ ایک زبردست تصویر تھی، مسجد کے ایک سرے پر چبوترہ تھا۔اس کی بھی چھت ایسی ہی تھی یہ صفہ کہلاتا تھا۔یہی اس زمانہ کا دارالعلوم تھا۔مسجد نبوی ﷺ سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لیے حجرے تعمیر کرائے جن میں اللہ کے رسول ﷺ آرام فرماتے تھے۔

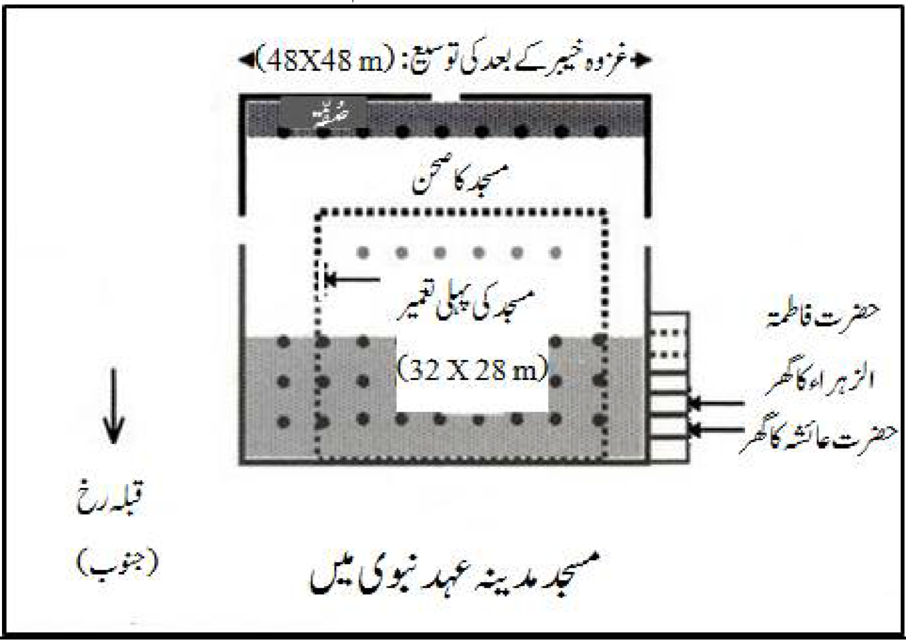

8.5 رشتہ مواخات کا قیام

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد جو بہت اہم ترین امور انجام دیئے ان میں سے ایک رشتہ مواخات کا قائم کرنا تھا جس کی وضاحت یہ ہے کہ مہاجرین مکہ سے بے سروسامان آئے تھے اگرچہ ان میں کچھ حضرات وہ تھے جو مکہ میں رہتے ہوئے بہت دولت منداور خوشحال لوگوں میں شمار ہوتے تھے مگر مکہ معظّمہ سے چوں کہ چھپ کر ہی نکلنا ہوا تھا اس لیے ساتھ کچھ بھی نہ لا سکے تھے۔آپؐ نے مدینہ آتے ہی اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ مہاجرین کی جو جماعت مکہ مکرمہ سے آئی ہے وہ مدینہ منورہ کے لوگوں کے لیے(انصار کے لیے) باعث اذیت وموجب پیچیدگی نہ بنیں اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا تب بھی ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ساتھ ہی آپ ﷺ کو یہ بھی خیال تھا کہ مہاجرین جنھوں نے دین کی خاطر انتہائی تکلیفیں برداشت کی ہیں اور اپنے گھر، وطن، عزیز واقارب، مال وزر، خاندان، برادری سب کو چھوڑ کر مدینہ آئے ہیں اب اور زیادہ پریشان وشکستہ دل نہ ہوں اور مہاجرین نذرونیاز اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ دست وبازو سے کام لینے کے

خوگر تھے اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار ومہاجرین میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے چنانچہ آپ ﷺ نے تمام مہاجرین وانصار کو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر جمع فرما کر خطاب فرمایا اور مہاجرین وانصار کے درمیان رشتۂ اخوت قائم فرمایا اور ایک مہاجر ایک انصاری کو بلا کر فرماتے کہ یہ تمہارا بھائی ہے جس کے بعد انہوں نے اس رشتہ کو اس انداز سے نبھایا کہ وہ حقیقی بھائی بن گئے۔ انصاری بھائی مہاجر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئے اور گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر فرمایا کہ آج سے آدھا تمہارا ہے اور آدھا میرا ہے یہاں تک کہ سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ سعد بن ربیع جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بھائی قرار پائے ان کی دو بیویاں تھیں انہوں نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ تم ایک کو پسند کر لو میں اس کو طلاق دے دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیں لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار فرمایا۔

انصار کے پاس جو بھی کچھ مال و دولت یا باغات تھے۔ سب کے بارے میں رسول اللہ سے درخواست کی کہ یہ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں مہاجرین نے انکار فرمایا کیوں کہ وہ تجارت پیشہ لوگ تھے اور کھیتی کے اس فن سے ناآشنا تھے مگر انصار نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کام ہم ہی کریں گے پیداوار میں نصف حصہ مہاجر کا ہوگا۔ مہاجرین نے کہا کہ آپ ہمیں بازار کا راستہ بتا دیں۔ چنانچہ ان کو قینقاع کے بازار کا راستہ دکھایا گیا۔ بعض صحابہ نے دکانیں کھولی، بعض کپڑے کی تجارت کرنے لگے اور بعض نے کھجور کی تجارت شروع کر دی۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی تجارتوں سے اپنا گزر بسر شروع کر دیا، خود عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اس بازار میں جا کر گھی اور پنیر کی تجارت کی اور رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ ان کا خود ہی کا بیان ہے کہ میں مٹی پر بھی ہاتھ ڈالتا ہوں وہ بھی سونا ہو جاتی ہے۔ یہ تو ان مہاجرین کے گزر بسر کا معاملہ تھا۔ رہا ان حضرات کی سکونت کا مسئلہ تو اس کا انتظام اس طرح سے ہوا تھا کہ جن انصار کے پاس سکونت کے دو گھر تھے اور ایک سے ان کی ضرورت پوری ہو رہی تھی تو دوسرا مہاجر بھائی کو دے دیا۔ جن کے پاس گھر کے قریب رہائشی زمین تھی، انہوں نے وہ زمین مہاجرین بھائیوں کو دے دی۔ حضرت عثمان غنیؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دے دیں تھیں۔

غرض اس عہد مواخات کو انصار مدینہ نے اس خلوص اور احتیاط سے نبھایا کہ تاریخ میں نہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر ملتی ہے اور نہ بعد میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ تمام ہی مہاجرین کو انصار نے حقیقی معنوں میں اپنا بھائی سمجھا اور بے دریغ اپنا تمام مال واسباب ان کے سپرد کر دیا اور مہاجرین نے بھی اپنا بار اپنے انصار بھائیوں پر نہیں ڈالنا چاہا بلکہ انہوں نے نہایت جفاکشی اور مستعدی کے ساتھ محنت مزدوریاں کیں اور چھوٹی چھوٹی تجارتیں شروع کیں جس سے اپنی ضروریات زندگی اپنی قوت بازو سے مہیا کرنے لگے اور اپنے انصار بھائیوں کے لیے اس طرح موجب تقویت بن گئے۔

اسلام تہذیبِ اخلاق وتکمیلِ فضائل کی شہنشاہی ہے، اسی سلطنت الٰہی کے لیے وزراء، اربابِ تدبیر، سپہ سالاران، لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں، شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درس گاہِ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحادِ مذاق موجود ہو جو تربیت کے لیے ضروری ہے، تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحادِ مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شان نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ ان کے والد زید آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ملت ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے، حضرت سعیدؓ نے اُن ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی اس لیے اسلام کا نام سننے کے ساتھ ہی انہوں نے لبیک

کہا،ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یاان سے پہلے اسلام لائیں۔حضرت عمرؓاُن ہی کے گھر میں اوران ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔علم وفضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہؓ میں تھے۔ان کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی،جنہوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓان کوسیدالمسلمین کہتے تھے۔بارگاہِ نبوت میں منصبِ انشاپرسب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے۔فن قراءت کے وہ امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔حضرت ابوحذیفہؓ عتبہ بن ربیعة کے فرزند تھے جوقریش کا رئیس اعظم تھا۔اس مناسبت سے ان کوحضرت عبادؓ بن بشر کا بھائی بنایا گیا جوقبیلۂ اشھل کے سردار تھے۔

حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح جن کورسول اللہ ﷺ نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھااوردنیاہی میں جنت کی بشارت دے تھی۔ایک طرف توفاتحِ شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے،دوسری طرف اسلام کے مقابلے میں پدری اورفرزندی کے جذبات ان پرکچھ اثرنہیں کرسکتے تھے۔چنانچہ غزوۂ بدر میں جب ان کے باپ اُن کے مقابلے میں آئے توانہوں نے پہلے حقوقِ ابوّت کی مراعات کی لیکن بالآخراسلام پر باپ کوقربان کردینا پڑا۔اُن کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیئے گئے جوقبیلۂ اوس کے رئیس اعظم تھے۔ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پرنظرآتا ہے،بنوقریظہ ان کے حلیف تھے اورعرب میں حلیف کارشتہ اخوت اورابوّت کے برابر ہوتا تھا،تاہم بنوقریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا توانہوں نے اپنے چارسو حلیفوں کواسلام پرنثارکردیا۔

حضرت بلالؓ اورحضرت ابورُویحہؓ،حضرت سلمانؓ فارسی اورحضرت ابودرداءؓ،حضرت عمارؓ بن یاسر اورحضرت حذیفہؓ بن یمان،حضرت مصعبؓ اورحضرت ابوایوبؓ میں وہ وحدت موجودتھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد بلکہ استادبھی شاگرد سے اثر پذیرہوسکتا تھا۔

انصارنے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جوحق اداکیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیرنہیں مل سکتی۔بحرین جب فتح ہواتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارکو بلاکرفرمایا کہ میں اس کوانصار میں تقسیم کردینا چاہتا ہوں۔انہوں نے عرض کی کہ پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کواتنی ہی زمین عنایت فرمالیجئے،تب ہم لینا منظورکریں گے۔

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں۔آپ ﷺ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کوہے؟ جواب آیا کہ''صرف پانی''۔آپ ﷺ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہوکرفرمایا کوئی ہے جواُن کوآج اپنا مہمان بنائے۔حضرت ابوطلحہؓ نےعرض کی ۔''میں حاضرہوں''۔غرض وہ اپنے گھرلے گئے۔لیکن بیوی نے کہاصرف بچوں کا کھانا موجودہے۔انہوں نے بیوی سے کہاچراغ بجھادواوروہی کھانا مہمان کے سامنے لاکررکھ دو۔مہمان توکھاتارہااور یہ جھوٹ موٹ خالی منہ اس طرح چلاتے رہے کہ گویا کھارہے ہیں،اسی واقعہ کے بارے میں یہ آیت اتری ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔(حشر:9)

(اورگوان کوخودتنگی ہو،تاہم اپنے اوپردوسروں کوترجیح دیتے ہیں)۔

8.6 دینی درسگاہ کا قیام

مسجد کے سرے پرایک مسقّف چبوترہ تھا جوصفہ کہلاتا تھا یہ ان لوگوں کے لیے تھا جواسلام لاتے تھےاورگھر بارنہیں رکھتے تھےاورمکہ میں جس طرح دارِارقم اسلام کی پہلی درسگاہ تھی،اسی طرح مدینہ میں صفہ اسلامی درسگاہ تھی۔

عربی لفظ''صفۃ'' سائبان کوکہتے ہیں،یہ ایک سائبان تھاجومسجد نبوی ﷺ کے ایک کنارہ پرمسجد سے ملاہواتیارکیا گیا تھا،صحابہؓ میں سے اکثر

تو مشاغلِ دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، اُن میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لیے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہ بند دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آ کر شریکِ نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلّم ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو اُن کو بلا لیتے اور اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنی طاقت کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی اسّی اسّی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکّی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ ''یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں''۔ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے۔ ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا اس کے ساتھ جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر ''قاری'' کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوۂ معونہ میں انہی میں سے ستر (70) آدمی اسلام سکھلانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

تحویل قبلہ کے بعد جب مسجد نبوی ﷺ کا رخ بیت اللہ کی طرف ہو گیا تو قبلہ اول کی طرف دیوار اور اس کے متصل جو جگہ تھی وہ ان فقراء وغرباء کے ٹھہرانے کے لیے بدستور چھوڑ دی گئی کہ جن کے لیے کوئی ٹھکانہ اور گھر بار نہ تھا، یہ جگہ صفہ کے نام سے مشہور تھی۔

صفہ اصل میں سائبان اور سایہ دار جگہ کو کہتے ہیں، وہ ضعفاء مسلمین وفقراء شاکرین جو اپنے فقر پر فقط صابر ہی نہ تھے بلکہ امراء اور اغنیاء سے زیادہ شاکر اور مسرور تھے، جب احادیثِ قدسیہ اور کلماتِ نبویہ سننے کی غرض سے بارگاہِ نبوت ورسالت میں حاضر ہوتے، تو یہاں ہی پڑے رہتے تھے لوگ ان حضرات کو اصحابِ صفہ کے نام سے یاد کرتے تھے گویا یہ اس بشیر ونذیر اور نبی فقیر کی خانقاہ تھی جس نے بہ ہزار رضا ورغبت فقر کو دنیا کی سلطنت پر ترجیح دی۔

اور اصحابِ صفہ اربابِ توکل اور اصحابِ تبتل کی ایک جماعت تھی جو لیل ونہار تزکیہ نفس اور کتاب وحکمت کی تعلیم پانے کے لیے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتی تھی، نہ ان کو تجارت سے کوئی مطلب تھا اور نہ زراعت سے کوئی سروکار تھا، یہ حضرات اپنی آنکھوں کو آپ ﷺ کے دیدار پر انوار کے لیے اور کانوں کو آپ ﷺ کے کلمات قدسیہ کے سننے کے لیے اور جسم کو آپ ﷺ کی صحبت اور معیت کے لیے وقف کر چکے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے ستر اصحابِ صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی، فقط تہہ بند تھا یا کمبل تھا جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے اور کمبل بھی اس قدر چھوٹا تھا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک اور ہاتھ سے اس کو تھامتے کہ

کہیں ستر نہ کھل جائے۔

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اصحابِ صفہ میں تھا۔ہم میں سے کسی کے پاس ایک کپڑا بھی پورا نہ تھا، پسینہ کی وجہ سے بدن پر میل کچیل جمارہتا تھا۔جو بارگاہِ خداوندی میں ہزار نظافتوں سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھا۔یہ حضرات وہی اشعت واغبر (پراگندہ سراور گردآلود) تھے کہ اگر خداپر قسم کھا بیٹھتے تھے تو خدا ان کی قسم کو پورا کرتا تھا۔مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ کہا کرتے تھے کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے سوا کوئی خدا نہیں کہ میں بسا اوقات بھوک کی وجہ سے اپنا شکم و سینہ زمین پر لگا دیتا۔(تا کہ زمین کی نمی اور برودت سے بھوک کی حرارت میں کچھ خفت آجائے)اور بسا اوقات پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا تا کہ سیدھا کھڑا ہوسکوں۔

ایک روز سرراہ جا کر بیٹھ گیا، اتنے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے، میں نے ان سے ایک آیت قرآنی کا مطلب دریافت کیا اور غرض یہ تھی کہ وہ میری صورت اور ہیئت کو دیکھ کر کھانا کھلانے کے لیے اپنے ہمراہ لے جائیں، لیکن ابوبکرؓ چلے گئے (غرض کو سمجھے نہیں)۔

اسی طرح پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے، ان سے بھی اسی طرح آیت قرآنی کا مطلب دریافت کیا مگر وہ بھی گزرے چلے گئے۔

کچھ دیر بعد ابوالقاسم ﷺ (جن کو خداوند ذوالجلال نے خیرات وبرکات کا قاسم تقسیم کرنے والا ہی بنا کر بھیجا تھا) ادھر سے گزرے، دیکھتے ہی پہچان گئے اور مسکرائے اور فرمایا اے ابوھر (یعنی اے ابوہریرہ) میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا میرے ساتھ چلے آؤ، میں آپ ﷺ کے ساتھ ہولیا، آپ ﷺ گھر پہنچے، دیکھا تو ایک پیالہ میں دودھ رکھا ہے، دریافت فرمایا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا، گھر والوں نے کہا فلاں نے آپ ﷺ کو یہ ہدیہ بھیجا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوہریرہ اصحابِ صفہ کو بلالاؤ۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اصحابِ صفہ اسلام کے مہمان تھے، نہ ان کا گھرانہ اور نہ ان کے پاس کچھ مال تھا، غرض یہ کہ ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔آپ ﷺ کے پاس جب کہیں سے صدقہ آتا تو اصحاب صفہ کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ نہ لیتے، اس لیے کہ صدقہ آپ ﷺ پر حرام تھا اور اگر ہدیہ آتا تو خود بھی اس میں سے کچھ تناول فرماتے اور اصحاب صفہ کو بھی اس میں شریک کرتے۔اس وقت آپ ﷺ کا یہ حکم دینا کہ اصحابِ صفہ کو بلالاؤ، میرے نفس کو کچھ شاق گزرا اور اپنے دل میں کہا کہ کیا یہ ایک پیالہ دودھ اصحاب صفہ کے لیے کافی ہوگا؟ اس دودھ کا تو سب سے زیادہ حقدار میں تھا کہ کچھ پی کر طاقت اور توانائی حاصل کرتا پھر یہ کہ اصحابِ صفہ کے آنے کے بعد مجھ ہی کو اس کی تقسیم کا حکم دیں گے اور تقسیم کے بعد یہ امید نہیں کہ میرے لیے اس میں سے کچھ بچ جائے، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

چنانچہ اصحابِ صفہ کو بلا کر لایا اور آپ ﷺ کے حکم سے ایک ایک کو پلانا شروع کیا، سب سیراب ہوگئے تو آپ ﷺ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ صرف میں اور تو باقی رہ گئے، میں نے عرض کیا، بالکل درست ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور پینا شروع کرو، میں نے پینا شروع کیا اور آپ ﷺ برابر یہ فرماتے رہے اور پیو اور پیو یہاں تک کہ میں بول اٹھا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا اب بالکل گنجائش نہیں، آپ ﷺ نے پیالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اللہ کی حمد کی اور بسم اللہ پڑھ کر جو باقی تھا، اس کو پی لیا۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ فرماتے ہیں کہ اصحابِ صفہ فقیر تھے، رسول اللہ ﷺ ان کو صحابہ پر تقسیم فرمادیتے کہ جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ ایک کو اور جس کے پاس تین کا ہو وہ چوتھے کو اپنے ہمراہ لے جائے۔

محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ جب شام ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اصحاب صفہ کو لوگوں پر تقسیم فرمادیتے، کوئی دو کو لے جاتا اور کوئی تین کو اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اسّی اسّی آدمی اپنے ہمراہ لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اہلِ صفہ میں تھا، جب شام ہوتی تو ہم سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، آپ ایک ایک دودو کو اغنیاء صحابہ کے سپرد فرمادیتے اور جو باقی رہ جاتے، ان کو اپنے ساتھ شریک طعام فرماتے، کھانے سے فارغ ہوکر ہم لوگ شب کو مسجد میں سو جاتے۔

مسجد نبوی ﷺ کے دوستونوں میں ایک رسّی بندھی رہتی تھی، جس پر انصار اپنے باغات سے خوشے لالا کر اصحابِ صفہ کے لیے لٹکا دیتے تھے، اصحابِ صفہ ان کو لکڑیوں سے جھاڑ کر کھاتے، معاذ بن جبلؓ ان کے منتظم اور نگران تھے۔

عوف بن مالک اشجعیؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے اور دستِ مبارک میں عصا تھا، دیکھا کہ ایک خراب خوشہ لٹکا ہوا ہے، آپ نے اس خراب خوشہ پر عصا لگا کر فرمایا کہ اگر یہ صدقے والا چاہتا تو اس سے بہتر خوشہ صدقہ میں لاسکتا تھا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر باغ والا ایک ایک خوشہ لاکر مساکین کے لیے مسجد میں لٹکائے۔ اور جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

(فی کل عشرۃ اقناء قنو یوضع فی المسجد للمساکین)

''ہر دس خوشوں میں سے ایک خوشہ لاکر مسجد میں مساکین کے لیے رکھا جانا ضروری ہے''۔

اسی سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ بھوکوں اور پیاسوں کیلئے مسجد میں پانی اور اشیاء خوردنی کا لاکر رکھنا نہایت پسندیدہ اور مستحسن ہے۔

عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں ایک سال ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا، ایک دن فرمانے لگے کاش تو ہمارا وہ زمانہ بھی دیکھتا کہ جب کئی کئی دن ہم پر ایسے گزرتے تھے کہ اتنا کھانا بھی میسر نہ آتا تھا جس سے ہم کمر ہی سیدھی کرلیں، یہاں تک کہ مجبور ہوکر پیٹ سے پتھر باندھتے تاکہ کمر سیدھی ہوسکے۔

فضالہ بن عبیدؓ سے مروی ہے کہ بسا اوقات اصحابِ صفہ بھوک کی شدت کی وجہ سے عین حالتِ نماز میں بیہوش ہوکر گر جاتے، باہر سے اگر کوئی اعرابی اور بدوی آتا تو ان کو دیوانہ اور مجنون سمجھتا۔

رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آتے اور ان الفاظ میں ان کو دلاسا اور تسلی فرماتے:

(لو تعلمون مالک عنداللہ لاحببتم ان تزدادوا فقرا و حاجۃ)۔

''اگر تم کو یہ معلوم ہوجاتا کہ اللہ کے یہاں تمہارے لیے کیا تیار ہے تو البتہ تم تمنا کرتے کہ ہمارا یہ فقر اور فاقہ اور بڑھ جائے''۔

احادیث میں ان حضرات کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس طرح سے ہیں:

عیاض بن غنمؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کے چیدہ اور پسندیدہ اور رفیع المرتبت افراد وہ ہیں کہ جن کے متعلق مجھ کو ملاءِ اعلیٰ (ملائکہ مقربین) نے یہ خبر دی ہے کہ وہ لوگ ظاہر میں خدائے عزوجل کی رحمت واسعہ کا خیال کرکے ہنستے ہیں اور دل ہی دل میں خداوند ذوالجلال کے عذاب وعقاب کی شدت کے خوف سے روتے رہتے ہیں، صبح وشام خدا کے پاکیزہ اور پاک گھرانوں یعنی مسجدوں میں خدا کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

زبانوں سے خدا کو رغبت اور رہبت (امید اور خوف) کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں اور دلوں سے اس کی لقاء کے مشتاق ہیں، لوگوں پر ان

کا بار نہایت ہلکا اور خود ان کے نفوس پر وہ نہایت بھاری اور گراں، زمین پر پا پیادہ نہایت آہستگی اور سکون کے ساتھ چلتے ہیں، اکڑتے اور اتراتے ہوئے نہیں چلتے، چیونٹی کی چال چلتے ہیں، یعنی ان کی رفتار سے تواضع اور مسکنت ٹپکتی ہوتی ہے۔

قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، پرانے اور بوسیدہ کپڑے پہنتے ہیں، ہر وقت خداوند ذوالجلال کے زیرِ نگاہ رہتے ہیں، خدا کی آنکھ ہر وقت ان کی حفاظت کرتی ہے، روحیں ان کی دنیا میں ہیں اور دل ان کے آخرت میں، آخرت کے سوا ان کو کہیں کا فکر نہیں، ہر وقت آخرت اور قبر کی تیاری میں ہیں۔

اصحابِ صفہ کی تعداد کم و بیش ہوتی رہتی تھی، عارف سہروردیؒ نے عوارف میں لکھا ہے کہ اصحابِ صفہ کی تعداد چار سو تک بھی پہنچی ہے۔

ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابن اعرابی اور حاکم نے ان کے اسماء و احوال جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں سب کو جمع کر دیا اور زہاد صحابہ اور اصحابِ صفہ کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔ ان میں سے بعض حضرات کے نام حسبِ ذیل ہیں:

1. ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ، 2. عمار بن یاسر ابوالیقظانؓ، 3. عبداللہ بن مسعودؓ، 4. مقداد بن عمروؓ، 5. خباب بن ارتؓ، 6. بلال بن رباحؓ، 7. صہیب بن سنانؓ، 8. زیدؓ بن الخطاب (یعنی عمر بن الخطابؓ کے بھائی)، 9. ابومرثد کناز بن حصین عدویؓ، 10. ابوکبشہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ، 11. صفوان بن بیضاؓ، 12. ابوعبس بن جبرؓ، 13. سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ، 14. مسطح بن اثاثہؓ، 15. عکاشہ بن محصنؓ، 16. مسعود بن ربیعؓ، 17. عمیر بن عوفؓ، 18. عویم بن ساعدہؓ، 19. ابولبابہؓ، 20. سالم بن عمیرؓ، 21. ابوبشر کعب بن عمروؓ، 22. خبیب بن یسافؓ، 23. عبداللہ بن انیسؓ، 24. جندب بن جنادہ ابوذر غفاریؓ، 25. عتبہ بن مسعود ہذلیؓ، 26. ثابت بن ودیعہؓ، 27. سلمان فارسیؓ، 28. حذیفہ بن الیمانؓ، 29. ابوالدرداء عویمر بن عامرؓ، 30. عبداللہ بن زید جہنیؓ، 31. حجاج بن عمرو اسلمیؓ، 32. ابوہریرہ دوسیؓ، 33. ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ، 34. معاذ بن الحارثؓ، 35. سائب بن خلادؓ، 36. عبداللہ بن عمرؓ (نکاح سے پہلے ابن عمر اہل صفہ کے ساتھ رہتے تھے اور انہی کے ساتھ مسجد میں شب گزارتے تھے)۔

8.7 اذان کی ابتداء

اللہ کے رسول ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد ایک مسئلہ یہ درپیش تھا کہ مسلمانوں کو عبادت کے لیے کس طرح جمع کیا جائے کیوں کہ یہاں مکہ جیسے تو حالات نہیں تھے کہ وہاں عبادات چھپ کر ہی کی جاتی تھیں یہاں تو عبادات کی جو روح ہے وحدت و اجتماع اس پر عمل آسان تھا۔ لیکن کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کا کوئی انتظام نہ تھا لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ کیوں کہ اب مسجد نبوی تو تعمیر ہو چکی تھی لیکن ایسا کوئی انتظام نہ تھا کہ صحابہ کو جمع کر کے نماز ادا کر لی جائے، آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیئے جائیں۔ جو نماز کا وقت ہونے پر لوگوں کو گھروں سے بلا لایا کریں لیکن اس میں زحمت تھی بالآخر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو جمع فرما کر مشورہ کیا، صحابہؓ نے مختلف آراء پیش کیں کسی نے کہا کہ نماز کے وقت مسجد میں ایک علم کھڑا کر دیا جائے لوگ اُسے دیکھ کر آ جایا کریں، آپ ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا کسی نے ناقوس بجانے کی رائے دی وہ بھی ناپسند ٹھہری کسی نے یہود اور عیسائیوں کے طریق کو اختیار کرنے کی صلاح دی، آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند فرما کر حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اس لیے کہ اس سے ایک طرف تو نماز کے وقت کی اطلاع ہو رہی تھی اور دوسری طرف دن میں پانچ مرتبہ دعوت اسلام کا اعلان بھی ہو رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہجرت کرنے کے بعد پہلے ہی سال میں جو امور انجام دیئے گئے ان میں سے ایک اذان کی ابتداء بھی ہے۔

8.8 پہلی دستاویز

سرکار دو عالم ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ صرف فرمائی وہ شہر مدینہ کا امن و امان اور باشندگان مدینہ کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانا تھا کیوں کہ وقت امن میں جو امور انجام دیے جاتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ان اقدامات میں سے جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہجرت فرمانے کے بعد کیے ہیں ان میں سے ایک اہم قدم یہ ہے کہ آپ نے تمام باشندگان مدینہ کے درمیان جن میں یہود، مشرکین سب ہی شامل تھے ایک عہد نامہ مرتب فرمایا اس پر سب نے ہی خوشی بخوشی دستخط کیے اس پہلے معاہدہ میں جو اہم ترین قرار دیں تھیں ان کی تفصیل اس طرح سے ہے:

1. خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔
2. یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔
3. یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
4. یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔
5. کوئی بھی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔
6. مدینہ پر اگر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔
7. کسی دشمن سے ایک فریق اگر صلح کریگا تو دوسرا فریق بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی جنگ اس سے مستثنٰی ہوگی۔
8. باشندگان مدینہ میں کوئی شخص کسی دوسرے کے دین و مذہب اور جان و مال سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔
9. باشندگان مدینہ میں کوئی دو فریق اگر کسی بات پر آپس میں جھگڑا کریں گے اور خود صلح نہ کر سکیں تو اس کا ناطق فیصلہ آپ ﷺ صادر فرمائیں گے جس سے کسی کو انحراف و انکار نہ ہوگا۔
10. اگر جنگ پیش آ گئی تو اس کے مصارف اور فوائد میں تمام باشندگان مدینہ برابری کے ساتھ شریک ہوں گے۔ایسے ہی اگر مدینہ کے یہود کا کسی قبیلہ سے معاہدہ ہے تو مسلمان بھی اس کا لحاظ رکھیں گے ایسے ہی اس کا برعکس کہ اگر مسلمانوں کا کسی سے معاہدہ ہے تو یہود مدینہ بھی اس کا ایسے ہی پاس و لحاظ رکھیں گے۔نیز مدینہ کے اندر کشت و خون حرام سمجھا جائے گا اور مظلوم کی مدد سب پر فرض ہوگی۔

دراصل انصار کے دو قبیلے اوس اور خزرج میں جو آخری معرکہ ہوا تھا جنگ بعاث میں اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا اس لیے یہود اس چیز کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں جب اللہ کے رسول مدینہ تشریف لائے تو یہ اہم ترین امر انجام دیا کہ مسلمان اور یہودیوں کے تعلقات منضبط ہو جائیں اس لیے آپ ﷺ نے انصار اور یہود کو بلا کر مذکورہ بالا شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کر لیا۔اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد اللہ کے رسول نے یہ کوشش فرمائی کہ مدینہ کے اردگرد رہنے والے قبائل کو بھی اس معاہدہ میں شامل کر لیا جائے تا کہ بدامنی اور آئے دن کی خونریزی کا مکمل طور پر استیصال ہو جائے۔ابھی تمام قبائل اس میں شامل بھی نہ ہوئے تھے کہ مدینہ کے اندر خفیہ اور باہر سے علانیہ حملے شروع ہو گئے۔

8.9 منافق کی سرداری کا خاتمہ

مدینہ میں ایک شخص عبدالرحمٰن بن ابی بن سلول بہت عقل مند، تجربہ کار، ہوشیار اور چالاک شخص تھا۔اوس اور خزرج کے تمام قبائل پر اس کا

اثر تھا۔لوگ اس کی سرداری کو متفقہ طور پر تسلیم کرتے تھے۔قبائل اوس وخزرج چند روز پیشتر جنگ بعاث میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوکر اور اپنے بہت سے بہادروں کو قتل کرا کر کمزور ہو چکے تھے۔عبداللہ بن ابی نے اس حالت سے فائدہ اٹھانے اور دونوں قوموں میں اپنی مقبولیت کو بڑھانے میں کوتاہی نہیں کی۔ مدینہ والے ارادہ کرر ہے تھے کہ عبداللہ بن ابی کو تمام مدینہ کا افسرِ اعلیٰ یا بادشاہ بنالیں اور ایک عظیم الشان جلسہ ترتیب دے کراس میں باقاعدہ طور پر عبداللہ بن ابی کی سرداری کا اعلان کردیں۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی کے لیے ایک تاج بھی بنوالیا گیا تھا۔اسی دوران میں مدینہ کے اندر اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ السلام داخل ہوئے۔

آنحضرت ﷺ کے مدینہ تشریف لے آنے کے بعد مدینہ میں مسلمان سب سے بڑی طاقت سمجھے جانے لگے۔اور بالآخر مسلمانوں کو فوقیت وافسری کو مذکورہ بالا عہد نامہ پر دستخط کر کے سب نے تسلیم کرلیا۔اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عبداللہ بن ابی کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور اس کی بادشاہت وسرداری خاک میں مل گئی۔ چوں کہ وہ بڑا چالاک وہوشیار آدمی تھا۔آنحضرت ﷺ کو اگرچہ اپنا رقیب اور دشمن سمجھتا تھا لیکن اس دشمنی کے اظہار کو غیر مفید سمجھ کر اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔قبائل اوس اور قبائل خزرج میں جو لوگ ابھی تک بُت پرست تھے وہ عبداللہ بن ابی کے زیر اثر تھے۔قریشِ مکہ کو جب معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقاء مدینہ میں پہنچ کر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے اور مذہب اسلام کا دائرہ روز بروز وسیع ہورہا ہے تو انہوں نے سب سے پہلی شرارت اور شیطانی سازش یہ کی کہ عبداللہ بن ابی اور مشرکین مدینہ کے پاس ایک تہدید آمیز پیغام بھیجا کہ تم نے ہمارے آدمی کو ہماری مرضی کے خلاف اپنے یہاں ٹھہرالیا ہے مناسب یہ ہے کہ تم اُس سے لڑو اور اپنے شہر سے نکال دو۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم پورے ساز وسامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ کریں گے۔تمہارے جوانوں کو قتل کردیں گے۔تمہاری عورتوں پر متصرف ہوجائیں گے۔

اس پیغام کے پہنچنے پر عبداللہ بن ابی نے تمام مشرکوں کو جمع کیا اور مکہ والوں کے اس پیغام سے مطلع کر کے سب کو لڑائی پر آمادہ کردیا۔اتفاقاً آنحضرت ﷺ کو اس مجلس اور اس سازش کا حال معلوم ہوا۔آپ ﷺ فوراً اس مجمع میں تشریف لے گئے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ قریش مکہ نے تم کو دھوکا دینا چاہا ہے، اگر تم ان کی دھمکی اور دھوکے میں آگئے تو بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم ان کو صاف جواب دے دو اور اپنے عہد وقرار پر جو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے، قائم رہو۔اگر قریش نے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم کو ان کا مقابلہ کرنا اور لڑنا بہت آسان ہوگا۔ کیوں کہ ہم سب متفقہ طور پر اُن کے سامنے آئیں گے۔لیکن اگر تم مسلمانوں سے لڑے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور رشتہ داروں کو قتل کرو گے اور برباد ہوجاؤ گے۔آنحضرت ﷺ کی یہ بات سن کر مجمع نے تائید کی اور اُسی وقت تمام مجمع منتشر ہوگیا۔عبداللہ بن ابی دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

8.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد ہم نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جب مکہ کی سرزمین پر مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا نیز ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جانے لگا تب اللہ کے رسول نے صحابہ کو ہجرت کی اجازت دیدی۔
- آپ ﷺ نے نبوت کے تیرھویں سال بحکم الٰہی ہجرت فرمائی۔
- حضرت اسماءؓ کو ذات النطاقین کا لقب دیا گیا۔
- مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں سات ماہ رہے۔
- مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہوجائے لیکن درحقیقت یہ عظیم

الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

- نبی ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ صرف فرمائی وہ شہر مدینہ کا امن وامان اور باشندگان مدینہ کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانا تھا۔
- نبی ﷺ کے مدینہ تشریف لے آنے کے بعد مدینہ میں مسلمان سب سے بڑی طاقت سمجھے جانے لگے۔
- اصحاب صفہ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔
- اذان کی ابتداء پہلی ہجری میں مدینہ میں ہوئی۔
- پہلے ہجری سال کے اہم امور مسجد نبوی کی تعمیر، اذان کی شروعات، رشتہ مواخات، یہود سے معاہدہ ہے۔
- منافقت کی ابتداء عبداللہ بن ابی بن سلول کے ذریعہ ہوئی۔

8.11 نمونہ امتحانی سوالات

8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. ہجرت کی اجازت ملنے کے بعد آنخضور ﷺ کس کے گھر تشریف لے گئے تھے؟

a. ابوبکر صدیقؓ　b. عمر فاروقؓ　c. عثمان غنیؓ　d. علی مرتضیٰؓ

2. آنخضور ﷺ قبا کب پہنچے تھے؟

a. 4/ربیع الاول　b. 8/ربیع الاول　c. 12/ربیع الاول　d. 9/ربیع الاول

3. آپ ﷺ نے قبا میں کتنے دنوں تک قیام فرمایا تھا؟

a. 8/دن　b. 12/دن　c. 14/دن　d. 18/دن

4. ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کس کے مہمان ہوئے تھے؟

a. مقدادؓ　b. ابوذر غفاریؓ　c. ابوایوب انصاریؓ　d. کلثومؓ

5. رشتہ مواخات کب قائم ہوا تھا؟

a. 1/ہجری میں　b. 2/ہجری میں　c. 3/ہجری میں　d. 4/ہجری میں

6. منافقوں کا سردار کسے کہا جاتا ہے؟

a. ابوسفیان　b. ابوجہل　c. عبداللہ بن ابی ابن سلول　d. عتبہ بن ربیعہ

7. مدینہ میں اذان کی جب شروعات ہوتی تو پہلی اذان کس نے دی تھی؟

a. عمر فاروقؓ　b. ابوذر غفاریؓ　c. بلالؓ　d. ابی ابن کعبؓ

8. مدینہ جا کر آپ ﷺ نے جو پہلا معاہدہ کیا تھا اس میں مسلمانوں کے ساتھ کون شریک تھے؟

a. صرف یہودی　b. صرف نصرانی　c. صرف مشرکین　d. سبھی

9. رشتہ مواخات درج ذیل میں سے کن کے گھر منعقد ہوا تھا؟

a. ابوایوب انصاریؓ b. مالک بن عوفؓ c. انس بن مالکؓ d. سعد بن معاذؓ

10. مسجد نبویﷺ کی زمین کی قیمت کس نے ادا کی تھی؟

a. عثمان غنیؓ b. ابوبکر صدیقؓ c. ابوایوب انصاریؓ d. ابوذر غفاریؓ

8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. عبداللہ بن ابی بن سلول کو اللہ کے رسول سے حسد کیوں تھا؟ بیان کیجیے۔
2. اللہ کے رسولﷺ نے قباء میں مسجد کی بنیاد ڈالی۔اس عبارت پر روشنی ڈالیے۔
3. اذان کی ابتداء کیسے ہوئی؟ بیان کیجیے۔
4. مسجد نبویﷺ کی تعمیر پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5. مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ کے رسولﷺ نے جو معاہدہ کیا تھا اس کا مقصد کیا تھا؟ بیان کیجیے۔

8.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. رشتہ مواخات پر ایک وضاحتی نوٹ لکھیے۔
2. مدینہ پہنچنے کے بعد یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی شرائط وضاحت سے لکھیے۔
3. سفر ہجرت پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔

8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	سیرۃ النبی	:	علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، جلد اول
2.	تاریخ اسلام (جلد اول)	:	شاہ اکبر خاں صاحب نجیب آبادی
3.	سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم)	:	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
4.	الرحیق المختوم	:	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
5.	محمد عربی	:	مولانا عنایت اللہ سبحانی
6.	رحمۃ للعالمین	:	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری
7.	محسن انسانیت	:	نعیم صدیقی

-:oOo:-

اکائی 9 : اہم غزوات (حصہ اول)

اکائی کے اجزا

9.0		تمہید
9.1		مقصد
9.2		غزوہ بدر
9.3		غزوہ احد
9.4		غزوۂ احزاب (خندق)
9.5		غزوہ سویق
9.6		غزوہ بنو مصطلق
9.7		اکتسابی نتائج
9.8		نمونہ امتحانی سوالات
	9.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	9.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	9.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
9.9		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید

اس اکائی میں ابتدائے اسلام کی بعض مشہور غزواۃ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ یہ غزوات کیوں اور کن حالات میں پیش آئے اور ان کے کیا نتائج سامنے آئے۔ غزوہ (عربی: غزوۃ اور جمع غزوات): وہ لڑائی ہے جس میں نبی ﷺ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی ہو۔ اگر اس لڑائی میں آپ ﷺ شامل نہ ہوں، تو اس کو ''سریہ'' یا ''بعثہ'' کہا گیا ہے۔ لغت میں غزوہ کا معنی قصد کرنا ہے۔

رمضان المبارک میں حق و باطل کا پہلا تاریخ ساز معرکہ غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا تیرہ سال تک کفار مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر کس طرح ظلم وستم کا پہاڑ توڑا، ان کا گمان تھا کہ یہ مٹھی بھر مسلمان مکہ کے لشکر کے سامنے نہ ٹک سکیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی نے کس طرح ظاہری شکست کو فتح میں بدل دیا۔ یہ اسلام اور دشمنان اسلام میں امتیاز برتنے کے لیے پہلی جنگ ہے۔ اس اکائی میں غزوہ بدر سے لے کر غزوہ بنو مصطلق تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں کیا طریقہ اپنایا، جنگ کے ماحول، پس ومنظر اور آثار و نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

9.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی لڑائیوں کا مقصد لڑنا نہیں بلکہ قیام امن، دفاع اور کمیونٹی کا تحفظ تھا، اور اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں بلکہ اخلاق کے ذریعہ پھیلا ہے۔ غزوات نبوی ﷺ کے پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے پُرتشدد اور جارح ہونے کی بات جو کہی جاتی ہے وہ بے وزن ہے اس لیے کہ یہ ساری جنگیں دفاعی ہیں۔ اس اکائی سے یہ واضح ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی جنگیں اور غزوات انسانی تاریخ میں غیر معمولی طور پر امتیاز ہیں، دوران جنگ اتنی کم جانیں ضائع ہوئیں کہ انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ نیز عہد نبوی کی جنگوں میں جو امتیاز ہے اس کا مختصر تعارف لانا اس اکائی کا مقصد ہے۔

9.2 غزوہ بدر (رمضان 2ھ مطابق 624ء)

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سالانہ میلہ لگتا تھا۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ ستر (70) میل ہے۔ نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے اور یہاں صحابہ کرام کو ساتھ لے کر جہاں ایک طرف اسلامی ریاست کی مضبوطی اور اس کے استحکام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے وہیں دوسری طرف قریش مکہ کی فتنہ انگیزیوں سے بھی محتاط تھے اس لیے کہ کفار قریش کے لیے یہ بھی پریشانی کا سبب تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ میں سکون کیوں ہے اور مسلمانوں کی تعداد کیوں کر بڑھ رہی ہے۔ اس بڑھتی تعداد کو روکنے کے لیے اور مسلمانوں کا استیصال کرنے کے لیے قریش نے ایک جنگ کا فیصلہ کیا جس کے مصارف کے لیے ابوسفیان کے زیر سرپرستی ایک تجارتی قافلہ ملک شام کو روانہ ہوا جس میں 50 ہزار دینار کی پونجی لگائی گئی تھی جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی حصہ لیا تھا گویا کہ مکہ کے تمام ہی لوگوں نے اس میں اپنا سرمایہ لگایا تھا اور یہ بات طے تھی کہ اس تجارتی قافلہ سے حاصل ہونے والا سارا نفع مدینہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی جنگ میں لگایا جائے گا۔

آپ ﷺ کو جب اس قافلہ کی واپسی کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو جمع فرما کر اس بات کا اظہار فرمایا اور مکہ کے لوٹنے والے اس قافلہ کو بغرض تنبیہ روکنے کا فیصلہ کیا تاکہ آئندہ قریش کو مسلمانوں کے خلاف ناپاک عزائم کی جرأت نہ ہو اور ان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ مدینہ سے معاملات خراب کر کے ان کے لیے تجارت مشکل ہو جائے گی اور شام جو اس زمانہ میں تجارت کی منڈی تھی اس تک پہنچنا ان کے لیے مشکل ہو جائے گا گویا اس قافلہ کو روکنے کا مدعا تخویف و تادیب تھا۔

امیر قافلہ ابوسفیان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے دو کام کیے اول یہ کہ اس نے یہ خبر مکہ میں پہنچوادی کہ مسلمان ہمارے قافلہ کو لوٹنا چاہتے ہیں دوم اپنا راستہ بدل دیا اس خبر کے مکہ پہنچتے ہی ابوجہل مکہ سے تقریباً ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ نکلا جس میں 700 اونٹ اور 300 گھوڑے تھے اور یہ لشکر ہر طرح کے سامان جنگ سے لیس تھا۔ جب قریش کا وہ تجارتی قافلہ بچ کر مکہ پہنچ گیا تو ابوسفیان نے ابوجہل کے پاس خبر بھیجی کہ ہم مکہ پہنچ گئے ہیں اب واپس چلے آؤ ابوجہل اپنے لشکر پر مغرور تھا اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ واپس ہو بلکہ مسلمانوں کے استیصال کی ٹھان لی اور آگے بڑھتا رہا۔

قریش کے اس لشکر کا علم جب رسول اکرم ﷺ کو ہوا تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ مکہ کے لوگوں نے اپنے جگر گوشے تمہاری طرف بھیجے ہیں ان کا مقابلہ کرنے سے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت مقدادؓ نے نہایت شجاعت اور بہادری کے کلمات کہے اور تیسری مرتبہ کے دریافت کرنے پر حضرت سعدؓ نے انتہائی ولولہ انگیز جملے فرمائے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کو مکمل اطمینان ہو گیا تو آپ ﷺ نے مدینہ سے روانگی کا حکم دیا اور باہر آ کر جب گنتی کی گئی تو یہ تعداد 313 تھی جس میں صرف دو گھوڑے اور 70 اونٹ تھے۔ یہ اسلامی لشکر جب مقام بدر پر پہنچا تو دیکھا کہ کفار پہلے سے ہی بلند مقام پر خیمہ زن ہیں مسلمانوں کو پست اور ریتیلی زمین پر ہی خیمہ لگانا پڑا۔ 17/ رمضان کو دونوں

طرف سے صفیں آراستہ ہوئی، اللہ کے رسول ﷺ نے خود مسلمانوں کی صفوں کو درست فرمایا اور اس کے بعد لشکر کفار کی طرف سے مبارزت طلب کی گئی اولاً تین انصاری صحابہ میدان میں آئے مگر کفار نے مہاجرین میں سے مبارزت طلب کی چنانچہ حضرت علیؓ کے ساتھ دوسرے دو مہاجر میدان میں آئے اور پھر اس کے بعد طرفین سے لڑائی شروع ہوگئی اور فریقین نے فتح وغلبہ کے لیے جان کی بازی لگادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چودہ (14) مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ جن میں (6) مہاجر اور (8) انصار تھے۔ جب کہ سرداران قریش کو شامل کرتے ہوئے کفار مکہ کے (70) بہادر قتل ہوئے اور تقریباً اتنی ہی تعداد قیدی بنائی گئی۔ ان قیدیوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے حسن سلوک کی تاکید کی۔

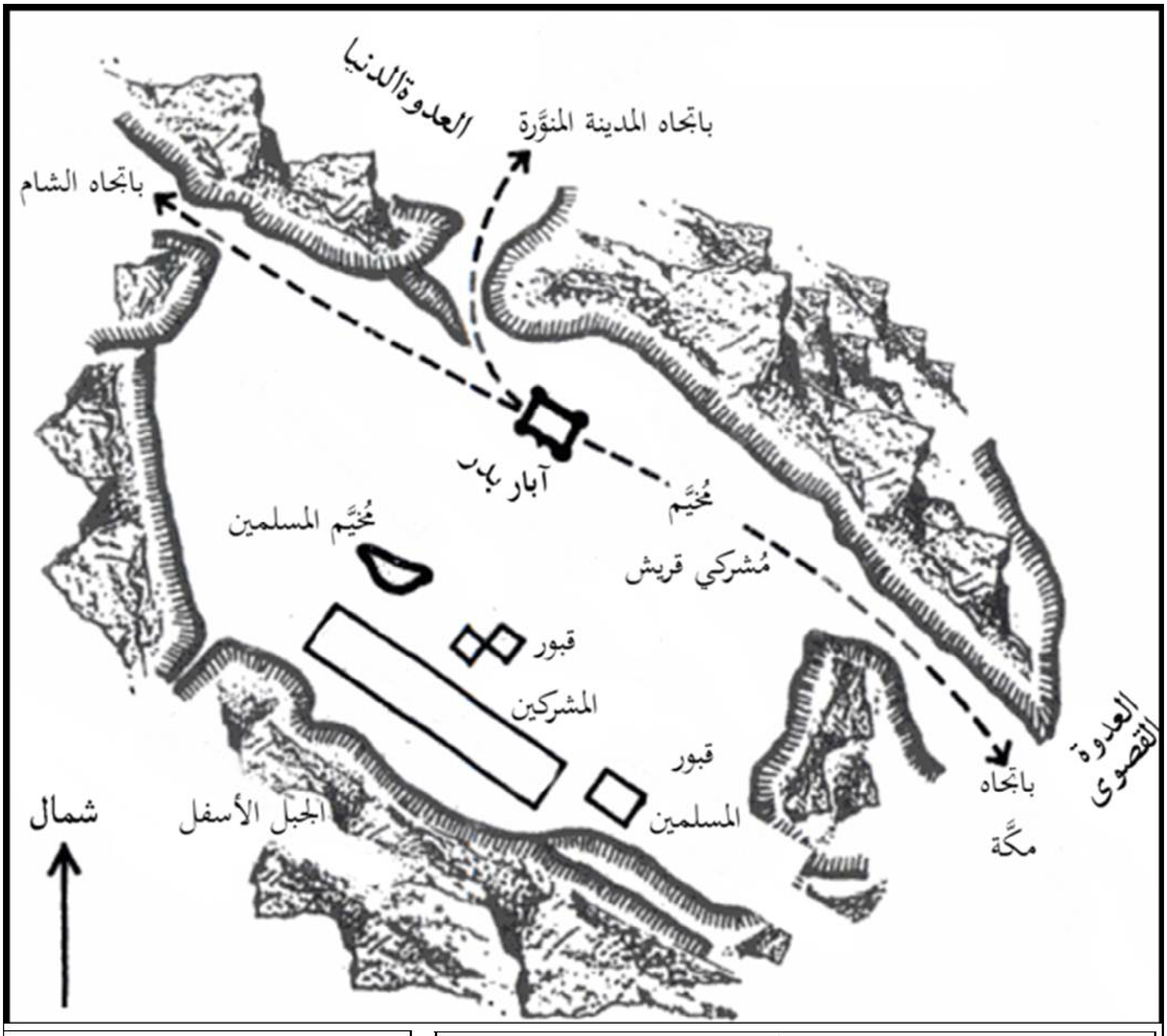

www.commons.wiimedia.org/

غزوہ بدر: کنویں بدر کے قریب، ۱۱۰ رکلومیٹر مدینہ کے جنوب مغربی میں

قیدی جب مدینہ میں پہنچ گئے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو صحابہ کرامؓ میں تقسیم فرما کر حکم دیا کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص ابوعزیز بن عمیر بھی تھا جو لشکرِ کفار کا علمبردار اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کا حقیقی بھائی تھا۔ ابوعزیز کا بیان ہے کہ جب مجھے بدر سے گرفتار

کر کے مدینہ کی طرف لا رہے تھے تو میں انصاریوں کی ایک جماعت کے زیرِ حراست تھا۔ یہ انصاری جب کھانا کھانے بیٹھتے تو روٹی مجھے دیتے اور خود کھجوریں کھا کر گذارا کر لیتے۔ میں شرما کر روٹی ان میں سے کسی کو دیتا تو وہ پھر مجھی کو واپس کر دیتا۔ مدینہ میں پہنچ کر ابوعزیز ابی یسر انصاریؓ کے حصے میں آیا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ ابی یسر انصاریؓ سے کہنے لگے کہ اس کو خوب حفاظت سے رکھنا اور اس پر سختی کرنا کیونکہ اس کی ماں بڑی مالدار ہے۔ اس سے معقول فدیہ ملے گا۔ ابوعزیز نے یہ دیکھ کر کہ میرا حقیقی بھائی میرے محافظ کو سختی کرنے کی تاکید کر رہا ہے۔ کہا کہ بھائی صاحب! کیا آپ میرے لیے یہی خیر خواہی کر رہے ہیں؟ حضرت مصعبؓ نے جواب دیا کہ اب تو میرا بھائی نہیں ہے۔ میرا بھائی یہ شخص ہے جو تیری حراست کر رہا ہے۔ ابوعزیز کی ماں نے چار ہزار درہم بھیج کر ابوعزیز کو رہائی دلوائی۔ جنگ بدر میں مشرکوں کے شکست پانے کی خبر جب مکہ پہنچی تو جس طرح کفار کو رنج و ملال ہوا اُسی طرح اُن چند مسلمانوں کو جو مکہ میں رہ گئے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے، بے حد مسرت و خوشی حاصل ہوئی۔ ابولہب کسی وجہ سے اس جنگ میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ اس نے جب مکہ کے تمام بڑے بڑے سرداروں کے مقتول اور اہل مکہ کے شکست یاب ہونے کی خبر سنی تو اس کے دل پر ایسا دھکا لگا کہ چند دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اسیرانِ جنگ کے متعلق آنحضرت ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ میں صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میری تو یہ رائے ہے کہ ان قیدیوں کے اندر ہم میں سے جو جس کا عزیز ہے وہی اس کو قتل کرے تاکہ مشرکوں کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں اللہ و رسول ﷺ کی محبت قرابت داری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اسلام کے مقابلے میں تمام رشتے ہیچ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، میری رائے یہ ہے کہ فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کو کچھ مالی امداد پہنچے اور مسلمان اپنا ساز و سامانِ جنگ درست کر سکیں اور ممکن ہے کہ ان اسیروں میں سے اکثر کو دینِ اسلام کے قبول کر لینے کی توفیق بھی میسر ہو۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کو پسند فرمایا۔ بعض قیدیوں کو بلا فدیہ لیے ہوئے ویسے ہی چھوڑ دیا۔ فی کس چار ہزار درہم سے ایک ہزار درہم تک فدیہ مکہ والوں نے بھجوا کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھڑا لیا۔ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور زرِ فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے، ان سے کہا گیا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو، اور آزاد ہو جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی زینبؓ ابھی تک مکہ ہی میں اپنے شوہر ابوالعاص کے یہاں تھیں۔ ابوالعاص بھی ان قیدیوں میں شامل تھے۔ حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار اُتار کر ابوالعاص کے فدیہ میں بھیج دیا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مناسب سمجھو تو زینبؓ کا ہار اس کو واپس کر دو۔ کیونکہ یہ اس کی ماں خدیجہؓ کی یادگار اس کے پاس ہے۔ لوگوں نے بخوشی اس بات کو قبول کیا۔ اور حضرت ابوالعاصؓ کو چھوڑ دیا۔ ابوالعاص نے مکہ میں واپس جا کر حضرت زینبؓ کو مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس بھجوا دیا۔ ابوالعاصؓ اس واقعہ کے چھ برس بعد مسلمان ہو گئے تھے۔

مکہ میں اس شکست کے بعد مقتولین کے ورثاء نے بلند آواز سے نوحہ و زاری نہیں کی۔ کیونکہ اس سے مسلمان خوش ہوتے۔ صفوان بن امیہ نے جس کا باپ امیہ اور بھائی علی دونوں بدر میں مارے گئے تھے۔ عمیر بن وہب کو خفیہ طور پر آمادہ کیا کہ مدینہ میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرے۔ عمیر بن وہب زہر میں بجھی ہوئی تلوار لے کر مکہ سے چل کر مدینہ میں پہنچے تو حضرت عمرؓ کو شبہ گزرا۔ وہ عمیر کی تلوار کا قبضہ پکڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمرؓ تم عمیر کو چھوڑ دو۔ پھر آپ ﷺ نے قریب بلا کر پوچھا کہ کیوں آئے ہو۔ عمیر نے جواب دیا کہ میرا بیٹا قیدیوں میں شامل ہے، اسے رہا کرانے آیا ہوں کہ آپ مجھ پر رحم کریں اور میرے بیٹے کو آزاد کریں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم کو صفوان نے میرے قتل کے لیے آمادہ کر کے بھیجا ہے۔ سچی بات کیوں نہیں کہتے۔ پھر آپ نے صفوان اور عمیر کے مشورہ کرنے کی تمام کیفیت سنا دی۔ عمیر نے

کہا: میں مسلمان ہوتا اور اقرار کرتا ہوں کہ آپ ﷺ خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سچے رسول ہیں۔ کیونکہ اس بات کی خبر سوائے صفوان اور میرے کسی تیسرے شخص کو ہرگز نہ تھی۔

جنگ بدر میں خدا تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کی۔فرشتوں کے شریکِ جنگ ہونے کا حال خود کفار نے مکہ میں جا کر بیان کیا۔بعض مشرکین مدینہ جولڑائی کا تماشا دیکھنے چلے گئے تھے یا اتفاقاً لڑائی کے روز بدر میں موجود اور قریب کی پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔اُن کا بیان ہے کہ ہم نے لڑائی کے وقت اپنے سروں کے اوپر سے ایک بادل کے ٹکڑے کو گذرتے ہوئے اور مقامِ جنگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔اس بادل کے ٹکڑے میں سے جبکہ وہ بالکل ہمارے قریب سے گزر رہا تھا گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جلدآگے بڑھو۔راوی کہتا ہے کہ اس آواز کے سننے سے ہم پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ میرے چچازاد بھائی کا خوف کے مارے دم نکل گیا۔

غرض یہ کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی ملی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ کفار مکہ کو سامان جنگ سے لیس ہونے کے باوجود یہ تاریخی ہزیمت برداشت کرنی پڑی۔میدان بدر سے فارغ ہوکر اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور مقام صفراء میں پہنچ کر آپ ﷺ نے بحکم الٰہی مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم فرمایا۔

9.3 غزوہ احد (شوال 3ھ مطابق 625ء)

جنگ بدر میں شکست کے بعد ایک طرف اہل مکہ کے دلوں میں آتش انتقام تھا تو دوسری طرف مدینہ کے یہود اور منافقوں کے برانگیختہ کرنے نے آگ میں گھی کا کام کیا یعنی اور جوش بھر دیا تیسری طرف ابوسفیان کی بیوی ہند نے جس کے والد اور بھائی بدر میں قتل ہو گئے تھے،اس نے ابوسفیان کو غیرت دلائی جس کی وجہ سے ابوسفیان جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا اور اس تجارتی قافلہ کا سارا مال اس کے مالکوں میں تقسیم نہ کرکے سامان جنگ کی فراہمی میں لگا دیا اور اس طرح پورے سال تیاری کی۔ان تیاریوں میں مدینہ کے یہود اور منافق لوگوں نے بھی خفیہ طور پر مسلمانوں کی خبریں پہنچا کر اور مشورے دے کر کفار قریش کی بہت مدد کی اور مدینہ کے مسلمان کفار کے ان ارادوں سے ناواقف تھے۔

غرض تین ہزار تجربہ کار بہادروں کا لشکر شوال کے شروع ہی میں مکہ سے روانہ ہوا اور جب یہ مدینہ کے قریب پہنچا تو اللہ کے رسول ﷺ کو اس کی خبر مکہ میں مقیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس نے دی۔آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع کرکے مشورہ کیا کہ مدینہ میں رہ کر ہی ان کی مدافعت کی جائے یا باہر نکل کر۔اللہ کے رسول ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مدافعت کرنی چاہیے۔اتفاق سے عبداللہ بن ابی (جو منافقوں کا سردار تھا) کی بھی رائے یہی تھی،عمر دراز صحابہ کی رائے بھی یہی تھی کہ باہر جا کر نہیں یہیں سے مدافعت کریں گے لیکن اکثر نوجوان صحابہ کرام کی رائے اس کے برعکس تھی وہ چاہتے تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے تاکہ دشمن کو ہماری کمزوری کا احساس نہ ہو۔یہ شوال بروز جمعہ کا واقعہ ہے،اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے جمعہ کی نماز ادا کی اور پھر گھر تشریف لے گئے اور گھر سے زرہ پہن کر باہر نکلے اور بڑی دقت نظری سے حالات کا جائزہ لیا اور بالآخر کسی وجہ سے معرکہ بدر میں شریک نہ ہونے والے صحابہ کرام کے حوصلوں اور جذبات کا خیال کرتے ہوئے مدینہ سے باہر جا کر جنگ لڑنے کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ نماز جمعہ کے بعد روانہ ہوئے۔ابھی تقریباً دو میل کا ہی سفر ہو پایا تھا کہ عبداللہ بن ابی اپنے ساتھ تین سو لوگوں کو لے کر واپس ہو گیا یہ کہہ کر کہ جب میری رائے نہیں مانی گئی مدینہ میں رہ کر لڑنے کی تو ہم کیوں اپنی جانوں کو مصیبت میں ڈالیں۔

اب ایمان و یقین کی دولت سے سرشار صرف سات سو مسلمان رہ گئے تھے جنھوں نے کفر و شرک کے سورماؤں سے ٹکرا کر اسلام کا بول بالا کرنے کا فیصلہ کیا اور شام ہوتے ہوتے مقام احد پر پہنچ گئے۔

میدانِ احد پہنچ کر آپ ﷺ نے لڑائی سے پہلے ہی عبداللہ بن جبیرؓ کی قیادت میں پچاس تیراندازوں (عربی: رُماۃ) کا ایک دستہ گھاٹی پر تعینات کیا اوران کو حکم دیا کہ خواہ کوئی بھی حالت پیش آ جائے تم کو یہ جگہ نہیں چھوڑنی ہے (اس گھاٹی میں ہو کر دشمن پیچھے سے حملہ آور ہوسکتا تھا اس حملہ کو روکنے کے لیے یہ حکم آپ نے دیا تھا) بہر حال صفیں درست کیں اور 10 رشوال بروز ہفتہ میدان کارزار گرم ہوا اول وہلہ میں مسلمانوں کے حملہ سے بہتیرے زعمائے کفر تہہ تیغ ہوگئے جس سے کفار کے حوصلے پست ہو گئے ،ان کی ہوا اکھڑ گئی اوران کے 12 علمبردار جب شہید ہو گئے تو کسی نے علم (جھنڈا) اٹھانے کی جرات نہ کی اور وہ زمین پر گرا رہا جس سے دوپہر بعد وہ پیچھے ہٹنے شروع ہو گئے اور پشت پھیر کر فرار ہونے لگے جس سے مسلمانوں کی اپنی فتح و کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا۔تب ان تیراندازوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی جب کہ عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو روکا بھی مگر فتح وظفر کی خوشی اور کفار کے تعاقب کے شوق نے ان سے یہ جگہ چھڑوا دی ادھر خالد بن ولید نے جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے اسی جگہ سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔عبداللہ بن جبیرؓ مع اپنے چند رفقا کے اسی جگہ شہید ہوئے۔اس کے بعد دوسرے کفار قریش بھی لوٹ آئے اور مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے کئی طرف سے حملے ہوئے جس سے مسلمان کفار کی نرغہ میں آ گئے اور اچانک میدان جنگ کی صورت بدل گئی جس سے مسلمان اس جیتی ہوئی جنگ کو ہار گئے۔

میدان احد میں حضرت حمزہؓ تلوار چلاتے چلاتے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے بڑھے چلے جاتے تھے۔حبشی غلام وحشی نے آپ کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور ایک پتھر کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔جب آپ کفار کو مارتے اور ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو اس نے موقع پا کر اپنا حربہ پھینک مارا۔اور وہ نیزہ ایک پہلو سے دوسرے پہلو کے پار نکل گیا اور حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے۔وحشی نے جا کر ہند بنت عتبہ کو حضرت حمزہؓ کے شہید کر دینے کی خبر سنائی۔حضرت حنظلہؓ نے حملہ کر کے کفار کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا،اور ابوسفیان تک پہنچ گئے۔حضرت حنظلہ دوڑ کر ابوسفیان پر وار ہی کرنا چاہتے تھے کہ شداد بن اسود لیثی نے پیچھے سے آ کر اُن پر وار کیا اور وہ شہید ہو گئے۔حضرت نضرؓ بن انس اور سعدؓ بن الربیع نے بھی بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔مسلمان ہر طرف سے کفار کے نرغہ میں آ گئے اور ان کی جمعیت میں انتشار اور سراسیمگی پیدا ہو گئی۔میدانِ جنگ میں یہ صورت ہو گئی کہ جا بجا تھوڑے تھوڑے مسلمان بہت بہت کافروں کے غول میں گھر گئے۔ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔اور ہر طرف سے ان پر تلواریں برسنے لگیں۔آنحضرت ﷺ بھی صرف بارہ صحابیوں کے ساتھ کفار کے نرغے میں آ گئے۔حضرت مصعب بن عمیرؓ علم لیے ہوئے آپ ﷺ کے قریب ہی کھڑے تھے۔کفار کے ایک مشہور شہسوار ابن قمیہ لیثی نے حملہ کیا اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کو شہید کر دیا۔حضرت مصعبؓ چونکہ آنحضرت ﷺ کے ہم شکل تھے اس لیے اس نے سمجھا کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ابن قمیہ نے ایک بلند مقام پر چڑھ کر بلند آواز سے کہا: قَدْ قَتَلْتُ مُحَمَّداً۔اس آواز سے مشرکوں کے دل بڑھ گئے اور وہ خوشی سے اُچھلنے لگے۔مسلمان اس آواز کو سن کر اپنی اپنی جگہ حیران وششدر رہ گئے۔کعب بن مالکؓ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو بلند آواز سے کہا کہ مسلمانو! خوش ہو جاؤ۔رسول اللہ زندہ وسلامت موجود ہیں۔پھر آنحضرت ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا۔اِلَیَّ عِبَادُ اللہِ اَنَا رَسُوْلُ اللہِ (خدا کے بندو! میری طرف آؤ، میں خدا کا رسول ہوں۔یہ آواز سن کر مسلمان ہر طرف سے آپ ﷺ کی طرف آنے شروع ہوئے۔کفار سے لڑتے،اُن کے حملوں کو روکتے اور ان کو مارتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچے۔ادھر آنحضرت ﷺ کی اس آواز نے کفار کو بھی بتا دیا کہ آپ ﷺ کس جگہ تشریف فرما ہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی سب اُسی طرف متوجہ ہو گئے۔اور وہ مقام جہاں آنحضرت ﷺ تشریف رکھتے تھے،لڑائی کا مرکز بن گیا۔

کچھ لوگ مسلمانوں کی فوج کے ایسی حالت اور ایسے مقامات پر تھے کہ وہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچ سکے اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔اس

پریشانی اور کارزار کے عالم میں ایک مشرک نے آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ کر آپ ﷺ پر وار کیا۔جس سے چہرۂ مبارک زخمی ہوا۔ابن قمیہ نے آپ ﷺ کے قریب پہنچ کر تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ خود کے دو حلقے آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک میں آنکھ سے نیچے کی ہڈی میں گھس گئے۔ان کو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے دانت سے پکڑ کر کھینچا تو ان کے دو دانت ٹوٹ گئے۔کفار کی پوری طاقت اب آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مبارک پر حملے میں صرف ہونے لگی۔

ادھر چند جاں نثاروں نے آپ ﷺ کے گرد ایک حلقہ بنالیا۔حضرت ابودجانہ نے آپ ﷺ کی طرف منہ کرکے اپنی پشت کو ڈھال بنالیا۔پشت کو سپر بنانے میں یہ مدعا تھا کہ جو تیر آئے وہ ان کے جسم پر لگے۔اگر منھ کفار کی طرف اور پشت آنحضرت ﷺ کی طرف ہوتی تو ممکن تھا کہ تیر کو آتے ہوئے دیکھ کر فطری طور پر جھجک پیدا ہوا اور اپنے جسم کو بچائیں۔اور مبادا تیر آنحضرت ﷺ تک پہنچ جائے۔چنانچہ ان کی پشت تیروں سے چھلنی ہوگئی اور وہ اسی طرح کھڑے رہے۔حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت ابوطلحہؓ،حضرت زبیرؓ،حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لیے دیوارِ آہنی کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہوگئے۔اور تیر و تلوار چلا چلا کر دشمنوں کو روکتے رہے۔حضرت طلحہؓ دشمنوں کی تلواروں کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔یہاں تک کہ اُن کا ہاتھ زخموں کی کثرت سے بیکار ہوگیا تھا۔حضرت زیاد بن سکن انصاریؓ مع اپنے پانچ ہمراہیوں کے آنحضرت ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔حضرت عمارہ بن زیاد بھی آنحضرت ﷺ کی حفاظت میں پروانہ وار شہید ہوئے۔ام عمارہ جن کا نام نسیبہ بنت کعبؓ تھا،لشکرِ اسلام کے پیچھے پیچھے لڑائی دیکھنے کی غرض سے گئی تھیں۔جب لڑائی کا رنگ دوپہر کے بعد یکا یک تبدیل ہوا تو وہ آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ گئیں۔ابن قیمہ نے جب آنحضرت ﷺ پر وار کیا تو ام عمارہ نے تلوار لے کر ابن قیمہ پر پے در پے کئی وار کیئے۔مگر چونکہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لیے اس پر اثر نہ ہوا۔اس نے ام عمارہ کو تلوار کا ایک ہاتھ مارا تو شانہ کے قریب سے ان کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔

جب آنحضرت ﷺ کے گرد خوب زور شور سے ہنگامۂ کارزار گرم تھا۔ایک شقی نے دور سے ایک پتھر پھینک مارا جس سے آپ ﷺ کا ہونٹ زخمی ہوا اور نیچے کا ایک دانت شہید ہوگیا۔اسی حالت میں آپ ﷺ کا پائے مبارک ایک گڑھے میں جا پڑا۔اور آپ ﷺ گر گئے،حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت طلحہؓ نے آپ ﷺ کو اُٹھا کر باہر نکالا۔آپ ﷺ کے گرد جب صحابۂ کرامؓ کی ایک مختصر جماعت فراہم ہوگئی اور لڑائی شدت سے جاری ہوئی تو کفار کے حملوں میں سستی پیدا ہونے لگی۔اور صحابۂ کرامؓ نے کفار کو مار مار کر ہٹا دیا۔اس حالت میں آنحضرت ﷺ نے پہاڑ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا۔اور صحابۂ کرامؓ کی جماعت کے ساتھ پہاڑ کی ایک بلندی پر چڑھ گئے۔مدعا اس سے یہ تھا کہ کفار کے نرغہ سے نکل کر پہاڑ کو پشت پر لے لیں اور لڑائی کا ایک محاذ قائم ہوجائے۔چنانچہ یہ تدبیر یعنی لڑائی کے لیے بہترین مقام کو حاصل کرنا بہت مفید ثابت ہوئی۔مسلمانوں کے بلند مقام پر چڑھ جانے کے بعد ابوسفیان نے بھی پہاڑ پر چڑھنا چاہا،اور وہ کفار کی ایک جماعت کو لے کر دوسرے راستے سے زیادہ بلند مقام پر پہنچنا چاہتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو حکم دیا کہ ان کو اوپر چڑھنے سے باز رکھو۔حضرت عمر فاروقؓ چند ہمراہیوں کے ساتھ اُس طرف روانہ ہوئے اور ابوسفیان کی جماعت کو نیچے دھکیل دیا۔

اب مسلمانوں کی جمعیت جلد جلد بڑھنے لگی۔مسلمان جو منتشر ہوگئے تھے پہاڑ کی اس بلندی پر آ کر آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہونے لگے۔کفار کو اب یہ جرأت نہ ہوئی کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوں مگر ایک کافر اُبی بن خلف جو آنحضرت ﷺ کے قتل کا پہلے سے ارادہ کرکے آیا تھا،اپنے گھوڑے پر سوار آنحضرت ﷺ پر حملہ آور ہوا۔اس کو آتے ہوئے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا:اس کو آنے دو۔وہ قریب پہنچ کر آپ ﷺ پر حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی حارث بن صمہ کے ہاتھ سے نیزہ لے کر اس پر وار کیا۔نیزہ کا کنارہ اس کی ہنسلی یعنی گردن کی نیچے کی ہڈی

میں لگا۔ یہ زخم بہت معمولی سا معلوم ہوتا تھا لیکن وہ یہ زخم کھا کر نہایت بدحواسی کے ساتھ بھاگا۔ وہ جب حملہ آور ہوا تھا تو یہ شور مچاتا ہوا چلا تھا کہ میں محمد (ﷺ) کو ضرور قتل کر کے آؤں گا۔ اس بدحواسی و سراسیمگی کے ساتھ جب بھاگ کر گیا تو مشرکین نے اس کا مذاق اُڑایا۔ چنانچہ اسی زخم کی وجہ سے وہ واپسی میں مکہ پہنچنے سے پہلے راستہ ہی میں مرگیا۔ اور یہی ایک شخص ہے جو آنحضرت ﷺ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا: اَفِی الْقَوْمِ مُحَمَّدٌ (کیا تم لوگوں میں محمدؐ ہیں؟) آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اس کو جواب نہ دو۔ پھر اس نے پوچھا: کیا تم میں ابوبکر صدیقؓ ہیں؟ اس طرف سے کچھ جواب نہ ملا۔ پھر اس نے پوچھا: کیا تم میں عمر بن الخطابؓ ہیں؟ اس پر بھی سکوت رہا۔ پھر وہ بولا: معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب قتل ہوگئے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ کو تاب نہ رہی فوراً چلا کر بولے: ''اے دشمنِ خدا یہ سب زندہ ہیں اور تو رسوا ہوگا''۔ یہ سن کر کچھ متعجب سا ہوا اور فخر یہ لہجے میں کہنے لگا: اُعْلُ ھُبَلُ اُعْلُ ھُبَلُ (ہبل کی جے ہبل کی جے) آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے کہا: اس کو جواب دو کہ اَللّٰهُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ (اللہ برتر و بزرگ ہے) ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کی زبان سے یہ سن کر کہا: لَنَا عُزّٰی وَلاَ عُزّٰی لَکُم (عزیٰ بت ہمارا ہے تمہارا نہیں ہے) عمر فاروقؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے موافق جواب دیا: اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَلاَ مَوْلٰی لَکُمْ (اللہ ہمارا ولی ہے تمہارا ولی نہیں ہے) ابوسفیان نے کہا کہ یہ لڑائی جنگ بدر کے برابر ہوگئی۔ یعنی ہم نے جنگِ بدر کا بدلہ لے لیا۔

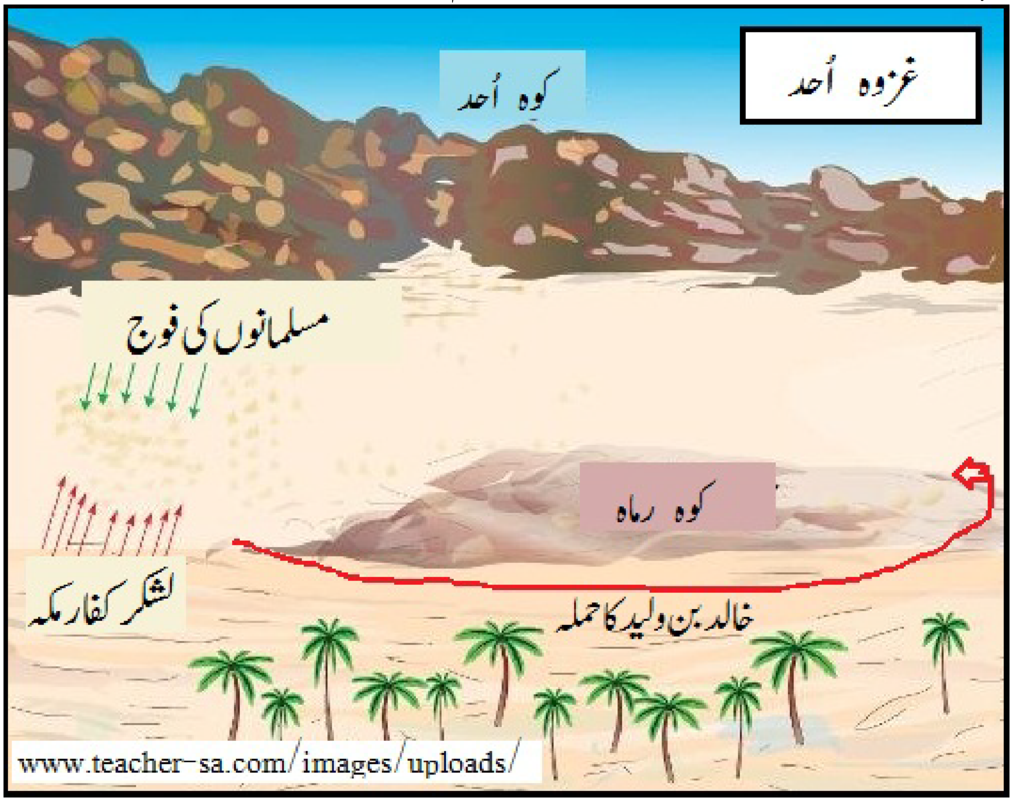

حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے موافق جواب دیا: ''نہیں، برابری نہیں ہوئی کیونکہ ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین دوزخ میں''۔ اس کے بعد ابوسفیان خاموش ہوگیا۔ پھر اُس نے بلند آواز سے کہا کہ اب ہمارا تمہارا مقابلہ آئندہ سال پھر بدر میں ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کہہ دو: نَعَمْ هُوَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ مَوْعِدٌ (اچھا، ہم کو یہ وعدہ منظور ہے۔) ابوسفیان یہ باتیں کہہ سن کر وہاں سے چل دیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابوسفیان کے پیچھے بھیجا کہ ان کی روانگی کا نظارہ دیکھو۔ اگر انہوں نے اونٹوں پر کجاوے رکھے ہیں تو یہ مکہ کو جانا چاہتے ہیں اور اگر اس کے خلاف گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اونٹوں پر کجاوے نہیں کسے تو مدینے پر حملہ کا قصد رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے مدینے

پرحملہ کا قصد کیا تو ہم ان پر ابھی حملہ آور ہوں گے۔ حضرت علیؓ گئے اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر خبر لائے کہ وہ اونٹوں پر سوار ہیں اور کجاوے کس رکھے ہیں۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مسلمان ہار کر بھی میدان احد میں تھے اور کفار جیت کر بھی میدان سے باہر تھے، مقام روحا تک جا کر مشرکین کو خیال آیا کہ اس لڑائی میں فتح کے بعد بھی کامیابی نظر نہیں آ رہی ہے کیوں کہ نہ تو ہمارے ساتھ مسلمان قیدی ہیں اور نہ ہی مال غنیمت ہے اس لیے یہاں سے دوبارہ مرنے مارنے کا ارادہ کر کے ابوسفیان لشکر لے کر واپسی پر آمادہ ہوا مگر اسی درمیان اس کو معبد بن ابی معبد نے آ کر یہ خبر سنائی کہ مسلمان مقام حمراء الاسد میں ہیں اور تمہارے تعاقب میں آ رہے ہیں یہ خبر سن کر لشکر کفار بدحواس ہو گیا اور بجائے مدینہ کی طرف جانے کے سیدھے مکہ کی راہ لی۔ مسلمانوں کی طرف سے اس جنگ میں 65 انصار اور 4 مہاجر شہید ہوئے۔

9.4 غزوۂ احزاب/غزوہ خندق (5ھ مطابق 627ء)

یہودی قبیلہ بنونضیر مدینہ منورہ سے نکل کر خیبر میں مقیم ہوا اور یہاں آ کر انہوں نے ایک نہایت عظیم اور منظّم سازش شروع کی، اس قبیلہ کے سردار حضرات نے اولاً مکہ کا رخ کیا اور قریش سے کہا کہ اگر تم ہمارا ساتھ دے دو تو ہم ان مسلمانوں کا صفایا کر سکتے ہیں انہیں اس کا جواب ہاں میں دینے میں کوئی تامل ہی نہیں تھا کیوں کہ وہ تو اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور زور آزمائی بھی کر چکے تھے، لہٰذا ان کو آمادہ جنگ کرنے کے بعد یہ رؤسا قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور ان کو بھی اسی طرح مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے برانگیختہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح قبیلہ بنو کنانہ بھی تیار ہو گیا اور دوسرے قبائل سے بنوفزارہ، بنوسلیم اور بنوسعد میں مسلمانوں کے خلاف منظّم فضا تیار کرنے کے ساتھ ساتھ بنوقریظہ کو بھی بدعہدی بر آمادہ کر لیا اور اس سازش میں شامل کر لیا جب کہ یہ قبلہ ابھی مدینہ میں رہ رہا تھا اور مسلمان کا حلیف تھا۔

تقریباً پچاس سرداروں نے خانہ کعبہ میں جا کر قسمیں کھائیں کہ جب تک زندہ ہیں مسلمانوں کی مخالفت سے منہ نہ موڑیں گے اور اسلام کے استیصال میں جان کی بازی لگا دیں گے تب ابوسفیان سردار قریش اپنے ہم عہد قبائل سے چار ہزار کا لشکر لے کر مکہ سے روانہ ہوا اور راستے میں دوسرے قبائل کی فوج شامل ہوتی گئی مدینہ کے قریب آتے آتے اس حملہ آور فوج کی تعداد ایک روایت کے مطابق ۱۰ ہزار دوسری روایت کے مطابق 24 ہزار تھیں۔ یہ سازش صیغہ راز میں رکھی گئی تھی جس سے مسلمان اس کی طرف سے لاعلم تھے۔ پھر جب اللہ کے رسول ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ حملہ آور فوج سے محفوظ رہنے کے لیے محصور فوج کے گرد خندق کھود دی جائے اللہ کے رسول نے ان کی اس تجویز کو پسند فرمایا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے۔ مدینہ کے تین طرف مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا صرف ایک ہی سمت کھلی ہوئی تھی اسی طرف آنحضرت ﷺ تین ہزار صحابہ کی جمعیت کے ساتھ شہر سے باہر نکلے اور خندق کھودنے کا کام شروع کر دیا۔ اللہ کے رسول نے خود دس دس صحابہ کے لیے دس دس گز کے حدود قائم کیے یہ خندق 5 گز گہری اور پانچ گز چوڑی کھودی گئی جس کو ان تین ہزار صحابہ نے بیس روز میں تیار کیا۔ اللہ کے رسول بنفس نفیس اس کے کھودنے میں شریک تھے بالکل اسی طرح جس طرح مسجد نبوی کی تعمیر میں شریک ہوئے تھے۔

لشکر کفار جب خندق پر آیا تو اسے بڑا تعجب ہوا کیوں کہ انہوں نے عربوں میں اس سے پہلے کبھی اس قسم کی خندق نہیں دیکھی تھی لہٰذا اب کفار کے اس کثیر لشکر نے یہیں سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی سب سے بڑی کوشش تھی، تقریباً ایک ماہ تک یہ محاصرہ رہا، کفار نے کئی مرتبہ اسے عبور کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے دور دور سے ہی تیر برسائے جاتے رہے۔ رات کے وقت کفار کی طرف سے شب خون مارنے کا ڈر رہتا تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو رات میں بیدار رہنا پڑتا تھا اور دن میں تیروں کا مقابلہ کرنا ہوتا تھا اس لیے یہ بڑی سخت آزمائش تھی۔ غرض

یہ کہ منافقوں کے طعنے ،رات کی سردی، دن کی دھوپ اور بھوک پھر کفار کا مقابلہ، بنی قریظہ کا اندیشہ، منافقوں کا خطرہ، کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت ۔ان تمام حالات میں صحابہ کرام نے جس عزم و ہمت اور ثبات قدمی کا نمونہ پیش کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مسلمانوں سے صلح کے لیے کہا گیا کہ وہ دب کر صلح کر لیں انہوں نے صاف انکار کر دیا جیسا کہ سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کے الفاظ سیرت کی کتب میں موجود ہیں۔انہوں نے فرمایا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرات نہ کر سکا۔اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بلند کر دیا ہے۔اب محاصرہ کو 27 روز گزر گئے تو ایک رات تیز ہوا چلی جس سے ان کے خیموں کی قناتیں اکھڑ گئیں، کھانے دیگچے چولہوں پر الٹ گئے ،انکے چراغ گل ہوگئے جس سے انہوں نے بدشگونی لی اور راتوں رات فرار ہو گئے۔گویا اس ہوا نے فوجوں سے بھی بڑھ کر کام کیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب میں اس طرح سے ذکر کیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحاً وَجُنُوداً لَّمْ تَرَوْهَا (الاحزاب:9)

جب اللہ کے رسول ﷺ کو ان کے فرار کی خبر ہوئی تب آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ ابن الیمان کو خبر لانے کو بھیجا انہوں نے آ کر بتایا کہ کفار کی لشکرگاہ خالی ہے اور وہ بھاگ گئے ہیں تب آپ نے فرمایا کہ اب کفار قریش ہم پر کبھی حملہ آور نہ ہوں گے۔

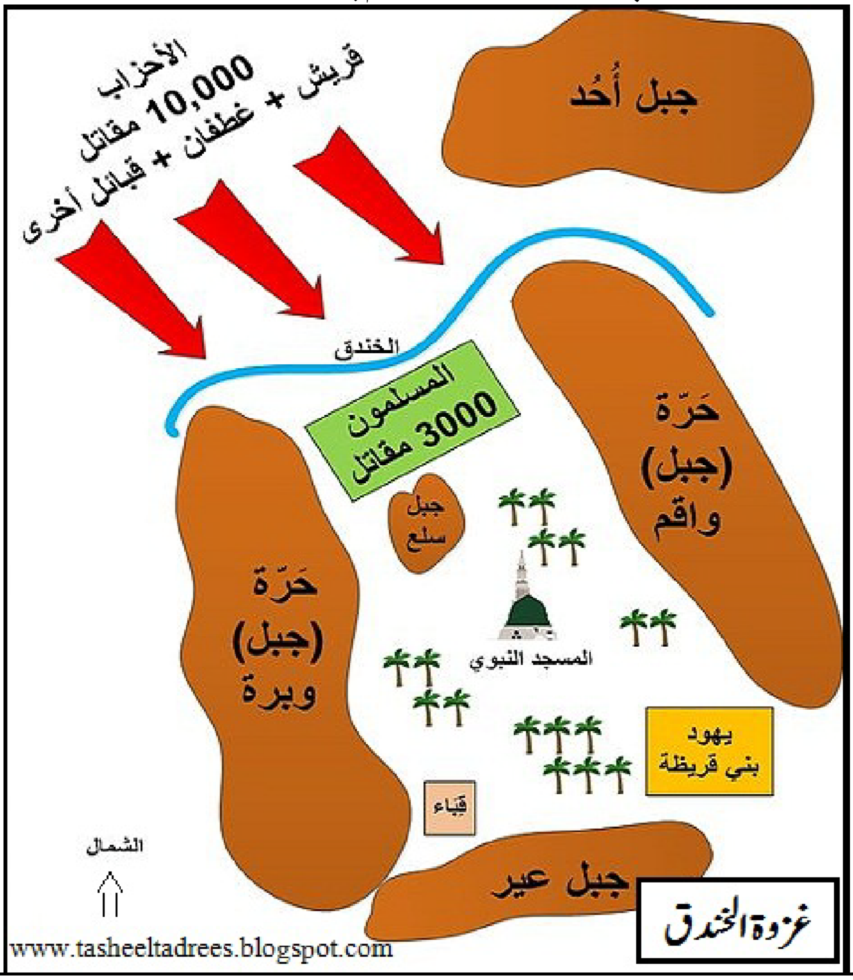

9.5 غزوہ سویق

ابوسفیان جنگ احد میں یہ کہہ کر گیا تھا کہ آئندہ سال مقام بدر میں لڑائی ہوگی۔مسلمانوں نے اس بات کو منظور کر لیا تھا۔منافقین مدینہ

جورات دن مسلمانوں کی بربادی کی تدبیر سوچتے رہتے تھے۔انہوں نے نعیم بن مسعود کو مکہ بھیجا کہ قریش کو اُحد کی قرارداد یاد دلائے اور جنگ کے لیے آمادہ کرے۔نعیم نے ابوسفیان کو توجہ دلائی کہ مسلمانوں کے مقابلے کی تیاری کرنی چاہیئے۔مکہ میں اس سال کچھ قحط اور گرانی تھی۔ابوسفیان نے کہا کہ ہم جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں۔لیکن تم یہ کام کرو کہ مدینہ میں جا کر ہماری عظیم الشان تیاریوں کا حال سناؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تا کہ وہ مدینہ سے نہ نکلیں اور اس سال لڑائی نہ ہو۔اگر یہ کام تم سے سرانجام پا گیا تو تم کو بیس اونٹ بطور شکریہ پیش کیے جائیں گے۔نعیم نے مدینے میں آکر بڑی آب وتاب کے ساتھ قریش کی تیاریوں کا حال جا بجا بیان کرنا شروع کیا۔یہ خبر سن کر مسلمان کچھ فکرمند ہونے لگے۔لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ ﷺ خدا کے سچے رسول ہیں پھر مسلمان ان خبروں کو سن کر کیوں گھبرا رہے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ایک شخص بھی میرے ہمراہ نہ چلے تو میں تنہا حسب وعدہ کفار کے مقابلے کے لیے بدؔر کے میدان میں پہنچ جاؤں گا۔چنانچہ اس کے بعد آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کی اور بدؔر کی جانب روانہ ہوئے۔تو آپ ﷺ کے ہمراہ ڈیڑھ ہزار صحابۂ کرامؓ کا لشکر تھا۔روانگی کے وقت آپ ﷺ عبداللہ بن رواحہؓ کو مدینہ کا عامل مقرر فرما گئے تھے۔اس مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے لشکر کا عَلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سپرد کیا تھا۔کل فوج میں اس مرتبہ دس گھوڑے تھے۔ابوسفیان لڑائی سے جان بچانا چاہتا تھا۔مگر جب اس کو آنحضرت ﷺ کے مدینہ سے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ مکہ سے دو ہزار کا لشکرِ جرار لے کر چلا۔خشک سالی کی وجہ سے اُس لشکر کے پاس کھانے کے سامان میں ستّو کے سِوا اور کچھ نہ تھا اس واسطے اس لشکر کا نام جیش السویق مکہ میں مشہور ہوا۔

ابوسفیان کے لشکر میں اس مرتبہ پچاس سوار تھے۔یہ دو ہزار کا لشکر جب مقام عسفاؔن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر میں ڈیڑھ ہزار جانباز موجود ہیں۔اہل مکہ بدؔر اور اُحد میں دیکھ چکے تھے کہ تہائی اور چوتھائی تعداد کے مسلمانوں سے بھی ان کو شکست کھانی پڑی تھی۔اب بھی اگرچہ مسلمان تعداد میں کم تھے مگر اس تعداد کا حال معلوم ہو کر کفار کے اوسان خطا ہو گئے اور مقام عسفاؔن ہی سے یہ کہہ کر مکہ کو واپس چلے گئے کہ ہم قحط سالی کے ایام میں جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔یہ لشکر جب راستہ ہی سے واپس ہو کر مکہ میں پہنچا ہے تو مکہ کی عورتوں نے کہا کہ تم صرف ستو پینے گئے تھے۔اگر لڑنے کے ارادہ سے جاتے تو واپس کیوں آتے۔

آنحضرت ﷺ مقام بدؔر میں پہنچ کر آٹھ روز تک کفار کے منتظر رہے۔آٹھویں روز معبد بن ابی معبد خزاعی نے آکر اطلاع دی کہ ابوسفیان مکہ سے روانہ ہو کر اور مقام عسفان تک پہنچ کر پھر واپس چلا گیا ہے۔آپ ﷺ یہ سن کر بدؔر سے مدینہ کو واپس تشریف لے آئے۔اس میں مالِ غنیمت تو مسلمانوں کے ہاتھ نہ آیا لیکن ان ایام میں چونکہ بدؔر میں میلہ لگتا تھا اس لیے مسلمانوں نے تجارت کے ذریعے فائدہ اُٹھالیا۔

9.6 غزوہ بنو مصطلق

شعبان 5ھ میں خبر پہنچی کہ بنو المصطلق کا سردار حارث بن ضرار جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔اور وہ عرب کے دوسرے قبائل کو اپنا شریک بنا رہا ہے۔کہ آؤ مسلمانوں پر حملہ کرنے میں میرے ساتھ شریک ہو جاؤ۔آنحضرت ﷺ نے تحقیق حال کے لیے بریؔدہ بن حصیب اسلمیؓ کو بطور ایلچی روانہ کیا۔حضرت بریدہؓ نے واپس آکر اطلاع دی کہ حارث بن ضرار اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی پر تُلا ہوا ہے۔اُس نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور کسی طرح لڑائی اور حملہ سے باز آنا نہیں چاہتا۔ساتھ ہی خبر پہنچی کہ حارث اپنے لشکر کو لے کر روانہ ہونے والا ہے۔آنحضرت ﷺ نے فوراً مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا۔مدینہ میں زید بن حارث کو عامل مقرر کیا۔اور لشکرِ اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے۔اس لشکر میں تیس گھوڑے تھے جن میں دس مہاجرین کے اور بیس انصار کے تھے۔مہاجرین اور انصار کے جدا جدا عَلم تھے۔انصار کا علم سعد بن عبادہؓ کے

ہاتھ میں تھا اور مہاجرین کے علمبردار حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو مقدمۃ الجیش مقرر فرمایا گیا۔ چونکہ متواتر حملوں میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوتی ہوئی دیکھی تھی لہٰذا اس مرتبہ مالِ غنیمت کی طمع میں عبداللہ بن اُبی بھی اپنی جماعتِ منافقین کے ساتھ شریک ہو گیا۔

یہ منافق لوگ چونکہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے اس لیے ان کو تمام اسلامی حقوق حاصل تھے اور شریکِ لشکر ہونے سے وہ منع نہیں کیے جاسکتے تھے۔ یہ سب سے پہلا موقع تھا کہ عبداللہ بن ابی اور اُس کی جماعتِ منافقین لشکرِ اسلام کے ساتھ بغرض قتال روانہ ہوئی۔ جنگِ احد میں تو یہ لوگ راستے ہی سے لوٹ کر چلے آئے تھے اور شریکِ جنگ نہ ہوئے تھے۔ حارث بن ضرار نے ایک جاسوس روانہ کیا تھا۔ یہ جاسوس راستے میں اتفاقاً لشکرِ اسلام کے قریب پہنچا اور گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب اس کا جاسوس ہونا تحقیق ہو گیا اور اسلام لانے سے بھی اس نے انکار کیا تو رسمِ عرب اور جنگی آئین کے موافق اس کے قتل کا حکم صادر ہوا۔ اور وہ قتل کیا گیا۔ حارث کو جب اپنے جاسوس کے قتل ہونے اور آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچنے کی خبر پہنچی تو وہ بہت پریشان اور بدحواس ہوا۔

آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت فاروقؓ کو حکم دیا کہ تم آگے بڑھ کر ان کو اسلام کی دعوت دو۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے آگے بڑھ کر اُن کو تبلیغِ اسلام کی۔ انہوں نے اس کا سختی سے انکاری جواب دیا۔ اس کے بعد طرفین سے حملہ آوری ہوئی۔ کفار کا علَم بردار حضرت ابوقتادہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ علمبردار کے گرتے ہی کفار کے پاؤں یک لخت اُکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر مسلمانوں کے سامنے سے بھاگ گئے۔ جو آدمی کفار کے گرفتار ہوئے اُن میں جویریہ یعنی سالارِ لشکر کی بیٹی بھی گرفتار ہوئی بہت سا مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

اس سفر سے واپسی میں ایک اور قابلِ تذکرہ واقعہ افک پیش آیا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی سفر میں ہمراہ تھیں۔ ایک منزل پر لشکر نے قیام کیا۔ وہاں سے روانگی کے وقت حضرت عائشہؓ کا ہودج اونٹ پر رکھ دیا گیا۔ اور یہ محسوس نہ ہوا کہ ہودج میں ہیں یا نہیں حالانکہ وہ رفع حاجت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ اُن کو وہاں کسی قدر دیر اس وجہ سے لگی کہ وہ اپنی ہمشیرہ کا ایک ہار پہنے ہوئے تھیں، اتفاقاً اُس ہار کا ڈورا کسی جھاڑی میں اُلجھ کر ٹوٹ گیا اور موتی بکھر گئے۔ چونکہ پرائی چیز تھی اس لیے اور بھی زیادہ اس کا خیال ہوا۔ زمین پر سے موتیوں کے چننے میں وقت زیادہ صرف ہو گیا۔ لشکر اس عرصہ میں روانہ ہو گیا۔ آپؓ واپس تشریف لائیں تو قیام گاہ کو خالی پایا۔ بہت متردّد اور پریشان ہوئیں۔ اسی عرصہ میں صفوان بن معطلؓ اپنا اونٹ لیے ہوئے پیچھے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ صفوان بن معطلؓ کے سپرد یہ خدمت تھی کہ وہ سب سے پیچھے قیام کریں اور قافلہ کی روانگی کے بعد سب سے بعد میں قیام گاہ کا معائنہ کرتے ہوئے روانہ ہوں کہ اگر کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہے تو اُس کو اُٹھاتے لائیں۔ اور اس طرح کسی کا کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔ صفوانؓ کو یہ خدمت اس لیے بھی سپرد کی گئی تھی کہ وہ کثیر النوم بھی تھے اور دیر میں سوتے ہوئے اُٹھتے تھے۔ حسبِ دستور صفوانؓ قیام گاہ کا معائنہ کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے ام المؤمنینؓ کو دیکھا تو متاسف وششدر رہ گئے۔ فوراً اپنے اونٹ سے اُترے، ام المؤمنینؓ کو اونٹ پر بٹھایا۔ اور اس کی مہار پکڑ کر روانہ ہوئے اور لشکر سے جا ملے۔ جب اپنے لشکر میں اس طرح پہنچنے اور لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ سب متاسف ہوئے لیکن منافقین کو بڑا اچھا موقع باتیں بنانے اور بہتان باندھنے کا مل گیا۔ منافقوں نے طرح طرح کی باتیں کر کے لشکر میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ آنحضرت ﷺ بہت متردّد اور خاموش تھے۔

غرض منافقوں نے اس مرتبہ شریکِ لشکرِ اسلام ہو کر مسلمانوں کو اپنی شرارتوں سے پریشان کرنے کا خوب موقع پایا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر منافقوں نے جو بہتان باندھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ تقریباً ڈیڑھ ماہ اپنے والد کے یہاں رہیں اور مسلمانوں کو عام طور پر حضرت صدیقہؓ کی عصمت وعفت اور مظلومی کا یقین ہو گیا۔ ایک مہینے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن کی پاک دامنی وبے گناہی کا حکم نازل ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے

عائشہ صدّیقہؓ کے صدیقہ ہونے کی گواہی دی۔اس سے پیشتر ایک اور صدیقہ یعنی حضرت مریم پر بھی اسی قسم کا بہتان لوگوں نے باندھا تھا۔وہ بھی خائب وخاسر ہوئے اوراس صدیقہ پر بہتان باندھنے والوں کا انجام بھی خسران وہلاکت ہی ہوا۔

اس سفر میں منافقوں نے جو جو شرارتیں کیں،اُن کا علم آنحضرت ﷺ کو ہوتا رہا۔ابھی مدینہ منورہ میں داخل نہ ہوئے تھے کہ ایک صحابی نے عبداللہ بن اُبی منافق کی بدکلامیوں کا ذکر کرکے استدعا کی کہ اس منافق کے قتل کا حکم صادر فرمایا جائے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی چونکہ بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس لیے اگر اس کو قتل کیا گیا تو لوگ کہیں گے کہ محمد(ﷺ) اپنے دوستوں کو قتل کرنے لگے۔عبداللہ بن ابی کا بیٹا سچا مسلمان تھا جن کا نام عبداللہ بن عبداللہ بن ابی تھا۔عبداللہ بن عبداللہ کو جب معلوم ہوا کہ میرے باپ کی کشتنی وگردن زنی ثابت ہوچکی ہے تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اورعرض کیا کہ عبداللہ بن اُبی یعنی میرے باپ کے قتل کرنے کی خدمت میرے سپرد کی جائے تاکہ میں اُس کا سر کاٹ کرلاؤں اور یہ ثابت ہوجائے کہ اسلام باپ سے زیادہ قیمتی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں،میں عبداللہ بن ابی کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے وقت عبداللہ بن ابی کے بیٹے نے خود باپ کو مدینہ کے اندر داخل ہونے سے روک دیا اور کہا کہ تو منافق ہے اس لیے تجھ کو مدینہ میں داخل نہ ہونے دوں گا۔آنحضرت ﷺ کو جب معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے متعلق حکم دیا کہ اس کو مدینہ میں آنے دو۔

بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی جویریہؓ ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔حارث چندروز بعد خود مدینے میں آئے۔اوراپنی بیٹی کو آزاد کرانے کی خواہش ظاہر کی۔آپ ﷺ نے جویریہؓ کو خود فدیہ دے کر رہا کرادیا۔جویریہؓ نے باپ کے ہمراہ جانے کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔آپ ﷺ نے جویریہؓ کی منشا کے موافق اور حارث کی رضامندی سے جویریہؓ کے ساتھ نکاح کرلیا۔اس نکاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ نے بنی المصطلق کے تمام اسیروں کو یہ کہہ کر آزاد کردیا کہ جو قبیلہ آنحضرت ﷺ کا رشتہ دار بن گیا ہے ہم اس کو قیدی یا غلام نہیں رکھ سکتے ۔ساتھ ہی تمام مال غنیمت بھی واپس کردیا۔اس طرح یہودیوں کے ایک قبیلہ کے ساتھ اس نکاح کی وجہ سے دشمنی کی جگہ محبت پیدا ہوگئی۔

9.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جنگ احد میں مسلمانوں کو اپنے درمیان رہنے والے منافقین کی پہچان ہوئی جو بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں کفران کے رگ وپے میں بسا ہوا تھا۔
- جنگ احد میں مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ نبیؐ کے حکم کی نافرمانی مصیبت اور پریشانی کا سبب بنتی ہے جس سے جیتی ہوئی لڑائی میں بھی ہار ہوجاتی ہے۔
- جنگ احد میں مسلمانوں کے ایمان ویقین کا بھی امتحان ہوگیا۔
- جنگ بدر کو قرآن کریم نے یوم الفرقان کے نام سے ذکر کیا ہے۔
- جنگ بدر نے دنیا کو یہ بھی بتایا کہ افراد کی کثرت وقلت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ بلکہ ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال چند افراد بھی بڑے سے بڑے گروہ کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔
- جنگ بدر مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ تھی جس نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بڑھایا اور کفار کی ہمتوں کو پست کیا جس سے مکہ اور

مدینہ کے اردگرد مذہب اسلام لاثانی طاقت کی حیثیت سے ابھرا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

- غزوہ احزاب کا نام غزوہ خندق بھی ہے۔
- احزاب حزب کی جمع ہے بمعنی جماعت چوں کہ اس غزوہ میں بہت سی جماعتیں مسلمانوں کے خلاف جمع ہوگئی تھیں اس لیے اس کا نام احزاب ہے۔
- خندق گڈھے اور کھائی کو کہتے ہیں چوں کہ اس غزوہ میں مدینہ کے گرد خندق کھودی گئی تھی اس لیے اس کا نام خندق بھی ہے۔
- بنو قریظہ نے مسلمانوں کے حلیف ہونے کے باوجود غداری کی تھی۔

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. غزوہ بدر میں لشکر کفار کی کمان کس کے ہاتھوں میں تھی؟

a. ابوسفیان b. ابوجہل c. عتبہ d. ولید

2. بدر کس کا نام تھا؟

a. ایک شہر کا b. ایک گاؤں کا c. ایک پہاڑ کا d. ایک وادی کا

3. جنگ احد کب ہوئی تھی؟

a. 2ھ میں b. 3ھ میں c. 4ھ میں d. 5ھ میں

4. عبداللہ بن ابی جنگ احد سے اپنے جن ساتھیوں کے ساتھ واپس ہوا ان کی تعداد کتنی تھی؟

a. 200 b. 300 c. 400 d. 500

5. احد کی گھاٹی پر آپ ﷺ نے جن 50 تیز اندازوں کو مقرر کیا تھا، ان کے سردار کون تھے؟

a. عبداللہ بن جبیر b. عبداللہ بن عباس d. عبداللہ بن مسعود d. ابی ابن کعب

6. مقام روحا میں ابوسفیان کو حضور ﷺ کے آنے کی خبر پہنچانے والے شخص کا کیا نام تھا؟

a. معبد بن ابی معبد b. عقبہ بن ابی معیط c. عتبہ بن ربیعہ d. سب غلط

7. غزوہ احزاب کے موقع پر کفار کے فرار ہونے کی خبر کس نے لایا تھا؟

a. حذیفہؓ ابن الیمان b. عبداللہؓ بن مسعود c. عبداللہؓ بن مسعود d. عامر بن فہیرہ

8. غزوہ احزاب میں خندق کھودنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟

a. سلمان فارسیؓ b. عبداللہؓ بن رواحہ c. صہیب رومیؓ d. اخنسؓ ابن شریک

9. غزوہ احزاب میں کھودی گئی خندق کی گہرائی کتنی تھی؟

a. 3 گز b. 5 گز c. 6 گز d. 7 گز

10. خندق کھودنے والے صحابہ کی تعداد تھی:

a. ایک ہزار　b. دو ہزار　c. تین ہزار　d. چار ہزار

9.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. غزوۂ بدر کے اسباب بیان کیجیے۔
2. غزوۂ سویق پر اپنی معلومات قلمبند کیجیے۔
3. غزوۂ بنو مصطلق پر نوٹ لکھیے۔
4. غزوۂ اُحد میں تیراندازوں کا کیا کردار تھا؟ بیان کیجیے۔
5. غزوۂ احزاب کے اسباب بیان کیجیے۔

9.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. غزوۂ بدر پر ایک مفصل نوٹ لکھیے۔
2. غزوۂ احد کب اور کن حالات میں پیش آیا؟ مفصلاً تحریر کیجیے۔
3. غزوۂ احزاب کا واقعہ تحریر کیجیے۔

9.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	سیرۃ النبی (جلد اول)	:	علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2.	تاریخ اسلام (جلد اول)	:	شاہ اکبر خاں صاحب نجیب آبادی
3.	سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم)	:	مولانا محمد ادریس کاندھلوی

-:oOo:-

اکائی 10 : اہم غزوات (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقصد
10.2		صلح حدیبیہ
10.3		غزوہ خیبر
10.4		غزوۂ موتہ
10.5		فتح مکہ
10.6		غزوہ حنین
10.7		غزوہ تبوک
10.8		اکتسابی نتائج
10.9		نمونہ امتحانی سوالات
	10.9.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	10.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	10.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
10.10		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید

اس اکائی میں اسلام کے مشہور غزوات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کا مشاہدہ کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بیشتر حصہ دشمنان اسلام، کفار، یہود و نصاری اور منافقین سے جنگ وجدال میں صرف ہوا، یہ غزوات کیوں اور کن حالات میں پیش آئے، نیز صلح حدیبیہ میں کیسے دشمن کی منہ مانگی شرائط کو تسلیم کرکے دس سال کے لیے صلح کر لی، خیبر کے یہودی جو کہ اپنی سازشوں اور شرارتوں سے مسلمانوں کو پریشان کررکھا تھا، ان کو اپنی طاقت وقوت پر بے جا فخر تھا اور وہ یہ اندازہ کیے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو آسانی سے زیر کردیں گے لیکن جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے کیسے خیبر کو فتح کیا، اسی طرح غزوہ موتہ دراصل مسلمانوں کے صبر واستقلال، نظم وضبط اور ایمان کی پختگی کا امتحان تھا اور یہ جنگ کیسے عیسائی ممالک کی فتوحات کا سبب بنیں، جیسا کہ فتح مکہ مسلمانوں کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی، مکہ جہاں سے مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم کی

ساری حدوں کو عبور کیا گیا ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ مکہ چھوڑ دیں یا اسلام سے منحرف ہو جائیں، لیکن آج اسی جگہ پر فاتحانہ اور اللہ کا شکر بجالاتے ہوئے پوری آب و تاب کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ ان ساری تفصیلات کو پڑھیں گے۔

10.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ جان سکیں کہ اسلام جب خستہ حالت میں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے اپنا دفاع کیا لیکن بعد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپ نے عام معافی کا اعلان کیا، آپ ﷺ نے جنگ کے میدان میں جو حکمت عملی اختیار کی مثلاً لشکر کی ترتیب، حساس مراکز پر تعیناتی، جنگی پلاننگ وغیرہ کیا طریقہ کار اپنایا، اور ان کے کیا نتائج سامنے آئے۔ انہی غزوات کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن و امان قائم کیا، آپ دیکھیں گے کہ تمام غزوات کا تعلق مدنی زندگی سے ہے، آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے جنگی معنی بدل دیئے، جانور، درخت، کھیتی، کو تباہ و برباد کرنے سے روکا، عورتوں، بچوں اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والوں مردوں سے باز پرس کرنے سے منع فرمایا، فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی زخمی پر حملہ نہ کرو، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرو، اور کسی قیدی کا قتل نہ کرو۔'' آپ کے سامنے مختصر تعارف لانا اس اکائی کا مقصد ہے۔

10.2 صلح حدیبیہ (ذوقعدہ 6ھ مطابق 628ء)

کعبۃ اللہ اسلام کا مرکز تھا، دین ابراہیمی کی یادگار تھا اور اہل عرب کا عام قبلہ تھا، تمام ہی اہل عرب اسے اپنا مشترک ورثہ سمجھتے تھے، قبائل عرب سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے کیوں کہ ان کے یہاں اب لڑائی کسی مقصد کے لیے نہیں بلکہ لڑائی ہی خود ایک مقصد بن گئی تھی، ذریعہ معاش کی کمی، ضروریات زندگی میں پریشانی اور کسی قاعدے و قانون کے نہ ہونے سے اہل عرب میں جنگ کی عادت اس قدر راسخ ہوگئی تھی کہ عرب اس قتل و غارت گری اور لوٹ مار کو اپنے مفاخر میں شمار کرنے لگے تھے، لیکن اشہر حرم (وہ چار مہینے جن میں لڑائی نہ کرتے تھے) کے آتے ہی لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، قبائل عرب دور دور سے آکر ان مہینوں میں عبادت کیا کرتے تھے۔ مسلمان کفار قریش کے مظالم سے پریشان ہو کر مکہ سے چلے تو گئے تھے لیکن بہر حال ان کا محبوب وطن تو تھا اور کعبہ پر بھی ان کا کم سے کم اور قبائل کے برابر تو حق تھا ہی جو ان کو رہ رہ کر یاد آتا رہتا تھا۔

شوال 6ھ میں اللہ کے رسول نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں اس خواب نے خانہ کعبہ کی زیارت کی اس آرزو کو اور تحریک دی کیوں کہ مسلمان چھ سال سے اس کی زیارت سے محروم تھے چنانچہ آپ ﷺ چودہ سو صحابہ کی رفاقت میں عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ سے 9 میل پہلے مقام حدیبیہ میں پڑاؤ ڈالا (یہاں ایک کنواں تھا جس کو حدیبیہ کہتے تھے اس کنویں کے نام پر اس گاؤں کا نام حدیبیہ ہوا اور چوں کہ معاہد صلح بھی اس جگہ لکھا گیا اس لیے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں) اور حضرت عثمان غنیؓ کے ذریعہ اہل مکہ تک پیغام بھجوایا کہ مسلمان عمرہ کرنا چاہتے ہیں لڑنے کی نیت سے نہیں آئے ہیں۔ قریش نے حضرت عثمان غنیؓ کو نظر بند کر لیا ادھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا، اس خبر نے مسلمانوں کو صدمہ میں ڈال دیا تب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا بدلہ لیا جائے گا اور آپ ﷺ نے ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام ہی صحابہ نے انتہائی جوش و جذبہ کے ساتھ دست مبارک پر جان نثاری کا عہد کیا، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ بیعت رضوان کے عنوان سے مذکور ہے جو قرآن کریم کی سورہ فتح میں اس طرح سے بیان ہوا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ

السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً .وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزاً حَكِيماً۔(الفتح:19-18)

(تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے پھر معلوم کیا جو ان کے جی میں تھا پھر اتارا ان پر اطمینان اور انعام دیا ان کو ایک فتح کا نزدیک۔اور بہت سی غنیمتیں جنھیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔

بدیل بن ورقہ خزاعی بنی خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ مسلمانوں کے طرفدار ہیں۔آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ قریش کو یہ خبر بھجوائی کہ ہم لڑنے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں بلکہ صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔بدیل بن ورقہ نے قریش کے پاس آکر حضور ﷺ سے سنی ہوئی ساری بات بتادی۔جواب میں عروہ بن مسعود نے کہا کہ ہمیں خود جا کر محمدؐ سے اس کی غرض اور منشا معلوم کرنی چاہئے۔عروہ نے کافی تفصیل سے حضورؐ سے بات کی۔اس نے کافی قریب سے حضورؐ کے اصحاب کا طرزِ عمل دیکھا اور حضورؐ کے تئیں صحابہؓ کی عقیدت ووارفتگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔قریش کے پاس واپس آکر اس نے کہا کہ میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں،لیکن بخدا جس قدر محمدؐ کے دوست محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں ویسی تعظیم کہیں نہیں دیکھی کہ وضو کے پانی کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی محمدؐ کے دوست اس کو اچک لیتے ہیں اور اس پانی کو اپنے ہاتھ چہرہ اور جسم پر ملتے ہیں۔اگر کوئی بات محمدؐ کی زبان سے نکلتی ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے سب دوڑ پڑتے ہیں۔اے قریش! محمدؐ نے جو بات کہی ہے اس کو مان لو اور اُنہیں عمرہ کرنے دو۔پھر قریش نے حُلیس کو بھیجا۔حلیس نے واپس آکر قریش سے کہا کہ کیا خدا کے گھر سے اس شخص کو روکا جائے گا جو اس کی تعظیم کے لیے آیا ہے۔قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے تم محمدؐ کو موقع دو کہ وہ جو کرنا چاہتے ہیں کریں۔

اس تاریخی بیعت نے کفار مکہ کے قلوب میں وہ ہیبت طاری کردی کہ انہوں نے سہیل بن عمرو (ابو یزید) کو اپنا قاصد بنا کر اس مقصد سے مسلمانوں کے پاس بھیجا کہ وہ مصالحت کرلیں (سہیل بن عمرو نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے،لوگوں نے ان کو خطیب قریش کا خطاب دے رکھا تھا) چنانچہ سہیل بن عمرو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور دیر تک شرائط صلح پر گفتگو ہوتی رہی،حضورؐ نے اس سے کہا کہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اور کعبۃ اللہ کے درمیان تم لوگ رکاوٹ نہ بنو۔سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر ہم نے اجازت دی تو سارا عرب یہ کہے گا کہ ہم تم سے ڈر گئے اس لیے تم لوگ آئندہ سال آکر طواف کرسکتے ہو۔بالآخر چند شرائط پر اتفاق ہوا اور اللہ کے رسول نے حضرت علی کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ لکھ دیں۔

شرائط صلح:

1. مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔
2. اگلے سال آئیں اور صرف تین روز قیام کر کے عمرہ ادا کریں گے۔
3. ہتھیار لگا کر نہ آئیں،صرف تلوار ساتھ لائیں وہ بھی نیام میں ہوگی۔
4. صلح کی میعاد دس سال ہوگی۔اس عرصہ میں کوئی فریق دوسرے فریق کی جان و مال سے قطعاً متعرض نہ ہوگا۔
5. عرب کی ہر ایک قوم اور قبیلے کو اختیار ہوگا کہ وہ جس فریق کے ساتھ چاہے ہم عہد ہو جائے،ان ہم عہد قبائل پر بھی اس صلح نامہ کی شرائط کا نفاذ ہوگا۔

6. اگر قریش میں سے کوئی شخص بلا اجازت اپنے ولی کے مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا تو قریش کی طرف واپس کیا جائے گا، لیکن اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس آجائے گا تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

معاہدہ صلح کی شرائط مسلمانوں کے خلاف تھی جس کی وجہ سے یہ صحابہ کرام کو سخت ناگوار وگراں معلوم ہو رہی تھیں مزید برآں یہ ہوا کہ ابھی معاہدہ لکھا ہی جارہا تھا کہ خود سہیل کا بیٹا ابو جندل جو مسلمان ہو گیا تھا اور یہ کفار کے نزدیک بڑا جرم تھا جس کی وجہ سے کفار نے ان کو سخت جسمانی ایذائیں دیں تھیں جن کے نشان بھی ان کے جسم پر موجود تھے وہ اللہ کے رسول کے پاس کفار کی قید سے نکل کر آ گئے اور مدینہ چلنے کی فریاد کرنے لگے سہیل نے کہا کہ شرائط معاہدہ کے مطابق ابو جندل کو واپس کیا جائے، اللہ کے رسول ﷺ نے سہیل کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر ابو جندلؓ ان کے والد کو واپس کر دیئے گئے اور والد نے ان کو وہیں سے مارنا شروع کر دیا، اس نظارہ کو دیکھ کر صحابہ بے تاب ہو گئے اور حضرت عمر نے خدمت اقدس میں عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ نبی برحق نہیں، کیا ہم مسلمان نہیں؟ کیا وہ لوگ مشرک نہیں پھر ہم دین کے معاملہ میں ایسی ذلت کیوں برداشت کریں گے اللہ کے رسول ﷺ نے عمر کے ہر سوال کا جواب دینے کے بعد فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں بد عہدی نہیں کر سکتا اس کے بعد حضرت عمرؓ کا غصہ فرو ہو گیا اور زندگی بھر اپنی اس جرات و گستاخی پر پشیمان رہے۔

صلح حدیبیہ کی صلح بظاہر دب کر کی گئی تھی اسی وجہ سے مسلمان اپنے کو کمزور اور دبا ہوا محسوس کر رہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی نگاہِ بصیرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ صلح فتح مبین کی تمہید ہے اور مسلمان نے بھی دیکھ لیا کہ وہ کمزور شرائط ہی بہت جلد مفید شرائط نظر آنے لگیں کیوں کہ اس صلح کا سب سے خوشگوار پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کو دشمنوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کا موقع ملا اور اس طرح زبان و بیان کے ذریعہ دین کی اشاعت کا ایک وسیع میدان صحابہ کرام کو مل گیا اس لیے کہ کوئی بھی فرقہ، تنظیم و جماعت یا مذہب جس قدر امن و امان کی حالت میں اپنا دائرہ وسیع کر سکتا ہے اتنا لڑائی اور جنگ و جدال کی حالت میں نہیں کر سکتا چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد دوگنی ہو گئی تھی اس لیے کہا گیا کہ یہ صلح فتح مبین کی تمہید ہے۔ جس کا اعلان قرآن کریم میں ان الفاظ میں ہے: اِنَّا فَتَحنَا لَکَ فَتحاً مُبِیناً۔

عصر حاضر میں اس صلح کی معنویت اس طرح سے ہے کہ صلح حدیبیہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کے خواب کی عملی شکل کی راہ میں پیش آنے والا ایسا انقلابی واقعہ ہے جس نے تاریخ اسلام میں ایک سنہرے دور کا آغاز کیا اور دنیائے انسانیت کو ایک ایسا درس دیا جس میں بظاہر شکست کی شکل میں فتح کا راز مضمر تھا، جس نے لوگوں کو جذبات کے بجائے دانش مندانہ اور حکمت سے بھرپور طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دی۔

صلح کی تمام شرطوں کے لکھے جانے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ اونٹ کی قربانی پیش کرو اور حلق کراؤ لیکن صحابہؓ کے غصہ کا یہ عالم تھا کہ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ پھر بالآخر حضور ﷺ نے خود نحر اور حلق کرایا تو صحابہؓ نے بھی آپ ﷺ کی تقلید کی اور حلق کرایا اور پھر مدینہ کی طرف مسلمان لوٹ گئے۔ راستہ میں مسلمانوں کو فتح مبین کی بشارت سنا کر ان کا غصہ اور غم ہلکا کیا گیا۔

صلح حدیبیہ جو بظاہر شکست کی شکل میں تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے اس صلح کے ذریعہ اپنی بے بسی اور کمزوری کا اعتراف کر لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صلح سے فتوحات اسلامی کا آغاز ہوا اور بعثت رسول ﷺ کے عظیم مقصد کی تکمیل ہوئی جس کا اظہار اللہ نے ان الفاظ میں کیا:

هُوَ الَّذِیٓ أَرسَلَ رَسُولَهُ بِالهُدَی وَدِینِ الحَقِّ لِیُظهِرَهُ عَلَی الدِّینِ کُلِّهِ۔ (الصّف: 9)

(وہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس دین کو تمام

ادیان پر غالب کردے)۔

اس صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک آپس میں جنگ نہیں ہوگی،اس شرط کا مثبت اثر یہ ہوا کہ کفار مکہ تردد اور خوف کے بغیر مدینہ آنے لگے،اس طرح قریب سے اُنہیں مسلمانوں کے اخلاق وکردار اور عادات واطوار کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا جو ان کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنا۔

اس جنگ بندی کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اب تک قریش کے ساتھ جنگی الجھنوں میں پھنسنے کی وجہ سے مکہ اور مدینہ کے علاوہ دوسرے علاقوں اور ملکوں کی طرف آنحضرت ﷺ کو توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔جب قریش کی طرف سے اطمینان ہوا تو آپ ﷺ نے مختلف ملکوں کے سربراہوں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط ارسال کئے، چنانچہ دعوتی مشن کے تحت آپ ﷺ نے قیصر روم کے نام حضرت دحیہ کلبیؓ کے ذریعہ،کسریٰ کے نام حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے ذریعہ،بحرین کے حاکم منذر بن ساوی کے پاس حضرت علاء بن حضرمیؓ کے ذریعہ،شاہ مصر مقوقس کے پاس حاطب ابن ابی بلتعہؓ کے ذریعہ اور شاہ حبش نجاشی کے پاس عمرو بن امیہ الضمری کے ذریعہ دعوتی خطوط بھجوائے۔ان سب کے علاوہ آپ ﷺ نے امیر بُصری،امیر دمشق ،شاہ یمامہ اور دوسرے سربراہوں کو بھی دعوت اسلام کے خطوط بھیجے اور اُنہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ان میں سے بعض نے اسلام قبول کیا مثلاً شاہ حبش اور منذر بن ساوی وغیرہ نے اپنی قوم کے ساتھ اسلام قبول کرلیا اور بعض نے اسلام کی طرف میلان ظاہر کیا اور بعض نے علی الاعلان دشمنی ظاہر کی جیسا کہ کسریٰ کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے آپ ﷺ کے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔ان دعوتی خطوط کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب کی سرحد سے باہر بھی اسلام متعارف ہوگیا اور ایک دین کی حیثیت سے اسے تسلیم کیا جانے لگا۔یہ بعثت رسول ﷺ کے مقصد کی تکمیل کی طرف بڑا قدم تھا کیوں کہ اسلام صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم پر چھا جانے کے لیے آیا تھا۔عملی طور پر اس کا اثر بھی نظر آنے لگا،چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال کے عرصہ میں اس قدر مسلمان ہوئے جتنے کہ ابتدائے اسلام سے سولہ سال کے عرصہ میں ہوئے تھے۔اسی لیے اللہ نے اس صلح کو فتح سے تعبیر کیا تھا۔یہ اور بات ہے کہ شکست جیسی صلح کو فتح سمجھنا انسانی عقل سے بالاتر بات تھی اسی لیے حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے دریافت فرمایا:او فتح ھذا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ہاں یہ فتح ہے۔

صلح کی ایک شق یہ بھی تھی کہ جو شخص یا قبیلہ مسلمانوں سے دوستی کرنا چاہئے وہ مسلمانوں سے دوستی کرسکتا ہے اور جو چاہے قریش سے دوستی کرسکتا ہے اور اس طرح وہ لوگ بھی اس صلح کا حصہ ہوں گے۔

چنانچہ بنوخزاعہ نے مسلمانوں کی مصاحبت اختیار کی جب کہ بنوبکر نے قریش کے ساتھ جانا بہتر سمجھا۔لیکن بنوبکر نے صلح سے انحراف کرتے ہوئے بنوخزاعہ پر حملہ کردیا اور کئی لوگوں کو قتل کردیا۔اس عہد شکنی میں قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا۔اس طرح صلح حدیبیہ کی قریش نے صریح خلاف ورزی کی اور جنگ بندی کا معاہدہ توڑ دیا۔اس کے نتیجے میں حضور ﷺ نے دس ہزار افراد کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور بغیر کسی بڑی لڑائی کے مکہ فتح ہوگیا۔

اگر غائرانہ نظر سے صلح حدیبیہ کی شرطوں اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف ہوجائے گی کہ حضور ﷺ کی نظر نے پہلے ہی اس کے مفید اثرات کو بھانپ لیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے اختلاف اور غصہ کے باوجود آپ ﷺ نے قریش مکہ کے ساتھ مصالحت کی راہ اختیار کی۔اور بالآخر وہ پورا مکہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا جس کے ایک حصے کعبۃ اللہ میں جانے سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا۔

آج جب کہ پورے عالم میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف دشمن طاقتیں نبرد آزما ہیں طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہیں اور ان

کوصفحہ ہستی سے مٹانا چاہتی ہیں،صلح حدیبیہ ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ تشدد اور جبر واکراہ اور جذبات کے بجائے حکمت ودانشمندی اورعقل مندانہ طرزِ عمل کے ذریعہ ہی عالم کے قلوب کو مسخر کیا جاسکتا ہے۔

10.3 غزوہ خیبر (محرم 7ھ مطابق 629ء)

خیبر مدینہ منورہ سے آٹھ منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ یہودی قوت کا انتہائی اہم اور بڑا مرکز تھا۔ یہاں انہوں نے کئی مضبوط قلعے بنا رکھے تھے جن کی تعداد کتب تاریخ میں چھ مذکور ہے۔وہ اہل خیبر ہی تھے جنہوں نے کفار مکہ اور دشمنان اسلام کو غزوہ خندق کے لیے ابھارا اوراس کے لیے خیبر کے وفد نے مدینہ کے قریب تمام دشمنان اسلام سے ملاقات کی اور ایک مقررہ وقت پر مدینہ کا رخ کیا تاکہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا سکیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے دفاعی اقدام اختیار کرتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے دشمنان اسلام کے خوابوں کو چکنا چور کردیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ کو مشرکین کی جانب سے تواطمینان حاصل ہوگیا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ خیبر کے علاقے میں مسلمانوں کے استیصال کی تیاریاں ہورہی ہیں، مدینہ سے جلاوطن ہونے والے قبیلہ بنونضیر وقریظہ اس جگہ آکر مقیم ہوئے اوران کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عداوت ودشمنی کے انگارے بھڑک رہے تھے اس لیے انہوں نے یہاں کے مقامی یہود کو بھی مسلمانوں کے خلاف تیار کرلیا جس کی وجہ سے خیبر اب مکہ کے بعد مسلمانوں کی عداوت کا سب سے بڑا مرکز بن کر ابھرا، قبیلہ غطفان کو انہوں نے اس شرط کے ساتھ اپنے ساتھ شریک کرلیا تھا کہ مدینہ کی نصف پیداوار تم کو دی جائے گی۔ایسے ہی انہوں نے مدینہ میں رہے منافقین کو اپنا شریک وسہیم بنالیا تھا جس سے یہ دور بیٹھے ہوئے بھی مسلمانوں کی ہر ہر حرکت سے باخبر تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کردیا کہ جو لوگ صلح حدیبیہ کے وقت موجود تھے وہی لوگ اس جنگ میں شریک ہوں گے اوراس کے مال غنیمت میں وہی لوگ حصہ دار ہوں گے جو حدیبیہ میں شامل تھے، قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> **سَیَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلاً**۔(سورہ فتح:15)
>
> (جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔تم ان سے صاف کہہ دینا کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے، اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے۔ یہ کہیں کہ نہیں تم لوگ حسد کررہے ہو بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں)۔

اللہ کے رسول کو جب یہود کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ چودہ سو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔خیبر پہنچتے ہی آپ نے اعلان کیا:''کل میں جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اوراس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اوراس کے رسول محبت کرتے ہیں۔''صبح تمام صحابہ کرام بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اس آرزو اور امید کے ساتھ کہ جھنڈا اسے ہی مل جائے گا،لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جھنڈا حضرت علیؓ کو عطا فرمایا۔ یہود نے میدانِ جنگ میں مسلمانوں سے مقابلہ دشوار سمجھا اور قلعوں میں بند ہوجانے کو اختیار کیا کیوں کہ

ان کے یہ قلعے اس انداز کے تھے کہ صعب بن معاذ کے قلعہ سے دوسرے قلعوں میں آسانی سے مدد پہنچ جاتی تھی۔ بہر حال لشکر اسلام نے سب سے اول قلعہ ناعم پر حملہ کیا اور سخت کوشش و مقابلہ کے بعد یہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا اور اس کے بعد دیگر قلعے بھی ماتحتی میں آ گئے اگر چہ دو کا محاصرہ تقریباً دس روز جاری رہا بالآخر حضرت علی کے ہاتھوں مرحب کا قلعہ بھی لشکر اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ اہل خیبر اپنے اہل و عیال کے ساتھ خیبر چھوڑ کر چلے جانے پر راضی ہو گئے تھے۔ مگر پھر گفت و شنید کے بعد اس شرط پر رہنے کے مجاز قرار پائے کہ زراعت و باغات کی نصف پیداوار وہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے تب یہ حضرت عمر فاروق کے آخر عہد خلافت تک خیبر میں رہے۔ خیبر کے اس غزوہ میں 15 مسلمان شہید ہوئے 4 مہاجر، 11 انصار جب کہ 92 یہودی مارے گئے۔

10.4 غزوۂ موتہ (8ھ مطابق 629ء)

اللہ کے رسول ﷺ نے ان تمام سلاطین کے نام دعوتی خطوط لکھے تھے جن کی سلطنتیں عرب کے ارد گرد واقع تھیں، ان دعوتی خطوط نے اکثر شہنشاہوں کے درباروں میں بہت ہی اچھا اثر کیا لیکن کچھ حکماء جو دشمنوں کی سازش اور مذموم کوششوں سے زیادہ متاثر تھے انہوں نے بجائے دعوت پر صلح و سلامتی کے کان رکھنے کے اور زیادہ مخالفت و عداوت پر مستعد ہو گئے انہیں بدبختوں میں سے ایک شرحبیل بن عمرو غسانی بھی تھا جو علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔

آنحضرت ﷺ نے حارث بن عمیر ازدی کے ہاتھوں ایک خط قیصر روم کے پاس روانہ کیا ابھی یہ قاصد صحابی شام کے قریب مقام موتہ میں پہنچے تھے یہاں کے اس بدبخت حاکم (شرحبیل بن عمرو) جو قیصر روم کی طرف سے اس علاقے کا صوبہ دار تھا ان صحابی رسول کو گرفتار کر لیا اور یہ معلوم کرنے پر کہ آپ ﷺ کا خط لے جا رہے ہیں ان کو شہید کر دیا۔ یہ خبر جب مدینہ پہنچی تو مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا تب اللہ کے رسول نے اس کے قصاص کے لیے تین ہزار صحابہ کی فوج تیار کر کے اس سردار کی سرکوبی کے لیے روانہ کی۔ زید بن حارثہؓ کی قیادت میں، گو کہ یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چوں کہ تمام ہی مہمات کا اصل مقصد تبلیغ اسلام اور دعوت اسلام ہوتا تھا اس لیے ارشاد فرمایا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دینا اگر قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔

جب صحابہ کی یہ فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو منافقوں نے شرحبیل کو اس کی اطلاع دے دی اور اس نے مقابلے کے لیے کم و بیش ایک لاکھ کی فوج تیار کی اور دوسری طرف خود قیصر روم بے شمار فوج لے کر بلقاء کے مقام تاب میں مقیم تھا۔ میدان موتہ میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا ایک طرف ایک لاکھ کا ٹڈی دل لشکر تھا اور دوسری طرف تین ہزار غازیان اسلام تھے۔ حضرت زید بن حارثہ علم ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے یہاں تک کہ شہید ہو گئے اسی طرح حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ان کے بعد لشکر اسلام نے خالد بن ولید کو اپنا سردار مقرر کیا یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی قبول اسلام کے بعد اسلام کے لیے پہلی جنگ تھی آپ نے پے در پے دشمنوں کے اس عظیم لشکر پر کئی سمت سے حملے کیے اور صبح سے شام تک آپ نے اس جوانمردی سے مقابلہ کیا اور شام ہوتے ہوتے رومی بھاگنے لگے مسلمانوں نے کچھ دور تک ان کا تعاقب کیا اور مال غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔

10.5 فتح مکہ (8ھ مطابق 630ء)

صلح حدیبیہ کی بنا پر حلیف بننے کی جو آزادی ملی تھی اس میں قبیلہ خزاعہ مسلمانوں کا حلیف ہو گیا تھا اور ان کے حریف یعنی بنو بکر نے قریش سے معاہدہ کر لیا تھا ان دوؤں حریفوں میں مدت دراز سے مخاصمت تھی مگر ظہور اسلام سے وہ لڑائیاں رک گئی تھی کیوں کہ ظہور اسلام کے وقت سارا زور

شمع اسلام کو بجھانے پر تھا اور جب صلح حدیبیہ نے لوگوں کو سکون کی سانس لینے کا موقع دیا تو بنو بکر کو پھر اپنی پُرانی دشمنی یاد آ گئی اور وہ مسلمانوں کے حلیف یعنی بنو خزاعہ پر حملہ آور ہوئے جس میں رؤسائے قریش نے ان کو علانیہ مدد دی، یہاں تک کہ حدود حرم میں بھی بنو خزاعہ کے لوگوں کا خون بہایا

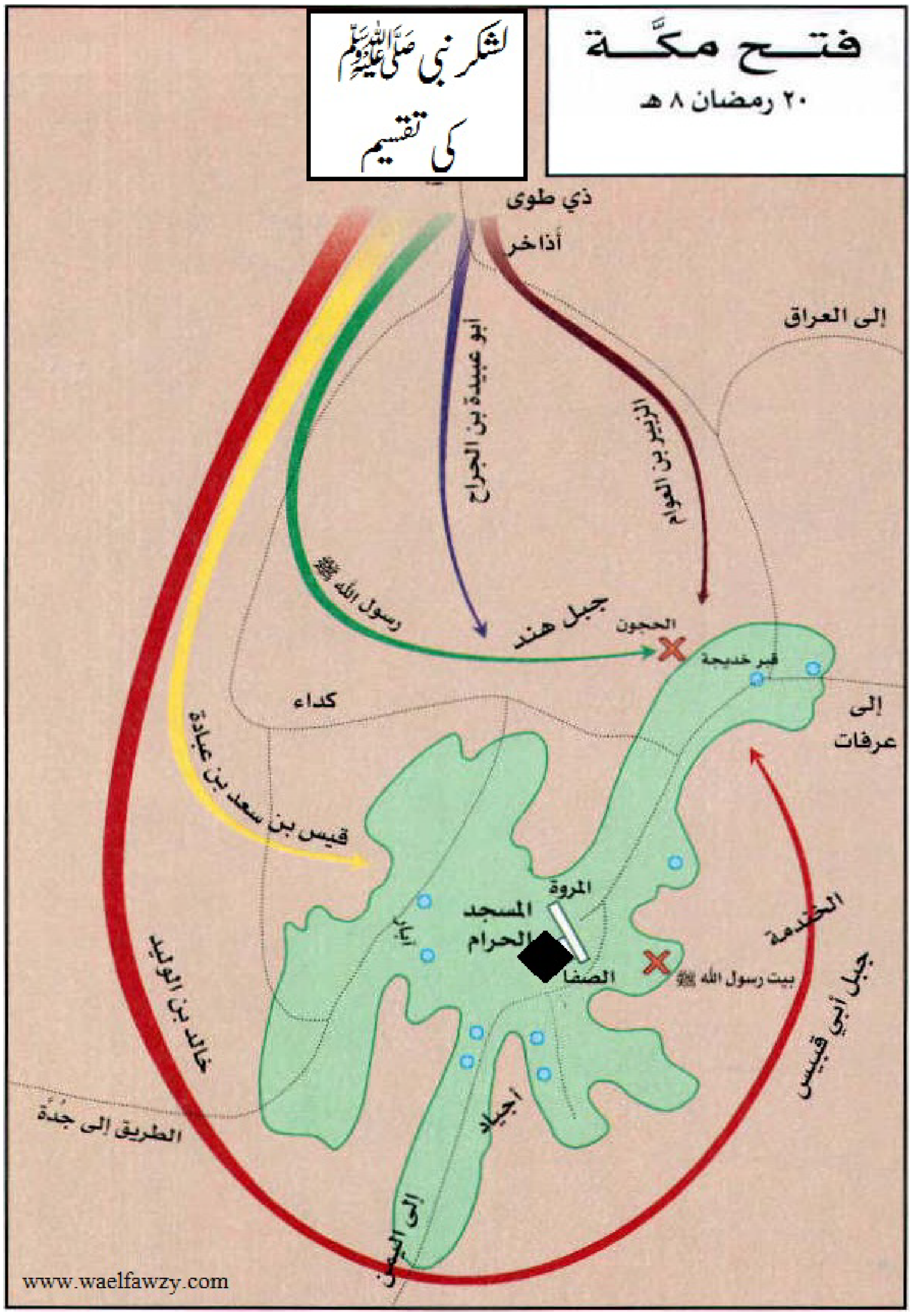

گیا تب قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے اللہ کے رسول سے مدد کی فریاد کی تب آپ ﷺ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے وہ تین شرطیں یہ تھیں:

1. بنو خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

2. قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

3. اعلان کر دیا جائے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قریش نے تیسری شرط مانی یعنی صلح حدیبیہ کا جو معاہدہ تھا وہ ختم کیا جاتا ہے۔ تب اللہ کے رسول ﷺ نے مکہ جانے کی تیاری شروع کی اور اتحادی قبائل کے پاس بھی قاصد روانہ کیے اور 10 رمضان 8ھ کو 10 ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوئے اور مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع مرالظہر ان میں پڑاؤ ڈالا اور یہ فوج دور دور تک پھیل گئی اور اللہ کے رسول کے حکم کے مطابق تمام افواج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام وادی روشن ہوگئی، اب جب لشکر اسلام آگے بڑھا مکہ کی طرف تو اللہ کے رسول نے حضرت عباس سے فرمایا کہ ابوسفیان سردار مکہ کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑ کر دو تا کہ اسلامی لشکر کا جلال اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ مکہ میں داخل ہو کر آپ نے یہ منادی کرا دی کہ ہر شخص رسول ﷺ کے عفو عام کا مستحق بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنا دروازہ بند کر لے یا بیت اللہ میں داخل ہو جائے یا پھر ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی خاص عنایت و مہربانی کے باوجود بعض کفار اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور قریش کے ایک گروہ نے مقابلے کا قصد کیا اور حضرت خالد بن ولیدؓ والے دستہ پر تیر برسائے جس سے تین صحابہ شہید ہو گئے تب حضرت خالد بن ولید نے جوابی حملہ کیا اور تیرہ لوگوں کو قتل کیا تب ان کو اس ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ مہاجرین و انصار کی اس جماعت کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال نے بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ نماز کے بعد اللہ کے رسول مقام صفا میں ایک بلند مقام پر بیٹھے اور جو اسلام قبول کرنے آ رہے تھے ان سے بیعت کی۔ باہر خانہ کعبہ کے صحن میں اسلام کے وہ سخت مخالفین جمع تھے جنھوں نے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو سخت سے سخت تکالیف سے دو چار کیا تھا آج وہ عفو و کرم کے منتظر بن کر کھڑے تھے۔ تاریخ و سیرت کتب شاہد ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انتقامی جذبہ سے خالی ہو کر سوائے چند اشخاص کے عام معافی کا پروانہ دیا۔ فتح مکہ دین اسلام کے لیے ایک عظیم معرکہ ثابت ہوا، اس لیے کہ عرب کے دوسرے قبائل جو قریش مکہ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے لیکن مسلمانوں کی اس کامیابی اور ان کا حسن و اخلاق دیکھ کر مخالفت چھوڑ بیٹھے۔ فتح مکہ کے بعد کافی تیزی کے ساتھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ غرض اس غزوہ نے بت کدوں کی مکمل طاقت کو نست و نابود کر کے رکھ دیا۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے پندرہ روز یہاں قیام فرمایا، اس فتح کے بعد سارا عرب اسلام کے قبضہ میں آ گیا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے بیت اللہ کا طواف کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک کمان تھی جس سے وہ بتوں کو گراتے جاتے اور یہ فرماتے رہے:

''جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا''۔ (اسراء: 81)

(حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے)۔

خانہ کعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی قریش مکہ سے خطاب فرمایا:

''لوگو! اللہ نے جس دن آسمان کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرام (حرمت والا شہر) ٹھہرایا۔ اس لیے وہ اللہ کی حرمت کے سبب قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ کوئی آدمی جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے حلال نہیں کہ اس میں خون بہائے یا یہاں کوئی درخت کاٹے۔ اگر کوئی شخص اس بنا پر رخصت اختیار کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قتال کیا تو اس سے کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی تھی لیکن تمہیں اجازت نہیں دی ہے۔ اور میرے لیے بھی اسے صرف دن کی ایک ساعت میں حلال کیا گیا۔ پھر آج اس کی حرمت اسی طرح پلٹ آئی، جس طرح کل اس کی حرمت تھی۔ اب چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو یہ پہنچا دے۔''

بالآخر مکہ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور اسلامی فوج بغیر کسی نقصان کے وادی مکہ پر قابض ہوگئی۔

10.6 غزوہ حنین (8ھ مطابق 630ء)

جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اور فتح مکہ اس کا سب سے بڑا سبب بنا کیوں کہ اس کے بعد بہت سے قبائل نے خود ہی پیش قدمی کر کے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا لیکن قبیلہ ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اب ہمارا نمبر ہے یہ دونوں قبیلے نہایت جنگ جو اور فنون جنگ سے زبردست واقف تھے انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ ایک عام حملہ مسلمانوں پر کیا جائے انتہائی جوش اور جذبہ کے ساتھ اس کی تیاری کی اور اپنا سب کچھ ساتھ لے کر نکلے تاکہ پیچھے ان کی حفاظت کا خیال ہی دل میں نہ آئے اور جوانمردی و جذبات سے مقابلہ کیا جا سکے۔

اللہ کے رسول ﷺ جب ان کی جنگی تیاریوں سے واقف ہوئے تو آپ ﷺ بھی ان مخالفین اسلام کی سرگرمیوں کا جواب دینے کے لیے کمربستہ ہوئے اور بارہ ہزار کی جمعیت ساتھ لے کر حنین کی طرف بڑھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سے قبل اتنی تعداد میں مسلمان کبھی کسی معرکہ کو سر کرنے کے لیے نہیں نکلے تھے اس لیے عام صحابہ بالعموم اور نومسلمین بالخصوص اس تعداد پر نازاں ہوئے اور ان کی زبان سے بے اختیار نکل

گیا کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے اللہ رب العزت کو مسلمانوں کی یہ ادا پسند نہ آئی اور اس پر ان کا مواخذہ ہوا اس طور پر کہ اول وہلہ میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و بدنظمی پھیل گئی۔ جس سے دو ہزار نو مسلم بھاگ گئے، ان کو بھاگتا ہوا دیکھ کر مسلمانوں میں ایسی سراسیمگی پھیلی کہ جس کو جدھر منتشر ہونے کا موقع ملا وہ ادھر ہی چلا گیا لیکن جلد ہی اللہ کے رسول کی تحریک پر حضرت عباس متحرک ہوئے اور الگ الگ قبائل کا نام لے کر پکارا پھر ان کی ترغیب پر مسلمانوں میں جو ہمت و جذبہ پیدا ہوا اس سے وہ اس جوش وخروش اور بہادری سے لڑے کہ میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا اور بڑے سرداران کی ہلاکت و بربادی اور مالک بن عوف کے فرار سے وہ شکستہ دل ہو گئے۔ اور ہزیمت و پسپائی ان کا مقدر ہو گئی اور مسلمان مال غنیمت کی ایک بڑی مقدار کے ساتھ واپس ہوئے۔ حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔

10.7 غزوہ تبوک (9ھ مطابق 630ء)

جنگ موتہ کی ہزیمت کا انتقام لینے کے لیے غسانی بادشاہ نے ایک لشکرِ عظیم فراہم کر کے ہرقل روم سے امداد طلب کی۔ ہرقل نے چالیس ہزار کا لشکرِ جرار غسانی بادشاہ کے پاس بھیجا اور خود بھی عظیم الشان فوج لے کر عقب سے روانہ ہونے کا قصد کیا۔ ابو عامر راہب مکہ سے قیصرِ روم کے پاس چلا گیا تھا۔ اس کا کام اور مقصد یہی تھا کہ قیصر کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسائے۔ ادھر اس نے منافقینِ مدینہ سے برابر خفیہ پیام کا سلسلہ جاری رکھا اسی کے دیئے ہوئے مشورہ کے مطابق منافقین نے مسجد ضرار کی تعمیر شروع کی تھی۔ غرض سرحدِ شام پر عیسائی فوجوں کے اجتماع اور قیصر کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی خبریں متواتر مدینہ میں پہنچنی شروع ہوئیں۔ آپ ﷺ نے اس عیسائی حملہ کو ملکِ شام کی سرحد پر روکنا ضروری سمجھا کیونکہ ملکِ عرب کے اندر ہرقل روم کی فوجوں کے داخل ہونے سے یک لخت تمام ملک عرب میں بدامنی پیدا ہونے کا قوی احتمال تھا۔ نیز سرحد پر ایسے لشکرِ عظیم کا اجتماع کوئی ایسی بات نہ تھی کہ آپ ﷺ اس کو معمولی سی بات سمجھ کر خاموش رہتے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عام طور پر قبائل کو اطلاع دی کہ ہرقل کی فوجوں کے مقابلے کے واسطے آ آ کر شریکِ لشکر ہونا چاہئے۔ مسلمان اطرافِ ملک سے آ آ کر مدینہ منورہ میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ منافقین کی جماعت مدینہ میں موجود تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو ہمیشہ بہکانے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔

اس سے پہلے جب کبھی آپ ﷺ نے کسی طرف کو فوج لے جانے کا عزم فرمایا پہلے سے اس کا اعلان نہیں فرماتے تھے تاکہ منافقین کو اعتراض کرنے اور مسلمانوں کے بددل بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ عین وقت پر وقت مسلمانوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اس مرتبہ چونکہ بڑا لشکر جمع کرنا تھا اور اس کا سامان فراہم کرنا بھی دشوار کام تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اعلان کر دیا تھا کہ ہرقل کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سرحدِ شام کی طرف مسلمانوں کو جانا پڑے گا۔ گذشتہ سال چونکہ خشک سالی رہی تھی اس لیے لوگوں کی مالی حالت بھی کمزور تھی۔ اس سال فصل اور پیداوار اچھی ہوئی تھی اور اس کے کاٹنے کا وقت آ چکا تھا لہٰذا لوگ اپنی فصلوں کو چھوڑ کر جانا طبعی طور پر کسی قدر گراں محسوس کرتے تھے۔ ہرقل اور اس کے وزراء نے اپنے اس حملہ کی تیاریوں کے سلسلے میں منافقین مدینہ کو پہلے ہی سے اپنا شریک بنا لیا تھا۔ مدینہ کے منافقوں کی سازشی مجلسیں ایک یہودی کے یہاں روزانہ منعقد ہوتی تھیں۔ بارہ منافقوں نے مل کر اپنی ایک مسجد الگ تعمیر کی۔ مدعا یہ تھا کہ اس مسجد میں سازشی جلسے اور ہر قسم کی مخالف اسلام صلاح و مشورہ کی باتیں ہوا کریں گی اور اس مسجد کے ذریعے مسلمانوں میں تفرقہ و نااتفاقی پیدا کرنے کا سامان پیدا کیا جائے گا۔ ان منافقوں نے جب دیکھا مسلمان جنگ اور سفر کی تیاریوں میں مصروف ہیں تو ہمت شکن باتیں شروع کیں اور موسمِ گرما کے اس طویل سفر کی دقتیں لوگوں میں بیان کرنے لگے۔ کیونکہ ان کا مقصد قیصر کی فوجوں کی مدینہ پر حملہ آور کرانا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ملکِ شام کی طرف پہلے ہی حملہ آور ہو کر عیسائی فوجوں کے سیلاب کو عرب میں داخل ہونے سے روک دیں۔

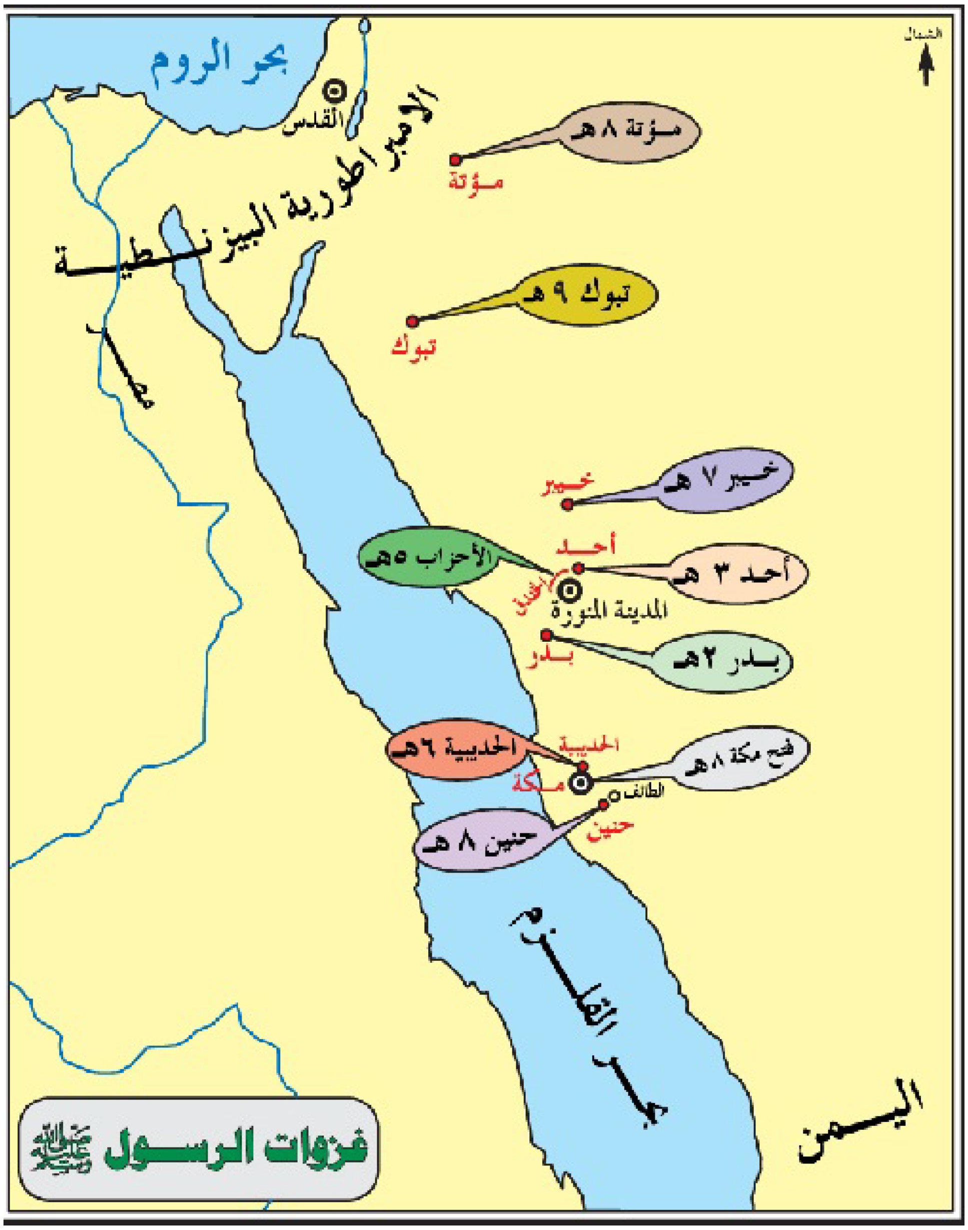

آنحضرت ﷺ نے مدینے میں تمام صحابہ کو تیاری کرنے اور شریکِ لشکر ہونے کا حکم دیا تھا۔ ساتھ ہی زادِراہ، سواری، اسلحہ، جنگ کے لیے روپے کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس لیے چندہ کی بھی عام اپیل فرمائی تھی۔ منافقین نے لوگوں کو بہکانے اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ حضرت عثمان غنیؓ اپنا مالِ تجارت شام کی طرف روانہ کرنے والے تھے۔ انہوں نے وہ تمام لشکر کے سامان کی تیاری کے لیے چندہ میں دے دیا۔ جس کی مقدار نوسو اونٹ، سو گھوڑے معہ ساز و سامان اور ایک ہزار طلائی دینار تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے گھر کا تمام مال و اسباب لاکر چندہ میں دے دیا۔ اور کہا کہ بال بچوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مال و اسباب میں سے نصف لاکر دے دیا اور نصف اہل و عیال کے لیے چھوڑ دیا جو لوگ بہت ہی غریب تھے اور محنت مزدوری سے گزر کرتے تھے۔ انہوں نے بھی بڑی دلیری سے جو کچھ ان سے ہو سکا لا لاکر جمع کر دیا۔ منافقین نے اس چندہ میں بھی شرکت نہ کی۔ تیس ہزار لشکر مدینہ میں جمع ہو گیا۔ فوجی سامان صرف اس قدر درست ہوا کہ تمام فوج نے جوتے

بنالئے۔آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ تم لوگ جوتے بنالو۔کیونکہ پاؤں میں جوتے ہونے سے آدمی سوار کے حکم میں سمجھا جاتا ہے۔

غرض ماہ رجب 9ھ میں آپ ﷺ تیس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔مدینہ سے ایک گھنٹہ کی مسافت کے فاصلہ ایک بستی ذی رواں میں آپ ﷺ پہنچے تھے کہ منافقین نے آکر عرض کیا کہ ہم نے ایک مسجد بنائی ہے ہماری خواہش ہے کہ آپ چل کر نماز ادا کریں تا کہ وہ مسجد بھی قابلِ تعظیم سمجھی جانے لگے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس وقت سفر کی تیاری میں مصروف ہوں، واپسی کے وقت دیکھا جائے گا۔آپ ﷺ نے مدینہ سے نکل کر ثنیۃ الوداع نامی پہاڑی پر قیام کیا اور محمد بن مسلمہؓ انصاری کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا۔منافقوں کا سردار اعظم عبداللہ بن ابی بھی معہ اپنی جماعت کے شہر سے نکل کر ثنیۃ الوداع پہاڑی کے نشیبی دامن میں خیمہ زن ہوا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ہمراہ چلنے پر آمادہ ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا منشاء لوگوں کو آپ ﷺ کے ہمراہ جانے سے روکنا تھا۔جب آپ ﷺ معہ لشکر آگے کو روانہ ہوئے تو منافقین عبداللہ بن ابی کے ہمراہ مدینہ کو واپس لوٹ آئے۔بعض منافق اس غرض سے کہ مخبری کر کے عیسائیوں کو مدد پہنچائیں اسلامی لشکر میں شریک رہے۔

آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے لیے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا۔مدینہ میں منافقوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت یہ کہنا شروع کیا کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت علیؓ کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔وہ ان کو بار خاطر سمجھتے تھے۔اسی لیے ان کو چھوڑ دیا ہے۔حضرت علیؓ یہ سن کر برداشت نہ کر سکے، مسلح ہو کر مدینہ سے چل دئے اور مقام الجرف میں مدینہ سے کوس بھر کے فاصلہ پر آنحضرت ﷺ کے حضور میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ منافقین میری نسبت ایسی ایسی باتیں کرتے تھے اس لیے حاضر خدمت ہو گیا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جھوٹے ہیں، میں نے اپنے گھر بار کی حفاظت کے لیے تم کو مدینہ میں چھوڑا تھا۔تم واپس جاؤ۔اور ان کی دل جوئی کے لیے فرمایا کہ تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو ہارونؑ کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔مگر فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔حضرت علیؓ وہاں سے پھر مدینہ کو واپس تشریف لے گئے۔بعض صحابی جو کسی سستی یا غفلت کے سبب آپ ﷺ کے ہمراہ روانہ نہ ہو سکے تھے۔آپ ﷺ کی روانگی کے بعد مدینے سے روانہ ہوئے اور راستے کی منزلوں میں شریکِ لشکر ہوتے گئے۔بعض منافقین جو مسلمانوں کو بددل کرنے کے لیے شریکِ لشکر تھے، وہ راستہ کی مختلف منزلوں سے جدا ہو کر واپس ہوتے رہے مگر ان کی اس حرکتِ نامعقول کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔آپ ﷺ نے کسی کے حال سے کوئی تعرض نہ فرمایا اور جو راستہ میں رہ گیا اس کے متعلق پرواہ نہ کی۔راستہ میں قوم ثمود کی تباہ شدہ بستیاں آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہاں سے استغفار پڑھتے ہوئے جلدی گزر جاؤ اور یہاں کے کنوؤں کا پانی بھی نہ پیو۔اسی علاقہ حجر کے حدود میں ایک شب قیام کرنا پڑا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص تنہا لشکر گاہ سے باہر نہ نکلے۔جب آپ ﷺ تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈر کے قریب سے گذرے تو آپ ﷺ نے چادر سے اپنا منہ چھپالیا اور سواری کو مہمیز لگا کر تیز کر دیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب ظالموں اور گنہگاروں کی بستی میں جاؤ تو دوڑتے ہوئے استغفار پڑھتے ہوئے جاؤ کہ مبادا ہمیں بھی ایسی ہی مصیبت پیش نہ آ جائے۔

جب لشکرِ اسلام چشمۂ تبوک پر سرحد شام میں پہنچ گیا تو وہاں قیام کیا۔ہرقل آپ ﷺ کو پیغمبر حق سمجھتا تھا اس نے جب آپ ﷺ کے آنے کی خبر سنی تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جانے میں بہتری سمجھی۔عیسائی لشکر اور غسانی بادشاہ سب لشکرِ اسلام کی خبر سن کر ادھر ادھر چلے گئے اور میدان خالی چھوڑ گئے۔تبوک مدینے سے چودہ پندرہ منزل کے فاصلے پر تھا۔یہاں آپ ﷺ نے بیس روز کے قریب قیام کیا۔اسی عرصہ میں کئی قبائل کے سرداران آئے اور جزیہ کی شرط پر صلح کر لی۔

سرحد شام کے حاکموں اور رئیسوں سے اطاعت اور امن وامان رکھنے کا اقرار لے کر صحابۂ کرامؓ سے آپ ﷺ نے مشورہ کیا۔سب کی رائے

یہی ہوئی کہ اب اورزیادہ قیام اورانتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہرقل اوراس کی فوجیں مرعوب ہوچکی ہیں۔اگران میں ہمت ہوتی تو مقابلے پرآجاتے۔آخرکارآپ ﷺ تبوک سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔جب آپ ﷺ مدینہ کےقریب پہنچےاورمدینہ صرف ایک گھنٹہ کے راستہ پررہ گیا تو آپ ﷺ نے دوصحابہؓ کومنافقین کی بنائی ہوئی مسجد کے جلانے اورمسمار کرنے کے لیےحکم دیا کیونکہ باری تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمادی تھیں:وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا الخ اوراس طرح منافقین کےمکر سےآنحضرت ﷺ واقف ہوچکے تھے۔چنانچہ مسجدضرار کانام ونشان مٹادیا گیا۔آپ ﷺ ماہ رمضان 9ھ میں داخلِ مدینہ ہوئے۔اس سفریعنی غزوہ تبوک میں دومہینے صرف ہوئے۔

10.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- صلح حدیبیہ فتح مبین کی تمہید کےطور پرتھی۔جس کے نتیجے کےطور پرمسلمانوں کوتبلیغ اسلام کابہترین موقع ملا۔
- غزوہ خیبر یہود کی شرارتوں کی وجہ سے پیش آیا۔
- جنگ موتہ مسلمانوں اورعیسائیوں کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ تھی۔
- ملک شام کے حدود میں ہونے والی لڑائیوں میں قابل تذکرہ یہ پہلی لڑائی تھی۔
- حضرت خالدبن ولید کےاسلام لانے کے بعد جنگ موتہ ان کی پہلی جنگ تھی۔
- صلح حدیبیہ کامعاہدہ ٹوٹنے کی وجہ بنوبکرکابنوخزاعہ پرحملہ کرنا تھا۔
- فتح مکہ کے موقع پراللہ کےرسول نے ان دشمنوں کوبھی معاف کردیا جن کی وجہ سے ہجرت کے لیےمجبور ہونا پڑا تھا۔
- غزوہ حنین کی وجہ قبیلہ ہوازن وثقیف کاوہ حسد تھاجوان کواسلام کے بڑھتے دائرہ سے ہورہا تھا۔

10.9 نمونہ امتحانی سوالات

10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. خطیبِ قریش کس کوکہاجاتاہے؟

a. سہیل بن عمرو b. حی ابن اخطب c. ابوسفیان d. عتبہ بن ربیعہ

2. جب صلح حدیبیہ کامعاہدہ لکھاجارہا تھااس وقت مکہ سے مسلمان ہوکرکون آئے تھے؟

a. ابوجندل b. ابوالبصیر c. مغیرہ بن شعبہ d. تمام غلط

3. جب مسلمان رسول اللہ کےساتھ مقام حدیبیہ میں ٹھہرے ہوئے تھےتو آپ ﷺ نے کسےاپنا قاصد بناکرمکہ بھیجا تھا؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. حضرت علیؓ

4. مقام حدیبیہ میں اللہ کےرسول ﷺ نے ایک درخت کے نیچے صحابہ سے جوبیعت کی تھی اسے کیا کہاجاتاہے؟

a. بیعت عقبہ اولیٰ b. بیعت عقبہ ثانیہ c. بیعت رضوان d. بیعت صلوٰۃ

5. قبیلہ غطفان کوخیبر کے یہود نے مدینہ کی کتنی پیداوار دینے کی شرط پراپنے ساتھ ملایا تھا؟

a. پوری b. نصف c. تہائی d. چوتھائی

6. اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولید نے پہلی کون سی جنگ لڑی تھی؟

a. احد b. احزاب c. موتہ d. حنین

7. جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار کون تھے؟

a. زید بن حارثہؓ b. اسامہ بن زیدؓ c. مغیرہ بن شعبہؓ d. ثابت بن اقرمؓ

8. فتح مکہ کے موقع پر کفار نے جو تیر برسائے تھے اس میں کتنے صحابہ شہید ہوئے تھے؟

a. تین b. پانچ c. آٹھ d. دس

9. حنین کہاں واقع ہے؟

a. مکہ اور مدینہ کے درمیان b. مدینہ اور طائف کے درمیان c. مکہ اور طائف کے درمیان d. سب غلط

10. فتح مکہ کے موقع پر خالد بن ولید کے جوابی حملے میں قتل ہونے والے کفار کی تعداد کتنی تھی؟

a. 9/لوگ b. 13/لوگ c. 15/لوگ d. 17/لوگ

10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. صلح حدیبیہ کی شرائط لکھیے۔
2. غزوہ موتہ کو مختصراً لکھیے۔
3. غزوہ حنین کو اختصار سے بیان کیجیے۔
4. غزوۂ خیبر کا واقعہ لکھیے۔
5. صلح حدیبیہ "فتح مبین" کیسے ہے؟ بیان کیجیے۔

10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. صلح حدیبیہ کا واقعہ تفصیل سے لکھیے۔
2. فتح مکہ کا واقعہ مفصلاً تحریر کیجیے۔
3. غزوہ حنین کا واقعہ قلم بند کیجیے۔

10.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. سیرۃ النبی (جلد اول) : علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2. تاریخ اسلام (جلد اول) : شاہ اکبر خاں صاحب نجیب آبادی
3. سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم) : مولانا محمد ادریس کاندھلوی
4. الرحیق المختوم : مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
5. رحمت للعالمین : قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

-:oOo:-

اکائی 11 : شخصیت رسول ﷺ

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقصد
11.2 ولادت سے نبوت تک
11.3 شخصیت رسول ﷺ کی کاملیت
11.4 شخصیت رسول ﷺ کی جامعیت
11.5 شخصیت رسول ﷺ کی تاریخیت
11.6 حیات نبوی ﷺ
11.7 ازواج مطہرات اور اولاد
11.8 اکتسابی نتائج
11.9 نمونہ امتحانی سوالات
11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید

اس اکائی میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اس طور پر کہ آپ ؐ کی نبوت سے پہلے کی جو چالیس سالہ مکی زندگی ہے اس کا نقشہ پورے طور پر سامنے آجائے، نیز اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو اس اکائی میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

11.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک آئیڈیل شخصیت کے لیے تاریخیت، کاملیت جامعیت اور عملیت جیسی جن شرائط کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ سرکارِ دو عالم ﷺ میں کامل اور مکمل طور پر پائی جاتی ہیں، اس لیے آپ ﷺ کی شخصیت ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

11.2 ولادت سے نبوت تک

تمام سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش واقعہ اصحابِ فیل کے باون یا پچپن روز کے بعد ہوئی۔ آپ ﷺ عربی تاریخ کے مطابق بارہ ربیع الاول بروز پیر بوقت صبح صادق اور انگریزی تاریخ کے حساب سے 20/اپریل 571ء کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، اس حالت میں کہ آپ ﷺ کے سر پر والد کا سایہ نہیں ہے، کیونکہ آپ ﷺ کے والد حضرت عبداللہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گئے ہوئے تھے، وہاں سے واپسی میں طبیعت خراب ہوئی اور مدینہ طیبہ میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں رک گئے اور اسی دوران انتقال ہوگیا۔ پیدائش کے بعد اس زمانے کے دستور کے مطابق ولادت کے چند روز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ اتفاق سے ان کو کوئی بچہ نہ ملا، حضرت آمنہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو اولاً ان کا خیال تھا کہ یتیم بچہ کو لے کر کیا کروں گی، مگر بعد میں اس خیال سے کہ خالی ہاتھ جانے سے تو یتیم بچہ کو ہی لے لینا بہتر ہے، اس لیے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کر لی اور اس طرح انہیں آپ ﷺ کو دودھ پلانے کا شرف ان کا مقدر بنا۔

ولادت کے چوتھے یا پانچویں سال میں شق صدر کا واقعہ پیش آیا تو حلیمہ سعدیہ گھبرا گئیں اور آپ ﷺ کو حضرت آمنہ کے حوالہ کر دیا۔ تقریباً چار سال حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس رہ کر مکہ واپس آئے اور ابھی آپ ﷺ عمر کی چھٹی بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ والدہ آپ ﷺ کو لے کر مدینہ منورہ گئیں اور واپسی میں مقام ''ابواء'' میں وفات پا گئیں، یعنی چھ سال کی عمر میں والدہ محترمہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ مقام ''ابوا'' سے ام ایمن کے ساتھ مکہ واپس آئے اور اب آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں پرورش پا رہے تھے، دادا آپ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، ہر وقت آپ ﷺ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، ایک قلیل عرصہ ہی ان کی کفالت میں گذرا تھا کہ ابھی آپ ﷺ کی عمر مبارک آٹھ سال ہے اور دادا بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ تاریخ میں ہے کہ جب عبدالمطلب کا جنازہ اٹھ رہا تھا تو آپ ﷺ فرطِ محبت سے روتے جا رہے تھے، عبدالمطلب نے اپنے مرض الوفات میں اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کرتے وقت وصیت کی تھی کہ اپنے اس بھتیجے کی خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہ کرنا، چنانچہ ایک طویل مدت تک چچا ابو طالب نے آپ ﷺ کی سرپرستی کا حق ادا کیا، اس طور پر کہ محمد ﷺ کو والدین کے سایہ عاطفت سے محرومی کا احساس تک نہ ہونے دیا جس کی نظیر میں بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ آپ ﷺ کی عمر اس وقت بارہ سال ہے اور ابو طالب کو تجارت کی غرض سے شام جانا ہے جہاں وہ سال میں ایک مرتبہ جایا کرتے تھے، لہٰذا اس بار جب انہوں نے ارادہ سفر کیا اور سفر کی تکالیف ومصائب کی غرض سے ابو طالب آپ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن آنحضرت کو ابو طالب سے محبت اس قدر تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل گئے جس کو ابو طالب برداشت نہ کر سکے بالآخر ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات کتابوں میں درج ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چچا ابو طالب اپنے والد کی وصیت کو بڑی خوبی وجوانمردی کے ساتھ پورا کیا جو انہوں نے حضور کی کفالت کے لیے کی تھی اسی لیے وہ آپ کو اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔

جب آپ کی عمر مبارک پندرہ سال ہوئی تھی تب ایک جنگ میں شرکت کی جس میں آپ کے سپرد یہ خدمت تھی کہ آپ اپنے چچاؤں کو تیر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے، یہ جنگ حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔ بیس سال کی عمر میں قریش کے چند قبائل کے درمیان واقع ہونے والے ایک معاہدہ میں شرکت کی جو عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ہوا تھا جس میں سبھی نے مظلوم کی حمایت ونصرت کا وعدہ کیا کہ مظلوم خواہ اپنا ہو یا پرایا، دیسی ہو یا پردیسی حتی الواسع اس کی اعانت وامداد سے دریغ نہ کرینگے۔ اللہ کے رسول اس معاہدہ میں پیش پیش تھے۔ اس معاہدہ کی بنیاد عدل وانصاف اور مساوات ومواخاۃ پر تھی۔ تاریخ میں یہ حلف الفضول کے عنوان سے درج ہے۔ شام کے دوسرے سفر سے واپسی کے بعد جب آپ کی عمر 25 سال

تھی۔حضرت خدیجہؓ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اور محمد بن اسحاق کے بقول حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ آپؐ کی تمام ہی اولادیں حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی پھر تیس سال کی عمر سے آپؐ کو کشف والہام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پینتیس سال کی عمر میں ایک اہم ترین جھگڑے کے فیصل بنائے جاتے ہیں جس کی وضاحت یہ ہے کہ قبائل قریش ایک جنگ کے قریب آ گئے تھے اور جنگ عظیم کی تمام تیاریاں کر لی گئیں تھیں اور یہ جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر کون قبیلہ نصب کرے گا؟ ہر ایک قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ یہ شرف اس کے حصہ میں آئے اس کے لیے ان میں آپس میں ضد پیدا ہو گی اور ہر طرف سے تلواریں نکل آئیں اور کچھ قبائل مرنے مارنے کی قسمیں کھانے لگے، اس جھگڑے کی وجہ سے پانچ روز تعمیر کا کام بھی رکا رہا بالآخر تمام لوگ خانہ کعبہ میں جمع ہوئے اور ایک مجلس منعقد کی، اس میں ابوامیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ جو شخص کل سب سے پہلے خانۂ کعبہ میں داخل ہوتا نظر آئے اُسی کو حکم مقرر کیا جائے اور وہ جو فیصلہ کرے سب اس پر رضامند ہوں گے اب اگلے روز جب دیکھا گیا تو وہ ذات اللہ کے رسولؐ کی تھی چنانچہ سب نے فیصلہ کیے لیے آپؐ کی طرف رجوع کیا اور آپؐ نے اس طرح سے فیصلہ کیا کہ ایک چادر بچھائی اس پر حجر اسود اپنے دست مبارک سے رکھا اور پھر قبائل کے سرداران سے کہا کہ چادر کے گوشوں کو پکڑ لو۔ چنانچہ سرداران قریش پتھر کو اس کے مقام تک لے آئے اور پھر آپؐ نے اپنے دست مبارک سے چادر سے اٹھا کر حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کر دیا جس سے کسی کو شکایت باقی نہ رہی اور سب خوش ہو گئے۔ عمر دراز سرداران قریش بھی آپؐ کی ذہانت وفطانت کو دیکھ کر حیران رہ گئے اس لیے کہ اگر یہ جنگ شروع ہو جاتی تو ماقبل کی لڑائیوں سے سخت ہوتی جس کے نتائج بڑے ہیبت ناک اور تباہ کن ثابت ہوتے کیونکہ اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے کچھ قبائل نے خون سے بھرے پیالہ میں انگلیاں ڈال کر قسمیں کھالی تھیں جو اس زمانہ کی سب سے شدید قسم کی قسم تھی۔ آپؐ کے اس شاندار فیصلے کے نتیجہ میں وہ قبائل جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بننے جا رہے تھے امن وآشتی کے علمبردار بن گئے۔

الغرض آپؐ کے چاہے ایام طفولیت کے شب وروز ہوں یا پھر عہد شباب، مکی زندگی کا نبوت سے پہلے کا دور بھی بے مثال ہے، یعنی اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہے کہ جن اوصاف حمیدہ واخلاقِ فاضلہ کی بنیاد پر ایک کامل انسان کا نقشہ سامنے آتا ہے وہ سب آپؐ کی زندگی میں وحی الٰہی کے باضابطہ آغاز سے قبل ہی نمایاں ہو جاتے ہیں، مشرکانہ عقائد واعمال سے اجتناب، غرباء ومساکین کے ساتھ حسن سلوک، یتیموں وبیواؤں سے ہمدردی، جھوٹ سے نفرت، ظلم وناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج، عدل وانصاف کے قیام کے لیے عملی اقدامات، بڑوں کی عزت وتکریم، چھوٹوں سے شفقت ومحبت وغیرہ وہ اخلاق فاضلہ ہیں جن کا تجربہ ومشاہدہ اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں کو بھی نبوت سے قبل مکی زندگی میں ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اعدائے اسلام نے نبوت سے پہلے ہی مکی زندگی میں آپ کو صادق اور امین کے القاب سے نوازا تھا گویا آپؐ کی زندگی تمام ہی غلاظتوں سے پاک تھی، ایسا اس لیے تھا کہ مشیت ایزدی میں آپؐ خاتم النبیینؐ تھے اور مشیت الٰہی ہی کے مطابق آپؐ کی پرورش ہو رہی تھی تب ہی تو آپؐ نبوت سے قبل ہی ایسی صفات حسنہ واخلاق عالیہ سے آراستہ ہو جاتے ہیں کہ قوم آپ کو صادق اور امین کے القاب سے پکارتی ہے۔

11.3 شخصیت رسول ﷺ کی کاملیت

کسی کی زندگی چاہے کتنی بھی تاریخی ہو جب تک وہ کامل نہ ہو، دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتی اور کسی کی زندگی کا کامل ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زندگی کے تمام اجزاء ہمارے سامنے نہ ہوں۔ اللہ کے رسولؐ کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے لیکر وفات تک صحابہ کے سامنے رہا جس کو بعد میں تحریر میں لے آیا گیا اور تاریخ عالم کے سامنے ہے، آپؐ کی زندگی کا مختصر سے مختصر گوشہ بھی آپؐ کے وطن کے اشخاص کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا یعنی پیدائش، بچپن، جوانی، شادی، سفر شام وغیرہ جو نبوت سے قبل کے واقعات ہیں یا دعوت وتبلیغ، سفر طائف، معراج،

ہجرت، غزوات ووفات یعنی نبوت کے بعد کے حالات میں سے کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس سے اہل سیر و تاریخ واقف نہ ہوں یہاں تک کہ نبوت کے بعد والی زندگی کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، دوستی، دشمنی، اوڑھنا، بچھونا، چلنا، پھرنا، سفر، حضر، خلوت، جلوت، دن کا روزہ، رات کی عبادت یہاں تک کہ قد و قامت اور خانگی تعلقات کے تمام احوال کتب سیر میں موجود ہیں۔

زوجہ سے بڑھ کر انسان کی اندرونی کمزوریوں کا واقف کار کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کے رسولؐ پر سب سے اول آپؐ کی بیوی ہی ایمان لائی، حضرت خدیجہؓ نبوت سے قبل پندرہ برس تک آپؐ کی زوجیت میں رہ چکی تھیں اور آپ کے ہر حال اور ہر کیفیت کی نسبت ذاتی واقفیت رکھتی تھیں، اس کے باوجود جب آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے سب سے پہلے اس دعویٰ کی سچائی کو تسلیم کیا۔ بڑے سے بڑا انسان یہ ہمت نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی اہلیہ کو اجازت دیدے کہ تم میری ہر بات اور ہر حالت کو ظاہر کرسکتی ہو اور اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ایک نہیں نو بیویاں تھیں اور ہر ایک کو یہ اجازت تھی کہ وہ جو خلوت میں دیکھے اُسے جلوت میں بیان کردے، جو رات کی تاریکی میں دیکھے اُسے دن کے اُجالے میں لوگوں کے سامنے ظاہر کردے اس اخلاقی وثوق اور اعتماد کی مثال اللہ کے نبی کے علاوہ کیا کسی کی زندگی میں مل سکتی ہے نہیں ہرگز نہیں۔

مذکورہ بالا احوال اللہ کے رسولؐ کے ذاتی تھے یہی حال آپؐ کے معمولات، عبادات واخلاق اور معاملات کا ہے کہ آپؐ خواہ تنہائی میں ہوں یا مجمع میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، دن میں ہوں یا رات میں ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت و کیفیت ہو سب کو منظر عام پر لایا جائے۔

مسجد نبویؐ میں ایک چبوترہ ان عقیدت مندوں کے لیے تھا جن کے پاس رہنے کے لیے گھر نہ تھا وہ باری باری سے دن میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اس سے روزی روٹی حاصل کرتے، سارا وقت آپؐ کے ملفوظات سننے، آپؐ کے حالات دیکھنے اور آپؐ کی معیت میں گذارتے تھے ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی تھی، ان ہی میں سے حضرت ابو ہریرہؓ ہیں جن سے زیادہ کسی صحابی کی روایات نہیں ہیں، ان حضرات کا کام ہی یہ تھا کہ آپؐ کے حالات دیکھتے اور دوسروں سے ان کو بیان کرتے۔ دن میں پانچ وقت مدینہ میں رہنے والی تمام مسلمانوں کی آبادی مسلسل دس برس تک آپؐ کی ایک ایک حرکت کو دیکھتی رہی اور دیکھنے کے بعد نہ صرف ان کو بیان کی اجازت تھی بلکہ بیان کا تاکید اور حکم تھا۔

اللہ کے رسولؐ کی شخصیت ایسی کامل ہے جس کی کاملیت کا اعتراف دشمنوں کو بھی تھا جیسا کہ جب آپؐ مکہ میں رہے اور دعویٰ نبوت سے قبل چالیس سال ان لوگوں کے درمیان گذارے۔ جو ایک طویل زمانہ ہے جس میں بہت سے حالات آتے ہیں مگر آپؐ کو اس درمیان ان لوگوں کی طرف سے جن کے ساتھ رہ رہے ہیں، صادق اور امین کا خطاب ملتا ہے۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو قریش نے غصہ ظاہر کیا، دشمنی کی، مخالفت کی، قتل کی سازش مگر آپؐ کے اخلاق واعمال پر ایک حرف بھی زبان سے نہ نکال سکے جبکہ دعویٰ نبوت کو توڑنے کے لیے کفارِ قریش نے اپنی دولت لٹائی، جانیں گنوائیں، اولادیں قربان کیں لیکن یہ نہیں کرسکے کہ آپؐ کے اخلاق ومعاملات غلط ثابت کرسکیں جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ جو دوستوں کی نگاہوں میں تھے وہی دشمنوں کی نظروں میں بھی تھے پردہ میں کچھ نہ تھا۔ آپؐ نے اپنے حالات اور واقعات پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی، آپؐ جیسے تھے سب کے سامنے تھے اور اسی طرح آپ کے حالات وواقعات کتب حدیث میں موجود ہیں اور قیامت تک ایسے ہی رہیں گے۔

قرآن کریم نے اللہ کے رسولؐ کی زندگی کو مسلمانوں کے لیے نمونہ بتایا اور اس کی پیروی کو خدائی محبت کا ذریعہ بتایا جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران:4)

(اے لوگوں اگر تم خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا)۔

یعنی آپ ؐ کی اتباع کو خدائی محبت کا معیار بتایا اس لیے کہ ہر چیز میں، ہر حالت میں، ہر کیفیت میں اتباع کرنا مشکل امتحان ہے، اس اتباع کے امتحان میں اولاً صحابہ کھرے اترے اور اسی جذبہ نے صحابہ و تابعین، تبع تابعین، محدثین، مؤرخین اور ارباب سیر کا یہ اہم فرض قرار دیا کہ وہ ایک ایک بات، ایک ایک چیز معلوم کریں اور آنے والی نسلوں کو بتائیں تاکہ اپنی کوشش بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ اللہ کے رسول ؐ کی زندگی مسلمانوں کی نگاہوں میں کامل ہے تب ہی تو اس کی نقل کو انہوں نے کمال کا معیار یقین کیا ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تمام کمالات کا مجموعہ تھی، کتب سیرت کے مطالعہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم ؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو کمالات فرداً فرداً عطا کئے گئے وہ سارے کمالات اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کی ذات میں جمع کر دیئے تھے۔ آپ ﷺ کو آدم ؑ کا خلق، شیث ؑ کی معرفت، نوح ؑ کا جوش تبلیغ، ابراہیم ؑ کا ولولہ توحید، اسماعیل ؑ کا ایثار، صالح کی فصاحت، حضرت لوط ؑ کی حکمت، موسیٰ ؑ کا جمال، یعقوب ؑ کی تسلیم ورضا، داؤد ؑ کی آواز، ایوب ؑ کا صبر، یونس ؑ کی اطاعت، دانیال ؑ کی محبت یوسف ؑ کا حسن، یحییٰ کی پاک دامنی، عیسیٰ ؑ کا زہد جیسے تمام اوصاف یکجا جمع کر دیئے گئے تھے جس سے بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ شخصیت رسول ؐ تمام ہی کمالات کا مجموعہ تھی۔

11.4 شخصیت رسول ﷺ کی جامعیت

اللہ کی رسول ؐ کی سیرت انتہائی جامع ہے یعنی انسانوں کے تمام طبقات کے لیے آپ ؐ کی سیرت میں نصیحت اور سبق موجود ہے چاہے وہ سبق حاصل کرنے والا حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، مہمان ہوں یا میزبان ہر ایک کے لیے سیرت رسول ؐ میں درس عبرت ہے کیونکہ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی مثال نہیں بن سکتی ویسے ہی اس کا برعکس، ایک امیر کے لیے غریب کی زندگی نمونہ نہیں بن سکتی ایسے ہی غریب کے لیے امیر کا طرزِ عمل مثال نہیں بن سکتا، اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ پیغمبر کی سیرت جامع ہو ہر ایک کے لیے جو مختلف مناظر کے رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ ہو اور اللہ کے رسول ؐ کی سیرت میں زبردست جامعیت ہے یہاں تک کہ ہر انسان کے مختلف لمحوں کے مختلف افعال جیسے اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، ہنسنا، رونا یعنی تمام افعالِ جسمانی کے لیے نمونوں کی ضرورت تھی اللہ کے رسول ؐ کی سیرت میں ان سب احوال کے لیے بھی رہنمائی موجود ہے۔

اللہ کے رسول ؐ کی شخصیت ایسی جامع ہے کہ ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی کے لیے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہے، اس لیے کہ اگر امیر ہو تو مکہ کے تاجر کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو اور اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر سے دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار کو دیکھو اور اگر شکست کھائے ہو تو معرکہ احد درس عبرت رکھتا ہے، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے کو دیکھو اور اگر استاذ ہو تو صفہ کے معلم پر نظر کرو، اگر واعظ و مقرر ہو تو مسجد نبویؐ کے ممبر پر وعظ کرنے والے کی نصیحت پر کان رکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر جوان ہو تو محمد عربی ؐ کا دورِ شباب پڑھو، اگر کسی معاملہ میں ثالث و فیصل بن رہے ہو تو حجر اسود کی تنصیب کا فیصلہ پڑھو، اگر شوہر ہو تو حضرت خدیجہ ؓ وحضرت عائشہ ؓ کے شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ ؓ کے والد کا حال دیکھو، غرض تم جو کچھ بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو تمہارے نبی کی سیرت میں تمہارے لیے نمونہ موجود ہے اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالب علم اور نورِ ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے آپ ؐ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے جامع ہونے کے پہلو کو ہم اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دنیا میں جو دنیوی علوم کی تعلیم گاہیں

ہیں ان میں سے کچھ وہ ہیں جہاں صرف ایک فن کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے اس میں تعلیم حاصل کرنے والے اس فن کے حاذق و ماہر ہو جاتے ہیں جیسے کہیں میڈیکل کالج ہے، کہیں انجینئر نگ کالج ہے، کہیں ایگریکلچر کالج ہے وغیرہ ان میں سے ہر تعلیم گاہ سے ایک ہی قسم کے طلبہ نکلیں گے یعنی میڈیکل سے صرف ڈاکٹر، انجینئر نگ کالج سے انجینئر اور ایگریکلچر کالج سے زراعت کے ماہرین علیٰ ھذا القیاس۔ دوسری قسم ان تعلیم گاہوں کی ہے جو اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہیں۔ یعنی بڑی بڑی یونیورسٹیاں جن میں مختلف شعبہ جات ہوتے ہیں اور ایک ہی ادارہ سے ڈاکٹر بھی، انجینئر بھی، فلاسفہ، ادیب بھی، زراعت کے ماہرین بھی، قانون داں بھی سبھی نکلتے ہیں اب توجہ طلب امر یہ ہے کہ صرف ایک ہی تعلیم، ایک ہی پیشہ اور ایک ہی علم کے جاننے والوں سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل نہیں ہو سکتی، بلکہ ان سب کے مجموعہ سے سوسائٹی کمال کو پہنچتی ہے۔ اگر صرف ایک ہی علم اور ایک ہی پیشہ کے ماہرین سے دنیا بھر جائے تو اس دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اب دیکھیے اس درسگاہ نبوت کو کہ کیا وہاں صرف ایک فن کی تعلیم ہو رہی تھی یا تمام علوم و فنون کی معدن یونیورسٹی تھی جہاں ذوق طبع و استعداد کے مطابق ہر قوم، قبیلہ و ملک کے لوگ تعلیم حاصل کر کے دنیا و آخرت کو سنوارتے ہیں۔ نیز مقصد سامنے ہوتا ہے دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، خدا کے نام کی اونچائی۔ تعلیم انسانی کی اگر ہم ان درسگاہوں پر نگاہ ڈالتے ہیں جن کے اساتذہ انبیاء علیہم السلام ہیں تو کہیں تعداد دس ہے، کہیں بیس ہے، کہیں تعداد سینکڑوں میں ہے اور کہیں ہزاروں میں ہے، لیکن جب مدرسہ نبوت کی آخری تعلیم گاہ کو دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ طالب علم بیک وقت ہیں۔

مطالعہ فطرت کے بعد انسان کو اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا انسانی مزاجوں اور انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کامل کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ کی جامع شخصیت کے علاوہ کوئی آخری، دائمی اور عالمگیر رہنما نہیں ہو سکتا ہے اسی لیے اعلان فرمایا گیا کہ ''اگر تم خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو آؤ میری پیروی کرو'' اگر تم بادشاہ ہو تو میری پیروی کرو، رعایا ہو تو میری پیروی کرو، معلم ہو تو میری پیروی کرو، امیر ہو تو میری پیروی کرو، غریب ہو تو میری پیروی کرو، مظلوم ہو تو میری اتباع کرو، عابد ہو تو میری پیروی کرو، قوم کے خادم ہو تو میری پیروی کرو، غرض جس نیک راہ پر بھی ہو اور اس کے لیے بلند اور عمدہ سے عمدہ نمونہ چاہتے ہو تو میری پیروی کرو یعنی محمدؐ کی ذات والا صفات تمام انسانی کمالات اور صفاتِ حسنہ کا ایک جامع نمونہ ہے۔

11.5 شخصیت رسول ﷺ کی تاریخیت

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول عام اور سند یافتہ سیرت تمام شکوک و شبہات سے پاک ہے، یہ بات صرف مسلمانوں کے درمیان ہی نہیں غیروں میں بھی مسلم ہے کہ مذہب اسلام نے اپنے پیغمبر کی اور نہ صرف پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی اللہ کے رسولؐ کی ذات سے تھا، اس کی اس طرح سے حفاظت کی ہے کہ دنیا حیرت میں ہے، ان حضرات کو جو آپؐ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو تحریر اور تدوین کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے راویانِ حدیث، محدثین اور اربابِ سیر کہتے ہیں جن میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد میں چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایہ روایت تحریری صورت میں آ گیا تو ان تمام راویوں کے نام ونشان، تاریخ، زندگی، اخلاق و عادات کو بھی ضبط تحریر میں لے آیا گیا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعۂ احوال کا نام ''اسماء الرجال'' ہے۔ اگر دنیا میں تحریری سرمایہ ہی قابل وثوق ہو سکتا ہے تو خود عہد نبویؐ میں صحابہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کو جمع کیا اور بعد والوں کے لیے یادگار چھوڑا اور پھر بعد والوں نے اس کو کتابوں میں تحریر کر لیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ صحابہؓ کی زندگی میں تابعین نے ان تمام روایات، واقعات اور حالات کو ایک ایک سے معلوم کر کے ہمارے لیے فراہم کر دیا تھا۔

سیرتِ مبارکہ کے اس تاریخی پہلو کا سب سے اہم اور سب سے مستند اور صحیح ماٰخذ خود قرآن کریم ہے جس کی صحت واعتبار میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی سیرت کے تمام ضروری اجزاء قبل نبوت کی زندگی، یتیمی، غریبی، اعلان نبوت، تبلیغ، معراج، ہجرت، غزوات سبھی اس میں موجود ہیں اور اس سے زیادہ معتبر تاریخی سیرت دنیا کے پردہ پر دوسری کوئی موجود نہیں ہے اس لیے کہ اللہ کے رسولؐ کی سیرت کو صرف زبانی اور تحریری یادداشت پر ہی محدثین سلف اور خلفائے اسلام نے قناعت نہیں کی بلکہ اس فن کے بڑے بڑے اماموں نے تعلیم کی غرض سے حلقۂ درس قائم کیے اور اس وقت سے لے کر آج تک ہر ملک میں، ہر زبان میں آپؐ کے حالات، واقعات، ارشادات پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کتاب دوسرے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کے مقابلے زیادہ صاف، زیادہ معتبر اور زیادہ تاریخی ہے، سیرت نبویؐ کی ابتدائی کتب ہر مصنف سے سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص نے سنکر، پڑھ کر اور ہر ہر حرف کو سمجھ کر دوسروں کو پہنچایا ہے جس سے بآسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کی شخصیت کو جو تاریخیت ملی ہے وہ کسی دوسرے نبی کے حصہ میں بھی نہیں آسکی ہے۔

جن مختلف انسانی طبقوں نے ہم پر احسانات کیے ہیں وہ سب ہی شکریہ کے مستحق ہیں لیکن سب سے زیادہ جن شخصیات کے احسانات ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جنہوں نے اپنے ادوار میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانہ کے مناسب اخلاق عالیہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا کہ کسی نے صبر، کسی نے ایثار، کسی نے جوش توحید، کسی نے تسلیم ورضا، کسی نے عفت و پاکدامنی اور کسی نے زہد غرض ہر ایک نے دنیا میں انسان کی پُر پیچ زندگی کے راستہ میں ایک ایک مینار قائم کر دیا ہے جو صراطِ مستقیم کا پتہ بتاتا ہے مگر ضرورت تھی ایک ایسے رہبر اور رہنما کی جو اول سے آخر تک پوری راہ کو اپنی ہدایات اور عملی مثالوں سے واضح کر دے اور ہمارے ہاتھوں میں پوری عملی زندگی کی ایک رہبر کتاب دیدے جس سے ہر مسافر منزل مقصود راستہ تلاش کر سکے۔ یہ رہنما سلسلہ انبیاء کے آخری فرد جناب محمد عربیؐ ہیں۔

محمد عربیؐ کی شخصیت عالم میں خدا کی تعلیم وہدایت کی شاہد ہے، نیکوکاروں کو فلاح وسعادت کی بشارت سنانے والے مبشر ہیں اور جو غافل ہیں ان کے لیے نذیر ہیں، بھٹکنے والوں کے لیے اللہ کی طرف پکارنے والے داعی ہیں یعنی آپؐ کی ذات وہ روشنی ہے جو راہ کی تاریکیوں کو کافور کر رہی ہے ویسے تو خدا کا ہر پیغمبر شاہد، مبشر، داعی، نذیر اور سراج منیر بن کر اس دنیا میں آیا ہے مگر یہ تمام صفات سب کی زندگیوں میں عملاً یکساں ونمایاں ہو کر ظاہر نہیں ہوئیں بہت سے خصوصیات کے ساتھ شاہد تھے، کچھ خصوصیت کے ساتھ نذیر تھے اور بعض خصوصیت کے ساتھ داعی حق تھے لیکن جو شاہد، مبشر، نذیر، داعی اور سراج منیر سب کچھ بیک وقت تھے اور جس کی حیات میں یہ سارے نقش ونگار عملاً نمایاں تھے وہ صرف اور صرف آپؐ کی شخصیت ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ عملی یعنی اخلاقی اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہیں جیسا کہ حضرت خدیجہؓ کے اسلام لانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کے دعویٰ نبوت سے قبل وہ آپؐ کی زوجیت میں پندرہ سال رہ چکی تھیں جو ایک طویل عرصہ ہے ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے تو آپؓ نے اس طرح سے آپؐ کو پہچان لیا تھا کہ ادھر زبان مبارک سے نبوت کی خبر نکلتی وہیں حضرت خدیجہؓ کا دل اس تصدیق پر فوراً امادہ ہو جاتا ہے۔ آپؐ کی بلند اخلاقی کی شہادت باری تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں دی ہے یہ کہہ کر اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم (بیشک تو بڑے (درجہ کے) اخلاق پر ہے)۔

سرکارِ دو عالمؐ نے جو کہا وہ کر کے بھی دکھایا ہے یعنی آپؐ کے فرمودات خوشنما الفاظ کا مجموعہ نہیں تھے بلکہ آپؐ کے عزم صادق کا اظہار ہوتے تھے مثلاً آپؐ نے روزوں کا حکم لوگوں کو بتایا کہ عام مسلمانوں پر سال کے ایک ماہ کے روزے فرض ہیں مگر خود کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں ہوتا تھا یا آپؐ نے لوگوں کو صدقات وخیرات کی طرف رغبت دلائی اور خود آپؐ نے زہد وقناعت اور ایثار کی تلقین کی اور ساتھ ہی

ساتھ اس کا نمونہ بھی پیش کیا۔ یہی حال خدا پر اعتماد، توکل اور بھروسہ کا ہے کہ آپؐ ایک ایسی جاہل قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے مگر آپؐ نے کبھی اس کی پروانہ کی اور عین حرم میں جا کر توحید کی آواز بلند کی جس کے نتیجے میں تکلیف دینے کی جو بھی شکلیں اس وقت کے حساب سے ہوسکتی تھیں کفار نے ان تمام کو اختیار کیا مگر آپؐ کے قدم میں ذرہ بھی لغزش نہ ہوئی اگر چہ موقع ایسا بھی آیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے مگر خدا کی نصرت پر کامل اعتماد اور بھروسہ رکھنے والی آپؐ کی ذات پہاڑ کی طرح اپنی جگہ ثابت قدم رہی جیسا کہ میدان احد میں ہوا کہ اکثر مسلمان حواس باختہ ہو گئے تھے جس سے قدم پیچھے ہٹا لئے مگر آپؐ اپنی جگہ پر تھے پتھر کھائے، تیروں اور تلواروں کے حملے ہورہے تھے، خود کی کڑیاں سر مبارک میں دھنس گئی تھیں، دندان مبارک شہید ہو گیا تھا یعنی چہرۂ اقدس زخمی ہو رہا تھا مگر اس وقت بھی اپنا ہاتھ لوہے کی تلوار پر نہیں رکھا بلکہ خدا ہی کی نصرت و مدد پر اعتماد رکھا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری پر پورا یقین تھا۔

دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی جو مثالیں آپؐ کی زندگی میں ملتی ہیں، ان کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ انسانی عاجز و قاصر ہے مثلاً ابوسفیان جو جنگ بدر، احد اور جنگ احزاب جیسی لڑائیوں کا سرغنہ ہوتا ہے یہاں تک کہ کئی مرتبہ وہ آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے، یعنی اس کا ہر قدم اسلام دشمنی کا غماز ہوتا ہے لیکن فتح مکہ میں جب حضرت عباسؓ کے ساتھ آپؐ کے سامنے آتا ہے گو کہ اس کا ہر جرم اس کے قتل کو دعوت دیتا ہے مگر آپؐ کا عفو عام ابوسفیان سے کہتا ہے ڈر کا مقام نہیں ہے محمد الرسول اللہ ﷺ انتقام کے جذبہ سے بالاتر ہیں اور نہ صرف اس کو معاف فرماتے ہیں بلکہ فرمایا جاتا ہے جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا وہ بھی امن میں ہے۔

وحشی جو حضرت حمزہؓ کا قاتل ہے فتح طائف کے وقت وہاں سے کہیں چلا جاتا ہے پھر جب وہ مقام بھی فتح ہو جاتا ہے اور اُسے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی لوگ اس کو کہتے ہیں کہ تم نے محمدؐ کو پہچانا نہیں، تمہارے لیے ان کے آستانے سے بڑھ کر کوئی دوسری جگہ امن کی نہیں ہوسکتی، چنانچہ وحشی حاضر ہوتا ہے، آپؐ دیکھتے ہیں اور آنکھیں جھکا لیتے ہیں عزیز چچا کی شہادت کا منظر سامنے آجاتا ہے، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، قاتل سامنے موجود ہے مگر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے وحشی جاؤ میرے سامنے نہ آیا کرو کہ شہید چچا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سفر طائف کی وہ مشکلات جن کو بھلانا بھی آسان نہ تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے نو برس کے بعد ایک دن معلوم کیا کہ یارسول اللہ ﷺ تمام عمر میں آپؐ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا آیا تب آپؐ نے اسی طائف کے سفر کا حوالہ دیا تھا مگر جب وہی عبد یالیل طائف کا وفد لے کر مدینہ میں حاضر ہوتا ہے تو آپؐ اس کو اپنی مقدس مسجد میں ہی ٹھہراتے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر صحن حرم میں قریش کے باقی ماندہ تمام سردار مفتوحانہ انداز میں کھڑے ہیں ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کو مٹانے میں ہر طرح کا زور آزما چکے تھے، وہ بھی جو آپؐ کے ساتھ گستاخیاں کرتے تھے، جنھوں نے آپؐ کے قتل کے مشورے کیے تھے، جنھوں نے آپؐ کے عزیزوں کا ناحق خون کیا تھا، وہ بھی جو غریب مسلمانوں کو ستانے میں پیش پیش رہتے تھے وہ سب مجرمین سرنگوں تھے اور اللہ کے رسولؐ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا جو آپؐ کے ایک اشارہ کا منتظر تھا مگر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''تم سب آزاد ہو''۔

یہ ہے دشمنوں کو معاف کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک، یہ اسلام کے پیغمبر کا عملی نمونہ اور عملی تعلیم جو صرف خوش بیانیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

مذہب اسلام اپنے پیغمبر کے صرف الفاظ نہیں بلکہ عمل اور سنت کی دعوت دیتا ہے نیز اپنے پیغمبر کو اپنی کتاب کا عملی نمونہ اور پیکر بنا کر پیش کرتا ہے، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اور صرف پیغمبر اسلام کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے چنانچہ طریقۂ

نماز کے ناواقف سے کہتا ہے کہ: ’’تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ بیوی، بچوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم ان الفاظ میں دی جاتی ہے: **خیر کم خیر کم لاھلہٖ و انا خیر کم لاھلی** (تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لیے سب سے اچھا ہو اور میں اپنے بیوی بچوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں)۔

آپ ﷺ نے مساوات، اخوت انسانی اور جنس انسانی کی برابری کی عملی مثال پیش کی، عرب میں قبائل کی باہمی شرافت کی زیادتی و کمی کا حد درجہ لحاظ تھا لیکن زبان نبوت نے اعلان کیا کہ: ’’تم سب آدم علیہ السلام کے بیٹے ہو اور وہ مٹی سے بنے تھے، کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر، عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے تم میں افضل وہ ہے جو اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیزگار ہے‘‘۔ تو اس تعلیم نے دفعتاً سب کو ایک فہرست میں لا کھڑا کیا اور خود آگے بڑھ کر اس کی مثالیں پیش کیں جن امثلہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آدمؑ سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہر ایک نبی کی مصلحانہ زندگی کا نمونہ آپؐ کی شخصیت میں موجود ہے اسی لیے اسلام کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبر کی سنت کی پیروی کی بھی دعوت دیتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب: 21)

(لوگوں تمہارے لیے خدا کے رسولؐ کی زندگی میں بہتر پیروی ہے)۔

11.6 حیاتِ نبوی ﷺ

تمام اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں اور حضرات انبیاء کرام کی یہ برزخی حیات اگرچہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی لیکن بلاشبہ یہ حیات حسی اور جسمانی ہے، اس لیے کہ روحانی اور معنوی حیات تو عام مؤمنین بلکہ ارواح کفار کو بھی حاصل ہے۔

احادیث صحیحہ اور صریحہ سے ثابت ہے کہ مردے سنتے ہیں مگر جواب نہیں دے سکتے، مقتولینِ بدر سے آپ کا خطاب فرمانا صحیحین اور تمام کتب حدیث میں مذکور اور مشہور ہے۔

جس طرح انبیاء کرام اس حیات دنیویہ میں مشغول عبادت تھے اسی طرح اس حیات برزخیہ میں بھی مشغولِ عبادت ہیں، بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کلام میں آخری قید محط کلام ہوتی ہے لہٰذا ’’**الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون**‘‘ میں مقصودِ کلام صلوٰۃ اور عبادت فی القبر کا بیان کرنا ہے، اصل حیات امر مفروغ ہے ’یصلون‘ سے پہلے حیات کا ذکر محض تمہید کے لیے ہے اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء کرام کے اجسامِ مطہرہ اگرچہ اس عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو گئے لیکن وہی اجسام حسب سابق مشغول عبادت ہیں اور اعمالِ حیات اور اشغال زندگی بدستور جاری ہیں اور اعمال و اشغال میں نماز کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ایمان کے بعد درجہ نماز کا ہے اور نماز انبیاء کرام کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ غرض یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی حیات جسمانی ہے، محض روحانی نہیں، اس لیے مرنے کے بعد روحانی حیات اور سمع و ادراک حضرات انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے تمام افراد اور آحاد بشر کے لیے ثابت ہے اور حدیث سے مقصود انبیاء کرام کی خصوصیت اور ان کا امتیاز بیان کرنا ہے، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن تم مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا:

’’ہمارا صلوٰۃ وسلام آپ پر کیسے پیش ہوگا حالانکہ وفات کے بعد آپ کا جسم بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو چکا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ

انبیاء کے اجسام کو کھائے۔اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا،امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے اور بھی شواہد ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے''۔

صحابہ کا سوال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب اس امر کی صریح دلیل ہے کہ حیات سے جسمانی حیات مراد ہے، محض روحانی حیات مراد نہیں، ورنہ اگر فقط روح مبارک پر درود کا معروض ہونا مراد ہوتا تو صحابۂ کرامؓ کا یہ سوال کہ آپ کا جسم تو وفات کے بعد بوسیدہ ہوجائے گا اور پھر حضور پرنور گا یہ جواب کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اجساد انبیاء کو حرام کردیا ہے، سب بے معنی ہوجائے گا، محض روح پر اعمال پیش ہونے کے لیے جسم کا محفوظ رہنا ضروری نہیں، آپ جواب میں یہ فرمادیتے کہ تمہیں جسم سے کیا بحث، تمہارا صلوٰۃ وسلام تو میری روح پر پیش ہوگا، محض روح پر اعمال کا پیش ہونا انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے یہ امر ثابت ہے کہ مردے کلام وسلام کو سنتے ہیں اور بعض ایام میں ان پر ان کے اقارب کے اعمال پیش ہوتے ہیں جیسا کہ **شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور** میں اس پر علامہ سیوطی نے مفصل کلام کیا ہے، روح متصل بالجسد پر قبر میں امت کے اعمال کا پیش ہونا یہ نبی اکرم ﷺ کی خصوصیت ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے روز خاص طور پر مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، جمعہ کا دن یوم مشہود ہے جس میں ملائکہ بکثرت حاضر ہوتے ہیں۔ جو شخص بھی مجھ پر درود پڑھے گا وہ مجھ پر پیش کیا جائے گا، ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"قال ان الله حرم علی الارض ان تأکل اجساد الانبیاء فنبی الله حی یرزق"۔

(کیا بعد موت کے بھی آپؐ پر ہمارا درود پیش ہوگا۔آپؐ نے فرمایا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کے اجسام کو کھائے۔پس اللہ کا ہر نبی قبر میں زندہ ہے اور اللہ کی طرف سے اس کو رزق دیا جاتا ہے)۔

شیخ سبکیؒ فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا یہی عمل تھا کہ آپؐ کے ادب اور تعظیم میں مسجد نبویؐ میں آواز بلند نہیں کرتے تھے **(کماقال تعالیٰ ان الذین یغضون اصواتھم عندرسول الله اولئک الذین امتحن الله قلوبھم للتقویٰ)**۔

سید الملائکہ سیدنا جبریل امین ایک مرتبہ حضور پرنور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بصد ادب آپ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہؐ اجازت ہو تو آپ سے قریب ہوجاؤں، آپ نے اجازت دی، جبریل امینؑ نے حضور پرنور ﷺ کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آواز سے عرض معروض کی۔

اور اسی طرح مرض الوفات میں جب ملک الموت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو بصد ادب ونیاز پست آواز سے قبض روح کی اجازت چاہی۔

اور ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من صلی علی عندقبری سمعته ومن صلی علی نائیا بلغته"۔

(جو شخص میری قبر کے قریب سے مجھ پر درود پڑھتا ہے اسے میں خود سنتا ہوں اور جو دور دراز سے مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھ کو (بذریعہ فرشتوں کے) پہنچا دیا جاتا ہے)۔

اور ظاہر ہے کہ قریب اور بعد کا یہ فرق حیات جسمانی کے اعتبار سے ہے نہ کہ حیات روحانی کے اعتبار سے۔

علامہ مناوی رحمۃ اللہ تعالیٰ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ کی روح مبارک کو آپ کے جسد اطہر کے مستقر یعنی قبر شریف کے ساتھ تعلق ہے اور زمین پر انبیاء کرام کے اجسام کو کھانا قدرۃً ممنوع ہے پس قبر شریف میں آپ کا حال ایسا ہے جیسے سونے والے کا حال ہوتا ہے کہ اس کی روح کو عروج ہوتا ہے جس قدر، جس درجہ اللہ کے یہاں اس کا مرتبہ ہوتا ہے اسی قدر اس کو عالم ملکوت میں عروج ہوتا ہے اور باوجود اس کے اس کی روح کو اس کے بدن سے تعلق رہتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ جو میری قبر کے قریب سے مجھ پر صلاۃ وسلام پڑھے گا اس کو میں خود سنوں گا اور یہ حدیث مذکور اس حدیث کے منافی نہیں جس میں یہ آیا ہے کہ تم جہاں بھی ہو مجھ پر درود بھیجا کرو، اس لیے کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ بار بار میری قبر پر حاضری کی مشقت اور کلفت مت اٹھاؤ، تمہارا درود وسلام مجھ کو ہر جگہ سے پہنچے گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ حاضر ہو کر بالمشافہ صلوٰۃ وسلام غائبانہ صلوٰۃ وسلام سے افضل ہے البتہ ایسی بار بار حاضری جس سے بارگاہِ نبوت کی عظمت وہیبت میں کمی آجائے اس کو منع فرمایا''۔

اور مسند بزار میں بسند جید عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ امت کے اعمال آپ پر پیش ہوتے ہیں اور آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

بہر حال روایات سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء کرامؑ قبروں میں زندہ ہیں اور ان کے اجسام مبارکہ بوسیدہ اور بالیدہ ہونے سے محفوظ ہیں اور وفات کے بعد عبادات سے معطل نہیں، بلکہ نمازیں پڑھتے ہیں اور حج کرتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کو رزق ملتا ہے اور مزار مبارک پر جو شخص حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے، اس کو خود سنتے ہیں اور امت کے اعمال آپ پر قبر ہی میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام امور اس امر کی قطعی دلیل ہیں کہ حضرات انبیاء کی حیات جسمانی ہے اور ارواح طیبہ کا اجسام مبارکہ سے تعلق قائم ہے، غرض یہ کہ انبیاء کرام کی حیات دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور یہ امر بدیہی ہے کہ امت نے جسد اطہر کو وفات کے بعد قبر شریف میں ودیعت رکھا اور شریعت نے مزار مبارک کی زیارت کی تاکید کی ہے اور قبر مبارک ہی میں امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور قبر ہی میں آپ نماز ادا فرماتے ہیں اور قبر مبارک ہی میں آپ کو اللہ کی طرف سے رزق پہنچتا ہے اور اجسامِ مبارکہ کا قبروں میں دفن کیا جانا مشاہدہ اور معائنہ سے ثابت ہے جس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں اور اجسادِ مطہرہ کا قبور سے دوسری جگہ منتقل ہونا کہیں ثابت نہیں اور احادیثِ متواترہ سے انبیاء کرام کی جو حیات ثابت ہے وہ حیات فی القبور ہے، نہ کہ حیات فی السموات۔

اور قبور میں اجسام ودیعت رکھے گئے ہیں تو ثابت ہوگیا کہ انبیاء کرامؑ کی حیات جسمانی ہے اور روح کا اصل تعلق اجسام سے قبروں میں ہے، غرض یہ کہ ان روایات سے یہ امر خوب واضح ہوگیا کہ وفات کے بعد نبی اکرم ﷺ کا اصل مستقر قبر مبارک ہے کہ جہاں آپ کا جسد اطہر محفوظ ہے نہ کہ آسمان۔ اور اسی مقام پر آپ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے تعلق ہے اور اسی جگہ آپ پر امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی روح مبارک کو عالم علوی سے بھی تعلق ہے، لہٰذا اگر آپ کی روح مبارک سیر وتفریح کے لیے اعلیٰ علیین اور ملکوت السموات والارض میں باذن خداوندی جہاں چاہے جائے، تو وہ اس کے منافی نہیں، حق تعالیٰ شانہ کو اختیار ہے کہ اپنے برگزیدہ بندہ کو جہاں چاہے سیر کرائے اور امور آخرت

اوراحوالِ برزخ کواحوالِ دنیا پر قیاس کرنا نادانی ہے۔

حضرات انبیاء کرام بلاشبہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز و نیاز میں مشغول ہیں،لیکن شب معراج میں انبیاء کرام کو نبی اکرم ﷺ کی ملاقات کے لیے مسجد اقصیٰ میں جمع کر دیا گیا اور پھر جس کو چاہا آسمانوں پر بھی بلایا اور ظاہر یہی ہے کہ انبیاء کرام کی یہ ملاقات روح اور جسم دونوں کے ساتھ تھی،جیسا کہ شیخ نورالحق دہلوی نے تیسیر القاری شرح بخاری میں لکھا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شب معراج میں انبیاء کرامؑ کے اصل اجسام مبارکہ تو قبر میں مقیم ہوں اور مسجد اقصیٰ میں آپ کی ملاقات کے لیے ان کی ارواح مبارکہ کو ان کے اجسام عنصریہ کے ہم شکل بنا کر جمع کیا گیا ہو۔مگر ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ حضرات انبیاء ان ہی اجسام دنیویہ کے ساتھ جوان کی قبروں میں محفوظ اور صحیح وسالم ہیں ۔آپ کی ملاقات کے لیے جمع ہوئے ہوں اور قدرتِ قدیمہ کے لحاظ سے لقاء روحانی وجسمانی اور زمینی اور آسمانی اور ہر قسم کا نقل مکانی سب برابر ہیں،محض استبعاد طبعی سے احادیثِ نبویہ کو رد کرنا بے عقلی اور بے دینی کی دلیل ہے،باقی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کس کیفیت اور کس شان سے ملاقات ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے اور جنت کا باغ بنادی جاتی ہے۔پس اگر روضہ اقدس کو نمونہ فردوسِ بریں اور رشکِ علیین بنادیا جائے تو کیا استبعاد ہے،حضرت عثمانؓ سے ایام محاصرہ میں عرض کیا گیا کہ شام چلے جائیں تاکہ وہاں اس فتنہ اور بلا سے محفوظ ہوجائیں،تو یہ فرمایا کہ میں دارِ ہجرت (مدینہ منورہ) اور آنحضرت ﷺ کے قرب اور پڑوس کو نہیں چھوڑ سکتا۔

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے مکان کے کواڑ بنوائے تو یہ حکم دیا کہ یہ کواڑ مدینہ سے باہر جا کر بنائے جائیں تاکہ ان کے بنانے کی آواز مسجد نبویؐ میں نہ آئے اور اس آواز کی وجہ سے حضور پرنور ﷺ کو تکلیف نہ ہو۔

ابونعیم سعید بن مسیّب سے روایت کرتے ہیں کہ جن ایام میں واقعہ حرہ پیش آیا تو مسجد نبویؐ میں میرے سوا کوئی نہ تھا،ان ایام میں جب نماز کا وقت آجاتا تو میں قبر مبارک سے اذان کو سنتا،اس کے مطابق نماز ادا کرتا،تین دن تک مسجد نبویؐ میں نماز نہیں ہوئی اور قبر مبارک سے اذان کی آواز سن کر نماز پڑھتا تھا۔

یہ واقعہ بھی اس کی دلیل ہے کہ روح مبارک کا اسی جسد اطہر سے تعلق قائم ہے کہ جو روضہ اقدس میں ودیعت رکھا گیا ہے،جس کی بناء پر علماء نے لکھا ہے کہ:

> ''حیاۃ الانبیاء کے تمام دلائل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حضرات انبیاء اپنے ابدان اور اجساد مطہرہ کے ساتھ زندہ ہیں،جس طرح دنیا میں ابدان کے ساتھ زندہ تھے یعنی یہ آپ کی حیات برزخیہ حیات جسمانی ہونے میں حیات دنیویہ کے مماثل اور مشابہ ہے۔فرق یہ ہے کہ عالم برزخ میں باوجود حیات جسمانی ہونے کے غذاء سے مستغنی ہیں''۔

عہد صحابہ وتابعین سے لے کر اس وقت تک امت کے تمام علماء وصلحاء کا یہ عمل رہا ہے کہ جو شخص زیارتِ نبویؐ کے لیے جاتا ہے اس کے واسطہ سے حضور پرنورؐ کی خدمت میں ہدیہ سلام بھیجتے ہیں اور بہت سے اولیاءِ امت نے جب حضور پرنور ﷺ پر سلام پڑھا ہے تو حجرہ مبارکہ میں سے وعلیک السلام کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہے۔

یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ روح مبارک کو جسم اطہر کے ساتھ اسی قبر منور میں تعلق ہے،اسی جگہ سلام پڑھا جاتا ہے اور اسی جگہ سے جواب سنا جاتا ہے۔

11.7 ازواج مطہرات اور اولاد

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالی کے خصوصی حکم کے تحت متعدد نکاح فرمائے، ان میں بعض نکاح ان لوگوں کی قربانی کا حق ادا کرنے کے لیے تھا، جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کے لیے قربان کردیا تھا، جیسے حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ۔ بعض نکاح آپ ﷺ نے ان خواتین کی دل داری کے لیے فرمایا جنھوں نے اسلام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا، اور وہ بے سہارا ہوگئی تھیں، جیسے حضرت (اُم حبیبہ) رملہ بنت ابی سفیان۔ بعض نکاح کا مقصد اس قبیلہ کے لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنا اور دعوتِ حق کے قریب کرنا تھا، جیسے حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ، اسی طرح حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح متبنیٰ کی قدیم رسم کو ختم کرنے کے لیے ہوا، کیوں کہ ان کے شوہر حضرت زید بن حارثہؓ آپ ﷺ کے متبنیٰ تصور کیے جاتے تھے، اور زمانہ جاہلیت میں لوگ متبنیٰ کو صلبی بیٹے کا درجہ دیتے تھے۔ بحیثیتِ مجموعی ان ازواج مطہرات کے ذریعہ دین کی نشر و اشاعت میں بے حد مدد ملی۔ تفسیر قرآن، روایتِ حدیث، احکام فقہیہ اور بالخصوص خواتین سے متعلق مسائل بیان کرنے میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ وغیرہ سے اُمت کو جو نفع پہنچا، وہ کسی اور سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

آپ ﷺ کو چار صاحبزادیاں (حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت اُم کلثومؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ) اور تین صاحبزادے ہوئے (حضرت قاسمؓ، حضرت عبداللہؓ، حضرت ابراہیمؓ)، تینوں صاحبزادے بچپن ہی میں فوت ہوگئے، حضرت ابراہیمؓ کے سوا آپ ﷺ کی تمام اولاد اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے ہیں، حضرت ابراہیم آپ کی باندی اور زوجہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اُم المومنین	اُم المومنین کی عمر بوقت نکاح	نبی ﷺ کی عمر بوقت نکاح
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	40سال	25سال
حضرت سودہؓ	50سال	50سال
حضرت عائشہ صدیقہؓ	9سال	54سال
حضرت حفصہؓ	22سال	55سال
حضرت زینب بنت خزیمہؓ	30سال	55سال
حضرت اُم سلمہؓ	26سال	56سال
حضرت زینب بنت جحشؓ	26سال	57سال
حضرت جویریہؓ	20سال	57سال
حضرت ریحانہ بنت زیدؓ	--	57سال
حضرت اُم حبیبہؓ	26سال	57سال
حضرت ماریہ قبطیہؓ	--	58سال
حضرت صفیہؓ	17سال	59سال
حضرت میمونہؓ	36سال	59سال

11.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اللہ کے رسول ﷺ کی نبوت سے قبل کی زندگی بھی بے مثال ہے اگر یہ کہا جائے کہ جن اوصافِ حمیدہ اوراخلاقِ فاضلہ کی بنیاد پر ایک کامل انسان کا نقشہ سامنے آتا ہے وہ سب آپ ؐکی زندگی میں وحی الٰہی کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی نمایاں ہو جاتے ہیں۔
- آپ ؐکی دو تہائی زندگی مکہ میں گذری اس لیے اس کو جاننا ضروری ہے چاہے قبل از نبوت والی ہو یا بعد از نبوت والی ہو۔
- نبوت کے بعد اللہ کے رسول ؐکی زندگی کتاب اللہ کی تفسیر قرار دے دی جاتی ہے۔
- اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت تاریخی ہے۔
- اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت کامل اور جامع ہے۔
- اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت اور آپ ؐکا اسوہ عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل ہے۔

11.9 نمونہ امتحانی سوالات

11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. انگریزی تاریخ کے حساب سے آپ ﷺ کی ولادت کب ہوئی تھی؟

a. 20/جنوری571ء b. 20/فروری571 c. 20/مارچ571ء d. 20/اپریل571ء

2. آپ ﷺ کی والدہ کا انتقال کہاں ہوا تھا؟

a. مکہ میں b. میدان عرفات میں c. مقام ابوا میں d. مدینہ میں

3. عبدالمطلب کی وفات کے وقت آپ ﷺ کی عمر کیا تھی؟

a. 6/سال b. 8/سال c. 10/سال d. 12/سال

4. حرف فجار کے وقت آپ ﷺ کی عمر کیا تھی؟

a. 12/سال b. 15/سال c. 17/سال d. 19/سال

5. عبداللہ بن جدعان کے گھر پر جس معاہدہ میں آپ ﷺ نے شرکت کی تھی اس کا نام کیا ہے؟

a. واقعہ تحکیم b. حلف الفضول c. صلح حدیبیہ d. بیعت رضوان

6. تعمیر کعبہ میں جب آپ ﷺ کو حکم بنایا گیا تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر کیا تھی؟

a. 25/سال b. 30/سال c. 35/سال d. 40/سال

7. مکہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی کتنی زندگی گذری تھی؟

a. ایک تہائی b. دو تہائی c. آدھی d. سب غلط

8. صفہ کن کی جائے قیام تھی؟

a. جن کے اپنے گھر نہ تھے b. مدینہ والوں کی c. مکہ والوں کی d. مہمانوں کی

9. حضرت خدیجہؓ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے وقت آپ ﷺ کی عمر کیا تھی؟

a. 20/سال　b. 25/سال　c. 30/سال　d. 35/سال

10. حجر اسود کے لفظی معنی کیا ہیں؟

a. کالا پتھر　b. سفید پتھر　c. جنت کا پتھر　d. جنت کی کیاری

11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. آپ ﷺ کا سن ولادت لکھ کر بتائیے کہ شروعات کے چھ سالوں میں آپ ﷺ کس کس کے ساتھ رہے؟
2. آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے کفالت کا کیسا حق ادا کیا؟ بیان کیجیے۔
3. تعمیر کعبہ میں جب آپ ﷺ کو حکم بنایا گیا اس کے متعلق اپنی معلومات تحریر کریں۔
4. عبد المطلب کی کفالت میں آپ ﷺ کتنے دن رہے اور اپنے مرض الوفات میں انہوں نے ابو طالب کو کیا وصیت کی تھی؟
5. حرب فجار کے وقت آپ ﷺ کی عمر کتنی تھی اور اس جنگ میں آپ نے کیا خدمت انجام دی؟

11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اللہ کے رسول ﷺ کی مکی زندگی کا حال مفصلاً لکھیے۔
2. اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت کامل اور جامع ہے، تفصیل سے تحریر کیجیے۔
3. اللہ کے رسول ﷺ کا اسوہ تاریخی اور نمونہ عمل ہے، مفصل نوٹ لکھیے۔

11.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	سیرۃ النبی (جلد اول)	:	علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی
2.	تاریخ اسلام (جلد اول)	:	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی
3.	سیرۃ المصطفیٰ (جلد دوم)	:	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
4.	رحمت للعالمین	:	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

-:oOo:-

اکائی 12 : تدوین سیرت

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقصد
12.2		سیرت کا مفہوم
	12.2.1	سیرۃ کے لغوی معنی
	12.2.2	اصطلاحی مفہوم
	12.2.3	غزوہ کے معنی
	12.2.4	فن سیرت کی اصطلاحی تعریف
12.3		سیرت طیبہ کے مصادر
	12.3.1	قرآن مجید
	12.3.2	معاہدات
	12.3.3	خطوط
	12.3.4	فرامین وتقاریر
	12.3.5	احادیث
12.4		تدوین سیرت
	12.4.1	پہلی صدی ہجری
	12.4.2	دوسری صدی ہجری
	12.4.3	تیسری صدی کے اہم سیرت نگار
12.5		اکتسابی نتائج
12.6		کلیدی الفاظ
12.7		نمونہ امتحانی سوالات
	12.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	12.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	12.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات

12.0 تمہید

سیرت کا موضوع بڑا اہم ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات وخدمات کا تعارف کرایا جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔رہتی دنیا تک کے لیے بھیجے گئے اور دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی کا واحد نسخہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں مضمر ہے۔آپ ﷺ کی حیات کا ایک ایک گوشہ اور آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک عمل قابل تقلید ہے۔آپ ﷺ کی ذات شریعت مطہرہ کی عملی تفسیر ہے۔اس لیے اللہ کی کتاب قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں وہ تمام امور ضبط تحریر میں لائے گئے جو شریعت ہیں لیکن حیات طیبہ کے کچھ ایسے گوشے جن کا تعلق احکام سے نہیں تھا ان کو احادیث کی کتابوں میں تفصیل سے شامل نہیں کیا گیا۔شروع میں انہی امور کی تفصیلات مرتب کرنے کے لیے سیرت کا فن وجود میں آیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمریوں میں ان امور کی تفصیل لکھی گئیں تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھنے کا اہتمام عہد صحابہ میں شروع ہو گیا تھا اور پھر بتدریج یہ رجحان بڑھتا گیا۔آج صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سوانح عمریاں تقریباً ہر زبان میں موجود ہیں اور تقریباً ہر مذہب کے ماننے والوں نے اس بابرکت کام میں حصہ لیا ہے۔آج گزرتے ہوئے وقت کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب آپ کی سیرت پر کوئی تحریر نہ لکھی جارہی ہو۔دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اور کسی نہ کسی زبان میں ہر وقت سیرت طیبہ کے موضوع پر کوئی نہ کوئی نئی تحریر ضبط تحریر میں آرہی ہوتی ہے۔دنیا میں آج تک کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا ہوئی جن کی تفسیر حیات اتنی تفصیل سے لکھی گئی ہو اور اتنی تعداد میں لکھی گئی ہو اور پھر بھی عالم یہ ہو کہ:

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر　　　ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

یعنی دفتر ختم ہوگئے اور عمر کی منزل ختم ہوگئی اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ابھی آپ کی توصیف کی تمہید ہیں الجھے ہوئے ہیں۔

12.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو سیرت کے معنی ومفہوم اور اس کے مترادفات سے واقف کرانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ سیرت کے بنیادی مراجع ومصادر جیسے قرآن مجید اور اس کے علاوہ احادیث رسول اللہ ﷺ،آپ ﷺ کے فرامین،خطوط،معاہدات اور دیگر روایات سے آگاہ ہو جائیں گے۔آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سیرت طیبہ کی ترتیب وتدوین کیسے ہوئی،شروع میں سیرت کی کون سی کتابیں لکھی گئیں،خاص طور پر سیرت کی بڑی کتابوں کی تالیف سے پہلے سیرت کے موضوع پر کیا تصنیفی سرمایہ تھا۔ساتھ ہی ان کتابوں کے مصنفین اور مولفین کی حیات وخدمات کا بھی مختصر تعارف آپ کے سامنے لانا اس اکائی کا مقصد ہے۔

12.2 سیرت کا مفہوم

12.2.1 سیرۃ کے لغوی معنی:

سیرت یا السیرۃ عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کا مادہ سیر (س ی ر) ہے اور اس کے اصل معنی چلنے کے آتے ہیں۔لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ:

''لفظ 'سیرۃ' سار یسیر (باب ضرب یضرب) سیراً ومسیراً سے مشتق ہے۔اس کے اصلی حروف یعنی مادہ (س ی ر) ہے۔اس کے معنی ہیں

’جانا، لے جانا، چلنا، چلانا، منزل اور مسافت‘‘۔

یہ لفظ قرآن مجید میں بھی اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے:

’’**وقد رنا فیھا السیر**‘‘۔(السبا:18)

(ہم نے اس میں منزلیں مقرر کردی تھیں ان میں آنے جانے کی)۔

’’**وتسیر الجبال سیرا**‘‘۔(الطّور:10)

(اور پہاڑ (اپنی جگہ چھوڑ کر) تیزی سے چلنے لگیں گے)۔

اسی طرح انسانوں کے چلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

’’**فسیروا فی الارض**‘‘۔(آل عمران:137)

(تم زمین میں چل کر دیکھو)۔

’’**فلما قضی موسی الاجل وسار باھله**‘‘۔(القصص:29)

(پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کردی اور وہاں سے چلے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر)۔

سار اور سیر کے لغوی معنی میں اصل چلنا ہے۔ البتہ لغت میں اس لفظ کا مجازی استعمال بھی بکثرت ہے۔ چوں کہ جس طرح چلنا جسمانی ہوتا ہے اسی طرح فکر وخیال بلکہ عمل کی بھی ایک رفتار ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کے مجازی معنی میں معنوی طور پر چلنا یعنی عادات، اطوار اور خصائل بھی شامل ہیں۔ اسی طرح دشمنوں پر حملہ کرنا بھی اس کے اندر شامل ہے۔ اسی لیے **سار الی** کا مطلب کسی پر حملہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی ایک اعتبار سے چلنا ہی ہوتا ہے۔

12.2.2 اصطلاحی مفہوم:

سیرت کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں سیرت سے مراد سنت ،طریقہ ،ہیئت و حالت ،عادت وخصلت ،کردار وعمل ،طرز زندگی، عزت وناموس، معاملہ، مغازی، جہاد، قواعد وضوابط، بین الاقوامی معاملات، سوانح حیات اور سیرت نبوی وغیرہ تمام معانی ومفاہیم لیے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ آج کل ایک لفظ السیر ۃ الذاتیہ بھی استعمال ہوتا ہے اس کا مطلب اب کردار وعمل سے لیا جاتا ہے۔ البتہ اگر لفظ السیر ۃ سیرت مفرد استعمال ہو تو اس سے خاص رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہی مراد لی جاتی ہے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے:

’’**السیرة: السنة ،وقد سارت**

السیـرة: وسـرتهـا؛ السیـرة: الطریقة، یقال: سار بمسیرة حسنة والسیرة: الھیئة، وفی التنزیل العزیز : سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ. وسیر سیرة: حدث احادیث الاوائل‘‘۔

(سیرت کے لفظی معنی سنت اور طریقہ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کے اچھے طریقے پر چلا۔ سیرت کا معنی ہیئت وحالت بھی ہے۔ قران مجید میں ہے ’’ہم اسے عنقریب پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔ سیر کے ایک معنی قصے

بیان کرنے کے بھی آتے ہیں۔جیسے سیر سیرۃ کا مطلب ہے اس نے پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں بیان کیں)۔

اس طرح سیرۃ کے اصل معنی تو چال اور چلن یعنی رفتار اور مزاج دونوں کے آتے ہیں لیکن اصطلاح میں اب سیرت سے مراد اخلاق وعادات لیے جاتے ہیں اور السیر ۃ بالعموم اللہ کے رسول صلی اللہ ﷺ کے عادات،اخلاق اور آپ کی سوانح عمری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایک بات ملحوظ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات کے لیے لفظ سیرت کا استعمال بعد میں ہوا۔ابتدا میں رسول اللہ ﷺ کی حیات 'المغازی' کے عنوان سے مرتب کی گئی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ان کتابوں کے اندر صرف غزوات کی تاریخ مرتب کرنا ہی مقصود تھا۔جب اس میں پوری حیات طیبہ کو شامل کیا گیا تو پھر نام بھی السیر ۃ ہو گیا۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی جنگوں کے دو نام ہیں،ایک غزوہ اور دوسرا سریہ۔سیرت کی تدوین سے پہلے ان دو الفاظ کے معنی و مدلول کو بھی جاننا ضروری ہے۔

12.2.3 غزوہ کے معنی:

غزوہ عربی زبان کا لفظ ہے جو **غزا، یغزو، غزواً** سے مشتق ہے اس کے لغوی معنی ارداہ کرنے اور طلب کرنے کے ہیں۔اپنی اصل کے اعتبار سے سار اور غزا کا مفہوم ایک ہے۔یعنی اس میں چلنا شامل ہے۔اصطلاحاً یہ لفظ بھی جنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب اسلامی روایات میں السیر ۃ صرف رسول اللہ ﷺ کی حیات وکوائف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

> **''واصل الغرو القصد ومغزی الکلام مقصدہ ،والمراد با لمغازی ھنا ما وقع من قصد النبی الکفار بنفسہ او بجیش من قبلہ وقصد ھم اعم من ان یکون الی بلاد ھم او الی الاماکن التی حلوھا''۔**
>
> (غزو کے لغوی معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے آتے ہیں۔یہاں مغازی سے مراد نبی کریم کا بذات خود اپنے لشکر کے ساتھ کفار کی طرف نکلنا ہے۔یہ قصد وارادہ عام ہے خواہ ان کے شہروں کی طرف نکلیں یا ان مقامات کی طرف جہاں وہ قیام پذیر ہوں)۔

اصطلاح میں غزوہ کا مطلب ہوتا ہے ایسی جنگ جس میں رسول اللہ ﷺ خود شریک ہوئے ہوں ابتداً لفظ مغازی اپنے محدود معنی میں استعمال ہوتا تھا۔لیکن بعد میں اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوگئی حتیٰ کہ کتب سیرت پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔چنانچہ مغازی عروہ بن زبیر ،مغازی ابان بن عثمان،مغازی محمد بن شہاب زہری،مغازی ابن اسحاق،مغازی موسیٰ بن عقبہ اور مغازی واقدی وغیرہ میں مغازی کی راوایات کے ساتھ ساتھ دیگر روایات بھی شامل ہیں۔

چونکہ شروع میں ان کتابوں میں غزوات کے حالات زیادہ تفصیل سے ہوتے تھے،غالبًا اسی لیے ان کو کتاب المغازی کہا جاتا تھا۔بعد میں ان کتابوں میں سریات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا اور من جملہ پوری حیات طیبہ کے احوال بھی شامل کر دیئے گئے،اس لیے ان کتابوں کا نام المغازی کی جگہ السیر ۃ ہو گیا۔اب السیر ۃ النبو یہ کا مطلب ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک اور آپ کا پیغام۔

12.2.4 فن سیرت کی اصطلاحی تعریف:

محدثین عام طور پر فن سیرت کو بھی علم حدیث کا ہی ایک شعبہ قرار دیتے ہیں۔کیونکہ اس میں بھی نبی کریم ﷺ کے اقوال،افعال اور تقریرات

کا بیان ہوتا ہے۔اسی لیے وہ سیرت کو الگ سے کوئی فن تسلیم نہیں کرتے ہیں، بلکہ حدیث کا ہی ایک شعبہ قرار دیتے ہیں،مثلاً امام حاکم نے ''النوع الثامن والاربعون'' کے ماتحت لکھا ہے:

''هذا النوع من هذه العلوم معرفةمغازی رسول الله و سر ایاه و بعوثه و کتبه الی ملوک المشرکین وما یصح من ذالک وما یشذ''۔

(علوم حدیث کی اقسام میں یہ قسم ان امور کی معرفت ہے کہ رسول اللہ کے مغازی وسرایا،آپ کے بعوث اور مختلف مشرک بادشاہوں کی طرف خطوط میں کیا صحیح ہے اور کیا شاذ)۔

تاہم اکثر محدثین کے برخلاف اہل سیر اس فن کو ایک مستقل فن تسلیم کرتے ہیں۔چنانچہ حاجی خلیفہ نے اس فن کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''علم السیر مشتمل علی فنون، فن اسمائه، فن خصائصه، فن فضائله، فن شمائله، فن مغازیه، فن مولده ومبعثه''۔

(سیر کا علم چند فنون پر مشتمل ہے۔اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء،خصائص،فضائل،شمائل، مغازی اور مولد مبعث کے فنون شامل ہیں)۔

اس فن کی تدوین کے دوران اصحاب سیر کی توجہ مذکورہ بالا امور تک ہی رہی۔لیکن جیسے جیسے اس فن کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے اس کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔اب اس فن میں پورا عہد نبوی شامل ہے اور پورا اسلام کا نظام بھی اس میں شامل ہے۔چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب 'سیرۃ النبی' کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات اور پیغام کے جملہ پہلو شامل تھے،اور پھر اسی کے مطابق وہ کتاب تصنیف ہوئی۔اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے سیرت کے موضوع کی اس وسعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جو کچھ ہمارے پیغمبر،حضرات صحابہ اور آں عظام کے مبارک وجود کے ساتھ متعلق ہو اور آں جناب کی پیدائش سے وفات تک واقعات پر مشتمل ہو،سیرت کہتے ہیں''۔

القاموس الاسلامی میں اس فن کی تعریف اس طرح نقل کی گئی ہے:

''السیرة: اذا جاء لفظها مفردامعرفا قصد به تخصیصا 'السیرةالنبویة' ای تاریخ حیاة الرسول من مولده الی وفاته علیه السلام، مع ذکر آبا ئه واهل بیته وصحابته، فضلا عن ذکر خصاله علیه السلام واحواله وعاداته، ثم الاحداث المرتبطة بالدعوة کالوحی والهجرات والغزوات والوفود''۔

(سیرت کا لفظ جب مفرد معرفہ آئے تو اس سے بالخصوص سیرت نبوی مراد ہوئی ہے۔یعنی رسول کریم کے آباء،اہل بیت اور صحابہ کرام کے تذکرے سمیت آپ کی حیات کا ذکر،ولادت سے وفات تک،نیز آپ کے فضائل،احوال اور عادات،پھر وہ واقعات جن کا تعلق دعوت [توحید ورسالت] سے ہے،مثلاً وحی،ہجرت،غزوات اور وفود [بھی اس میں شامل ہیں])۔

12.3 سیرت طیبہ کے مصادر

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔اس لیے اول دن سے ہی سیرت طیبہ کو تحریری طور پر کتابوں میں اور عملی طور پر صحابہ کرام کے طریق زندگی میں منضبط کیا جاتا رہا۔رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے تمام واقعات اور زندگی کے تمام گوشے پوری طرح تاریخ کی روشنی میں ہیں۔رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دنیا کی کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کے احوال وکوائف اور ان کی جلوت وخلوت اس تفصیل سے تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہوں۔تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی تدوین وترتیب کے لیے بنیادی مصادر ومراجع جن پر سیرت کی بنیاد قائم ہے،حسب ذیل ہیں:

12.3.1 قرآن مجید:

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے جو رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔اس کتاب میں تمام انسانوں کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے مکمل ہدایت و رہنمائی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے پیغام کا اس میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہی سراپا القرآن ہے۔خود قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ’’**انک لعلی خلق عظیم**‘‘۔(القلم:4) یعنی اے محمد! بے شک آپ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہیں اسی طرح حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے اخلاق سراپا قرآن تھے۔

گویا قرآن مجید میں سیرت طیبہ کا بڑا حصہ محفوظ ہے اور بعض علماء نے صرف قرآن میں موجود سیرت طیبہ کے پہلوؤں کو الگ سے لکھ بھی دیا ہے۔اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں قرآن مجید میں موجود سیرت کے پہلوؤں کو مرتب کر کے کتابی شکل میں مدون کر دیا گیا ہے۔
اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ سیرت طیبہ کا سب سے معتبر ذریعہ کلام اللہ ہے۔

12.3.2 معاہدات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے معاہدات ہوئے۔ جیسے میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ، نجران کے لوگوں سے معاہدہ، بلکہ شعب ابی طالب کی محصوری بھی ایک دستاویز کی شکل میں تھی۔قریش نے باضابطہ ایک معاہدہ لکھ کر یہ مقاطعہ کیا تھا۔ان مشہور دستاویزات کے علاوہ بھی بعض معاہدات اور بھی تھے جن کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

سفر ہجرت میں سراقہ بن جعشم کو امان نامہ لکھ کر دینے کا تذکرہ متعدد کتابوں میں ہے۔خود سراقہ سے منقول ہے:

> ’’میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ میرے لیے ایک امان نامہ لکھ کر عنایت فرما دیں کہ جب آپ دوبارہ مکہ پر قبضہ کریں تو اس کی وجہ سے میرے گھر والے محفوظ رہیں۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کے لیے امان نامہ لکھ دیا۔‘‘

ہجرت کے بعد مہاجرین وانصار اور ان کے حلیف قبائل نیز مدینہ کے یہودیوں کے مابین تحریری معاہدہ طے پایا جو میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہے جس کا ذکر اوپر بھی آیا ہے اور جس کو مؤرخین ومحققین دنیا کا پہلا تحریری دستور قرار دیتے ہیں۔تحریری معاہدہ ہونے کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنی نوعیت میں یہ معاہدہ سیکولر تھا۔یعنی اس میں تین مذاہب کے لوگ شامل تھے اور تینوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔یہ معاہدہ متعدد کتابوں میں منقول ہے۔ابن ہشام نے لکھا ہے کہ:

’’وکتب رسول اللہ کتابا بین المھاجرین والانصار، وادع فیھم یھود

وعاهدهم...''۔

(رسول اللہ نے مہاجرین وانصار کے مابین ایک معاہدہ لکھا، اس صلح نامہ میں آپ نے یہودیوں کو بھی شامل فرمایا)۔

مدینہ منورہ تشریف لانے سے کچھ عرصہ بعد آپ نے مردم شماری کرائی، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل اسلام کے اسماء گرامی نقل تحریر کیے جو پندرہ سو تھے۔

ان کے علاوہ اس زمانے میں اور بھی کئی طرح کے تحریری کام تھے جو باضابطہ ریکارڈ کی طرح رکھے جاتے تھے۔ مثلاً جہاد کے بعد حاصل ہونے والے مال غنیمت کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ آمدنی اور خرچ کا بھی باضابطہ اندراج ہوتا۔ بعض صحابہ اسی کام پر مامور تھے اسی طرح ایک صحابی حضرت محمد بن مسلمہ اوسی انصاری کا بھی تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے غزوہ بنوقینقاع سے حاصل شدہ مال غنیمت کا حساب لکھا تھا۔ بلکہ وہ حساب انہی کے پاس رہتا تھا۔

12.3.3 خطوط:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں بہت سے خطوط لکھوائے تھے۔ ایسے خطوط کا تذکرہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے اور چند خطوط اپنی شکل میں موجود بھی ہیں۔ طبقات ابن سعد اور بعض دوسری کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے کم وبیش تین سو خطوط نقل کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر طبقات ابن سعد میں خطوط نقل کرنے کے ساتھ اس پر لگائی گئی مہر اور تصدیقات جیسی دیگر ضمنی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ ایک صحابی حضرت عمرو بن حزم انصاری نے تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہی آپ ﷺ کے خطوط جمع کرنے شروع کر دیئے تھے، اور تقریباً 21 خطوط کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس مجموعے کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ بعد میں ابن طولون نے اس کو مکمل اپنی کتاب میں نقل کر لیا تھا۔

12.3.4 فرامین وتقاریر:

رسول اللہ ﷺ کے متعدد تحریری فرمانوں اور تحریری خطبات کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ خاص طور پر صدقات وزکوۃ سے متعلق تحریری فرامین کتابوں میں مذکور ہیں۔ تحریری خطبات کے سلسلے میں بخاری کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ''**اکتبوہ لابی شاہ**'' (یہ ابوشاہ کے لیے لکھ دو)۔ اس سے یہ قیاس کرنا ممکن ہے کہ یہ خطبہ تحریری شکل میں ہوگا۔ اگر پہلے سے تحریر نہیں بھی تھا تو ابوشاہ کے لیے اس کو ضرور قلم بند کیا گیا ہوگا۔

12.3.5 احادیث:

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں احادیث بھی لکھی جاتی تھیں۔ لیکن یہ انفرادی کاوشیں تھیں اور ان کو بھی زیادہ عام نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ قرآن اور احادیث آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اس لیے تحریری احادیث کا ذکر آخر میں ہوا۔ بہر حال احادیث تو سیرت طیبہ کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ احادیث کے ان مجموعوں کی تفصیل ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی کتاب 'دراسات فی الحدیث النبوی' اور رسول اللہ کے عہد سے متعلق دیگر تحریری سرمایے کی تفصیلات ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب ''الوثائق السیاسیۃ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

12.4 تدوین سیرت

سیرت کی اولین مستقل کتابیں عہد صحابہ میں لکھی گئیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اس دور میں سیرت کی کتابیں المغازی کے نام سے لکھی گئیں،

جن میں صرف غزوات کی تفصیل ہوتی تھی۔ بعد میں ابن اسحاق نے 'السیر ۃ النبویۃ' کے نام سے تفصیلی کتاب لکھی جس میں غزویات وسرایا اور رسول اللہ ﷺ کے احوال زندگی بھی شامل تھے۔ چونکہ ابن اسحاق نے ہی سب سے پہلے سیرت طیبہ کے تمام پہلوؤں کو مدون کر کے اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتاب لکھی اور اپنی اس کتاب کا نام السیر ۃ النبویۃ رکھا اس لیے ان کو پہلا سیرت نگار بھی کہہ دیتے ہیں۔ ابن اسحاق کی سیرت کو ابن ہشام نے ایڈٹ کیا۔ یعنی اس کی تہذیب کی، اس لیے اب ابن ہشام کی سیرت زیادہ مقبول ہے۔

تدوین سیرت کے اس تاریخی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ابتدائی دور کے سیرت نگاروں کا تعارف ضروری ہے۔ ذیل میں سیرت نگاری کی اس تاریخ کو صدی وار نقل کیا جاتا ہے۔

12.4.1 پہلی صدی ہجری:

پہلی صدی ہجری میں سیرت ومغازی کی تدوین کے دو طریقے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ بعض صحابہ کرام صرف سیرت ومغازی کی احادیث روایت کرتے تھے۔ اس طرح گویا سیرت کی تدریس کے لیے باضابطہ استاد مقرر تھے اور اس کام کے لیے جگہ بھی مقرر تھی۔ مثلاً حضرت سفیان ثوری فرماتے تھے کہ جو شخص مغازی سیکھنا چاہے وہ مدینہ کا رخ کرے۔ (تدوین مغازی وسیر از قاضی اطہر مبارک پوری، ص168) یعنی مدینہ میں مغازی کا درس سب سے اچھا ہوتا تھا۔ اسی طرح مروی ہے کہ حضرت عبداللہ عباسؓ مسجد نبوی کے اندر ایک روز تفسیر کا درس دیتے تھے اور ایک روز مغازی کا درس دیتے تھے۔ اس طرح حضرت زین العابدین کا مقولہ مشہور ہے کہ ''ہم لوگ جس طرح اہتمام کے ساتھ قرآن کی تعلیم دیتے اسی طرح غزوات کا درس بھی دیا کرتے تھے''۔

سیرت کی حفاظت اور تدوین کا دوسرا طریقہ اس موضوع پر باضابطہ کتابوں کی تالیف کا تھا۔ بعض صحابہ اور بعض تابعین نے مغازی کی روایات جمع کر کے ان کو مستقل کتابی شکل میں مدون کیا تھا اور ان کو کتاب المغازی کا مستقل نام دیا تھا۔ پہلی صدی میں مغازی کی تدوین کرنے والے اہم مصنّفین حسب ذیل تھے۔

عبداللہ بن عباس:

حضرت عبداللہ بن عباس تفسیر وفقہ کے علاوہ مغازی کے بھی امام تھے اور انہوں نے ان تینوں علوم کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا تھا جس میں وہ ایک دن میں صرف ایک ہی علم کا درس دیا کرتے تھے۔ ابن سعد نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مسجد نبوی میں بیٹھ کر ایک روز فقہ کا، ایک روز تفسیر کا، ایک روز مغازی کا، ایک روز شعر کا اور ایک روز تاریخ کا درس دیتے تھے''۔

اگر چہ سیرت کے موضوع پر حضرت ابن عباس کی کسی مستقل کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اس وقت کا رواج یہی ہے کہ جو جس فن کا ماہر ہوتا تھا وہ اس فن کا مصنف بھی ہوتا تھا۔ اس لیے اصولی طور پر فن سیرت کے پہلے عالم اور مصنف حضرت ابن عباس ہی ہیں۔ چونکہ ان کی تصنیفات اہل تحقیق کی نگاہوں سے اوجھل رہیں اس لیے تذکرہ نگاروں کے باریک قلم نے سیرت کے پہلے مصنف ہونے کی یہ سعادت حضرت عروہ بن زبیر کے لیے مختص کر دی ہے۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ:

حضرت عروہ بن زبیر کی ولادت 23ھ مطابق 644ء میں ہوئی اور وفات 94ھ مطابق 713 میں ہوئی۔ وہ مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت

ابوبکر کے بیٹے اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔حضرت عائشہ کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کی اوران سے علم کا اکتساب کیا۔اپنے وقت کے جید عالم تھے۔بڑے فقہاء میں شمار ہوتے تھے اور حدیث کے بھی امام تھے۔انہوں نے ساری زندگی نہایت سادگی کے ساتھ گزاری۔ان کے بڑے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر باضابطہ خلیفہ بھی رہے۔خود ان کے بھی عبدالملک بن مروان سے بڑے قریبی روابط تھے۔انہوں نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مدینہ طیبہ میں ہی بسر کیا۔

حضرت عروہ بن زبیر کی کتاب کا نام 'مغازی الرسول' ہے۔یہ کتاب سیرت کی اکثر کتابوں کے لیے مرجع رہی ہے۔اگرچہ بعد میں اس کو سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں کا حصہ بنالیا اوراس کی انفرادی اہمیت صرف نام کی حد تک رہ گئی۔

ابوعمرو عامر بن شراحیل شعبی:

حضرت عامر بن شراحیل شعبی بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔وہ فقہ کے بڑے عالم تھے اور فقہ میں ان کی آراء بہت معروف ہیں بلکہ فقہ کے ارتقا میں ان کا بڑا کردار ہے۔انھوں نے پانچ سو صحابہ کا زمانہ پایا۔صحابہ کے بعد اپنے زمانے میں دینی علوم کے مرجع مانے جاتے تھے۔فن مغازی پر بھی ان کو بڑی غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔انھوں نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔ان کی کتاب کا نام خطیب بغدادی نے 'المغازی' لکھا ہے۔لیکن بعض دوسری کتابوں میں اس کتاب کے کئی اور نام بھی درج ہیں جیسے بعض کتابوں میں کتاب الفتوح یا کتاب الفتح کے نام بھی ملتے ہیں۔وہ اس کتاب کو پڑھایا کرتے تھے۔قتیبہ بن مسلم باہلی نے جب فرغانہ کے علاقے میں قلعہ جات فتح کیے تو اس دوران امام شعبی نے ''کتاب الفتح'' کا املاء کرایا۔آپ کا بیان ہے۔

''فجعلت املی علیه وهو ینظر حتیٰ فرغ من کتاب الفتح''۔

(پھر میں اس کے کاتب کو املاء کرانے لگا وہ دیکھ رہا تھا، حتیٰ کہ وہ کاتب ''کتاب الفتح'' لکھ کر فارغ ہوا)۔

اس کتاب کے کئی نام مذکور ہیں اور مختلف مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ یہ کتاب اپنے زمانے میں کافی مشہور تھی۔بعد میں اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس دور کی اکثر کتابوں کے ساتھ ہوا۔یعنی اس کتاب کو بعد کے مصنفین نے اپنی کتاب میں شامل کرلیا اوراس کا انفرادی وجود ختم ہوگیا۔

ابان بن عثمان:

ابان بن عثمان کی ولادت 20ھ مطابق 640 کے قریب ہوئی اور وفات ایک روایت کے مطابق 105ھ مطابق 723 میں ہوئی۔تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کے بیٹے تھے۔مدینہ کے بڑے فقہا میں شمار ہوتے تھے۔مدینہ میں حاکم بھی رہے۔لیکن ان کی اصل اہمیت اور اصل پہچان ان کی علمی فضیلت ہے۔انہوں نے غزوات سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔بلکہ بعض لوگ ان کو ہی پہلا سیرت نگار قرار دیتے ہیں اس لیے کہ وہ عمر میں حضرت عروہ سے تین سال بڑے تھے اور انہوں نے 99ھ سے قبل اپنی کتاب مرتب کر لی تھی۔روایتوں میں آتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک جب مدینہ طیبہ آئے تو انہوں نے ابان سے درخواست کی کہ وہ مغازی پر ایک کتاب لکھ دیں۔انہوں نے بتایا کہ وہ کتاب لکھ چکے ہیں۔سلیمان نے اس کو نقل کروالیا۔

قاسم بن محمد بن ابوبکر:

قاسم بن محمد بن ابوبکر (37ھ مطابق 657ء-107ھ مطابق 725ء) بڑے جید عالم تھے۔حضرت ابوبکر صدیق کے پوتے اور امام جعفر

صادق کے نانا اوران کے مربی تھے۔فقہ کے ماہر تھے۔مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار ہوتے تھے۔مغازی پر بھی بڑی وسیع نظر تھی۔امام طبری نے مغازی پر ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے اوراس میں سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

ہمام بن منبہ:

ہمام بن منبہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد تھے۔حدیث کے جید عالم تھے۔حدیث پر ان کی ایک مستقل کتاب 'صحیفہ ہمام بن منبہ' کو ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کرادیا ہے۔ان کی کتاب کا تذکرہ متعدد مصنفین نے کیا ہے۔

پہلی صدی ہجری میں سیرت طیبہ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ڈاکٹر فواد سیزگین اور صلاح الدین المنجد نے اس دور کی متعد کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں سے چند نام یہ ہیں:

	نام مصنف	وفات	نام کتاب
1.	ابوذر غفاری (منسوب)	(32ھ)	قصہ المعراج
2.	سھل بن ابی حثمہ	(41ھ)	المغازی
3.	جبیر بن مطعم	(59ھ)	احادیث شجرۃ النبی وذکر اسماۂ
4.	عبید اللہ بن کعب بن مالک انصاری	(97ھ)	المغازی

12.4.2 دوسری صدی ہجری:

دوسری صدی کے آتے آتے اسلامی دنیا میں کئی علمی انقلاب آئے۔جن میں ایک بڑا انقلاب تدوین حدیث کا تھا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سرکاری سرپرستی میں احادیث کو مرتب کروانے کی تحریک چلائی۔ ہر قابل ذکر شہر کے اندر موجود احادیث کو ضبط تحریر میں لایا گیا۔اس طرح سیرت سے متعلق روایات بھی مزید تحریری شکل میں مرتب ہوگئیں۔ بلکہ مغازی کی روایات بھی احادیث کی کتابوں کا حصہ بن گئیں۔ چنانچہ حدیث کی اکثر کتابوں میں 'المغازی' کے نام سے ایک مستقل باب قائم کیا جاتا ہے۔احادیث کی کتابوں میں شامل ابواب کے علاوہ مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں۔

دوسری صدی کے مشہور سیرت نگار حسب ذیل ہیں:

ابن شہاب زہری:

محمد بن مسلم ابن شہاب زہری (متوفی 124ھ/741ء) حدیث اور مغازی کے امام اوراپنے وقت کے بے مثال عالم تھے۔انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں جب سرکاری سطح پر تدوین حدیث کا کام شروع ہوا تو یہ بھی ان میں نمایاں کام کرنے والوں میں تھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کے علوم کو مدون کرنے کے لیے مستقل کاتب مقرر کردیے تھے جنھوں نے ایک عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر ان کے علوم ومعارف قلم بند کیے۔

امام زہری نے مغازی پر ایک مفصل کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب اگرچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں لکھی جا چکی تھی لیکن اس کا قوی امکان ہے کہ اس میں بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے۔اس لیے اس کو دوسری صدی کی اولین کتاب مانا جاسکتا ہے جو سیرت کے اہم ترین موضوع پر لکھی گئی۔

امام زہری کی کتاب المغازی سیرت کی وہ جامع کتاب ہے جومختلف تبدیلیوں کے بعد آج بھی موجود ہے۔دراصل سیرت ابن ہشام کی اصل بنیاد یہی کتاب ہے۔

عبداللہ بن ابوبکر:

عبداللہ بن ابوبکرصحابی رسول عمرو بن جزم مدنی کی اولاد میں تھے 56ھ/679ء میں ولادت ہوئی، 130ھ/747ء میں ان کی وفات ہوئی۔متعددصحابہ کرام سے ملاقات کی۔حضرت انس سے روایت بھی کرتے تھے۔تاریخ کا خاص ذوق تھا۔انہوں نے مغازی پرایک کتاب لکھی تھی۔یہ کتاب ضائع ہوگئی۔لیکن اس کے کچھ اقتباسات ابن اسحاق،واقدی اورابن سعدوغیرہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

ابوالمعتمر التیمی:

ابوالمعتمر سلیمان بن طرخاں التیمی (46 / 666-143 / 760) حدیث کے راوی تھے۔مختلف کتب احادیث میں ان کی روایات ہیں۔ لیکن ان کی مستقل کتاب مغازی میں ہے۔اس کے حوالے بھی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں اور یہ کتاب ابھی تک موجود ہے۔

موسیٰ بن عقبہ:

حضرت موسیٰ بن عقبہ الاسدی (متوفی 141ھ/758ء) مغازی کے امام تھے۔امام زہری کے بڑے تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ان کا میدان اختصاص سیرت طیبہ ہے۔انہوں نے مغازی کی روایت کا بڑا حصہ اپنے استادامام زہری سے حاصل کیا۔اس کے علاوہ اپنی کتاب میں متعدد نئے اضافے بھی کیے۔ان کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس عہدنبوی کی کچھ دستاویزات اور رسول اللہ ﷺ کے خطوط بھی محفوظ تھے جن کے حوالے انہوں نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔ان کی کتاب شائع ہوگئی ہے اور سیرت کا ایک اہم مرجع تسلیم کی جاتی ہے۔

محمد بن اسحاق:

تاریخ سیرت نگاری کے سب سے بڑے امام محمد بن اسحاق بن یسار (85 / 704-150 / 767) تھے۔وہ بھی امام زہری کے شاگرد تھے۔انہوں نے سیرت کی سب سے جامع اور مبسوط کتاب لکھی۔امام زہری کے عہد میں روایات کوموضوعات پرتقسیم کرنے کا رجحان کم تھا۔بلکہ جو روایت ہوتی اس کوسند کے ساتھ نقل کیا جاتا۔ابن اسحاق نے یہ کام بھی کیا کہ انہوں نے تاریخی ترتیب سے مکمل سیرت کوکتابی شکل میں مدون کیا۔ ابن اسحاق سے قبل بھی اگرچہ بعض حضرات نے مغازی کے ساتھ السیر ہ کا نام بھی استعمال کیا ہے لیکن ابن اسحاق نے سب سے پہلے اپنی کتاب کا نام 'السیر ۃ النبویہ' رکھا اور سیرت کے تمام پہلوؤں کا اس میں احاطہ کیا۔

ابن اسحاق کی کتاب کوان کے ایک شاگرد ابن ہشام نے مزید منقح کیا،روایات کی چھان پھٹک کی اور مزید روایات کا اضافہ کیا۔چونکہ ابن اسحٰق کی تہذیب وترتیب کے بعد اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ گئی اور اس کا ابن ہشام کا نسخہ ہی زیادہ مشہور ہوگیا اس لیے مرور ایام سے اس کتاب کا ابن اسحاق کا نسخہ ناپید ہوگیا تھا اور صحیح بات یہ ہے کہ ابن ہشام کی تہذیب کے بعد اس کی اتنی زیادہ افادیت بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔اس لیے علماء کا رجحان اس کی طرف کم ہوگیا تھا۔لیکن اب اس کا ایک ناقص نسخہ دستیاب ہوگیا ہے اور وہ شائع بھی ہوگیا ہے۔ بلکہ اس کا اردو اور دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔

معمر بن راشد:

معمر بن راشد الازدی (90 / 714-154 / 770) اپنی کتاب جامع معمر کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ ہمام بن منبہ کے شاگرد اور

عبدالرزاق بن ہمام کے استاذ تھے۔حدیث میں ان کی کتاب 'الجامع' کئی اعتبار سے بہت اہم مانی جاتی ہے۔انہوں نے 'الجامع' کے علاوہ 'المغازی' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔امام طبری وغیرہ نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا۔یہ کتاب بھی مرور کی نذر ہو کر ضائع ہوگئی البتہ اب اس کا ایک حصہ دستیاب ہے۔

امام واقدی:

امام محمد بن عمر بن واقد الواقدی (130 / 747-207 / 823) سیر و مغازی کے امام تھے۔ بہت سی کتابیں لکھیں، غزوات اور ان کی جزوی تفصیل کے ماہر تھے اور سیرت سے متعلق تمام مقامات کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات رکھتے تھے۔خلیفہ ہارون رشید جب حج کرنے تشریف لائے تو ان کو مقامات سیرت کی زیارت انہوں نے ہی کرائی تھی۔وہ زیادہ تر مدینہ میں رہے۔البتہ بعض مرتبہ دوسرے مقامات کا سفر بھی کیا اور بغداد گئے۔خالد بن یحییٰ برمکی نے خصوصی سرپرستی کی۔ہارون رشید نے بھی انعام و اکرام سے نوازا۔بعض محدثین نے ان کی ثقہ ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے۔تاہم محدثین کی ایک جماعت ان کو معتبر مانتی ہے۔

سیرت النبی سے متعلق ان کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ایک کتاب المغازی جس کے مخطوطات بڑی تعداد میں موجود ہیں اور جو مطبوعہ ہے۔دوسری مولد النبی۔یہ بھی مشہور کتاب ہے اور موجود ہے۔ان کی کتابوں میں طعم النبی کے نام سے بھی ایک کتاب کا تذکرہ ملتا ہے۔ان کتابوں کے علاوہ تاریخ اسلام پر ان کی کتابیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں سیرت النبی کا موضوع کافی اہم ہوگیا تھا بلکہ اس کی تدوین کے خط و خال بھی اسی صدی میں طے ہو گئے تھے۔ زیادہ روایات مرتب انداز میں جمع ہوگئیں تھی۔اوپر مذکور کتابوں کے علاوہ اس دور میں اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں سے اکثر کتابیں اب یا تو بعد کی کتابوں کا حصہ بن چکی ہیں یا ناپید ہوگئی ہیں۔تاہم تصنیف و تالیف اور تدوین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ڈاکٹر فواد سیزگین اور صلاح الدین المنجد نے متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں مغازی یا سیرت پر یا پھر اس موضوع کے کسی ایک گوشے یا پہلو پر لکھی گئیں۔ان میں سے چند مشہور کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام یہ ہیں:

	نام مصنف	وفات	نام کتاب
1.	عاصم بن عمر بن قتادہ	120ھ	السیر والمغازی
2.	یزید بن رومان	120ھ	المغازی
3.	محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل	131ھ	المغازی
4.	نجیح بن عبدالرحمٰن	170ھ	المغازی
5.	عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم مدنی	172ھ	المغازی
6.	معمر بن سلیمان بن طرخان	178ھ	المغازی
7.	براہیم بن محمد الفرازی	188ھ	السیر فی الاخبار والاحداث
8.	یحییٰ بن سعید بن ابان اموی	193ھ	المغازی
9.	ولید بن مسلم دمشقی	195ھ	المغازی

.10	مؤرج بن عمر السدوسی	195ھ	حذف من نسب قریش
.11	الکلبی، ہشام بن محمد	204ھ	نسب قریش

12.4.3 تیسری صدی کے اہم سیرت نگار:

تیسری صدی ہجری میں تدوین سیرت کا کام مکمل ہو گیا اس لیے اس صدی کو تدوین سیرت کی تکمیل صدی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور سرمایہ سیرت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ تاریخ کے دورانیے میں اس سلسلہ میں لگاتار اضافہ ہی ہوتا رہا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ اب جو بھی کام ہوتا ہے وہ دراصل اسی کام کی تدوین و ترتیب اور تشریح ہے جو تیسری صدی تک مدون ہو گیا تھا۔

تیسری صدی کے شروع میں دو عظیم سیرت نگاروں یعنی ابن ہشام اور ابن سعد نے سیرت طیبہ اور سیرت کے اہم گوشوں کو پوری طرح مدون کر دیا اور اس طرح اس فن کی تکمیل ہو گئی۔ اس صدی کے اہم سیرت نگار حسب ذیل ہیں:

ابن ہشام:

عبدالملک بن ہشام بن ایوب (متوفی 218ھ/834ء) عظیم ترین سیرت نگار تھے۔ ان کی کتاب السیر ۃ النبو یہ اپنے موضوع کی سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کتاب کے بے شمار مخطوطات موجود ہیں۔ بے شمار شروحات و حواشی ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک طرح سے ابن اسحاق کی السیر ۃ النبو یہ کی تہذیب ہے۔

ابن سعد کاتب الواقدی:

محمد بن سعد البصری (متوفی 230ھ/845ء) سیرت، متعلقات، سیرت اور ابتدائی عہد کی اسلامی تاریخ کے زبردست عالم تھے۔ امام واقدی کے کاتب بھی تھے۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ کاتب الواقدی کا لاحقہ لگ گیا۔ وہ اعلی درجے کے ثقہ راوی تھے۔ بعض محدثین امام واقدی کو کمزور راوی مانتے ہیں لیکن ابن سعد کے نزدیک نہایت معتبر راوی ہیں۔ ان کی وہ روایات جو واقدی کے علاوہ کسی اور سے مروی ہیں ان کو درست مانا جاتا ہے۔

ابن سعد نے الطبقات الکبری کے نام سے آٹھ جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں سیرت طیبہ پر ہیں اور باقی جلدیں صحابہ و تابعین کے احوال۔ پر اس طرح اس کتاب کے ذریعہ سیرت کی تدوین بھی مکمل ہوئی اور صحابہ و تابعین کے احوال کا بھی ایک جامع مرقع مرتب ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس حصے کی تکمیل کے بعد ہی سیرت کے تمام پہلوؤں کی تدوین مکمل ہو گئی۔

12.5 اکتسابی نتائج

اس یونٹ میں ہم نے پڑھا کہ

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے عادات و اخلاق کو جاننے کا ذریعہ ایک تو خود قرآن مجید ہے، دوسرے حدیث شریف ہے۔ ان کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مختلف تحریری سرمایے، خطوط، فرامین، معاہدات وغیرہ بھی اس کا ذریعہ ہیں۔
- سیرت کی تدوین کا باضابطہ آغاز صحابہ کے عہد میں شروع ہوا۔ پہلے سیرت کی کتابوں کو مغازی کہا جاتا تھا۔ ابن اسحاق کے زمانے سے ان کتابوں کو سیرت کہا جانے لگا تھا۔

- پہلے سیرت نگار حضرت عروہ بن زبیر ہیں۔ان کے بعد سیرت نگاری میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔پہلی صدی میں ہی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔دوسری صدی میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جاتی رہیں۔بلکہ دوسری صدی کے نصف آخر سے ہی اس فن کی تدوین کا دور مکمل ہو رہا تھا۔اور تیسری صدی کے نصف تک اس فن کی تدوین مکمل ہوگئی۔
- سیرت کے موضوع پر سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد سب سے بڑی اور جامع کتابیں ہیں۔اب یہی کتابیں اس موضوع پر سب سے مستند اور جامع حوالہ ہیں۔

12.6 کلیدی الفاظ

المغازی:	غازیوں کے اوصاف بیان کرنا (اصطلاح میں جس میں غزوات کے حالات بیان کیے گئے ہوں)
السیر ۃ:	جانا، چلنا، پھرنا (اصطلاحی معنی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے وفات تک کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہو)
غزوہ:	ارادہ کرنا، طلب کرنا (اصطلاحی معنی ایسی جنگ جس میں بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی)
تدوین سیرت:	سوانح حیات جمع کرنا، (اصطلاح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق معلومات کو جمع کرنا)

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. سیرت کی سب سے پہلی کتاب کس نے لکھی؟
a. حضرت عروہ بن زبیر b. امام زہری c. امام بخاری d. ابن ہشام

2. غزوہ کے لفظی معنی کیا ہیں؟
a. جنگ کرنا b. ارادہ کرنا c. سوار ہونا d. تیرنا

3. سیرت کے لفظی معنی کیا ہیں؟
a. کھانا کھلانا b. سونا c. چلنا d. میلان ہونا

4. دراسات فی الحدیث النبوی کس کی تصنیف ہے؟
a. ابن اسحاق b. حبیب الرحمٰن اعظمی c. محمد اکرم ندوی d. ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی

5. ابن سعد کی کتاب کا کیا نام ہے؟
a. طبقات b. صحیح c. سنن d. رجال

6. 'الصحیفۃ الصادقۃ' کس فن کی کتاب ہے؟
a. حدیث b. فقہ c. تفسیر d. تصوف

7. امام حاکم نے سیرت کو کس فن کی ایک قسم قرار دیا ہے؟
a. تفسیر b. تاریخ c. حدیث d. فقہ

8. سیرت پر حضرت عامر بن شراحیل شعبی کی کتاب کا کیا نام ہے؟

a. کتاب البلدان　　b. کتاب الفتح　　c. کتاب الصلوۃ　　d. کتاب الخراج

9. کس صحابی نے رسول اللہ کے خطوط کا مجموعہ تیار کیا تھا؟

a. معاذ بن جبل　　b. ابو ہریرہ　　c. ابوبکر صدیق　　d. عمر بن حزم

10. امام زہری نے کس خلیفہ کے حکم سے حدیث کی تدوین کا کام کیا؟

a. ہشام بن عبدالملک　　b. ولید بن عبدالملک　　c. عمر بن عبدالعزیز　　d. مروان بن حکم

12.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. سیرت نگاری میں عروہ بن زبیر کی اہمیت واضح کیجیے۔
2. ابن اسحاق کو سیرت کے میدان میں کیا اولیت حاصل ہے؟
3. امام زہری پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. طبقات ابن سعد کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
5. تیسری صدی ہجری کو تدوین سیرت کی صدی کیوں کہا جاتا تھا۔

12.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. سیرت طیبہ کے مراجع ومصادر کا تعارف کرائیے۔
2. پہلی صدی ہجری میں تدوین سیرت کی تاریخ بیان کیجیے۔
3. دوسری صدی ہجری میں تدوین سیرت کی تاریخ بیان کیجیے۔

12.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

---

1. مقدمہ سیرت النبی : علامہ شبلی نعمانی
2. سیرت نبوی کی اولین کتابیں اوران کے مؤلفین : جوزف ہورووتس، اردو ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی
3. تدوین سیر ومغازی : قاضی اطہر مبارک پوری
4. تاریخ تدوین سیرت : مولانا عبداللہ عباس ندوی
5. نقوش رسول نمبر (جلد اول)

-:oOo:-

اکائی 13 : خلافت راشدہ اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت

اکائی کی اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقصد
13.2 خلافت راشدہ: تفہیم اور ارتقاء
13.3 ابوبکر صدیقؓ: خلافت سے پہلے
13.3.1 واقعۂ اسریٰ کی تصدیق
13.3.2 حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ
13.3.3 مدینہ کی جانب ہجرت
13.3.4 ابوبکر صدیق مدینے میں
13.3.5 غزوات
13.3.6 صلح حدیبیہ
13.3.7 امارت حج
13.4 حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت وخلافت
13.4.1 لشکر اسامہ کی روانگی
13.4.2 مدعیان نبوت کی سرکوبی
13.4.3 مرتدین کی سرکوبی
13.4.4 منکرین زکوٰۃ
13.4.5 فتوحات
13.4.5.1 مہم عراق
13.4.5.2 مہم شام
13.4.6 تدوین قرآن
13.4.7 وفات
13.5 اکتسابی نتائج
13.6 نمونۂ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید

اس اکائی میں خلافت راشدہ کی تعریف، اس کے مفہوم اور ارتقاء سے بحث کی جائے گی۔ بعدازاں پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیات، کس طرح حضرت ابوبکرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، صدیق کا لقب کس وجہ سے نوازا گیا، ہجرت حبشہ کا ارادہ کیا لیکن پھر ابن الدغنہ کے کہنے پر ملتوی کر دیا، ہجرت مدینہ کے لیے تیاری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کے لیے انتظار، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صبر و استقامت، سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے سلجھانا، اور بحیثیت خلیفہ ان کی خدمات مثلاً لشکر اسامہؓ کی روانگی، منکرین زکوۃ، مدعیان نبوت، فتوحات، جمع تدوین قرآن ان سب واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

13.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو خلافت راشدہ کے مفہوم اور اس کے تاریخی ارتقاء سے آگاہی حاصل ہوگی۔ ساتھ ہی آپ خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیات اور خدمات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے اور اس بات کو بخوبی جان لیں گے کہ حضرت ابوبکرؓ کا اسلامی تاریخ میں بہت بڑا مقام ہے۔ آپ پڑھیں گے کہ کس طرح وہ رسول پاک کے ہر دعوے کی تصدیق بنا شک وشبہ کے کر دیتے تھے، کس طرح انہوں نے اپنے دو سالہ دور میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے اور لوگوں کو اس کی تلقین کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عوام اور حکمران کے حقوق کی نشاندہی کی، جو بعد کے خلفاء راشدین کے لیے سیاسی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت کو اتنا مضبوط اور مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کو کس طرح سے قائم رکھا اس بات سے آگاہی ہوگی۔

13.2 خلافت راشدہ: تفہیم اور ارتقاء

''خلافت راشدہ'' عربی زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ پہلا لفظ 'خلافت' کے لغوی معنی نیابت یا جانشینی کے ہیں۔ قرآن مجید میں اگرچہ لفظ 'خلافت' نہیں آیا ہے لیکن اس مادہ کے دوسرے الفاظ بشمول 'خلیفہ' اور 'استخلاف' کے موجود ہیں۔ صاحب خلافت کو خلیفہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید ان الفاظ کو ایک خاص مفہوم بہ معنی نیابت الٰہی کے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ حکمراں بنانے کے لیے لفظ 'خلافت' اور 'خلیفہ' کا استعمال زیادہ صراحت کے ساتھ ہمیں احادیث کی کتابوں اور تاریخ اسلامی کے مآخذ میں ملتا ہے۔ مثلاً: رسول اللہ ﷺ نے اپنے جانشینوں کے لیے خود خلفاء (واحد، خلیفہ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں، علیکم بسنتي و سنة الخلفاءِ راشدین '، یعنی تمہیں میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ (ابن ماجہ) دوسرا لفظ 'راشدہ' عربی کے لفظ 'رشد' سے ماخوذ ہے اور اسم فاعل مونث کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: 'راہ حق پر چلنے والی'۔ لہٰذا دونوں الفاظ کا لفظی معنی 'رشد سے بہرہ ور اور راہ حق پر چلنے والی نیابت اور جانشینی'۔

اسلام کی سیاسی اصطلاح میں 'خلافت راشدہ' کے معنی رسول اللہ ﷺ کے بعد یا ان کی غیر موجودگی میں آپ ہی کے مرتب کردہ اصولوں پر آپ

کی جانشینی کرنا ہے۔اسی کوامام کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔مزید یہ کہ اس سے صالحین کا وہ عہد حکومت مراد ہے جسے امت مسلمہ کی اجتماعی تائید حاصل رہی،اور جنہوں نے پیغمبر اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر حکومت کرتے ہوئے اسلام کے ظاہری اور باطنی تقاضوں کو پورا کیا۔اہل سنت والجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین سے مراد خلفائے اربعہ: حضرت ابوبکر صدیق،حضرت عمر فاروق،حضرت عثمان غنی،اور حضرت علی مراد ہیں۔ بعض علماء ان میں حضرت حسن بن علی اور آٹھویں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو بھی شامل کرتے ہیں جو کہ مختلف فیہ ہے۔اہل سنت مذکورہ بالا چاروں خلفاء کو بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کا جائز جانشین یقین کرتے ہیں۔اس کا عہد 632ء سے 661ء تک ہے۔اس کے بعد خلافت بنوامیہ میں منتقل ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے خلیفہ پر وہ سارے دینی اور دنیاوی فرائض عائد ہوتے ہیں جن کا ذمہ رسول اللہ ﷺ پر عائد کیا گیا تھا۔اگر مختصراً بیان کیا جائے تو خلیفہ کا سب سے اہم فریضہ شریعت کا نفاذ،دین اسلام کا قیام اور اس کی حفاظت ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ ریاست کا سربراہ اور فوج کا سپہ سالار اعظم،عدالت عالیہ میں قاضی القضاۃ،مالیات کا منتظم اعلی اور دین کا امام ہوتا ہے۔جن امور دین و دنیا میں قرآن و حدیث سے صراحتاً کوئی حکم موجود نہ ہو تو اس کا قول حجت تسلیم کیا جاتا ہے۔خلیفہ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔لیکن ریاست کے کاموں کو انجام دینے کے لیے قرآن و سنت کی ہدایت کی رو سے اسے مسلمانوں میں اصحاب علم وخرد سے مشورے لینا بھی لازمی ہے۔حالانکہ وہ ان مشوروں کا پابند نہیں ہوتا۔اسے پورا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے اعتبار سے کسی مشورے کو چاہے تو قبول کرے یا پھر رد کردے۔

شاہ ولی اللہ کے مطابق خلافت کے انعقاد کے چار طریقے ہیں۔پہلا طریقہ یہ کہ علاقے کے سردار،امرا،علماء اور قضاۃ کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلیں جو جامع شرائط خلافت ہو یعنی وہ مسلمان مرد ہو،عاقل بالغ ہو،مرد ہو،آزاد ہو،معذور نہ ہو،عادل ہو،مجتہد ہو اور قریشی ہو۔حضرت صدیق اکبر کی خلافت کا انعقاد اسی پہلے طریقے پر ہوا تھا۔انعقاد خلافت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ خلیفہ مسلمانوں میں سے کسی ایسے شخص کو جو جامع شرائط خلافت ہو منتخب کرلے اور اپنے بعد لوگوں کو اس کی اتباع کی وصیت کرے،تو لوگوں پر لازم ہوگا کہ اسی شخص کو خلیفہ تسلیم کریں۔حضرت عمر فاروق کی خلافت کا انعقاد اسی طریقہ پر ہوا تھا۔انعقاد خلافت کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ خلیفہ مسلمانوں میں سے جامعین شرائط خلافت کی ایک جماعت منتخب کرلے اور خلافت کو ان میں دائر کردے،پس مجلس شوریٰ اس جماعت میں سے ایک شخص کو منتخب کرلے اور اسے خلیفہ مقرر کردے۔حضرت عثمان کی خلافت اسی طریقہ پر منعقد ہوئی تھی۔خلافت کے منعقد ہونے کا چوتھا طریقہ استیلا ہے۔یعنی خلیفہ کی وفات کے بعد کوئی شخص لوگوں کو تالیف قلوب یا جنگ و جبر کے ذریعہ اپنے ساتھ کر کے خلیفہ ہو جائے تو شرعاً اس کی اطاعت واجب ہوگی۔اب اس کی دو صورتیں ہیں۔پہلی یہ کہ اگر اس شخص میں خلافت کی شرائط موجود ہوں اور اس نے خلافت حاصل کرنے میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اس کی خلافت ضرورت کے تحت جائز ہوگی۔ حضرت امیر معاویہ کی خلافت کا انعقاد اسی طرح ہوا تھا۔اور دوسری صورت یہ ہے کہ استیلا کرنے والا اگر خلافت کی شرطوں کا جامع نہ ہو اور اس نے اپنے مخالفین کو قتل کر کے یا حرام فعل کا ارتکاب کر کے خلافت حاصل کی تو ایسی خلافت جائز نہیں ہوگی اور اس فعل کا مرتکب گنہگار رہوگا۔لیکن علما کا اس بات پر اتفاق ہے ایسے شخص کی ان امور میں پیروی کرنا واجب ہوگا جو شریعت کے موافق ہوں گے،اور اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں ہوگی۔

13.3 ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: خلافت سے پہلے

حضرت ابوبکر کا سنہ ولادت 571 یا 572 عیسوی ہے۔آپ قبیلہ تیم بن مرہ سے تعلق رکھتے تھے اور آٹھویں پشت میں آپ کا نسب رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے۔آپ کا نام عبداللہ تھا لیکن اپنی کنیت 'ابوبکر' سے مشہور ہوئے۔روایت یہ بھی ہے کہ اسلام سے پہلے آپ کا نام عبدالکعبہ تھا لیکن اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ نام بدل کر عبداللہ رکھ دیا تھا۔آپ صدیق کے لقب سے مشہور ہوئے،ایک روایت کے مطابق عتیق بھی آپ

کا لقب تھا۔آپ کے والد کا نام عثمان بن عامر اور کنیت ابوقحافہ تھی اسی لیے آپ کو ابن ابی قحافہ بھی کہا جاتا ہے۔آپ کی والدہ ام الخیر سلمیٰ تھیں اور ان کا تعلق بھی قبیلہ تیم سے تھا۔زمانہ جاہلیت میں اشناق کا منصب قبیلہ تیم کے ہی سپرد تھا، یعنی یہ لوگ خون بہا اور تاوان کی رقوم معین کرتے تھے۔جب ابوبکرؓ جوان ہوئے تو یہ خدمت ان کے سپرد تھی۔خون بہا اور دیت کی رقم بھی آپ کے پاس ہی رکھی جاتی تھی۔حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں چار شادیاں کیں۔پہلی شادی آپ نے قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے کی۔ان کے بطن سے عبداللہ اور اسماء پیدا ہوئے۔اسماء بعد میں 'ذات النطاقین' کے لقب سے مشہور ہوئیں۔قتیلہ کے بعد ام رومان بنت عامر بن عویمر ان کے نکاح میں آئیں۔ام رومان سے عبدالرحمٰن اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ پیدا ہوئے۔جب آپ مدینہ تشریف لے آئے تو یہاں حبیبہؓ بنت خارجہ سے اور ان کے بعد اسمأؓ بنت عمیس سے شادیاں کیں۔

قریش ایک تجارت پیشہ قوم تھی، وہ سال میں سردی اور گرمی کے موسموں میں دو مرتبہ تجارت کی غرض سے دور دراز سفر کیا کرتے تھے۔حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی قوم کے دوسرے افراد کی طرح تجارت کو ذریعہ معاش بنایا تھا۔ان کا شمار مکہ کے بڑے اور مالدار تاجروں میں ہوتا تھا۔تجارت کی کامیابی میں ان کی رحم دلی، بلند اخلاقی اور جاذب شخصیت کا بھی بڑا دخل تھا۔آپؓ کا شمار قریش کے ان چند نیک افراد میں ہوتا ہے جو زمانہ جاہلیت میں عربوں کے گمراہ کن اعتقادات اور بری رسومات سے دور تھے۔حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت اور اسلام، دونوں ہی زمانوں میں شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، حالانکہ اہل مکہ شراب کے عادی ہی نہیں بلکہ اس کے عاشق تھے۔سیرت ابن ہشام میں ان الفاظ میں حضرت ابوبکر کے کردار کا ذکر کیا گیا ہے: ''ابوبکر اپنی قوم میں بہت ہر دلعزیز تھے۔علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔قریش مکہ کے تمام خاندانوں کے نسب انہیں ازبر تھے اور ہر قبیلے کے عیوب ونقائص اور محامد وفضائل سے بہ خوبی واقف تھے۔اس وصف میں قریش کا کوئی فرد ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔وہ خلیق، ایمان دار اور ملنسار تاجر تھے۔قوم کے تمام لوگ ان کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ برتاو کے معترف تھے اور انہیں فضائل کے باعث ان سے بے حد محبت کرتے تھے''۔

حضرت ابوبکرؓ کا قیام مکہ میں اس جگہ تھا جہاں آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنے کے بعد سکونت پذیر تھے۔چونکہ آپ دونوں ہم پیشہ تھے اور طبیعت میں بھی یکسانیت تھی، لہٰذا اعلان نبوت سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپؓ کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے۔حضرت ابوبکر وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بلاتردد سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور پیغمبر اسلام کے سچے ساتھی بن کر اسلام کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ابتدا ہی سے حضرت ابوبکرؓ کے اندر دین حق کی اشاعت کی خاطر ایک غیر معمولی جذبہ تھا۔اوائل اسلام میں ان کی دعوت پر بہت سے ممتاز صحابہ ایمان لائے اور پھر انہوں نے یہ سلسلہ ساری زندگی جاری رکھا۔عثمان بن عفان، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن عوام اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ انہی کی دعوت پر مسلمان ہوئے تھے۔

شروعاتی دور میں اسلام کی تعلیم مساوات سے متاثر ہوکر بہت سے غلام دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔یہ ایسی بات تھی جو ان کے بے دین سرداروں کے لیے ناگوار تھی۔لہٰذا وہ ان غلام مسلمانوں پر سختیاں کرتے اور ان سے اسلام کو ترک کرنے کے لیے کہتے۔ایسا ہی ایک واقعہ حضرت بلال حبشیؓ کے تعلق سے مشہور ہے۔آپ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔حضرت بلالؓ کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے امیہ بن خلف سخت ناراض ہوا اور طرح طرح کی اذیتیں دینے لگا۔ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ امیہ نے حضرت بلالؓ کو دوپہر کے وقت شدید دھوپ میں ریت پر لٹا دیا ہے اور ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ کر اسلام سے پھیر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔حضرت ابوبکرؓ نے اس منظر کی تاب نہ لا کر فوراً ہی حضرت بلالؓ کو امیہ سے خرید لیا اور انہیں آزاد کردیا۔حضرت بلالؓ کے علاوہ انہوں نے بیسیوں غلاموں کو جو صرف اسلام لانے کی وجہ سے اپنے آقاؤں کے ظلم کا شکار ہو رہے تھے، خرید کر آزاد کیا۔

جوں جوں اسلام کا دائرہ بڑھتا گیا، کفار مکہ کے مظالم بھی بڑھتے گئے۔ پہلے تو وہ صرف غلاموں اور مسکینوں پر ظلم کرتے تھے، لیکن بعد میں معزز ترین لوگ بھی ان کی ایذاء رسانیوں کا نشانہ بننے لگے۔ بت پرستی اور بتوں کی مذمت میں جب قرآن کی آیتیں نازل ہوئیں تو مکہ کے بعض اوباشوں نے ایک مرتبہ پیغمبر اسلام ﷺ کا راستہ روک کران پر حملہ کر دیا۔ ایک شخص نے آپ کی چادر کو اتنی زور سے کھینچا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ جو وہاں سے گزر رہے تھے انہوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کو بچانے کے لیے دوڑ پڑے اور آپ ﷺ کو کفار کے نرغے سے چھڑایا۔ رسول اللہ ﷺ پر جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ آپؓ نے متعدد موقعوں پر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آپ ﷺ کی جان بچائی اور کسی کا خوف کیے بغیر آپ ﷺ کی حمایت میں کھڑے رہے۔

13.3.1 واقعہ اسری کی تصدیق:

ہجرت مدینہ سے قبل ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تمام مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال دیا۔ لیکن اس موقع پر بھی ابوبکر صدیق نے جس حیرت انگیز قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا اس نے بہت سارے مسلمانوں کو ارتداد کے وبال سے بچا لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور رسول اللہ نے اس سفر کی تفصیل لوگوں کو بیان کرنی شروع کی تو مشرکین مکہ آپ کا مذاق اڑانے لگے کہ مکہ سے شام تک کا فاصلہ ایک مہینے کا ہے، پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ محمد بیت المقدس جائیں اور ایک ہی رات میں دو مہینے کی مسافت طے کر کے واپس آجائیں۔ یہ ایسی بات تھی کہ بعض مسلمانوں کو بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور ان کے دل تردد کا شکار تھے۔ ان لوگوں نے جا کر ابوبکر کو سارا ماجرا بیان کیا۔ اول تو ابوبکر نے ان مسلمانوں سے کہا کہ رسول اللہ پر جھوٹ کی تہمت مت لگاؤ۔ تو ان مسلمانوں نے ابوبکر سے کہا کہ آپؐ نے ابھی یہ بات بیان فرمائی۔ یہ سن کر ابوبکر نے جواباً وہ ایمان افروز جملہ کہا جس کی وجہ سے تاریخ میں آپ صدیق کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: ''اگر محمد ﷺ نے یہ بات کہی ہے تو بالکل سچ ہے۔ جب اللہ آسمان سے چند لمحوں میں وحی نازل فرما دیتا ہے تو اس کے لیے رات بھر میں آپ کو مکہ سے بیت المقدس لے جانا اور واپس لے آنا کیا مشکل ہے''۔ یہ کہہ کر آپ رسول اللہ کی تلاش میں نکلے، آپ نے رسول اللہ کو اس حال میں پایا کہ وہ معراج کے بارے میں لوگوں کو بتا رہے تھے۔ رسول اللہ کے قریب پہنچتے ہی آپ نے رسول اللہ کے بیان کی تصدیق کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ بالکل سچ فرماتے ہیں۔

13.3.2 حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ:

مسلمانوں پر جب قریش کے مظالم بہت زیادہ بڑھ گئے، تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ بعثت نبوت کے پانچویں اور چھٹے سال مسلمانوں نے بڑی تعداد میں حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر اگرچہ ایک معزز قبیلے کے فرد اور با اثر شخص تھے، اس کے باوجود وہ کفار مکہ کے جور و ستم سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ جب حضرت طلحہ بن عبداللہ ابوبکر کی دعوت پر مسلمان ہوئے تو ان کے چچا نوفل بن خویل نے غیض میں آکر طلحہ اور ابوبکر دونوں کو باندھ کر مارا، لیکن ان کے قبیلے تیم نے ابوبکر کی کچھ مدد نہ کی۔ لہٰذا انہوں نے بھی حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کیا اور رسول اللہ سے اجازت طلب کی۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ایک مقام پر جسے 'برک الغماد' کہتے ہیں، قبیلہ قارہ کا ایک سردار مالک بن دغنہ مل گیا۔ اس نے آپ کا راستہ روک کر دریافت کیا کہ کہاں جاتے ہیں؟ آپ نے اہل مکہ کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تا کہ اپنے دین پر بے روک ٹوک عمل کر سکوں۔ ابن دغنہ کہنے لگا: آپ جیسا آدمی نہ شہر سے نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔ آپ دوسروں کا بار اٹھاتے ہیں، مہمانان حرم کی مہمان نوازی کرتے ہیں، خود کما کر مفلسوں اور محتاجوں کی مالی امداد کرتے ہیں، حق کے کاموں میں سب کی مدد و اعانت کرتے ہیں، آپ میرے ساتھ واپس مکہ چلئے۔ ابن دغنہ آپ کو واپس مکہ لے آیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ابوبکر میری امان میں ہیں۔ قریش نے

ابن دغنہ کی امان کوتسلیم تو کرلیا لیکن ایک شرط یہ لگادی کہ ابوبکر جس طرح چاہیں اپنے گھر کے اندر خدا کی عبادت کریں اور قرآن پڑھیں لیکن گھر سے باہر پڑھنے کی انہیں اجازت نہیں ہوگی۔ کچھ دن تو ابوبکر نے ایسا ہی کیا لیکن آپ کے جذبہ ایمانی کو چھپ چھپ کر عبادت کرنا گوارا نہیں ہوا۔ لہٰذا آپ نے اپنے گھر کے صحن میں ہی مسجد بنالی اور اعلانیہ خدا کی عبادت کرنے لگے۔ کفار مکہ نے اس کی شکایت ابن دغنہ سے کی اور اس سے کہا کہ یا تو ابوبکر اعلانیہ عبادت کرنے سے باز آجائیں یا تم اپنی امان واپس لے لو۔ ان کو یہ خوف تھا کہ ابوبکر کو عبادت کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے لوگ متاثر ہوں گے۔ ابن دغنہ نے ابوبکر کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ابن دغنہ کی امان واپس کردی کہ میرے لیے خدا اور اس کے رسول کی پناہ کافی ہے۔

13.3.3 مدینہ کی جانب ہجرت:

اس واقعے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کلیۃً ترک کردیا۔ لیکن قریش کے مظالم میں کسی طرح کمی نہیں آئی۔ انہوں نے تین سال تک بنو ہاشم کا مقاطعہ کرکے انہیں شعب ابی طالب میں رہنے پر مجبور کردیا۔ اسی دوران عقبہ کی گھاٹی میں مدینہ منورہ سے آئے ہوئے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ حضرات داعی کی حیثیت سے اپنے وطن واپس لوٹے اور مدینہ میں اسلام کی دعوت میں مشغول ہوگئے۔ کچھ ہی وقت میں مدینہ کی سرزمین نور اسلام سے منور ہوگئی۔ مسلمانان مدینہ نے، جو تاریخ میں انصار مدینہ کے نام سے مشہور ہیں، نہایت خلوص کے ساتھ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ اس زمانے میں مکہ سے جو مسلمان مدینہ آکر آباد ہوئے انہیں تاریخ اسلام میں مہاجرین کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے بھی مدینہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کیا اور رسول اللہ سے اجازت چاہی۔ لیکن بارگاہ نبوت سے حکم ہوا کہ ابھی انتظار کرو، امید ہے کہ اللہ کی طرف سے مجھے بھی ہجرت کا حکم ہوگا۔ حضرت ابوبکر نے آپ کی معیت میں ہجرت کی اجازت چاہی۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ ابوبکر نے ہجرت کا ارادہ ملتوی کردیا اور اگلے چار مہینوں تک رسول اللہ ﷺ کے حکم کے منتظر رہے۔

مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کے لوگوں کے عہد و پیمان اور مدینہ کی طرف ہجرت کے واقعات نے قریش مکہ کو برانگیختہ کردیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان وہاں جاکر نہ صرف یہ کہ ان کے جور وستم سے محفوظ ہوجائیں گے بلکہ انہیں ایک مضبوط طاقت بن کرابھرنے کے مواقع بھی میسر آئیں گے اور پھر وہ قریش کے مقابلے میں کھڑے ہوسکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ شام کی طرف تجارتی شاہراہ مدینہ کی جانب سے ہوکر گزرتی تھی، لہٰذا مسلمان اس میں بھی رکاوٹیں ڈال کر ان کے راستے مسدود کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ قریش نے مسلمانوں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے، ان کی جائدادیں ضبط کیں، مدینہ والوں کو دھمکی بھرے پیغام بھیجے لیکن وہ مدینہ کی جانب مسلمانوں کو ہجرت کرنے سے نہیں روک سکے۔ چونکہ یہ ایک سنگین مسئلہ تھا، سرداران مکہ اس کے حل کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے 'دارالندوہ'، جو ایک طرح کا پنچایت گھر تھا، میں جمع ہوئے۔ جس تجویز پر سب نے اتفاق کیا وہ رسول اللہ کے قتل کی تجویز تھی۔ اس سے پہلے کہ قریش کوئی اقدام کرتے اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعہ رسول اللہ کو مطلع فرمادیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ہجرت کرجائیں۔ آپ ابوبکر کے گھر گئے اور فرمایا کہ انہیں ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔ ابوبکر پچھلے چار مہینوں سے اسی لمحے کے منتظر تھے۔ ابوبکر نے سفر کیلئے پہلے ہی سے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں۔ ایک اونٹنی آپ ﷺ کو پیش کی اور دوسری پر خود سوار ہوئے۔ اس قافلے کی پہلی منزل غار ثور تھی۔ اس دوران ہدایت کے مطابق ابوبکر کے بیٹے عبداللہ رات کے وقت مکہ کے تمام حالات سے آکر انہیں آگاہ کرتے رہے اور اسی طرح عامر بن فہیرہ جو ابوبکر کے غلام تھے بکریاں چراتے ہوئے غار ثور تک آتے اور بکریوں کا تازہ دودھ ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ تین دن اور تین رات اسی حالت میں بسر ہوئے۔ قریش کو رسول اللہ اور ابوبکر کے مدینہ کی جانب ہجرت کی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے ہر چند کوشش کی لیکن وہ اس مختصر سے قافلے کو مدینہ پہنچنے سے نہ روک سکے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب کچھ لوگ آپ دونوں کو تلاش کرتے ہوئے غار ثور کے دہانے تک پہنچ گئے۔ وہ اتنے قریب تھے کہ ابوبکر نے رسالتمآب سے عرض کیا کہ اگر انہوں نے ذرا بھی نیچے کی طرف نگاہ کی تو وہ ہم لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ابوبکر کو خوف زدہ دیکھ کر رسول اللہ نے انہیں تشفی دیتے ہوئے فرمایا: 'غمزدہ مت ہو، ہم صرف دو

نہیں ہیں، خدا بھی ہمارے ساتھ ہے' آپ کے اس جملے سے ابوبکر کو کچھ اطمینان ہوا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ کفار ناکام ونامراد واپس لوٹ گئے۔

غرض چوتھے روز پیغمبر اسلام، صدیق اکبر، ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ، اور ابن اریقط، جسے راہ بتانے کی خدمت پر اجرت پر رکھا گیا تھا، پر مشتمل یہ قافلہ غار ثور سے نکلا اور قریش کے ہر کارواں سے بچتا بچاتا 12 / ربیع الاول کو بعثت کے چودہویں سال مدینہ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں مہاجرین وانصار پہلے ہی سے رسول اللہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے آپ کا استقبال کیا اور مدینہ سے قریب مقام قباء میں آپ نے چند روز قیام فرمایا اور پھر مدینہ تشریف لے گئے۔ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ ابوایوب انصاریؓ کے یہاں جبکہ ابوبکرؓ، خارجہ بن زیدؓ کے مہمان ہوئے۔ مہاجرین کے لیے مدینہ کی آب وہوا عموماً ساز گار ثابت نہیں ہوئی۔ خاص طور پر ابوبکرؓ کے لیے کیوں کہ مدینہ میں تشریف آوری کے کچھ ہی عرصے بعد ہی آپ سخت بخار میں مبتلا ہوگئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے خدائے تعالی سے دعا کی کہ وہ مدینہ کی آب وہوا کو مہاجرین کی طبیعت کے موافق بنادے۔ اس دعا کی برکت سے ابوبکرؓ کو شفا حاصل ہوئی اور مدینہ کا ماحول بھی انصار کی طرح مہاجرین کی طبیعت کے موافق ہوگیا۔

13.3.4 ابوبکر صدیقؓ مدینے میں:

مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والوں کو مہاجرین کے نام سے جانا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار مدینہ کے ساتھ ان کا بھائی چارہ کرادیا۔ رسول اللہ ﷺ کے اس اہم کارنامے کو تاریخ میں 'مواخات' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مواخات میں طرفین کے لوگوں کے اعزاز ومرتبہ کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو خارجہ بن زہیرؓ کا بھائی بنایا گیا، جو مدینہ کے ایک معزز فرد تھے۔

مدینہ میں آکر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ آزادی سے سانس لینے اور اپنے رب کی عبادت کا موقع ملا۔ اب وہ اجتماعی طور پر بھی اللہ کی عبادت کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کی طرف توجہ دی، نہ صرف اس لیے کہ مسلمان اس میں نماز ادا کرسکیں، بلکہ اس لیے بھی کہ مسجد مسلمانوں کی آزادی وخودمختاری کا علامتی نشان تھی۔ رسول اللہ نے مسجد کی زمین دو یتیم بچوں سے خریدی اور ابوبکر سے اس کی قیمت ادا کروائی۔ یہ مسجد 'مسجد نبوی' کے نام سے مشہور ہوئی۔

13.3.5 غزاوت:

مدینہ کا ماحول مسلمانوں کے لیے نہایت ہی ساز گار ثابت ہوا تھا۔ یہاں انہیں ایک آزاد قوم اور متحد قوت کے طور پر ابھرنے کا موقع ملا۔ جو کفار مکہ کو کسی طرح برداشت نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہجرت مدینہ کے بعد سے فتح مکہ تک مسلمانوں پر متعدد حملے کئے۔ حضرت ابوبکر ان تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب رہے۔ ان غزوات میں مشکل سے مشکل حالات میں بھی انہوں نے آپ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آپ کی جاں نثاری کے چند واقعات درج ذیل ہیں۔

مسلمانوں کے سامنے پہلا سب سے اہم غزوہ بدر کا تھا۔ یہ غزوہ 2ھ کو بدر کے میدان میں پیش آیا۔ اس میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس جنگ میں حضرت ابوبکرؓ کا کردار بہت اہم تھا۔ اس موقع پر آپؓ ہاتھ میں تلوار لیے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور رہے، تا آنکہ جنگ ختم ہوگئی اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگئی۔

اس جنگ میں مال غنیمت کے علاوہ ستر افراد قید ہوئے۔ ان قیدیوں کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ لوگوں نے الگ الگ رائیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ انہیں قتل کردیا جانا چاہئے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے، جو نسبتاً رحم دل تھے اور اپنے سخت سے سخت ترین دشمن کو بھی قابو پانے کے بعد معاف کردیا کرتے تھے، فرمایا کہ انہیں فدیہ دے کر چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ رسول اللہ نے آپ کی رائے کو پسند کیا اور فدیہ

کی رقم لے کران قیدیوں کوآزاد کر دیا۔

دوسرااہم غزوہ جس میں مسلمان آزمائش میں پڑے، احد کا تھا۔ یہ غزوہ بدر کے آئندہ سال 3ھ میں احد کے پہاڑ پرواقع ہوا۔اس جنگ کی شروعات میں تو مسلمان غالب رہے،لیکن بعض مسلمانوں کی غلطی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔مسلمانوں کی ایک بڑی تعدادشہیدہوئی اوررسول اللہ کوبھی چوٹ آئی۔مسلمان فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ بہت سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔لیکن ابوبکرؓان مسلمانوں میں سے تھے جو پہاڑ کی طرح رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے ثابت قدم رہے۔

13.3.6 صلح حدیبیہ:

ہجرت کے چھ سال بعدرسول اللہ ﷺ نے عمرہ کرنے کاارادہ کیااورمہاجرین وانصارکی ایک جماعت لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ مسلمانوں کی آمد کی قریش کوجب خبرملی توان لوگوں نے تہیہ کرلیا کہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کومکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کرمسلمانوں نے پڑاؤڈالا،اورکفار کے پاس قاصدبھیجا کہ مسلمان جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں بلکہ ان کا مقصدصرف عمرہ کرنا ہے۔ پھرآپسی گفت وشنید کے بعدان کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا،لیکن اس معاہدہ میں بعض شرطیں ایسی تھیں جومسلمانوں کوسخت ناگوارتھیں۔حضرت عمرؓجیسے کبارصحابہ ان شرائط کومسلمانوں کی ہتک گردانتے تھے،اوراس سلسلہ میں اپنی ہچکچاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا بھی اظہارکر چکے تھے۔صحابہ کی جماعت میں صرف حضرت ابوبکرؓکی ذات ایسی تھی جس نے پورے خلوص دل سے رسول اللہ ﷺ کے اس فیصلے کوقبول کیا تھا۔انہوں نے اس موقع پرایک بارپھر اپنے عمل سے اپنے صدیق ہونے کا ثبوت دیا۔بعد میں سورہ فتح نازل ہوئی اورمسلمانوں کویقین ہوگیا کہ یہ صلح ایک فتح مبین ہے جواللہ اوراس کے رسول نے انہیں عطافرمائی ہے۔

13.3.7 امارت حج:

صلح حدیبیہ اور پھر 8ھ میں فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے ساری رکاوٹیں ہٹتی چلی گئیں۔جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی مخالف ساری طاقتیں یکے بعددیگرے ٹوٹتی چلی گئیں۔ہجرت کے نویں سال اطراف وجوانب سے لوگ اسلام میں داخل ہونے کے لیے جوق درجوق مدینہ آنے لگے۔چنانچہ آنحضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کواس سال امیرالحج مقرر کیا،اورحضرت ابوبکرؓتین سومسلمانوں کوساتھ لیکرمکہ روانہ ہوئے اورحج کے فرائض انجام دیئے۔اسی حج کے موقع پرحضرت علیؓ نے اوربعض روایات کے مطابق حضرت ابوبکرؓنے یہ اعلان کیا کہ اس سال کے بعدمشرکین حج نہیں کریں گےاوروہ مکہ چھوڑکردوسرے علاقوں میں چلے جائیں،اوراس کے لیے انہیں چارمہینوں کی مہلت دی گئی۔

10ھ میں حجۃ الوداع سے واپس تشریف لانے کے بعدرسول اللہ ﷺ بیمارہوگئے۔روز بروزمرض میں شدت آتی گئی اورآپ مسجد میں تشریف لانے سے بھی معذورہوگئے۔چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کواپنی جگہ امامت کرنے کاحکم دیا۔چونکہ حضرت ابوبکرؓنرم دل کے تھے،اس لیے حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ سے عرض کی کہ آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓکی جگہ حضرت عمرؓ کوامامت کے لیے مامورفرمادیں۔لیکن رسول اللہ ﷺ نے اصرارکے ساتھ ابوبکرکونمازپڑھانے کاحکم دیا۔لہٰذارسول اللہ کی علالت کے دوران حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کی امامت کی۔جب آپ کے مرض میں کچھ افاقہ معلوم ہوا،تو حضرت ابوبکرؓ آپ ﷺ سے اجازت لے کرمقام سخ اپنی زوجہ سے ملاقات کے لیےتشریف لے گئے۔اسی روزآپ ﷺ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔جب حضرت ابوبکرؓمدینہ واپس لوٹے تورسول اللہ ﷺ اس دنیاسے جاچکے تھے۔

رسول اللہ کی وفات کی خبرسے مسلمانوں کوگہراصدمہ پہنچا۔بعض اصحاب رسول تواپنے حواس قابومیں نہ رکھ سکے۔ابوبکرجب کاشانہ نبوی پر

حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ قسمیں کھا کھا کر رسول اللہ ﷺ کے انتقال سے انکار کر رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اگر لوگ محمد کی پرستش کرتے تھے تو بیشک وہ مر گئے اور اگر خدا کی عبادت کرتے ہیں تو بے شک وہ کبھی نہیں مرے گا''۔ اس تقریر کے بعد صحابہ کو قلبی اطمینان وسکون حاصل ہوا۔

13.4 حضرت ابوبکرؓ کی بیعت وخلافت

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہی آپ کی جانشینی کا اہم مسئلہ سامنے آیا۔ انصار سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ جب یہ خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی تو حضرت ابوبکرؓ کو لے کر وہاں پہنچے۔ انصار کا یہ دعوی تھا کہ چونکہ ان لوگوں نے مسلمانوں کی مدد کی اور مصیبت میں ان کے کام آئے تھے اس لیے وہ رسول اللہ کی جانشینی کے حقدار ہیں۔ جبکہ کا مہاجرین یہ کہنا تھا کہ چونکہ اسلام لانے میں انہیں انصار پر سبقت حاصل ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قریبی خاندانی رشتہ بھی رکھتے ہیں، اس لیے وہ خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اہل عرب انصار کی خلافت تسلیم نہیں کریں گے اور آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کی کہ امیر قریش سے ہوں گے۔ آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ امیر مہاجرین میں سے ہوں گے اور وزیر انصار میں سے۔ پھر آپؓ نے عمر اور ابوعبیدہ کے نام خلیفہ کے لیے تجویز فرمائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر کہا کہ ہم آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، کیوں کہ آپؓ ہمارے سردار اور ہم لوگوں میں سب سے بہتر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ آپؓ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ اس مجمع میں سب سے زیادہ معزز اور معمر صحابی تھے، تمام حاضرین نے اس انتخاب کو پسند کیا اور آپ کی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دئے۔ دوسرے روز مسجد نبوی میں بیعت عامہ ہوئی۔

13.4.1 لشکر اسامہؓ کی روانگی:

رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کا بار سنبھالتے ہی حضرت ابوبکرؓ کے سامنے مسائل ومشکلات کا ایک پہاڑ نظر آنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد مختلف محاذوں پر اسلام دشمن طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک طرف مدعیان نبوت کی جماعت تھی تو دوسری طرف مرتدین کی جماعت، پھر تیسری جانب مانعین زکوٰۃ کی جماعت تھی۔ ان مشکل حالات میں مدینہ سے باہر حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کا لشکر شام پر حملہ آور ہونے کے لیے خلیفہ کی اجازت کا منتظر تھا۔ اس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے خود تیار کیا تھا، لیکن آنحضور کی علالت اور پھر سانحہ ارتحال کے باعث یہ لشکر رک گئی تھی۔

مدینہ پر چاروں طرف سے یورش ہونے کے خطرات کے پیش نظر صحابہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ میں فوج کا رہنا نہایت ضروری ہے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ شام پر فوج کشی کو ملتوی کر دیا جائے اور پہلے مرتدین اور کذاب مدعیان نبوت سے نبٹا جائے۔ لیکن ابوبکر صدیق نے اس لشکر کو جسے رسول اللہ ﷺ نے خود تیار کیا تھا، روکنا نہیں چاہتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے بھی یہی مشورہ دیا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا، 'اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے کرنے کا حکم دیا ہے'۔ چنانچہ آپؓ نے حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روانہ کیا، اور یہ لشکر حدود شام میں اپنا مقصد پورا کر کے واپس لوٹا۔

ان واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے منہج خلافت کے حوالے سے جو بات کھل کر واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے منہج نبوی کی پیروی میں خلافت کے فرائض انجام دیئے اور اس سے ذرا بھی منحرف نہ ہوئے۔ متعدد مرتبہ لوگوں نے مصلحت کے پیش نظر آپ کو مشورے دیئے، لیکن اگر قرآن وسنت کا کوئی حکم اس بابت موجود ہوتا تو آپؓ اسی کی پیروی کرتے تھے۔ لشکر اسامہؓ کو روانگی کا حکم دینے اور منکرین زکوۃ سے

جنگ کرنے جیسے واقعات سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔

13.4.2 مدعیان نبوت کی سرکوبی:

مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں اور اسود عنسی نے یمن میں رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے میں نبوت کا دعوی کیا تھا۔ مسیلمہ نے تو آپ کے پاس ایک خط بھی روانہ کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ''میں نبوت میں آپ کے شریک ہوں۔ نصف دنیا آپ کی ہے اور نصف دنیا میری''۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں لکھا: ''محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ امابعد، دنیا خدا کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے گا اسے اس کا وارث بنائے گا۔ اور بہتر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد مدعیان نبوت کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ان میں طلیحہ بن خویلد تھا، بنی غطفان اس کے پیرو اور حامی تھے۔ ایک عورت، سجاح بنت حارث نے بھی نہایت زور وشور سے نبوت کا دعوی کیا تھا۔ سجاح نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے بعد میں مسیلمہ سے شادی کر لی۔ ان جھوٹے مدعیان نبوت کی جمعیت و طاقت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لہٰذا اسلام کی بقا کے لیے ان کی سرکوبی نہایت ضروری ہوگئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی۔ حضرت خالد بن ولید کا نام ان جنگوں کے لیے پیش کیا گیا۔ لہٰذا خالد بن ولید مہاجرین و انصار کی ایک جمعیت لے کر طلیحہ بن خویلد سے نبرد آزما ہوئے۔ جلد ہی اس کی طاقت ٹوٹ گئی اور اس کے بہت سے متبعین جنگ میں کام آئے۔ خود طلیحہ نے شام کی جانب راہ فرار اختیار کی۔ بعد میں وہ تائب ہو کر دوبارہ داخل اسلام ہو گیا۔

مدعیان نبوت کے خلاف سب سے سخت معرکہ مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں یمامہ میں برپا ہوا۔ مسیلمہ سے جنگ کے لیے حضرت شرحبیل بن حسنہ ایک فوج لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی فوجیں بھی ان کی اعانت کے لیے پہنچیں۔ مسیلمہ اور اس کے متبعین کے ساتھ مسلمانوں کی ایک شدید جنگ ہوئی۔ بہت سارے مسلمان شہید ہوئے، لیکن آخر میں فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ اور مسیلمہ حضرت وحشیؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی بیوی سجاح جو خود بھی نبوت کی دعویدار تھی، بصرہ کی جانب بھاگ گئی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

اسود عنسی کے گرد متبعین کی کثیر تعداد جمع ہوگئی تھی اور اس نے بہت طاقت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں آتا، اس کے دو پیروکاروں، قیس بن مکشوح اور فیروز دیلمی نے نشہ کی حالت میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کے ساتھ ہی مدعیان نبوت کا فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

13.4.3 مرتدین کی سرکوبی:

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد بعض قبائل اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ بحرین میں نعمان بن منذر، عمان میں لقیط بن مالک اور کندہ میں بادشاہوں کی ایک جماعت مرتدین کی قیادت کر رہی تھی۔ مدعیان نبوت سے نپٹنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین کی جانب توجہ کی، اور علاء بن حضرمی کو بحرین، حذیفہ بن محصن کو عمان اور زیاد بن لبید کو کندہ بھیج کر اس فتنے کی بھی بیخ کنی کر ڈالی۔

13.4.4 منکرین زکوۃ:

جزیرہ عرب میں ایک تیسرا گروہ جس کے خلاف حضرت ابوبکر کو جنگ کرنی پڑی منکرین زکوۃ کا تھا۔ یہ لوگ اسلام کا دعوی تو کرتے تھے لیکن مدینے کی حکومت اور غلبہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ ادائے زکوۃ کو جزیہ سمجھتے تھے جو ریاست مدینہ نے ان پر لگا رکھا تھا۔ جن قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کیا ان میں عبس، ذبیان، غطفان اور ان سے متعلق خاندان قبائل شامل تھے۔

منکرین زکوۃ سے جنگ کرنے کے حوالے سے صحابہ مختلف الرائے تھے۔ان میں حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کی یہ رائے تھی کہ جو لوگ کلمہ گو ہیں ان سے ہم جنگ کیسے کر سکتے ہیں۔لیکن حضرت ابوبکر نے فرمایا: ''جو نماز اور زکوۃ میں فرق کرے گا میں اس سے ضرور جنگ کروں گا۔ کیونکہ زکوۃ مال کا حق ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمے جو حقوق ہوں گے ان کی ادائیگی کا مطالبہ ان سے بہر صورت کیا جائے گا''۔

جو قبائل زکوۃ کے منکر تھے ان میں سے بعض لوگوں نے مدینہ میں حاضر ہو کر خود کو زکوۃ کی ادائیگی سے معاف رکھے جانے کی بات کہی۔لیکن حضرت ابوبکرؓ اسلام کے ایک رکن کے انکار کو پورے اسلام کا انکار تصور کرتے تھے، لہٰذا انہوں نے ان لوگوں کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ان سرداروں نے مدینہ کو فوج سے خالی دیکھ کر مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ بنالیا۔لیکن حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کی ایک مختصر جمعیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور انھیں شکست سے دوچار کیا۔منکرین زکوۃ شکست کھا کر بذہ اور ذوی القصہ بھاگ گئے۔ان دونوں مقاموں پر حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کی۔ذی القصہ کی جنگ کے بعد منکرین زکوۃ کی طاقت ٹوٹ گئی۔ان میں سے کچھ افراد بھاگ کر طلیحہ بن خویلد کی جمعیت میں شامل ہو گئے۔ جب ان میں جنگ کرنے کی ہمت نہ رہی تو زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گئے۔

13.4.5 فتوحات:

جزیرہ عرب کی سرحدوں پر صدیوں سے دو عظیم الشان سلطنتیں حکومت کرتی آ رہی تھیں۔شام کی جانب جزیرہ نمائے عرب کی سرحدیں سلطنت رومہ کا حصہ تھیں۔مسلمانوں سے رومی فوجوں کا مقابلہ پہلے کئی بار ہو چکا تھا، پہلی بار جنگ موتہ، دوسری مرتبہ 9 ھ میں غزوہ تبوک، اور پھر تیسری مرتبہ حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں مسلمانوں نے رومیوں کے خلاف فوج کشی کی تھی۔رومیوں کے مقابلے میں ایران میں موجود ساسانی حکمران جزیرہ عرب میں ایک زمانے میں یمن کے اندر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔عراق میں حیرہ کا علاقہ بھی ان کا باج گزار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سلطنتوں کے حکمرانوں کو اسلام کا پیغام بھیجا تھا۔لیکن انہوں نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔ظاہر ہے کہ جزیرہ عرب میں پنپتی ہوئی ایک نئی سلطنت ان دونوں حکومتوں کے لیے خطرہ تھی، جسے وہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔اس حقیقت سے پیغمبر اسلام ﷺ بھی آگاہ تھے اور حضرت ابوبکرؓ بھی اس خطرے کو بھانپ رہے تھے۔لہٰذا انہوں نے اندرونی انتشار و فساد سے فراغت پاتے ہی اپنی توجہ عراق اور شام کے محاذوں کی طرف مبذول کی۔

13.4.5.1 مہم عراق:

جس زمانے میں مسلمانوں نے ایرانی حکومت کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کی، وہ انقلاب حکومت اور طوائف الملوکی کا شکار تھی اور اپنی سابقہ شان و شوکت کھو چکی تھی۔ایران میں ایک نیا بادشاہ، یزدگرد سریر آرائے سلطنت تھا، جو نابالغ تھا اور ایک عورت توران بخت اس کی طرف سے سلطنت کی ذمہ داریاں انجام دے رہی تھی۔اس موقع کا فائدہ اٹھا کر سرحدوں پر موجود عربی قبائل نے بغاوت کر دی۔قبیلہ وائل کے ایک سردار مثنی شیبانی جو مسلمان تھے، انہوں نے دارالخلافہ میں حاضر ہو کر حالات سے حضرت ابوبکر کو مطلع فرمایا اور ان سے فوج کشی کی اجازت طلب کی۔اجازت ملنے کے بعد مثنی نے اپنے قبیلے کے ساتھ ایران کی سرحد پر حملہ کر دیا۔اس وقت تک حضرت خالدؓ بن ولید مدعیان نبوت کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے تھے۔حضرت ابوبکرؓ نے انہیں مثنی شیبانی کی مدد کے لیے ایران کی طرف روانگی کا حکم دیا۔حضرت خالدؓ کے پہنچتے ہی جنگ کی صورت حال بدل گئی۔حضرت خالدؓ کی کے زیر کمان مسلم فوج نے حیرہ کے بادشاہ نعمان کو مدائن بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد حضرت خالدؓ آگے بڑھ کر خورنق پر حملہ

آور ہوئے۔اہل خورنق نے مصلحت اندیشی سے مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی اور اسلامی ریاست کے باج گذار بن گئے۔اس طرح عہد صدیقی میں حیرہ کا پورا علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا۔

13.4.5.2 مہم شام:

مہم عراق کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ شام کی سرحدوں پر بھی جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔حضرت ابوبکر نے 13 ھ میں صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کے بعد شام کی طرف رومیوں کے خلاف کئی لشکر بھیجے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ کو حمص کی جانب، یزید بن ابی سفیان کو دمشق، شرحبیلؓ بن حسنہ کو اردن، اور عمرؓو بن عاص کو فلسطین کی مہموں پر روانہ کیا۔مجاہدین اسلام کی مجموعی تعداد 72000 تھی۔اسلامی حکومت کی سرحدوں سے نکلنے کے بعد مسلمانوں کو قدم قدم پر رومیوں سے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔

رومی فوجوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے مسلم سپہ سالاروں نے ان کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر لڑنے کا فیصلہ کیا، اور دارالخلافہ سے دشمن فوجوں کی کثرت کے بارے میں لکھ کر انہوں نے مزید امداد کی درخواست کی۔اس زمانے میں مدینہ میں کوئی فوج موجود نہ تھی، لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن ولید کو لکھا کہ وہ عراق کی مہم کی کمان مثنیٰ شیبانی کے سپرد کر کے مسلمان فوجوں کی کمک کیلئے شام کی جانب روانہ ہوں۔شام کی جانب بڑھتے ہوئے خالدؓ بن ولید کو عین التمر ،تدمر اور حودان میں دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ان ساری مہموں میں انہیں فتح وکامیابی حاصل ہوئی۔بالآخر وہ شام میں اسلامی فوجوں سے ملے۔مسلمانوں کی متحدہ فوجوں نے بصری اور فحل کو مسخر کیا۔اجنادین کے مقام پر مسلمانوں کو رومیوں کے خلاف سخت جنگ کرنی پڑی، جس میں بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے۔لیکن جمادی الاولی ۱۳ھ کو مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔اجنادین کے بعد مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔مسلمان ابھی دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ خلیفہ اول کا آخری وقت آ گیا۔لہٰذا دمشق خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں فتح ہوا۔

13.4.6 تدوین قرآن:

خلافت صدیقی کے اہم کارناموں میں سے ایک قرآن مجید کی جمع وتدوین ہے۔تدوین قرآن کی تاریخ میں جنگ یمامہ کی حیثیت اس اعتبار سے ہے کہ اسی جنگ کے بعد بعض مسلمانوں کو قرآن کے جمع کرنے کا خیال آیا۔واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں اگرچہ مسیلمہ کذاب کو شکست ہوئی تھی اور وہ مارا گیا تھا، لیکن اس جنگ میں بارہ سو مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں کبار صحابہ اور حفاظ قرآن کی ایک کثیر تعداد تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان مرتدین کے علاوہ مختلف محاذوں پر قیصر وکسریٰ کی فوجوں سے برسرپیکار تھے۔لہٰذا مزید حفاظ قرآن کی شہادت بھی یقینی بات تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اگر آئندہ جنگوں میں حفاظ کی شہادتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اندیشہ ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں، تاکہ پورا قرآن ایک جگہ محفوظ ہو جائے''۔ چونکہ ابوبکرؓ کی توجہ ابھی اس جانب نہیں تھی، لہٰذا فوری طور پر تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو جواباً یہ کہہ دیا کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔

اس کے بعد اس مسئلے پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان گفتگو ہوئی رہی۔حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کو اس کی بھلائی کا یقین دلاتے رہے، اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کی بات کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو، جو عہد نبوت میں کاتب وحی تھے، طلب فرمایا اور انہیں حضرت عمرؓ کے ارادہ سے آگاہ کیا۔لیکن حضرت ابوبکرؓ کی طرح انہوں نے بھی شروع میں تردد کا اظہار کیا لیکن بعد میں اس کام کی اہمیت اور حکمت ان پر واضح ہو گئی۔اور پھر انہوں نے بحسن وخوبی اس عظیم کام کو انجام دیا اور قرآن کے متفرق حصوں کو لکڑی، پتھر کے ٹکڑے، آدمیوں کے سینوں اور مختلف چیزوں سے ایک جگہ جمع کیا۔

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔قرآن مجید کی جمع وتدوین کے حوالے سے لوگوں میں ایک غلط فہمی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں میں کوئی جمع وترتیب نہیں تھی اور نہ ہی سورتوں کے کوئی مخصوص نام تھے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے خود آیتوں اور سورتوں کی ترتیب اور ان کے نام صحابہ کرام کو بتائے اور لکھوا دیئے تھے،اور اسی ترتیب سے وہ قرآن کریم حفظ بھی کرتے تھے،البتہ وہ لکھی ہوئی آیتیں اور سورتیں مختلف چیزوں میں تھیں،اور وہ منتشر تھیں۔اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان آیتوں اور سورتوں کو ایک جگہ جمع کروادیا تھا۔

زیدؓ نے قرآن کا جونسخہ مرتب کیا تھا وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا،ان کے انتقال کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے قبضہ میں آ گیا۔حضرت عمرؓ نے اسے ام المومنین حضرت حفصہؓ کو سونپ دیا۔البتہ لوگ اس نسخے سے قرآن کو نقل کرنے یا اپنے نسخے کی تصحیح کے لیے ان کے پاس آتے رہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں اسی نسخے سے چند نسخے نقل کروائے اور انہیں مملکت کے مختلف مقامات پر بھیجے تھے۔لیکن اصل نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس ان کی ساری زندگی رہا۔ان کے انتقال کے بعد وہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے قبضہ میں آیا۔اموی حکمراں مروان نے عبداللہؓ بن عمرؓ سے یہ نسخہ لیکر ضائع کروادیا۔

13.4.7 وفات:

حضرت ابوبکرؓ کی وفات 13ھ کو ہوئی اور خلافت کی مدت کل سوا دو برس رہی۔اس قلیل عرصہ میں آپ نے ارتداد،منکرین زکوۃ،اور جھوٹے نبیوں کے فتنوں کی سرکوبی کی اور دوطرفہ فتوحات کا سلسلہ شروع کیا،جس کی تکمیل حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی۔آپؓ کی وفات کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن جبکہ موسم نہایت سرد تھا آپ نے غسل فرمایا۔اس کے بعد آپ کو بخار آ گیا۔پندرہ دن اسی حالت میں گزر گئے، یہاں تک کہ مسجد جانے سے بھی معذور ہو گئے۔آپ نے اپنی جگہ عمر فاروق کو امامت کے فرائض انجام دینے پر مامور کیا۔جب مایوسی ہونے لگی تو آپؓ نے صحابہ کرام سے اپنی جانشینی کے متعلق مشورے کیے اور عمر فاروقؓ کا نام پیش کیا۔دین کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کے سخت رویہ سے سب واقف تھے،لہٰذا صحابہ کو اعتراض ہوا،تو آپؓ نے یہ کہہ کر کہ ’’جب خلافت کا باران پر پڑیگا تو خود نرم پڑ جائیں گے‘‘،لوگوں کو تسلی دی۔صحابہ سے مشورہ کر لینے کے بعد آپؓ نے حضرت عثمانؓ سے عہد نامہ خلافت لکھوایا،اور اپنے غلام کو بھیج کر مجمع عام میں اسے پڑھوایا۔سارے لوگوں نے اسے تسلیم کرلیا۔ان کے پاس بیت المال سے ایک خادمہ اور دو انٹنیاں تھیں جسے انہوں نے اپنی وفات کے بعد بیت المال کو واپس کرنے کی وصیت کی۔حضرت ابوبکرؓ نے یہ وصیت بھی فرمائی کہ جو کپڑا آپ نے پہنا ہوا ہے اسے ہی دھو کر کفن کے لیے استعمال کیا جائے۔

آپ کی وفات ترسٹھ برس کی عمر میں جمادی الآخر کے اواخر میں 13ھ کو ہوئی۔آپ کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیس نے غسل دیا اور حضرت عمرؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔عثمان،طلحہ،عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عمر رضی اللہ عنہم نے انہیں قبر میں اتارا۔حضرت ابوبکرؓ کو نبی ﷺ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

13.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات سیکھے:

- خلافت راشدہ کا معنی ’رشد سے بہرہ ور اور راہ حق پر چلنے والی جانشینی ہے‘۔
- اسلامی سیاسیات کی اصطلاح میں خلافت کے معنی دین و دنیا سے متعلق امور میں رسول اللہ کی نیابت ہے۔
- خلافت راشدہ کی کل مدت 632 عیسوی سے 661 عیسوی تک ہے۔

- مؤرخین کے نزدیک متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ، خلیفہ راشد ہیں۔ بعض حضرات حضرت حسن اور اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بھی خلفائے راشدین کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔
- حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص تھے جنھوں نے بلاتردد رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول کی اور ساری زندگی ان کی حمایت میں سرگرداں رہے۔
- ابوبکر پہلے شخص تھے جنہوں نے واقعہ اسریٰ کی تصدیق کی، جس کی وجہ آپؓ کو صدیق کے لقب سے نوازا گیا۔
- ہجرت مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہونے اور غار ثور میں آپ ﷺ کی معیت کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کو یار غار کا لقب ملا تھا۔
- مسجد نبوی کی زمین کی قیمت حضرت ابوبکرؓ نے ادا کی تھی۔
- 9 ہجری کو آپؓ کو رسول اللہ ﷺ نے امیر حج بنا کر بھیجا تھا۔
- رسول اللہ ﷺ کی علالت کے ایام میں ابوبکر نے مسجد نبوی میں امامت کے فرائض انجام دیئے تھے۔
- حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدعیان نبوت، ارتداد اور منکرین زکوٰۃ کا فتنہ رونما ہوا، جس کی آپ نے کامیابی کے ساتھ بیخ کنی کی۔
- حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں صحابہ کی کثیر تعداد جنگوں میں شہید ہو جانے کی وجہ سے تدوین قرآن کا عظیم کارنامہ انجام دیا گیا۔
- حضرت ابوبکرؓ کے وصال کے وقت بیت المال سے آپ کے پاس سفر کے لیے اونٹنیاں اور خدمت کے لیے ایک خادمہ تھی جسے آپ نے بیت المال کو لوٹانے کی وصیت کی۔

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. ذات النطاقین کس کا لقب تھا؟

a. حضرت عائشہؓ　b. حضرت اسماءؓ　c. حضرت حفصہؓ　d. حضرت فاطمہؓ

2. حضرت ابوبکر کی وفات کس سن میں ہوئی؟

a. 11ھ　b. 21ھ　c. 31ھ　d. 41ھ

3. حضرت ابوبکر کا دور خلافت کتنے برس کا ہے؟

a. چار برس　b. دس برس　c. دو برس تین ماہ　d. چھ برس

4. یار غار کس کا لقب تھا؟

a. حضرت ابوبکرؓ　b. حضرت عمرؓ　c. حضرت عثمانؓ　d. حضرت علیؓ

5. حضرت ابوبکر کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟

a. حضرت طلحہؓ　b. حضرت عمرؓ　c. حضرت ابوعبیدہؓ　d. حضرت علیؓ

6. اجنادین کس کے خلیفہ کے زمانے میں فتح ہوا؟

a. حضرت ابوبکرؓ　b. حضرت عمرؓ　c. حضرت عثمانؓ　d. حضرت علیؓ

7. دمشق کس خلیفہ کے دور حکومت میں فتح ہوا؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. حضرت علیؓ

8. حضرت ابوبکر نے تدوین قرآن کے کام پر کس صحابی کو مامور کیا؟

a. حضرت عبداللہ بن عباس b. حضرت عبداللہ بن عمر c. حضرت امیر معاویہ d. حضرت زید

9. حضرت ابوبکر کا تعلق کس قبیلہ سے تھا؟

a. بنو ہاشم b. بنوامیہ c. بنوتیم d. بنومخزوم

10. جھوٹے نبیوں کا فتنہ کس خلیفہ کے دورِ خلافت میں رونما ہوا؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. حضرت علیؓ

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. خلافت راشدہ کے ارتقاء پر ایک مختصر نوٹ لکھئے۔
2. خلافت سے پہلے حضرت ابوبکر کی خدمات پر تبصرہ کیجئے۔
3. حضرت ابوبکر صدیق کی بحیثیت خلیفہ خدمات پر روشنی ڈالئے۔
4. دورِ خلافت صدیقی کی فتوحات پر روشنی ڈالئے۔
5. تدوین قرآن پر ایک مختصر تبصرہ تحریر کیجئے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت ابوبکر کی حیات وخدمات پر ایک طویل مضمون لکھئے۔
2. عہد خلافت صدیق میں سرحد ایران اور ملک شام میں ہونے والی اسلامی فتوحات پر تفصیل سے لکھئے۔
3. خلیفہ بنتے ہی ابوبکر صدیق کو کن اہم چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا؟ جائزہ لیجئے اور اس کی روشنی میں خلافت صدیق کی اہمیت کو واضح کیجئے۔

13.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. تاریخ الخلفا : جلال الدین سیوطی
2. ابوبکر، صدیق اکبر : محمد حسین ہیکل، اردو ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی
3. ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفا : شاہ ولی اللہ دہلوی
4. خلفائے راشدین : شاہ معین الدین احمد ندوی
5. اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ (جلد 1 اور 8)

-:oOo:-

اکائی 14 : حضرت عمر بن خطابؓ: حیات وخدمات

اکائی کی اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقصد
14.2		پس منظر
14.3		ولادت
14.4		نام ونسب
14.5		بچپن اور جوانی کے ایام
14.6		ذریعہ معاش
14.7		قبول اسلام
14.8		ہجرت مدینہ
14.9		فراست اور شجاعت
14.10		عہدۂ خلافت
14.11		فتوحات
	14.11.1	عراق کی فتح
	14.11.2	شام کی فتح
14.12		حدود سلطنت کی توسیع
14.13		حکومت کا نظم ونسق
	14.13.1	طرز حکومت
	14.13.2	عدل وانصاف
14.14		سادگی
14.15		وفات
14.16		فضائل وکمالات
14.17		اکتسابی نتائج
14.18		نمونہ امتحانی سوالات

14.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.19 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید

اس اکائی میں اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ان کی ولادت، تعلیم وتربیت، قبول اسلام، ہجرت مدینہ دور خلافت اور طرز زندگی کو احاطہ تحریر میں لایا جائے گا اور ان کی فتوحات کا اجمالی تعارف پیش کیا جائے گا۔قبول اسلام کے وقت آپ پیشہ ور تاجر تھے اور مستحکم حیثیت کے مالک تھے۔اسلام لانے سے پہلے آپ دشمنان اسلام میں شمار ہوتے تھے لیکن اسلام کا شرف حاصل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے، ایام جاہلیت میں حضرت عمرؓ کے خاندان کے ذمہ عرب کی سفارت کا کام تھا۔آپ کو نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی، خطابت اور شہسواری میں ملکہ حاصل تھا، عزت نفس، بلند حوصلگی اور نکتہ دانی کے لیے عرب میں مشہور ومعروف تھے۔اس اکائی میں ہم ان کی تفصیل پڑھیں گے۔

14.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حیات وخدمات سے واقف ہوسکیں گے۔انھوں نے اسلامی سلطنت کو جو مضبوطی بخشی اور اس کا دائرہ وسیع کیا اس کا علم ہوگا۔حضرت عمرؓ کے دور میں اسلام کو بہت عزت نصیب ہوئی اور اسلام بہت زیادہ علاقوں میں پھیل گیا، آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا تھا (وہ صحابہ جن کو زندگی میں ہی جنت کی بشارت ملی) قیادت اور انتظام کے شعبے میں ایسا نظریہ وضع کیا جو بعد کے خلفاء کے لیے ایک نظیر قائم ہوگئی۔نیز عدل وانصاف کے لیے عدالتیں اور قاضی مقرر کیے، بیت المال قائم کیا، جیل خانے بنوائے، شہر قائم کیے اور نہریں کھدوائیں، جابجا فوجی چھاؤنیاں قائم کیں، تنخواہیں اور وظیفہ مقرر کیا ان تمام خدمات کا تعارف سامنے لانا اس اکائی کا مقصد ہے۔

14.2 پس منظر

اسلام کی آمد سے قبل عرب، جاہلیت اور عسکریت کا مرکز تھا۔تہذیب وثقافت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا؛ اسی لیے انہیں 'بدّو' کہا جاتا تھا۔عرب، روم اور ایران کے مقابلے بہت کمزور تھے اور شاہان روم وایران یعنی قیصر وکسری کا خوف ان پر طاری رہتا تھا، تاہم جب اسلام کی آمد ہوئی اور عرب میں اس کی اشاعت ہوئی اسی وقت سے ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہوا۔ابتدا میں حضرت عمرؓ بھی اسلام کے سخت مخالف تھے تاہم رفتہ رفتہ ان کے دل میں نور ایمان پیدا ہوا اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں تقویت حاصل ہوئی اور حضرت عمرؓ کے رعب ودبدبہ نے اسلام کی سربلندی میں اہم رول ادا کیا۔

14.3 ولادت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبل اسلام کی زندگی کے بارے میں بہت معلومات حاصل نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں بھی بہت اختلاف ہے۔تاہم علامہ شبلی نعمانی کے مطابق مشہور روایت یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ہجرت مدینہ سے چالیس سال قبل

حضرت عمر کی ولادت ہوئی۔ چونکہ 622ء ہجرت کا واقعہ پیش آیا تھا اس لحاظ سے 582ء ان کا سال ولادت ہوا۔ بہر حال اتنا طے ہے کہ 580ء سے 590ء کے درمیان ہی آپؓ کی پیدائش ہوئی تھی۔

14.4 نام ونسب

حضرت عمرؓ کے والد کا نام خطاب اور والدہ کا نام ختمتہ تھا۔ ان کا قبیلہ 'بنو عدی' کہلاتا ہے۔ عدی کے بھائی مرۃ رسول اللہ ﷺ کے اجداد میں شامل ہیں اس مناسبت سے حضرت عمر کا سلسلہ آٹھویں پشت میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے اور 23 واسطوں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متصل ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پیدائشی نام 'عمر'، کنیت 'ابو حفص' اور لقب 'فاروق' تھا۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

عمرؓ بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزی بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن ذراع بن عدی بن کعب بن فہر بن مالک۔ فہر بن مالک کی گیارہویں پشت میں عدنان ہیں جن کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملا ہوا ہے۔

14.5 بچپن اور جوانی کے ایام

عرب میں چونکہ اونٹ اور بکریاں پالنے کا رواج عام بات تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے والد خطاب نے اونٹ چرانے کا کام ان کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ پابندی اور محنت سے اونٹ چرانے کے لیے ضجنان کے میدان میں جایا کرتے تھے۔

عرب میں اس زمانے میں باقاعدہ علم وادب کی تدریس کا رواج نہیں تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت پورے قریش میں صرف سترہ آدمی کو لکھنا آتا تھا۔ جو شرفا اور معززین ہوتے ان کے بچے عام طور پر علم انساب، سپہ گری، کشتی اور تیر اندازی کا علم حاصل کرتے تھے۔ شعر وادب کا ذوق طبعی اور موروثی تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سبھی علوم وفنون پر مہارت حاصل کی۔ زمانہ جاہلیت میں ہر سال عکاظ میں میلہ لگتا تھا جس میں مختلف فنون کے ماہرین شریک ہوتے اور اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی وقت کے بڑے بڑے پہلوانوں سے مقابلہ کیا اور انہیں مات دی تھی۔ شہسواری میں بھی طاق تھے، جب کبھی گھوڑ سواری کا مقابلہ ہوتا تو اس میں حضرت عمرؓ ہی فاتح ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرؓ قریش میں بہادر، معزز اور شریف لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت بارعب اور معاملہ فہم بھی تھی، اس لیے سفارت کا معزز منصب انہیں دیا گیا تھا۔

14.6 ذریعہ معاش

اس زمانے میں بیشتر عرب تجارت سے وابستہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی تجارت کو ہی ذریعہ معاش بنایا اور اس میں خوب ترقی کی۔ سامان تجارت کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں مختلف شہروں اور ملکوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ ان اسفار سے انہیں کافی تجربات حاصل ہوئے اور ذہن وفکر میں پختگی پیدا ہوئی۔ تاہم افسوس ہے کہ ان اسفار کی تفصیل کہیں محفوظ نہ رہی۔ قریش نے ان کی بہادری اور فراست کو عکاظ کے میلوں اور تجارت کے معاملوں میں دیکھا تھا اور ان کی صلاحیت کے معترف تھے، اسی لیے جب قبیلے میں کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو حضرت عمرؓ سے رجوع کیا جاتا اور اس کے حل کے لیے انہیں سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا۔

14.7 قبول اسلام

جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور اہل عرب کو اسلام کی دعوت دی تو بہت سے لوگ مخالف ہو گئے۔ ان میں حضرت عمرؓ بھی پیش پیش تھے۔ اسلام سے پہلے آپؓ کے خاندان میں زید نامی ایک شخص تھے جو توحید کے قائل تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد اسی زید کے بیٹے سعیدؓ نے

اسلام قبول کرلیا، اور سعیدؓ کا نکاح چونکہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا۔ لہٰذا سعیدؓ کے ساتھ ساتھ ان کی بہن نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا، تاہم حضرت عمرؓ کو ابھی اس کی خبر نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ صاحب جاہ وجلال تھے۔ جن لوگوں کے اسلام لانے کی خبران کو ملتی ان کے دشمن ہوجاتے اور ان کو طرح طرح سے اذیت پہنچاتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ انتہائی غصہ کے عالم میں ننگی تلوار لیے گھر سے اس ارادہ سے نکلے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہی قتل کردیں، تا کہ روز روز کا یہ مسئلہ ختم ہو۔ راستہ میں نعیمؓ بن عبداللہ سے ملاقات ہوئی، اس حالت میں عمرؓ کو دیکھ کر کہا: پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں اپنے بہنوئی کو خوب مارا، اور جب بہن بچانے آئی تو اسے بھی مارا، اور دونوں کو لہولہان کردیا۔ انھوں نے کہا: عمرؓ! تم کچھ بھی کرلو، اسلام دل میں گھر کر چکا ہے اور ہم اس سے پلٹنے والے نہیں ہیں۔ عمرؓ نے اتنا سنا تو کہا: جو تم پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ جیسے ہی عمر کی نظر قرآن کی آیت پر پڑی، ان کے دل کی دنیا میں ایک انقلاب آگیا۔ وہاں سے سیدھے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت امیر حمزہؓ اور چند صحابہ وہاں موجود تھے، انہیں عمرؓ کو تلوار لیے دیکھ کر تھوڑا تردد ہوا، لیکن امیر حمزہؓ نے کہا: اگر نیک ارادے سے آیا تو بہتر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کی گردن اڑادیں گے۔ حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: عمر! کس ارادے سے آئے ہو۔ عمرؓ نے جواب دیا: آپ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے۔ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بے ساختہ اللہ اکبر نکلا، اتنا سننا تھا کہ سارے صحابہ خوشی سے جھوم اٹھے اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ یہ واقعہ اعلان نبوت کے چھٹے سال کا ہے۔ عرب میں اس وقت دو لوگوں کا بہت رعب ودبدبہ تھا اور اسلام کے خلاف یہ دونوں بہت سرگرم تھے، ایک عمر اور دوسرا ابو جہل۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی کہ عمر یا ابن ہشام (ابوجہل) کے ایمان سے اسلام کو قوت عطا فرما۔ چنانچہ یہ دعا حضرت عمرؓ کے حق میں قبول ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام سے اہل ایمان کو بہت تقویت ملی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک تقریباً پچاس آدمی ایمان لا چکے تھے، مگر ارکان اسلام کی ادائیگی اعلانیہ نہیں بلکہ خفیہ طور پر کی جاتی تھی۔ عمرؓ نے جب اسلام قبول کیا تو انھوں نے اعلانیہ طور پر فرائض کی ادائیگی کی یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں بھی نماز ادا کی گئی۔

14.8 ہجرت مدینہ

مکہ میں جب اسلام پھیلنے لگا تو دشمنان اسلام نے مسلمانوں کو ستانا شروع کردیا اور اسلام سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کردیں۔ تاہم جب تک ابو طالب زندہ رہے اس وقت تک کھل کر مقابلے میں آنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی۔ لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو کفار مکہ کا ظلم وستم بھی حد سے بڑھنے لگا اور اسلام سے باز رکھنے کے لیے کفار مکہ نے ظلم وستم کی انتہا کردی۔ مگر اسلام کی روحانی قوت اور ایمانی جذبہ نے انہیں اسلام سے پھرنے نہ دیا۔ اس درمیان مدینہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا اور یہاں کے معززین نے اسلام قبول کرلیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے اس جانب ہجرت کرنا شروع کردیا۔ حضرت عمرؓ بھی بیس صحابہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ پہنچ کر رفاعہ بن عبدالمنذر کے مکان پر قیام کیا۔ 622ء میں رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں پہنچ کر تمام مہاجرین اور انصار میں بھائی بھائی کا رشتہ قائم کیا گیا اور اہل مدینہ نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنا حقیقی بھائیوں کا درجہ دیا۔ حضرت عمرؓ کو قبیلہ بنو سالم کے سردار عتبان بن مالکؓ کا اسلامی بھائی بنایا گیا، جو آپؓ ان کے ساتھ مدینہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر قبا میں رہنے لگے۔ یہاں سے ہر دوسرے دن رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور مسلسل خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

14.9 فراست اور شجاعت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاملہ فہم اور صائب الرائے تھے۔ فہم وفراست اور شجاعت وبہادری میں ممتاز تھے۔ جب مدینہ میں اسلام کی بنیاد

مضبوط ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے تب ارکان اسلام کی ادائیگی کی جانب توجہ دی گئی۔ سب سے پہلے جو مسئلہ سامنے آیا وہ تھا اوقات نماز کے اعلان کا تھا۔ اس زمانے میں دیگر مذاہب کے لوگ ناقوس (ایک قسم کا آلہ جس میں پھونکنے سے تیز آواز آتی ہے) بجا کر عبادت کا وقت بتاتے تھے۔ چنانچہ کئی صحابہ نے اسی کے ذریعہ اعلان نماز کا مشورہ دیا، مگر اس معاملہ میں حضرت عمرؓ کی رائے مختلف تھی۔ انھوں نے کہا: ایک آدمی کو اعلان نماز کے لیے مقرر کیا جائے، لہٰذا ان کی رائے رسول اللہ ﷺ نے پسند کی اور اسی پر اتفاق ہوا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کے لیے منتخب کیا گیا اور یہیں سے اذان کی روایت قائم ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ ان کی رائے کے مطابق اسلام کے سب سے اہم رکن نماز کے اعلان کا طریقہ اذان کی صورت میں وجود میں آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام کے بعد ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں پیش پیش رہے، چنانچہ جب اسلام کے خلاف محاذ قائم ہوا اور جنگ کی نوبت آئی تو اس میں بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ شرکت کی۔ ہجرت مدینہ کے دو سال بعد بدر کا معرکہ پیش آیا، جس میں حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بنے رہے۔ حضرت عمرؓ نے اسلام کو اپنے عزیز و اقارب سے بلند رکھا اور اسلامی امور میں رشتے داری کا کوئی پاس و لحاظ نہیں رکھا۔ اس کا مظاہرہ بھی جنگ بدر میں انھوں نے کیا اور اپنے ایک ماموں کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیا جو اس جنگ میں کفار مکہ کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں ستر افراد قید ہو کر آئے، جن کے معاملے میں صحابہ نے مختلف رائیں دیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم میں سے جو شخص جس قیدی کا رشتہ دار ہے وہ اسے قتل کر دے۔ جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ رحمت بن کر آئے تھے، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا گیا۔

معرکہ خیبر میں فتح کے بعد وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ اس کا ایک حصہ حضرت عمر کو بھی ملا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اسے خدا کی راہ میں وقف کر دیا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر کو قبیلہ ہوازن کے مقابلے کے لیے تیس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا گیا، مگر حضرت عمر کا نام سنتے ہی ہیبت سے وہ لوگ بھاگ گئے۔

چھ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کی زیارت کا قصد کیا اور صحابہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ چلے، تاکہ قریش کو جنگ کا شبہ نہ ہو۔ کچھ دور جا کر حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ اس طرح جانا مناسب نہیں ہے اس لیے مدینہ سے ہتھیار منگوانے کا آپ ﷺ کو مشورہ دیا، جسے قبول کیا گیا اور مدینہ سے ہتھیار منگوا لیے گئے۔ اسی سفر میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا اور کفار مکہ کے ساتھ چند امور پر معاہدہ طے ہوا اور جب معاہدہ تیار ہوا تو اس پر اکابرین صحابہ کے ساتھ حضرت عمرؓ نے بھی دستخط کیا۔

آٹھ ہجری میں جب مکہ فتح ہوا، اس وقت صفا کے مقام پر حضور ﷺ نے مردوں سے بیعت لی، اور پھر جب عورتوں کی بیعت کی باری آئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں پر بیعت لیں۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھوں پر حضور ﷺ کی جانب سے بیعت لی۔ سنہ نو ہجری میں جب قیصر روم کے حملے کی خبر آئی تو مدینہ میں زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ چونکہ اس وقت مالی دشواری بھی در پیش تھی اس لیے تمام صحابہ نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اپنا حصہ پیش کیا۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے مال کے دو حصے کیے اور ایک حصہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے بے انتہا محبت تھی، جس کا عملی اظہار متعدد مواقع پر ہوا۔ تین ہجری میں ان کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ان کی صاحبزادی حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ نے نکاح فرمایا۔

حضور ﷺ کی جب وفات ہوئی تو حضرت عمرؓ اس قدر غمزدہ ہوئے کہ آپے سے باہر ہو گئے اور مسجد نبوی میں جا کر کہا کہ ''جو شخص یہ کہے گا کہ

آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اس کو قتل کر دوں گا''۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد فتنوں نے بڑی تیزی سے سر اٹھایا، لیکن حضرت عمر کی حکمت و دانائی اور مصلحت و دور اندیشی نے ان فتنوں کا سر بہت جلد کچل کر رکھ دیا۔

14.10 عہدۂ خلافت

حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور تقریباً سوا دو سال اس عہدہ پر فائز رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عہد نبوی ﷺ میں، اور اس سے پہلے اور پھر اپنے دور خلافت میں بھی حضرت عمرؓ کی فہم و فراست کا قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے ان کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ خلافت کے لیے حضرت عمرؓ سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اکابر صحابہ سے اس سلسلہ میں رائے لی، جن میں زیادہ تر ان کی اہلیت کے قائل تھے، مگر ان کی طبیعت میں سختی کو لے کر کچھ تردد میں تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جب خلافت کا بوجھ ان پر آئے گا تو خود نرم ہو جائیں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ابھی آپؓ کی موجودگی میں ان میں اتنا غیض و غضب ہے تو آپؓ کے جانے کے بعد کیا ہوگا، آپؓ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں خدا سے کہوں گا کہ میں نے اس شخص کو خلیفہ مقرر کیا جو تیرے بندوں میں سب سے بہتر تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور عہد نامہ لکھوایا کہ میں اپنے بعد عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔ پھر باہر آ کر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا: کیا تم لوگ عمرؓ کی خلافت پر راضی ہو؟ جواب میں لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نصیحت کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

14.11 فتوحات

حضرت عمرؓ نے جب خلافت کا بار سنبھالا، اس وقت اسلام کو ہر طرف سے مشکلات درپیش تھیں۔ ایسے دور میں جب ہر طرف منافقین ماحول خراب کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے، ایک نئی اسلامی سلطنت کو مستحکم کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ایک ساتھ کئی مسائل کا سامنا تھا۔ کئی محاذ پر جنگ جاری تھی، ان کو مدد پہنچانا اور فتح سے ہم کنار کرانا ایک اہم مسئلہ تھا۔ پھر ان سب پر مقدم لوگوں سے بیعت لے کر انہیں متحد کرنا تھا۔ چنانچہ بیعت کے لیے گرد و نواح سے بڑی تعداد میں لوگ آتے رہے اور کئی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ چونکہ عراق میں جنگ جاری تھی اور انہیں فوجی مدد کی ضرورت تھی، اس لیے بیعت کے بعد حضرت عمرؓ نے جہاد کے موضوع پر وعظ کیا۔ حاضرین میں سے قبیلہ ثقیف کے سردار ابو عبیدہ ثقفیؓ نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر کہا 'میں اس کام کے لیے حاضر ہوں'۔ اتنا سننا تھا کہ مجمع میں جوش پیدا ہو گیا اور ہر طرف سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہ ثقفیؓ کی سپہ سالاری میں ایک ہزار لوگوں کی فوج جمع کر کے عراق بھیجا، تاکہ وہ ایرانی فوج سے نبرد آزما ہوں۔ ابو عبیدہؓ اپنی قیادت میں پے درپے ان پر کئی حملے کیے اور بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے فتوحات حاصل کرتے رہے، بالآخر ہاتھی پر سوار سردار پر حملہ آور ہوئے، ہاتھی نے آگے بڑھ کر ان کو زمین پر گرا دیا اور سینے پر پیر رکھ کر مسل دیا۔ پھر ان کے بھائی نے علم اٹھایا وہ بھی شہید ہو گئے، اس طرح کئی لوگ علم اٹھاتے رہے اور شہید ہوتے رہے۔ بالآخر مثنیٰ نے علم سنبھالا اور بچی کھچی فوج کو منظّم کر کے ایرانی فوج پر حملہ آور ہوئے جس سے ایرانی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ اس جنگ میں اسلامی فوج کو بھاری نقصان ہوا۔

14.11.1 عراق کی فتح:

عراقی محاذ میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس سے حضرت عمرؓ سخت نالاں تھے، چنانچہ انہوں نے ان کو شکست فاش دینے کے لیے زور وشور سے تیاری شروع کر دی۔ خطیبوں نے اپنے پر جوش تقریروں سے لوگوں میں جوش پیدا کر دیا اور ایک بڑی فوج تیار ہو گئی۔ لیکن چونکہ حج کا زمانہ

آ گیا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ حج کی تیاری میں لگ گئے۔ حج کے بعد ایک بڑے لشکر کے ساتھ حضرت عمرؓ نے خود سپہ سالار بن کر جانے کا ارادہ کیا اور حضرت علیؓ کو امور خلافت سپرد کر کے عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ اس واقعہ سے لوگوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا کہ خود امیر المومنین سپہ سالار بن کر جا رہے ہیں۔ لیکن مدینہ چھوڑ کر ان کا جانا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس لیے فوج کو جمع کر کے ایک مقام پر رائے لی گئی۔ چنانچہ عام لوگوں نے سپہ سالار کی حیثیت سے شامل ہونے کو کہا۔ جب کہ اکابرین صحابہ نے اس کے خلاف مدینہ چھوڑ کر جانے سے منع کیا۔ کیوں کہ امیر المومنین کی غیر موجودگی کا دوہرا نقصان ہو سکتا تھا۔ ایک یہ کہ غیر موجودگی میں منافقین بغاوت کر دیں اور دوسرا اگر جنگ میں شکست ہوئی اور امیر المومنین کو کچھ نقصان پہنچا تو اسلام کی کمر ٹوٹ جائے گی اور سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔ حضرت عمر نے اکابرین صحابہ کی رائے کو اہمیت دی اور اپنا ارادہ ترک کر کے مدینہ لوٹنے کا فیصلہ کیا اور سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالار مقرر کیا۔ تاہم بطور احتیاط فوج کی نقل و حمل اور جنگی معاملات کو اپنے اختیار میں رکھا اور وہاں کے حالات پر مستقل نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جنگی احکام مسلسل جارے کرتے رہے۔

قادسیہ ایک سرسبز و شاداب مقام تھا، جہاں سے حضرت عمرؓ کا زمانۂ جاہلیت میں بارہا گزر تھا۔ اس لیے وہ یہاں کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کا تازہ ترین نقشہ منگوا کر میدان جنگ کا نقشہ تیار کیا اور تفصیل سے لڑائی کے تمام پہلوؤں کو سمجھایا۔ عمرؓ نے خبر بھجوائی کہ جنگ سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ سفیران اسلام قادسیہ کے پایۂ تخت مدائن میں یزدگرد کے دربار میں حاضر ہوئے اور اسلام کی خوبیاں اس کے سامنے بیان کیں اور اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی۔ مگر اس نے اپنے غرور میں کسی طرح کی مصالحت سے انکار کر دیا اور ذلیل کرنے کے خیال سے ایک ٹوکری مٹی لا کر ان کے سر پر ڈال کر واپس کر دیا۔ مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ دشمنوں نے خود مٹی ان کے حوالے کر کے جیت کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ چنانچہ رستم کی قیادت میں یزدگرد کی فوج وہاں پہنچی۔ تاہم وہ لڑنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے کئی بار جنگ ٹالنے کے لیے صلح کی پیش کش کی، مگر مسلمانوں نے اپنی شرطوں پر صلح کرنا چاہا۔ اس لیے بات نہ بن سکی اور صلح کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اس کے بعد جنگ کا اعلان ہوا۔ حضرت عمرؓ نے مجاہدین کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جنگ کے دوران ہی خوب صورت عربی گھوڑے اور تلواریں بھیجیں اور لوگوں کو جوش دلایا۔ کئی دنوں تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ مختلف اسلحوں سے لیس ایرانیوں کے بے شمار دستے تھے۔ مگر مسلمانوں نے جس بہادری سے ان کا مقابلہ کیا، اس کا جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ نے فتح مسلمانوں کو عطا فرمائی اور مختصر عرصہ میں یکے بعد دیگرے پورا عراق فتح ہوتا چلا گیا۔

قادسیہ کی جنگ کو لے کر حضرت عمرؓ بہت متفکر رہا کرتے تھے اور ہر دم قاصدوں کے منتظر رہتے تھے۔ فتح کے بعد قادسیہ سے ایک قاصد اونٹ پر سوار آیا حضرت عمرؓ اس کے ساتھ پیدل چلتے رہے اور جنگ کی تفصیل جانتے رہے، جب مدینہ کے حدود میں داخل ہوئے تو لوگوں نے امیر المومنین کے لقب سے انہیں بلایا، قاصد یہ سن کر گھبرا گیا اور شرمندہ بھی ہوا۔ مگر حضرت عمرؓ نے کہا: تم اپنی گفتگو جاری رکھو۔ اس کے بعد لوگوں کو بلا کر ایک خطبہ دیا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ 'مسلمانوں میں تمہارا بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بناؤں، میں خدا کا غلام ہوں، البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر اسی طرح میں تمہارا کام کروں کہ تم چین سے سو سکو، تو میری سعادت ہے اور اگر میری خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر کھڑے رہو، تو یہ میری بدبختی ہے۔ میں تم کو اپنے عمل سے تعلیم دینا چاہتا ہوں نہ کہ محض زبانی'۔

14.11.2 شام کی فتح:

ملک شام میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ہی فوج کشی ہوئی تھی، اور انہیں کے زمانے میں دمشق کا بھی محاصرہ ہوا تھا، تاہم فتح حضرت عمر کے دور خلافت میں ہوئی۔ مجاہدین نے سردی و گرمی سے بے نیاز ہو کر بڑی دلیری اور جواں مردی سے دمشق کا مقابلہ کیا۔ دمشق اس زمانے میں بڑی

اہمیت کا حامل شہر اور تجارت کا مرکز تھا۔ سنہ 14 ہجری مطابق 635ء میں یہ شہر فتح ہوا۔ اس شہر کی فتح سے شام کے دیگر صوبوں کی فتح میں بہت مدد ملی اور رومیوں پر مسلمانوں کی ہیبت بھی بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعد کی جنگوں میں انھوں نے لڑائی ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی اور کئی طرح کے لالچ دیئے کہ مسلمان واپس ہو جائیں۔ مگر مسلمان ان کی لالچ میں نہ آئے اور جنگ ہوئی۔ رومیوں نے اپنی پوری طاقت جھونک دی مگر مسلمانوں کے عزم و ارادے کے آگے ٹک نہ سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حضرت ابوعبیدہ نے فتح کی خوش خبری بھیجی اور مفتوحین کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت عمر نے جواب دیا ''رعایا ذمی قرار دی جائے اور زمین زمینداروں کے قبضے میں ہی رہنے دی جائے''۔

دمشق، اردن اور حمص میں شکست کے بعد رومیوں نے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع کی اور آس پاس کے تمام ممالک سے مدد کا مطالبہ کیا اس طرح ایک عظیم الشان لشکر تیار ہو گیا اور جنگ یرموک کا آغاز ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت میں یرموک کے مقام پر رومیوں کے ساتھ ایک خونریز جنگ ہوئی۔ یہاں بھی بڑی بہادری اور جاں نثاری کے ساتھ مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور رومیوں کے پیر اکھڑ گئے اور فتح حاصل ہوئی۔ قیصر روم کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ کی طرف بھاگ گیا۔ جب سے یہ جنگ شروع ہوئی تھی حضرت عمر بہت پریشان تھے، لیکن جیسے ہی انھیں فتح کی خبر ملی سجدہ میں گر پڑے۔

ان سارے واقعات سے عیسائیوں کے دلوں میں ایک خوف بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے بیت المقدس کی طرف جب اسلامی فوج نے کوچ کیا، تو وہاں کے عیسائی نے پہلے ہی صلح کی درخواست کی اور شرائط تسلیم کر لیے۔ البتہ اتنی درخواست کی کہ حضرت عمرؓ خود آ کر صلح نامہ تیار کر کے دستخط کریں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ مدینہ طیبہ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر بیت المقدس کے لیے روانہ ہوئے۔ معاہدہ کے بعد بیت المقدس کے اندر داخل ہوئے، سجدۂ شکر ادا کیا اور قرآن کی تلاوت کی۔ کئی دنوں تک یہاں قیام رہا۔ اس دوران ایک دن حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان دینے کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے جب اپنے مخصوص انداز میں اذان دینا شروع کیا، تو صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کا زمانہ یاد آ گیا اور بے چین ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین زار و قطار رونے لگے اور کافی دیر تک غم کا ماحول رہا۔

14.12 حدود سلطنت کی توسیع

حضرت عمرؓ نے جس وقت خلافت کا عہدہ سنبھالا تھا، اس وقت اسلامی سلطنت کا دائرہ بہت محدود اور غیر منظم تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بہت کم وقت ملا اور محض دو سال کی مدت میں انتقال ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے کل دس سال چھ مہینے اور چار دن تک خلافت کی ذمہ داری اٹھائی اور اپنی بصیرت سے دنیا کا ایک بڑا حصہ فتح کر کے اسلامی حدود میں شامل کر دیا۔ چنانچہ ان کے دور خلافت میں اسلامی سلطنت کا دائرہ بائیس لاکھ اکیاون ہزار تیس (22,51030) مربع میل تک وسیع ہو گیا۔ شام، مصر، عراق، جزیرہ، خوزستان، عراق، عجم، آرمینیا، آذر بائیجان، فارس، کرمان، خراسان اور مکران وغیرہ ان کی خلافت کے دوران یعنی ساڑھے دس سال میں اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ دنیا کا اتنا بڑا رقبہ اتنے کم عرصے میں فتح ہو جانا غیر معمولی بات تھی۔ اس زمانے کی عظیم الشان سلطنتیں بھی جو قیصر و کسریٰ کے نام سے مشہور تھیں، مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئیں۔ اس کامیابی پر پوری دنیا حیرت میں تھی کہ اتنی قلیل مدت میں عرب کے بدّوؤں اور چرواہوں نے کیسے فتح کر لیا۔ مغربی مورخین نے فتح کے اسباب میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ آپسی لڑائیوں کی بنا پر فارس اور روم کی سلطنتیں کمزور ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی فوجی طاقت کے مقابلے عرب بہت کمزور تھے۔ ان کے پاس جنگی آلات اور اسلحے کی فراوانی تھی، فوجوں کی کثرت تھی اور خوراک کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جبکہ عرب کے پاس بہت مختصر فوج تھی اور اسلحے بھی بہت معمولی تھے، ان کی فوج تربیت یافتہ بھی نہیں تھی، یہ عوام تھی، جنھیں اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے جمع

کیا گیا تھا۔ لہٰذا یورپی مؤرخین کا یہ کہنا کہ وہ آپسی لڑائیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے قابل قبول نہیں ہوگی۔ یہ دراصل حق اور باطل کی جنگ تھی اور مسلمان حق پر تھے۔ ان کے اندر ایمانی جوش وجذبہ کارفرما تھا، رسول اللہ ﷺ کی محبت تھی، اور ساتھ میں حضرت عمرؓ کی عقیدت وبصیرت نے ان میں مزید قوت پیدا کر دی تھی۔ اس لیے مسلمان جہاں بھی جاتے بڑی سے بڑی فوج کو درہم برہم کر دیتے تھے۔ دوسری بات جس علاقے کو فتح کرتے، وہاں مکمل امن وامان اور عدل وانصاف کا نظام قائم کیا جاتا تھا۔ اس طرح رعایا کو بھی ظالم وجابر حکومت کے چنگل سے نجات مل جاتی تھی۔ مفتوحہ شہر یا ملک کی غیر مسلم عوام مسلمانوں کی ایمانداری، دیانت داری اور اخلاق حسنہ کے گرویدہ ہو جاتی اور ان کے دلوں میں محبت پیدا ہو جاتی تھی۔

شام اور عراق کی فتح نے عربوں کا خوف عیسائیوں کے دلوں میں بٹھا دیا تھا۔ تاہم ایرانی وقفہ وقفہ سے ان مفتوحہ علاقوں میں بغاوت کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ ایران اس زمانہ میں بہت طاقتور سلطنت تھی۔ اس لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھانا کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ خود حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ایرانی ہم پر حملہ آور نہ ہوں اور ہمیں ان پر حملہ نہ کرنا پڑے۔ مگر ایرانیوں کی جب شورش بڑھی تو حضرت عمرؓ نے اسے تسخیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور فارس کی فتح کے ساتھ ہی ایران پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ انھوں نے آذربائیجان، اصفہان، طبرستان، آرمینیا، فارس، کرمان، سیستان، مکران اور خراسان کے علاوہ پورا عراق، شام، مصر اور اسکندریہ وغیرہ کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

14.13 حکومت کا نظم ونسق

حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ملکوں اور شہروں میں انتظامی امور اور حفاظتی تدابیر پر خاص توجہ دی۔ رعایا کی دیکھ بھال کے ساتھ ان کی زندگی کو بہتر بنانے اور امن وسلامتی قائم رکھنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی دوراندیشی سے سلطنت کو ہر نہج پر محفوظ اور مضبوط کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے آٹھ بڑے شہروں میں انھوں نے فوجی چھاؤنیاں بنوائیں۔ یہاں ہر دم چار ہزار گھوڑ سوار تیار رہتے اور جہاں بھی بدنظمی ہوتی یا کسی قسم کی ضرورت پیش آتی فوراً یہاں سے مدد بھیجی جاتی۔ چنانچہ حمص میں جب عیسائیوں نے قیصر روم کے ساتھ دوبارہ چڑھائی کی تو مسلمانوں نے فوراً اپنی فوج اکٹھی کر لی اور ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھاگنا پڑا۔

18 ہجری میں 'عمواس' کی وبا پھیلی۔ یہ اتنی مہلک وبا تھی کہ اس سے ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ملی تو فوراً اس کی روک تھام کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ جن مقامات پر اس کی تباہی کے اثرات تھے وہاں خود جاکر حالات کا معائنہ کیا اور اس وبا سے حفاظت کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ حضرت عمرؓ نے ملکی انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے شام کا سفر کیا اور بیشتر شہروں میں چند دن قیام کر کے انتظامات کی دیکھ بھال کی۔ فوجوں کی تنخواہیں اور وبا میں ہلاک ہونے والوں کے وارثین کے درمیان وراثت تقسیم کی گئی۔ نیز خالی عہدوں پر نئی تقرریاں کی گئیں اور سرحد کو محفوظ بنانے کے لیے چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔

14.13.1 طرز حکومت:

اسلامی تاریخ میں حضرت عمرؓ کی شخصیت سیاسی بصیرت اور فہم وفراست کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اسلام سے پہلے عرب، ایران اور روم کی طاقت وقوت سے بہت خوف زدہ رہتے تھے، مگر اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے خلیفہ ثانی کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی تو قیصر وکسریٰ بھی اسلامی سلطنت کا محض ایک حصہ ہو کر رہ گئے۔ حضور ﷺ نے اپنے عہد میں اسلام کی تبلیغ واشاعت پر زور دیا۔ ان کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، جس میں منافقین اور اسلام سے پھرے ہوئے لوگوں سے نپٹنے کے بعد بیرون عرب مہمات کا آغاز ہوا اور اسلام کا دائرہ بڑھنے لگا۔ لیکن اس وقت تک کوئی بہت بڑی کامیابی نہیں ملی تھی اور نہ ہی کوئی واضح نظام وجود میں آیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دس سالہ دور

حکومت میں اسلام کا دائرہ وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ نظام حکومت کے قیام پر توجہ دی، مختلف شعبے قائم کیے اور ایک آئیڈیل طرز حکومت کی بنیاد ڈالی۔

حضرت عمرؓ کا دور خلافت سیاسی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا کے تمام مورخین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں شخصی اور بادشاہی نظام قائم تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے برخلاف حکومت کو عوام سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انھوں نے مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں لایا، جس میں انصار و مہاجرین کے مختلف قبیلوں کے نمائندے شامل تھے۔ جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا، مسجد میں جمع ہونے کے لیے اعلان کر دیا جاتا، اور مسائل زیر بحث لائے جاتے۔ حضرت عمر اس بات کے قائل تھے کہ بغیر مشورے کے خلافت کا وجود نہیں ہے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عوام کو بھی اجازت تھی کہ وہ کسی بھی اہم مسئلے کی جانب توجہ دلانے میں تامل نہ کریں اور انتظامی امور کو بہتر بنانے کے لیے اپنے مفید مشورے بھی دیں۔ کوفہ، بصرہ اور شام میں جب خراج وصول کرنے کے لیے حاکم بنانے کی بات آئی تو حضرت عمر نے وہاں کی عوام کو اس کا اختیار دیا کہ وہ خود اپنے درمیان سے کسی قابل اور دیانت دار شخص کو منتخب کر لیں۔ اسی طرح اہل کوفہ کی شکایت پر وہاں کے گورنر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ان کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔

اسلامی سلطنت کا دائرہ جوں جوں بڑھتا گیا انتظامی امور کے مختلف شعبے قائم ہوتے گئے۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ علاقوں کو مختلف صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک کے انتظامات کے لیے بہت سے عہدے ترتیب دیئے تاکہ ملکی نظام کو بہتر کیا جا سکے۔ مثلاً والی یا حاکم، قاضی، پولیس آفیسر، کلکٹر اور میر منشی وغیرہ کے عہدے حضرت عمر نے اپنے زمانے میں ہی قائم کر دیئے۔ ان سب عہدوں پر قابل اور باصلاحیت لوگوں کو مامور کیا۔ البتہ اس سلسلہ میں لوگوں کی رایوں کا بھی مکمل خیال رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے تمام عہدوں پر منتخب لوگوں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں اور خدمت کے عوض میں پیسے دینے کا رواج قائم کیا۔ ساتھ ہی اس اہتمام سے تقرری ہوتی تھی کہ باقاعدہ مرکز سے فرمان جاری ہوتا، جس میں عہدہ، فرائض اور اختیارات کا تفصیلی ذکر ہوتا اور جس کا جہاں تقرر ہوتا وہ پورا فرمان پڑھ کر مجمع کو سناتا۔ تاکہ لوگ ان دائرہ کار سے آگاہ ہو سکیں اور روگردانی کی صورت میں اس سے باز پرس کر سکیں۔

حضرت عمرؓ نے بار بار اپنے خطاب میں حاکموں کو نصیحت کی اور ان کے فرائض و حدود یاد دلایا۔ انھیں عوام پر حکومت کرنے کے بجائے خدمت کرنے کے لیے کہا۔ حلف لیتے وقت عیش و آرام کی زندگی سے خاص طور پر علاحدہ رہنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ترکی گھوڑے پر سوار ہونا، باریک کپڑے پہننا، چھنا ہوا آٹا کھانا اور دروازہ پر دربان رکھنا تعیش کی زندگی میں شمار ہوتا تھا، اس لیے ان باتوں سے دور رہنے کے لیے ہر عامل کو حلف دلایا جاتا تھا۔ عاملوں کی بدعنوانی سے باخبر رہنے کے لیے تقرری کے وقت ان کی جائداد اور مال و اسباب کی فہرست بنالی جاتی اور جب اس عہدہ سے علاحدگی ہوتی تو فہرست میں موجود جائیداد اور مال و اسباب سے زائد چیزوں کی چھان بین کی جاتی تھی۔ جب کسی پر بدعنوانی کا الزام ثابت ہو جاتا تو اس کے مال سے آدھا حصہ لے کر بیت المال میں جمع کر دیا جاتا۔ حج کے موقع پر تمام حاکموں اور عاملوں کو جمع ہونے کا حکم تھا۔ یہاں سبھی لوگ جمع ہوتے اور ان کی شکایتیں سنی جاتیں اور ان کا حل کیا جاتا۔ اگر کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت آتی یا اس پر کوئی الزام لگایا جاتا تو پہلے اس کی تحقیق کی جاتی۔ اور اگر الزام ثابت ہو جاتا تو فوراً اسے سزا دی جاتی اور عہدے سے برطرف کر دیا جاتا۔ بیمار کی عیادت کرنا، کمزوروں کی مدد کرنا اور عیش و آرام کی زندگی سے بچنا خاص ہدایت میں شامل تھی۔

حضرت عمرؓ نے ہی خراج وصول کرنے کا نظام رائج کیا۔ تاکہ معاشی نظام کو بہتر اور مضبوط کیا جا سکے۔ کاشت کاری اور زراعت کی ترقی پر بھی انھوں نے خاص توجہ دی۔ زراعت کی سیرابی اور پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے محکمہ آب پاشی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بصرہ میں نہر ابی موسیٰ، نہر

معقل جسے دجلہ سے کاٹ کر نکالا گیا تھا، نہر سعد اور نہر امیر المومنین 18 ہجری میں کھودی گئی۔ جب عرب میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ کے حکم پر یہ نہر کھودی گئی جس سے عرب کو سیرابی ملی۔ یہ سب اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے محکمہ قضا قائم کیا۔ اب تک اس کے لیے کوئی علاحدہ شعبہ نہیں تھا۔ پھر اس کے لیے قاضیوں کے انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جاتا، اور انہیں سخت امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ قاضیوں کو رشوت سے بچانے کے لیے انہیں اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ لوگوں کو مسائل شرعیہ سے آگاہ کرانے اور ان کے مذہبی مسائل حل کرنے کے لیے محکمہ افتاء کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس محکمہ میں باقاعدہ حکومتی سطح پر مفتیوں کی تقرری کی جاتی تھی۔ جیل خانہ کا رواج حضرت عمر نے شروع کیا۔ ان سے پہلے عرب میں اس کا تصور نہیں تھا۔ حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے لیے جلاوطنی کی سزا کا آغاز بھی حضرت عمر نے ہی کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو بھی مال غنیمت آتا اسے ضرورت مندوں اور حق داروں میں فوراً تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ مگر جب حضرت عمرؓ کا دور آیا تو انھوں نے باقاعدہ بیت المال قائم کیا تاکہ معاشی نظام کو مضبوط و مستحکم کیا جا سکے۔

حضرت عمرؓ نے ملک کی حفاظت کے لیے فوجی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور ہر مسلمان کو ایک فوجی کی حیثیت سے تیار کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے مختلف جگہوں کو فوجی مراکز بنا کر ٹریننگ شروع کی گئی۔ گھوڑوں کی پیدائش اور افزائش، فوج کا دفتر، غلہ کی پیداوار میں اضافہ، فوجی چھاؤنیاں، تنخواہوں میں ترقی، خوراک کا بہتر انتظام، آب ہوا اور موسم کے لحاظ سے فوجوں کی تقسیم، پرچہ نویسوں اور کاتبوں کا انتظام، تیز رفتار قاصد کا اہتمام اور ذرائع نقل و حمل میں تیزی کے ساتھ ساتھ ایک بہتر سماج اور زندگی کے لیے تمام امکانات کو بروئے کار لایا گیا۔ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مکاتب کا قیام عمل میں آیا اور تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے اساتذہ کی تقرری تنخواہوں کے ساتھ کی گئی۔

حضرت عمر نے مساجد کے لیے اماموں اور موذنوں کا باقاعدہ تقرر کیا۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی توسیع بھی ان کی خدمات میں شامل ہیں۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان چوکیاں اور چشمے قائم کیے اور شہروں کی آبادکاری پر توجہ دی۔ انھوں نے ہجری کیلنڈر کا باضابطہ اور منظّم طریقہ رائج کیا۔ غلاموں کے قوانین میں نرمی پیدا کی شراب کے قوانین میں سختی برتی۔ ذمیوں کی حفاظت کو یقینی بنایا۔ حضرت عمر نے جنگی اصول تیار کیے اور فاتح قوم کے لیے خصوصی ہدایات بھی جاری کیں۔ فتح کے بعد قتل عام کی ممانعت قرار دی گئی۔ جنگ کے دوران بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو ہاتھ لگانے سے روکا گیا۔ اس کے علاوہ جانوروں کو مارنا اور درختوں کو کاٹنا سخت ممنوع قرار دیا گیا۔

14.13.2 عدل و انصاف:

حضرت عمرؓ عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ بہت معمولی قسم کی بے انصافی بھی وہ ہرگز نہیں فرماتے تھے۔ بیت المال کو وہ عوام کا مال سمجھتے تھے اور اس میں ذرہ برابر بھی خیانت برداشت نہیں کرتے تھے۔ کسی بھی حکومت کے لیے عوام وخواص اور حاکم و رعایا کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے برابری کا قیام و بقاء، اور قانون اور مواقع کا سب کے لیے یکساں طور پر میسر ہونا سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ اس لحاظ انتہائی کامیاب دور تھا۔ آپؓ نے کئی موقعوں پر عوام سے بہت واضح انداز میں اپنے حقوق کے مطالبے کی بات کہی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میں حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کروں تو عہدۂ خلافت سے اتار دینا۔ خلافت کا معاشی نظام بیت المال پر منحصر تھا اور بیت المال خلیفہ کے اختیار میں۔ مگر اس کے باوجود آپؓ نے اپنی ذات پر صرف اتنا ہی لیا، جو زندگی گذارنے کے لیے کافی ہو۔ لوگوں کے حقوق کا متعدد مرتبہ ذکر کیا اور لوگوں سے مواخذہ کرنے کی بھی بار بار درخواست کی، مال غنیمت کا نہ تو بیجا اسراف کیا اور نہ ہی لوگوں کے حقوق مار کر جمع خوری کی۔ کبھی کسی غیر

کے خلاف بھی ناانصافی کا کوئی فیصلہ نہیں دیا اور نہ ہی اپنوں کے حق میں کسی غلطی کو روا رکھا۔اس کی ایک اہم مثال حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی بھی ہے۔حضرت خالدؓ اس وقت کے عظیم سپہ سالار تھے۔ان کو صرف اس بنیاد پر ان کے عہدہ سے برطرف کر دیا کہ وہ آمدنی اور اخراجات کے حسابات خلیفہ کو نہیں بھیجتے تھے۔ یہ بات حضرت عمرؓ کو پسند نہیں تھی۔اس لیے انھوں نے حساب بھیجنے کی تاکید کی، لیکن جب حضرت خالدؓ نے نہ بھیجے تو انہیں سپہ سالار کے عہدہ سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہؓ کے ماتحت کر دیا۔

حضرت عمرؓ انتہائی بارعب اور صاحب جاہ وجلال شخص تھے۔اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے اپنی معزولی کے بعد جب تقریر کی تو کہا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ملک شام کی فتح سے پہلے مجھے وہاں کا افسر بنایا اور جب میں نے شام فتح کر لیا تو مجھے معزول کر دیا۔اس جملے پر ایک سپاہی نے کہا: ایسی باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔حضرت خالد نے فوراً جواب دیا: عمر کے ہوتے ہوئے کسی فتنہ کی کوئی گنجائش نہیں۔حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کے حقوق پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ چنانچہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو اہل ذمہ کے حقوق کا خیال رکھنے کی خصوصی تلقین کی اور کہا کہ خلیفہ وقت کو چاہیے کہ انہیں تکلیف میں نہ ڈالے اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کو لازمی سمجھے۔

14.14 سادگی

حضرت عمرؓ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ امیر المومنین بننے کے بعد بھی نہایت عام اور سادہ لباس میں رہتے تھے۔ بیت المقدس کے معاہدہ کے وقت مسلمانوں نے کسی قدر بہتر کپڑے پیش کیے، لیکن حضرت عمر نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا خدا نے جو اسلام کی عزت دی ہے وہی کافی ہے، کسی ظاہری لباس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وبا کے دنوں میں حضرت عمرؓ جب ملک شام گئے تو اس سفر کے دوران ان کا کرتا پھٹ گیا۔اس کی مرمت کے لیے ایلہ کے پادری کو دیا گیا۔اس نے پرانے کرتے پر پیوند لگانے کے ساتھ ساتھ ایک نیا کرتا بھی تیار کر کے حضرت عمر کو پیش کیا۔تاہم انھوں نے اپنا پرانا کرتا پہن لیا اور نئے کی جانب توجہ نہیں دی۔مسلمانوں کے خلیفہ بننے کے بعد ایک بار اس میدان سے حضرت عمرؓ کا گزر ہوا جہاں وہ اونٹ چرایا کرتے تھے اور جب تھک کر آرام کرنے لگتے تو ان کے والد مارا کرتے تھے۔اس وقت کو یاد کر کے حضرت عمر فرماتے ہیں'' آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں''۔

عام طور پر جب لوگ تخت وتاج کے مالک ہوتے ہیں تو ان میں بادشاہت آجاتی ہے اور رعایا کی ساری ضروریات پر اپنے عیش وآرام کو ترجیح دیتے ہیں۔حضرت عمرؓ کا دور اسلامی سلطنت کا بہت خوش حال دور رہا ہے اور وہ پوری سلطنت کے مختار کل تھے۔مگر اس کے باوجود ان کی پوری زندگی انتہائی سادگی میں گزری۔انھوں نے خود کو کبھی حکمراں یا بادشاہ نہیں سمجھا، بلکہ اسلام کے خادم کی حیثیت سے انھوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔انھوں نے اپنی ذاتی زندگی پر اتنا ہی خرچ روا رکھا جتنا ایک عام انسان کے جینے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

امیر المومنین کا یہ عالم تھا کہ عام لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مدینہ کے بازاروں میں گشت کیا کرتے تھے اور حاجت مندوں کی حاجت پوری کرتے تھے۔ان کے حدود سلطنت میں ہر شخص کو امیر المومنین سے حساب مانگنے کی اجازت تھی۔ بہت مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ لوگوں میں کپڑے تقسیم ہوئے اور سب کو ایک ایک حصہ ملا۔حضرت عمرؓ چونکہ طویل القامت تھے اس لیے ان کے لیے ایک کپڑا کافی نہیں ہوا، ان کے صاحبزادے عبداللہ نے اپنا حصہ اپنے والد کو دے دیا، لیکن یہ بات عوام کو نہیں معلوم تھی۔ چنانچہ جب ان کے پاس دو حصے دیکھے گئے تو ایک شخص فوراً سوال کر دیا کہ آپ کے پاس دو حصے کہاں سے آئے۔حضرت عمر نے خوشی خوشی اس کا جواب دیا اور انہیں کسی قسم کی ناراضگی بھی نہیں ہوئی۔آپ نے زندگی میں سادگی کو اپنا زیور بنا لیا تھا اور اسی میں ان کو آرام ملتا تھا۔غرض کہ حضرت عمرؓ نے دنیا کی تمام نعمتوں کی حصولیابی کے باوجود نہایت ہی سادگی

سے زندگی بسر کی۔

14.15 وفات

حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ بھی بہت عجیب ہے۔ انتہائی معمولی بات پر ایک پارسی غلام نے دنیا کو فتح کرنے والے امیر المومنین پر حملہ کر دیا، جس کے زخموں کی تاب نہ لا کر بالآخر مالک حقیقی سے جا ملے۔ دراصل عرب میں رواج تھا کہ غلاموں کی کمائی پر آقا محصول یعنی ٹیکس وصول کرتا تھا۔ فیروز ایک پارسی غلام تھا۔ جس کا آقا مغیرہ بن شعبہ نے اس پر روزانہ دو درہم کا ٹیکس لگا رکھا تھا۔ اس نے اپنا ٹیکس کم کرانے کے لیے امیر المومنین کی بارگاہ میں درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا پیشہ جاننے کے بعد فرمایا: تمہاری آمدنی کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں ہے۔ بس اسی بات کے لیے وہ حضرت عمرؓ سے بدلہ لینے کا ٹھان لیا، چنانچہ حضرت عمرؓ جب نماز میں امامت فرما رہے تھے، اس نے آپؓ پر پے در پے کئی حملے کر دیئے۔ حضرت عمرؓ زخموں کی تاب نہ لا کر گر گئے اور ان کی جگہ عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز مکمل کرائی۔ نماز کے بعد انہیں گھر لے جایا گیا۔ گھر میں انہوں نے اپنے قاتل کے بارے میں پوچھا، اور جب یہ معلوم ہوا کہ آپؓ پر حملہ کرنے والا شخص کوئی مسلمان نہیں تھا تو آپؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر طبیب بلایا گیا اور علاج کے ذریعے زخم بھرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر زخم اتنا گہرا تھا کہ بچنے کی امید ختم ہوگئی۔ اب مسئلہ آیا ولی عہدی اور جانشینی کا۔ چونکہ حضرت عمرؓ کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن کیے جائیں، لیکن چونکہ آنحضور ﷺ کے ایک پہلو حضرت صدیق اکبر مدفون تھے اور دوسرے پہلو کی جگہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا، لہٰذا اس آخری وقت میں حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہؓ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں آنحضور ﷺ کے پہلو میں دفن کیے جانے کی اجازت دے دیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جانشین مقرر کرنے کا تھا۔ صحابہ چاہتے تھے کہ خلیفہ کا مسئلہ حضرت عمرؓ حل کر جائیں تا کہ اس میں کوئی نزاع باقی نہ رہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس پر غور کیا تھا، تاہم انہیں کوئی واضح اور مناسب شخصیت نظر نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک نام پر انھوں نے مہر نہیں لگائی۔ بلکہ انہوں نے چھ افراد علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور کہا کہ کثرت رائے سے انہی میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے، اس کمیٹی میں اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھی شامل کر دیا، لیکن ان کے متعلق یہ وضاحت کر دی کہ ان کو بطور خلیفہ منتخب نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد آپؓ نے منتخب ہونے والے خلیفہ کے لیے بعض نصیحتیں اور وصیتیں فرمائیں، پھر اپنے قرض کی ادائیگی پر توجہ دی۔ ان سب کاموں سے فراغت پانے کے بعد 26 ذوالحجہ سنہ 23 ہجری، 6 نومبر 644ء کو مدینہ منورہ میں اس عظیم فاتح کا انتقال ہوگیا۔

14.16 فضائل وکمالات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام دینی و دنیاوی اوصاف و کمالات کے جامع تھے۔ دنیاوی معاملات کے ماہر اور سیاسی امور میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ زہد و تقوی اور روحانیت میں پیشوا تھے۔ عدل و انصاف کے ایسے پیکر تھے کہ اعلی اور ادنی، امیر اور غریب، اور بادشاہ اور رعایا میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ اسی بنیاد پر انہیں فاروق کا خطاب ملا یعنی حق و باطل کے مابین فرق کرنے والا۔

حضرت عمرؓ کی شخصیت میں بے شمار صلاحیتیں یکجا تھیں۔ زمانہ جاہلیت میں شجاعت و بہادری اور عقل و دانائی کی وجہ سے عرب میں معزز شمار ہوتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد انہیں رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہوا اور تمام معاملات میں ان کی رائے کو اہمیت دی گئی۔ بعض دفعہ ان کی رائے کی تائید اور توثیق میں بعض آیتیں بھی نازل ہوئی جن کے ذریعہ گویا انہیں تائید غیبی حاصل ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کے بارے میں فرمایا

کہ اللہ نے عمر کی زبان اور قلب کو صداقت کا مصدر بنایا ہے۔

حضرت عمرؓ دنیا کے عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ صدق وصفا کے پیکر بھی تھے، جود وسخا کے مظہر بھی تھے اور اخلاق اقدار میں برتر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مورخین، مفکرین اور سیاست دانوں نے ان کے فضائل وکمالات اور حیات وخدمات کے سامنے سرِتسلیم خم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دور خلافت میں جسمانی طور پر کسی بھی جنگ میں شرکت نہیں کی، تاہم ہر جنگ کا نقشہ خود تیار کرتے اور تمام پیش قدمی پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ہدایات جاری کرتے رہتے تھے۔ مدینہ میں رہ کر دور دراز ملکوں میں جاری جنگوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دنیا کے پہلے سپہ سالار تھے جو میدان جنگ سے باہر رہ کر فوجوں کو لڑاتے اور فتح وظفر سے ہم کنار کراتے تھے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ الہامی شخصیت کے مالک تھے۔

فاروقی عہد میں جتنی بھی فتوحات ہوئیں ان میں حضرت عمرؓ کی سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ امداد غیبی بھی انہیں برابر حاصل رہیں۔ چونکہ ہر جنگ کے لیے فوج روانہ کرتے وقت ظلم وزیادتی سے بچنے، عفو ودرگزر کو اپنانے اور اللہ پر کامل یقین رکھنے کی نصیحت فرماتے۔ جنگ قادسیہ میں جب مجاہدین کے سامنے دریائے دجلہ حائل ہوا تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے دریا کو حضرت عمرؓ کا واسطہ دیا اور اللہ کا نام لے کر دریا میں پوری فوج کے ساتھ اتر گئے۔ اللہ نے ان کی پکار سن لی اور دریا سے پورا لشکر صحیح سلامت گزر گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اہل فارس حیرت زدہ ہو گئے اور مسلمانوں نے فتح حاصل کی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مصر فتح ہو گیا تو دریائے نیل کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر سال خشک ہو جاتا اور جب اس میں ایک نوجوان لڑکی کی قربانی دی جاتی تب اس میں پانی آتا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص جب وہاں کے والی مقرر ہوئے تو انھوں نے اس معاملے کی جانکاری حضرت عمرؓ کو دی۔ حضرت عمر نے دریائے نیل کے نام ایک خط لکھا کہ 'اگر تو اپنی مرضی سے چلتا ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں اور اگر خدا کے حکم سے چلتا ہے تو خدا تجھے جاری رکھے گا' اور اس خط کو دریائے نیل میں ڈالنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خط کے ڈالتے ہی دریا جاری ہو گیا بلکہ پہلے سے زیادہ پانی اس میں آ گیا۔ چنانچہ ہر موقع پر اللہ نے ان کی غیبی امداد کی اور حضرت عمر نے بھی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری میں گزار دی۔

14.17 اکتسابی نتائج

- حضرت عمرؓ کا تعلق قبیلہ ''بنی عدی'' سے تھا۔ اور آپؓ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں آنحضور ﷺ سے جا ملتا ہے۔
- عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ کے برابر تھا، لیکن حضرت عمرؓ پڑھنے لکھنے کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔
- حضرت عمرؓ کی قبولیت اسلام کے بعد مسلمان اعلانیہ طور پر فرائض کی ادائیگی کے ساتھ خانہ کعبہ میں بھی نمازیں ادا کرنے لگے تھے۔
- حضرت عمرؓ دوسرے خلیفہ راشد ہیں۔ ان کی مدت خلافت دس سال اور چند مہینے ہے۔
- 18 ہجری میں عمواس کی وبا پھیلی تھی جس سے مسلمانوں کو کافی جانی ومالی نقصان پہنچا تھا۔
- حضرت عمرؓ کے عہد وقت کے سپر پاور روم اور ایران کو شکست دیا گیا اور وہ مملکت اسلامی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔
- انتظامی امور کے پیش نظر بعض اقدامات حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پہلی مرتبہ ہوئے، انہیں اولیات عمرؓ کہا جاتا ہے، مثلاً مختلف عہدوں اور مناصب پر مامور افراد کے لیے تنخواہیں مقرر کی گئیں، مکاتب، بیت المال، محکمہ قضاء، جیل خانوں کا قیام، ہجری کیلنڈر کا آغاز وغیرہ۔
- بیت المقدس کے معاہدہ کے لیے حضرت عمرؓ خود تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت مدینہ میں اپنا نائب حضرت علیؓ کو بنایا تھا۔

14.18 نمونہ امتحانی سوالات

14.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت عمر کو کون سا خطاب ملا تھا؟

a. صدیق b. غنی c. شجاع d. فاروقؓ

2. حضرت عمرؓ نے سپہ سالاری سے کسے معزول کیا تھا؟

a. حضرت علیؓ b. حضرت خالدؓ c. حضرت اسامہؓ d. حضرت ابوعبیدہؓ

3. ہجری کیلنڈر کا آغاز کس کے عہد خلافت میں ہوا تھا؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. حضرت علیؓ

4. حضرت عمر کی مدت خلافت کتنی ہے؟

a. بارہ سال b. آٹھ سال c. دس سال d. نوسال

5. حضرت عمر کی وفات کب ہوئی؟

a. 25 صفر، 25 ہجری b. 16 رمضان، 23 ہجری c. 26 ذوالحجہ، 23 ہجری d. 27 محرم، 22 ہجری

14.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت عمر کا سلسلہ نسب بتائیے؟
2. حضرت عمر کی رسول اللہ سے محبت اور قرابت کا ذکر کیجیے؟
3. حضرت عمر کا اسلام لانے کا واقعہ بیان کیجیے؟
4. حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کیوں معزول کیا گیا؟
5. مجلس شوری کیوں قائم کی گئی؟

14.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. قبل اسلام حضرت عمر کی شجاعت وبہادری اوران کی شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالیے؟
2. حضرت عمر کے دور خلافت میں فتوحات کا جائزہ لیں؟
3. حضرت عمر کے نظام حکومت پر مفصل نوٹ لکھیں؟

14.19 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. الفاروق : مولانا شبلی نعمانی
2. سیدنا حضرت عمر فاروق : محمد حسین ہیکل (ترجمہ حبیب اشعر)
3. تاریخ اسلام : شاہ معین الدین ندوی
4. خلفائے راشدین : شاہ معین الدین ندوی

-:oOo:-

اکائی 15 : حضرت عثمان بن عفانؓ : حیات اور کارنامے

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقصد
15.2 حضرت عثمانؓ کی ابتدائی زندگی (پیدائش تا قبولیت اسلام)
15.2.1 خاندان اور نام ونسب
15.2.2 پیدائش اور زمانہ جاہلیت کی زندگی
15.3 قبولیت اسلام کے بعد کی زندگی (قبولیت اسلام تا عہد خلافت)
15.3.1 قبول اسلام
15.3.2 نکاح
15.3.3 اذیت رسانی
15.3.4 ہجرت حبشہ
15.3.5 ہجرت مدینہ
15.3.6 مدنی زندگی
15.3.7 حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح
15.3.8 بیعت رضوان
15.3.9 عہد خلافت صدیقی میں
15.3.10 عہد خلافت فاروقی میں
15.4 عہد خلافت عثمانی
15.4.1 بطور خلیفہ انتخاب
15.4.2 فتوحات خلافت عثمانی اور اسلامی مملکت کی توسیع
15.4.2.1 بری فتوحات
15.4.2.2 بحری فتوحات
15.4.3 عہد خلافت عثمانی میں شورش کے اسباب وعوامل اور خلیفہ سوم کی شہادت
15.4.3.1 عہد خلافت عثمانی میں شورش کے اسباب وعوامل

15.4.3.2 خلیفہ سوم کی شہادت
15.5 حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ذاتی حالات وصفات اور علم وفضل
15.5.1 ذاتی حالات وصفات
15.5.2 علم وفضل
15.6 عہد خلافت عثمانی کا نظام حکومت
15.7 عہد خلافت عثمانی کی علمی وتمدنی سرگرمیاں
15.7.1 تدوین قرآن
15.7.2 عہد خلافت عثمانی کے تمدنی ورفاہی کارنامے
15.8 عہد خلافت عثمانی کا معاشرہ
15.9 اکتسابی نتائج
15.10 نمونہ امتحانی سوالات
15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید

اس اکائی میں اسلام کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی زمانہ جاہلیت کی زندگی اور آپ کی قبولیت اسلام کے بعد کی زندگی پر روشنی ڈالی جائے گی اور ان کے عہد خلافت کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے گا۔

15.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیات وخدمات سے واقف ہوسکیں گے۔ان کے عہد خلافت میں ہونے والی فتوحات اور دیگر کارناموں سے آگاہ ہوسکیں گے اور اس عہد کی علمی ودینی سرگرمیوں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد میں پروان چڑھنے والے فتنہ اور اس کے نتیجہ میں خلیفۂ سوم کی شہادت کے بارے میں بھی جان سکیں گے۔

15.2 حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ابتدائی زندگی (پیدائش تا قبولیت اسلام)

15.2.1 خاندان اور نام ونسب:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی ایک اہم شاخ بنوامیہ سے تھا۔قریش کی مختلف شاخوں میں بنوامیہ اور بنو ہاشم کے خانوادے تقریباً ایک درجہ میں شمار کیے جاتے ہیں اور عزت وشرف میں ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دیئے جاتے ہیں، تاہم بنو ہاشم سے آپ ﷺ

کے تعلق کی وجہ سے 'ہاشمی خاندان' کا درجہ بلند و بالا ہو جاتا ہے۔ بنوامیہ کی سیادت و قیادت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قریش کا قومی علم ''عقاب'' انھیں کی تحویل میں رہتا تھا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں جا کر آپ ﷺ سے مل جاتا ہے۔ اسے صرف ایک اتفاق ہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ والد اور والدہ دونوں کی ہی جانب سے ان کا نسب آپ ﷺ سے پانچویں پشت میں جا کر عبد مناف سے مل جاتا ہے۔

والد کی جانب سے سلسلۂ نسب یہ ہے: عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔

والدہ کی جانب سے سلسلۂ نسب یہ ہے: اَرُ ویٰ بنت کُرَ یز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف۔

حضرت عثمانؓ کی نانی ام حکیم البیضاء بنت عبد المطلب آپ ﷺ کی پھوپھی اور اور آپ ﷺ کے والد ماجد عبد اللہ کی جڑواں بہن تھیں۔

خلیفۂ سوم کا نام عثمان اور کنیت ابو عبد اللہ اور ابو عمرو تھی۔ وہ 'غنی' اور 'ذوالنورین' کے القاب سے ملقب کیے جاتے تھے۔ پہلا لقب ان کے بہت زیادہ مالدار ہونے پر شاہد ہے، تو دوسرے لقب سے آپ ﷺ کی دو بیٹیوں سے نکاح کرنے کی وجہ سے ملقب کیا گیا۔ ان کا ایک لقب ''جامع القرآن'' بھی تھا۔ یہ لقب اس لیے دیا گیا کہ انہوں نے پوری امت کو ایک قرآن پڑھنے پر جمع کیا تھا۔

15.2.2 پیدائش اور زمانہ جاہلیت کی زندگی:

ان کی پیدائش عام الفیل کے واقعہ کے چھ سال بعد 576ء میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے وہ عمر میں آپ ﷺ سے چھ سال چھوٹے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے ابتدائی حالات دیگر صحابۂ کرام کی طرح پردۂ غیب میں ہیں۔ عہد جاہلیت کے مصادر میں ان سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زمانہ جاہلیت کے ان چند افراد میں شامل تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اعلی اخلاق و کردار کے مالک ہونے کی وجہ سے قریش میں بڑی عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ پورے قبیلہ کی آنکھوں کے تارا تھے۔ چنانچہ قبیلۂ قریش کی ان سے محبت ضرب المثل بن گئی تھی، لہٰذا کہا جاتا تھا کہ 'بخدا میں تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی محبت قریش کے لوگ عثمان سے کرتے ہیں'۔

زمانہ جاہلیت میں ان کا شمار کامیاب و معزز تاجرین میں ہوتا تھا۔ وہ ربیعہ بن حارث نامی شخص کے ساتھ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، جس میں انہوں نے کافی مال و دولت کمایا تھا، اور قریش کے مالدار ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی اسی مالداری کی وجہ سے ان کا لقب 'غنی' پڑ گیا تھا۔

وہ زمانۂ جاہلیت کی تمام سماجی برائیوں اور خرافات سے پاک اور دور رہنے والے تھے، لہٰذا مصادر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ شراب نوشی اور زنا میں کبھی ملوث نہیں ہوئے، اور نہ ہی انہیں گانے بجانے اور لہو و لعب میں کوئی دلچسپی تھی۔ حالانکہ یہ تمام برائیاں زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ عام تھیں اور عربوں کی گھٹی میں شامل تھیں، اور ان میں شریک ہونے کو برا بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

15.3 قبولیت اسلام کے بعد کی زندگی (قبولیت اسلام تا عہد خلافت)

15.3.1 قبول اسلام:

حضرت عثمانؓ ایک نیک طینت اور سلیم فطرت شخص تھے، لہٰذا جب آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت دینے کا آغاز کیا، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر انھوں نے فوراً ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اسلام لانے والے چوتھے مرد تھے۔ ان سے پہلے حضرت ابو بکر، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا تھا۔

15.3.2 نکاح:

اسلام قبول کرنے کے بعد آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا یہ دوسرا نکاح تھا۔ ان کا پہلا نکاح آپ ﷺ کے چچا ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا تھا، لیکن اسلام دشمنی کے نتیجہ میں ابولہب نے بیٹے پر دباؤ ڈال کر طلاق دلوا تھی۔ ان کا یہ نکاح اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ حضرت عثمان اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہما جیسا بہترین جوڑا کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی یہ دوسرا نکاح تھا۔ چنانچہ ان کی پہلی بیوی سے ہوئی ان کی اولاد کی جانب نسبت کرتے ہوئے ان کی پہلی کنیت ابو عمرو تھی۔

15.3.3 اذیت رسانی:

کفار مکہ اسلام لانے والوں کے سخت خلاف تھے، لہٰذا وہ ہر اسلام قبول کرنے والے شخص کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتے تھے اور اس بات کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے کہ اسلام لانے سے قبل ان کے معاشرہ میں اس کی کیا حیثیت ومنزلت تھی۔ لہٰذا قریش کی آنکھوں کا تارا ہونے باوجود انہیں طرح طرح سے پریشان کیا گیا اور شدید ایذائیں دی گئیں، حتی کہ رسیوں سے باندھ کر مارا پیٹا گیا۔ لیکن وہ اسلام سے منھ پھیر لینے کے لیے کسی بھی حال تیار نہیں ہوئے۔ یہ سختیاں کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ان کے سگے چچا حکم بن ابی العاص تھے۔ ایک طرف چچا کا ظلم وستم جاری تھا تو دوسری طرف ماں جیسی عظیم ہستی بھی ان سے خفا ہو کر یہ کہتے ہوئے میکے سدھار گئیں کہ جب تک وہ اسلام کا دامن نہیں چھوڑیں گے وہ واپس نہیں آئیں گی۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پائے ثبات میں کسی قسم کی لغزش نہ پیدا ہو سکی، اور تھک ہار کر سب نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم وستم سے عاجز آ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، اور حبشہ کی طرف اپنی فیملی کے ساتھ کوچ کر گئے۔

15.3.4 ہجرت حبشہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار ان چند صحابہ کرام میں ہوتا ہے، جنھیں بعض معاملات میں اولیت کا شرف حاصل ہے، جیسے ان کا شمار ''السابقون الاولون''میں ہوتا ہے۔ انھیں کی خاطر ''بیعت رضوان'' کی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام کی تاریخ میں کی جانے والی پہلی ہجرت ''ہجرت حبشہ'' کے قافلہ میں شامل افراد میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ہجرت آنحضور ﷺ کے ایماء پر کی گئی تھی۔ اس ہجرت میں ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ حبشہ کے قیام کے دوران ہی ان کے بیٹے حضرت عبداللہ کی پیدائش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کی کنیت ابو عبداللہ پڑ گئی تھی۔

حضرت عثمان اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہما حبشہ میں چند سال مقیم رہے حتی کہ ان تک یہ خبر پہنچی کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا، لہٰذا مہاجرین حبشہ مکہ لوٹ آئیں۔ لیکن مکہ مکرمہ آنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ خبر جھوٹی تھی، چنانچہ بہت سے مہاجرین حبشہ دوبارہ حبشہ لوٹ گئے، لیکن حضرت عثمان اپنی بیوی رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ میں ہی رک گئے۔

15.3.5 ہجرت مدینہ:

انھوں نے دوسری ہجرت مدینہ کی جانب کی تھی۔ یہ مکہ سے مدینہ کی جانب عمومی ہجرت تھی اور اس میں زیادہ تر مسلمانان مکہ شامل تھے۔ آپ ﷺ نے مختلف گروہ میں مسلمانان مکہ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا وہ آپ ﷺ سے پہلے اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ کوچ کر گئے تھے۔ مدینہ میں ان کی مواخاۃ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھائی اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم کی گئی تھی۔ اس مناسبت سے

دونوں گھرانوں میں بہت زیادہ انسیت اور محبت ہوگئی تھی۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس نسبت کا تاحیات پاس رکھا اور جب ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو ایک دردناک مرثیہ کہا تھا۔

15.3.6 مدنی زندگی:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے اسلامی کارناموں کا اصل میدان ان کی مدنی زندگی ہے۔انھوں نے اسلام کی مدد میں دامے، درمے، سخنے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔خاص طور سے انہوں نے اپنے مال و دولت کے ذریعہ جو اسلام کی خدمت انجام دی تھی اس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا ہے۔ان کی مالی اعانت سے خوش ہو کر آپ ﷺ نے انہیں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی اور ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ اب وہ کوئی بھی گناہ کریں ان سے باز پرس نہیں ہوگی۔

ان کی مالی اعانت کی فہرست کافی طویل ہے جس میں 'بئر رومہ' کو خرید کر وقف کرنا، غزوہ تبوک کے موقعہ پر زبردست مالی تعاون کرنا، مسجد نبوی کی توسیع کے لیے زمین خریدنا وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے دیگر رفاہی کام بھی کیے تھے جیسے کئی ایک کنویں کھودوانا وغیرہ۔ان کے اس طرز عمل سے مدینہ میں پائی جانے والی پانی کی قلت کافی حد تک دور ہوگئی تھی۔

مالی اعانت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اکثر غزوات میں حصہ لیا تھا اور بعض غزوات جیسے غزوۂ ذات الرقاع اور غزوۂ بنو غطفان میں آپ ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے مدینہ میں ہی مقیم رہے تھے۔غزوۂ بدر کے وقت حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت علیل تھیں لہٰذا آپ ﷺ نے انہیں ان کی تیمارداری کے لیے مدینہ میں ہی رہنے کا حکم دیا تھا۔اسی وجہ سے صحیح بخاری میں مذکور اصحاب بدر کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔حالانکہ وہ جسمانی طور پر اس غزوہ میں شریک نہیں تھے، لیکن چونکہ وہ آپ ﷺ کے حکم کے مطابق مدینہ میں قیام پذیر تھے لہٰذا ان کو بھی اصحاب بدر کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔

15.3.7 حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح:

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انھیں خانوادۂ نبوی سے تعلق کی وجہ سے جو شرف حاصل تھا، اس سے وہ محروم ہوگئے، جس کا انہیں سخت رنج و ملال تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی دوسری بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا۔لیکن ان کا انتقال بھی چند سال بعد ہوگیا اور وہ ایک بار پھر مغموم ہوگئے۔آپ ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کتنے خوش تھے اور آپ ﷺ کو ان کی دل جوئی کس قدر عزیز تھی اس کا اندازہ اس فرمان نبوی سے ہوسکتا ہے کہ ''اگر میری کوئی اور بھی لڑکی ہوتی تو وہ میں عثمان رضی اللہ عنہ سے بیاہ دیتا''۔اسی طرح حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیتا'۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کی وجہ سے انہیں ''ذوالنورین'' کا لقب ملا تھا کہ ان کے نکاح میں آپ ﷺ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آئیں تھیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق انہیں اس لقب سے ملاء اعلی میں پکارا جاتا تھا۔

15.3.8 بیعت الرضوان:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بہت سارے فضائل و کمالات ہیں جن میں سے کچھ میں دیگر صحابۂ کرام بھی شامل ہیں لیکن ایک فضل و کمال ایسا ہے جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔یہ فضل و کمال انہیں اسلامی تاریخ میں ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور و معروف واقعہ کی وجہ سے حاصل ہوا تھا کہ ان کی خاطر آپ ﷺ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی تھی۔''بیعت رضوان'' کا پس منظر

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خواب دیکھنے کے بعد جب آپ ﷺ اپنے چودہ سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ کی جانب کوچ کئے، تو اہل مکہ کو یہ شک گزرا کہ آپ ﷺ ان پر حملہ آور ہونے کی نیت سے بڑھ رہے ہیں، لہٰذا انہوں نے آپ ﷺ کو مکہ کی حدود میں داخل نہ ہونے دینے کا پختہ ارادہ کرلیا اور جنگ وجدل کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ کا مقصد صرف بیت اللہ کی زیارت تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے ان سے گفت وشنید کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر اہل مکہ کے پاس روانہ کردیا۔ انھوں نے آپ ﷺ کا پیغام ان تک پہنچا دیا کہ آقائے محترم ﷺ عمرہ کی نیت سے صرف زیارت مکہ کی خاطر آرہے ہیں۔ پیغام پہنچانے کے بعد ان کی واپسی میں کچھ تاخیر ہوگئی جس کی وجہ سے اسلامی خیمہ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اہل مکہ نے انہیں شہید کردیا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ سخت بے چین ہوئے اور مسلمانوں میں غم ورنج کی لہر دوڑ گئی۔ آپ ﷺ نے اس خبر کو سن کر فرمایا ''جب تک ہم ان لوگوں سے جنگ نہ کرلیں یہیں رہیں گے''۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا ''یہ عثمان کے لیے ہے'' پھر وہاں موجود تمام صحابہ نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاطر جینے ومرنے کی قسم کھائی۔ اسی واقعہ کی جانب قرآن کی آیت ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ اِذْيُبَايِعُونَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

15.3.9 عہد خلافت صدیقی میں:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جس طرح آپ ﷺ کے معتمد علیہ تھے اسی طرح عہد خلافت صدیقی وفاروقی میں بھی ان کے قابل اعتماد رہے۔ دونوں خلیفہ ان کی عزت وقدر کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو غور سے سنتے تھے کہ ان کی رائے بہت متوازن ہوتی تھی اور ہر معاملہ میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔

عہد خلافت صدیقی میں وہ اکابر صحابہ کی مشاورتی کونسل کے اہم رکن اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشیر خاص تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ لہٰذا جب خلیفۂ ثانی کے انتخاب کا مرحلہ درپیش آیا تو خلیفۂ اول نے دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ ان سے بھی مشورہ کیا اور ان کی رائے کو اپنی رائے کے موافق پاکر خوشی کا اظہار کیا۔

لکھنا پڑھنا جاننے کی وجہ سے انہیں عہد خلافت صدیقی میں ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل تھا اور آج کی زبان میں انہیں خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کا پرسنل سکریٹری بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی قربت اور اعتماد کے نتیجہ میں خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشیں قرار دینے کے لیے جو دستاویز لکھوائی تھی اسے انھوں نے ہی لکھا تھا۔

اسلام کی مدد کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جودوسخا کا دریا جس طرح عہد نبوی میں رواں دواں تھا، اسی طرح وہ عہد صدیقی میں بھی جاری وساری رہا، لہٰذا عہد صدیقی میں جب ایک مرتبہ سخت قحط پڑا تو اس دوران ان کا ایک بڑا تجارتی قافلہ مدینہ پہنچا تھا۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے پورے تجارتی کارواں کو غریبوں اور حاجت مندوں کے لیے وقف کردیا تھا۔

حضرت ابوبکر وحضرت عثمان رضی اللہ عنہما میں بہت گہرے اور گھریلو مراسم تھے۔ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے 'مرض وفات میں میرے والد کی جتنی خدمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی اتنی کسی اور نے نہیں کی تھی'۔

15.3.10 عہد خلافت فاروقی میں:

خلافت فاروقی میں بھی وہ معزز صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے اور ان کی مجلس شوریٰ کے ممتاز ارکان میں شامل تھے۔ عہد صدیقی کی طرح عہد

فاروقی میں بھی مختلف فقہی و دینی مسائل کے حوالہ سے ان سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اکابر صحابہ کے حوالہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہی پالیسی اختیار کی تھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنائی تھی کہ وہ مدینہ سے باہر نہیں جائیں گے اور مدینہ میں ہی رہ کر سارے معاملات کی نگرانی کریں گے۔

خلیفۂ اول کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان سے ہر معاملہ میں مشورہ کرتے تھے اور ان کی رائے کو بہت غور سے سنتے اور خاص اہمیت دیتے تھے مثلاً جب مفتوحہ زمین کی ملکیت کا مسئلہ سامنے پیش آیا تو صحابۂ کرام کی ایک جماعت جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ رضی اللہ عنہم کا مشورہ تھا کہ ماضی کی طرح ان زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے، جب کہ دوسری جماعت صحابہ جیسے حضرت عثمان وغیرہ رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو حکومت کی ملکیت قرار دے کر اسے عوام کے قبضہ میں رہنے دیا جائے۔ یہی رائے خلیفۂ وقت کی بھی تھی، لہٰذا اسی رائے پر عمل درآمد کیا گیا۔ اسی طرح دیگر معاملات حکومت میں خلیفۂ وقت اپنی مشاورتی کونسل سے مشورہ کرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کو اکثر قبول کر لیا جاتا تھا۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ عزت و اکرام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اسی بنا پر جب دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خلیفۂ وقت سے کوئی بات کہنی ہوتی تو وہ تمام حضرات ان ہی کا سہارا لیا کرتے تھے اور وہ خلیفۂ وقت سے اس معاملہ کے بارے میں پوچھ لیا کرتے تھے۔

15.4 عہد خلافت عثمانی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب بطور خلیفہ ہوا، اور خلافت راشدہ کا سب سے طویل دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عہد میں عام طور سے وہی نظام حکومت رائج رہا جو خلافت فاروقی میں رائج تھا، تاہم کچھ نمایاں تبدیلیاں بھی اس عہد میں سامنے آئیں، جیسے سمندری فوج کا قیام اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کو مدینہ سے باہر جانے اور کہیں قیام کرنے کی اجازت وغیرہ۔

15.4.1 بطور خلیفہ انتخاب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناگہانی شہادت کے بعد ان کے نامزد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شوریٰ کونسل نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب بطور خلیفہ کیا تھا۔ اس انتخاب کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابولولو نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جان لیوا حملہ کیا اور ان کے جانبر ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی، تو انہوں نے اپنی جانشینی کے لیے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبداللہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کو نامزد کیا اور آپس میں مشورہ کے بعد انہیں چھ لوگوں میں کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کو کہا۔ خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا حضرات کے انتخاب کی وجہ یہ بتائی کہ ان سے آپ ﷺ راضی اور خوش ہو کر اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انتخاب خلیفہ کے حوالہ سے حسب ذیل ہدایات بھی جاری فرمایا:

1. مذکورہ بالا چھ افراد میں سے جس کے نام پر بھی اتفاق ہو جائے یا اسے اکثریت کی حمایت و تائید حاصل ہو اسے خلیفہ بنا دیا جائے۔
2. خلیفہ کا انتخاب تین دن کے اندر اندر ہو جانا چاہیے۔
3. جب تک خلیفہ کا انتخاب نہیں ہو جاتا ہے اس وقت تک امامت کے فرائض حضرت صہیب رضی اللہ عنہ انجام دیں گے۔
4. خلیفہ کی نامزدگی میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حیثیت صرف ایک مشیر کی ہوگی۔ انھیں خلافت کے لیے نامزد نہیں کیا جائے گا۔
5. کوئی بھی شخص جو مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر زبردستی خلیفہ بننے کی کوشش کرے اسے قتل کر دیا جائے۔

ان کے علاوہ دیگر ہدایات فاروقی کا ذکر ملتا ہے جن کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایات کے مطابق مذکورہ صحابہ کرام کی کونسل سر جوڑ کر بیٹھ گئی لیکن دو دن تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سے ہر ایک شخص کسی کے حق میں دست بردار ہو جائے اور بطور خلیفہ اس کے نام کی سفارش کر دے، لہٰذا حضرت زبیر بن عوام، حضرت طلحہ بن عبداللہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم نے بالترتیب حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے حق میں اپنے نام کو واپس لے لیا۔ اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنا نام حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے حق میں واپس لے لیا اور ان دونوں حضرات سے کہا آپ دونوں حضرات اپنا معاملہ میری صوابدید پر چھوڑ دیں اور میں جسے خلیفہ منتخب کر دوں اسے پوری خوشی اور رضامندی کے ساتھ قبول کر لیں۔ دونوں حضرات نے الگ الگ تنہائی میں ان کی بات ماننے کا اقرار کر لیا۔ جب یہ تمام مراحل بحسن وخوبی انجام پا گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ دیکھتے ہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اس کے بعد لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے اور بیعت عامہ کا عمل پورا ہو گیا۔ اس طرح یکم محرم الحرام 24ھ کو وہ اسلام کے تیسرے خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔ ان کے انتخاب کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ 'ہم نے اس شخص کو خلیفہ بنایا ہے جو اب زندہ لوگوں میں سب سے بہتر ہے'۔

15.4.2 فتوحات خلافت عثمانی اور اسلامی مملکت کی توسیع:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ عہد خلافت عثمانی میں بھی جاری رہا جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ جو فتوحات نامکمل تھیں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا اور جہاں کہیں بغاوت کے آثار نظر آئے، حکمت عملی کے ذریعہ ان کا سد باب کرتے ہوئے اسلامی حکومت کو مستحکم کیا گیا۔

خلافت فاروقی میں فوج کشی صرف بری راستوں سے ہوتی تھی کہ خلیفۂ دوم رضی اللہ عنہ سمندری جنگ کے سخت مخالف تھے اور وہ مسلمانوں کو سمندر کے خطرات میں ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن خلافت عثمانی میں بحری راستوں سے بھی فوج کشی کا آغاز ہوا۔ لہٰذا انھیں پہلا اسلامی خلیفہ قرار دیا جاتا ہے جنہوں نے پہلی سمندری فوج کو تیار کیا۔ ان بحری جنگوں کے ذریعہ نہ صرف شام و مصر کے ساحلوں کی حفاظت رومیوں سے کی گئی بلکہ قبرص کا جزیرہ بھی ان سے چھین لیا گیا۔

عہد خلافت عثمانی میں ہونے والی فتوحات کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. وہ شہر اور ممالک جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتح ہو چکے تھے، لیکن بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے، اور انہیں دوبارہ عہد عثمانی میں فتح کیا گیا جیسے اسکندریہ، آذربائیجان اور ارمینیہ وغیرہ۔
2. وہ شہر اور ممالک جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلی بار اسلامی افواج نے فوج کشی کی، اور فتح کے جھنڈے بلند کیے، جیسے طرابلس، تونس، الجزائر اور مراکش وغیرہ۔

عہد خلافت عثمانی میں اسلامی فتوحات کا دائرہ مزید وسیع ہوا جس کے نتیجہ میں اسلامی مملکت کا رقبہ مراکش سے کابل تک پھیل گیا تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک پر اسلامی افواج نے فوج کشی کی جن میں سے بہت سے ممالک سرنگوں ہوئے بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ''حضرت عثمانؓ بن

عفان کی فتوحات ،علاقہ،وسعت اور ہمہ گیری میں حضرت عمرؓ کی فتوحات سے بھی زیادہ تھیں۔ان کے دور میں اسلامی ریاست تین براعظموں -ایشیاء،افریقہ اور یورپ-تک وسیع ہوگئی تھی"،جس سے ان کی "بے پناہ سیاسی بصیرت اور پر جوش دینی خدمت کا اظہار ہوتا ہے"۔

15.4.2.1 بری فتوحات:

عہد خلافت عثمانی میں فتح ہونے والے علاقوں میں اسکندریہ،آرمینیہ،آذربائیجان،طبرستان،سجستان وغیرہ کی بغاوتوں کو فرو کر کے انہیں دوبارہ اسلامی مملکت میں شامل کیا گیا۔ان کے علاوہ ایشیاء کوچک کے بعض علاقے جیسے اران اور گرجستان،انطاکیہ،طرطوس وغیرہ کے علاوہ طرابلس،قبرص،عموریہ،ملطیہ،خراسان،فارس،طخارستان،کرمان،سجستان،کش،دوار،غزنہ وغیرہ میں بھی اسلامی افواج نے اپنے جھنڈے بلند کیے، جس کے نتیجہ میں مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کے بقول "دس سال کے عرصہ میں اسلامی حکومت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازہ تک وسیع ہوگئے"۔

عہد خلافت عثمانی میں بری فتوحات کا ذکر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "عراق،شام فلسطین،مصر اور ایران کی فتح اگرچہ مکمل ہو چکی تھی،لیکن ایران کا صوبہ خراسان ابھی فتح ہونے سے باقی رہ گیا تھا۔ایرانی شاہ ابھی تک زندہ تھا اور جب تک اس کا خاتمہ نہ ہو جاتا ایرانی فتح مکمل نہ ہوتی۔ایران کے ماتحت دوسرے شمالی صوبے جیسے آذربائیجان،آرمینیا اور مشرقی صوبے خراسان بھی فتح کیے گئے۔اسی عہد میں وسط ایشیاء کے کچھ سرحدی علاقے اور شہر بھی فتح ہوئے۔مصر میں اسکندریہ کی بغاوت دور کر کے اس کو دوبارہ فتح کیا گیا۔مصر کے بعد پورے شمالی افریقی ممالک کی فتح کی بنیاد ڈالی گئی اور لیبیا،تیونس وغیرہ کو فتح کر کے اسلامی ریاست کی حدود اور وسیع کی گئیں۔شمال میں بازنطینی علاقے فتح کر کے اس کی سلطنت کو اور کمزور کیا گیا"۔

15.4.2.2 بحری فتوحات:

بحری جنگوں وفتوحات کا آغاز عہد خلافت عثمانی سے ہوتا ہے جو اس عہد کا ایک اہم اور قابل ذکر کارنامہ ہے۔ان کے عہد خلافت میں تقریباً پچاس لڑائیاں سمندر میں لڑی گئیں اور دشمنوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اسلامی افواج کی بحری قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 31ھ میں قیصر روم نے ایک بڑے بحری بیڑے کے ساتھ سواحل شام پر حملہ کیا تو اسلامی افواج نے انہیں ایسی شکست فاش دی کہ انہیں پھر کبھی حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔یہ بحری جنگ تاریخ میں "ذات الصواری" کے نام سے مشہور ہے۔

عہد خلافت عثمانی کی بحری جنگوں میں شام ومصر کے گورنرس یعنی امیر معاویہ اور عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہما نے کافی نام کمایا اور ان کی جنگی حکمت عملی کی وجہ سے اسلامی افواج بحیرۂ روم کی ایک بڑی بحری طاقت بن گئی تھی۔

عہد عثمانی کی بحری فتوحات کے نتیجہ میں بھی اسلامی مملکت کے دائرہ میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ان بحری حملوں کے اسباب ونتائج کا ذکر "تاریخ تہذیب اسلامی" (حصہ دوم) میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے "حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری جہاد کے حق میں نہ تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی پہلے اس کی اجازت نہیں دی لیکن جب اسلامی صوبوں کو مسلسل خطرہ لاحق رہا تو انھوں نے بالآخر اس کی اجازت دے دی۔اس کے نتیجہ میں بحر روم میں واقع کئی جزیرے جیسے قبرص،ارداد،اور روڈس فتح کیے گئے اور صقلیہ (سسلی) پر حملہ کر کے بازنطینی بحریہ کی طاقت توڑی گئی۔جنوبی ایشیاء میں سیستان اور افغانستان کی فتح ہوئی اور ہندوستان کے صوبہ سندھ پر حملہ کیا گیا۔اسی طرح یورپ میں پہلی بار اسلامی فوج نے اندلس پر حملہ کر کے کچھ علاقے فتح کیے"۔

15.4.3 عہد خلافت عثمانی میں شورش کے اسباب وعوامل اور خلیفہ سوم کی شہادت:

15.4.3.1 عہد خلافت عثمانی میں شورش کے اسباب وعوامل:

خلافت عثمانی کی مجموعی مدت 12 سال ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔خلافت کا دور اول جو کل مدت خلافت کے نصف سے زیادہ ہے نہایت ہی امن وامان اور سکون واطمینان کا دور تھا۔مختلف محاذ پر کامیابیوں کا سلسلہ جاری تھا جب کہ دور ثانی جو چار پانچ سالوں پر مشتمل ہے نہایت ہی خلفشار، بدامنی اور فتنہ وفساد کا دور ہے۔اس انتشار اور بدامنی کے مختلف اسباب وعوامل ہیں، جن کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور آخر کار خلیفۂ سوم رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوئے۔عہد خلافت عثمانی میں پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کے حسب ذیل عوامل تھے:

☆ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ماننے والوں کا اسلامی حکومت میں شامل ہونا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کا اسلام کے خلاف بدلہ کے جذبات رکھنا اور اسلامی مملکت سے پوری طرح مطمئن نہ ہونا۔

☆ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی پرانی چشمک کے ساتھ ساتھ عرب وعجم کے مابین پائی جانے والی کشمکش خصوصاً یہودیوں اور مجوسیوں کی اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشیں، جن کا بنیادی سرغنہ عبداللہ بن سبا تھا، جس نے عہد عثمانی کے فتنہ کو بہت زیادہ ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

☆ گورنرس اور دیگر حضرات کا عزل ونصب، کبار صحابہ کے ساتھ بدسلوکی اور اقربا پروری کے تعلق سے غلط الزامات کا پروپیگنڈہ۔

مذکورہ بالا عوامل نے عہد خلافت عثمانی کے آخری دور میں بہت ہی زیادہ خلفشار اور انتشار پیدا کر دیا تھا جس کے بنیادی مراکز کوفہ، بصرہ اور مصر تھے۔اس بدامنی کا بنیادی سبب خلیفۂ وقت کی نرم دلی تھی کہ وہ کسی قسم کی سختی نہیں کرنا چاہتے تھے۔لہٰذا مخالفین کے حوصلے بلند ہوتے چلے گئے۔حضرت عثمانؓ نے اپنے اوپر لگنے والے الزامات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بٹھایا، جس نے ان کے خلاف لگنے والے تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دیا۔اپنی جانب سے متعدد بار صفائیاں اور وضاحتیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اعلان کیا کہ جسے مجھ سے یا میرے عمال سے شکایت ہے وہ حج کے موقع پر آ کر مجھ سے مل کر اپنی تمام شکایات دور کر لے،لیکن چونکہ مفسدین کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔لہٰذا وہ اپنی سازشوں سے باز نہ آئے حتیٰ کہ امیر المؤمنین پر حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔

15.4.3.2 خلیفہ سوم کی شہادت:

عہد خلافت عثمانی کے آخری دور میں بدامنی، انتشار اور خلفشار کا نتیجہ خلیفۂ سوم کی شہادت کی شکل میں سامنے آتا ہے کہ مفسدین نے 35ھ کے اواخر میں مدینہ کی جانب پیش قدمی کی جو اس وقت موسم حج کی بنا پر تقریباً خالی تھا۔پہلے انہوں نے حضرت عثمانؓ کے مسجد میں آنے جانے میں رکاوٹیں کھڑی کیں، پھر ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا، جو تقریباً چالیس دنوں تک جاری رہا۔اس محاصرہ کے درمیان انہوں نے گھر کی چھت سے باغیوں کو کئی بار مخاطب کیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکل سکا۔اس محاصرہ کے دوران انہوں نے مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کیا، لیکن نہ تو خلافت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوئے اور نہ ہی مدینہ سے کہیں اور جانے کے لیے راضی ہوئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کی تھی۔

اس محاصرہ کے دوران اکابر صحابہ نے اپنے فرزندوں کو ان کی حفاظت کے لیے مامور کر دیا تھا، ان کے علاوہ بھی ایک جم غفیر ان کی حفاظت کے وہاں موجود تھا اور انہوں نے باغیوں سے لڑائی کی اجازت بھی مانگی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ناحق خون بہانے سے انکار کر دیا اور

ان سے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی درخواست کی۔ ادھر باغیان کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ حج کا موسم ختم ہوتے ہی مدینہ میں لوگوں کی آمد کا آغاز ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کی خاطر خلیفۂ سوم پر اس وقت حملہ کر کے شہید کر دیا جب وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف تھے اوران کے خون ناحق کے چھینٹوں سے مصحف کا وہ صفحہ رنگین ہو گیا۔ ان کی شہادت کا یہ عظیم حادثہ 18 ذوالحجہ 35ھ/ 17 جون 656ء کو پیش آیا تھا۔

15.5 حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ذاتی حالات وصفات اور علم وفضل

15.5.1 ذاتی حالات وصفات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خوبصورت اور خوش قامت تھے۔ رنگ سرخ وسپید، بال سیدھے اور لمبے، ناک ستواں، دانت خوبصورت اور ہموار تھے۔ عمدہ قسم کا لباس زیب تن کرتے تھے اور اچھی اور عمدہ غذا کا استعمال کرتے تھے۔ نہایت رقیق القلب اور سادہ مزاج تھے۔ جود وسخا ان کے مزاج کا حصہ اور فطرت ثانیہ بن چکے تھے۔ ان کی جود وسخا سے اسلام کو قدم قدم پر فائدہ پہنچا، جن کے ذکر سے مصادر بھرے ہوئے ہیں۔ حیا ان کی فطرت کا سب سے نمایاں حصہ تھی جو ضرب المثل بن گئی ہے۔ فطرتاً کم سخن اور کم گو تھے لیکن جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو سیر حاصل گفتگو کرتے تھے۔ نہایت ہی سلیم فطرت تھے، لہٰذا زمانہ جاہلیت میں نہ کبھی شراب پی اور نہ ہی زنا میں ملوث ہوئے اور نہ ہی کبھی گانے بجانے کی کسی مجلس میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں بہت زیادہ دینی حمیت وغیرت پائی جاتی تھی کہ کوئی غیر شرعی اور غیر دینی کام ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ نہایت ہی خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کی خوب تلاوت کیا کرتے تھے اور انہیں کلام الٰہی اور حدیث نبوی سے حد درجہ عشق اور شغف تھا۔ ان کی ایک باندی کے قول کے مطابق وہ صائم الدھر اور قائم اللیل تھے۔ وہ آپ ﷺ کا نہایت ادب واحترام کرتے تھے اور حتی الامکان سنت نبوی کی اتباع کرتے تھے۔ معاملات میں نہایت ہی صاف ستھرے ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی متقی و پرہیز گار تھے۔

ان کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایسے ہیں جن میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے، جیسے آپ ﷺ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور ان کی دلجوئی کیا کرتے تھے۔ اسی دلجوئی کا نتیجہ تھا کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد اپنی دوسری بیٹی کو بھی ان کی زوجیت میں دے دیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد فرمایا تھا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں ان کا نکاح یکے بعد دیگرے ان سے کر دیتا۔ آپ ﷺ تاحیات ان سے خوش رہے، جس کا ثبوت آپ ﷺ کے وہ دعائیہ جملے ہیں جو روایات میں محفوظ ہیں۔ صحابۂ کرام کی نظروں میں ان کا درجہ شیخین کے بعد آتا تھا۔

15.5.2 علم وفضل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار ان چند افراد میں ہوتا تھا جو زمانۂ جاہلیت میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسی بنا پر انہیں کاتب وحی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ قرأت وتجوید کے بھی ماہر تھے۔ حدیث نبوی سے حد درجہ عشق وشغف کے باوجود ان سے مرویات کی تعداد صرف 146 ہے۔ انھیں فقہ میں بھی نہایت درجہ درک حاصل تھا جس کی وجہ سے ان کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا تھا۔ اسی فقہی بصیرت کی بنا پر وہ عہد خلافت صدیقی اور فاروقی میں مجلس افتاء وشوری کے رکن تھے۔ خصوصاً وراثت اور حج کے احکام ومسائل میں انہیں بہت زیادہ مہارت حاصل تھی۔ ان کے کئی ایک مجتہدانہ آراء کا ذکر مصادر فقہ میں پایا جاتا ہے۔ اکابر صحابہ میں ان کی فقہی آراء اور فتاوی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی تقریریں اور تحریریں 'ما قل ودل' کی مصداق ہوتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک اچھے شعری ذوق کے مالک بھی تھے اور بات بات پر اشعار سے استشہاد کیا کرتے تھے۔

15.6 عہد خلافت عثمانی کا نظام حکومت

خلافت عثمانیہ کی انتظامیہ فاروقی انتظامیہ کے مماثل تھی۔اس عہد میں بھی تقریباً وہی نظام حکومت قائم رہا، جو عہد خلافت فاروقی میں تھا، تاہم کچھ شعبوں میں کچھ اصلاحات کی گئیں تو کچھ نئے محکموں کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ نے نہایت ہی جامع انداز میں اس عہد کے نظام حکومت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ''حضرت عمر کی حکمت عملی اور انتظامیہ کے خطوط پر حضرت عثمان نے اسلامی ریاست کے نظم ونسق میں اور بہتری پیدا کی۔مزید صوبے بنائے، مرکزی نظام حکومت میں نئے شعبے اور محکمے قائم کیے۔صوبوں میں انتظامی اور مالیاتی ذمہ داریوں میں فرق پیدا کرنے کی حکمت اپنائی۔دیوان عطا میں اصلاح وترقی کی، احتساب کا محکمہ مضبوط کیا، گورنروں اور افسروں کے کاموں کا جائزہ لینے کے لیے مرکزی نگراں بھیجے۔عراق کی زمینوں کی تقسیم کی۔قضاء وعدالت، پولیس اور بیت المال کے شعبوں میں مزید اصلاح کی۔ان کے علاوہ اور دوسری اصلاحات کیں''۔

عہد خلافت عثمانی میں فوجی نظام میں ایک اہم تبدیلی ہوئی کہ خلیفۂ وقت کی اجازت سے بحریہ کا قیام عمل میں آیا اور اسلامی افواج نے بحری لڑائیوں کا آغاز بھی کر دیا ''جس کے نتیجہ میں بحر روم میں اور شمالی افریقہ کے ساحلی سمندر پر مسلم حکمرانی قائم ہوگئی''۔

15.7 عہد خلافت عثمانی کی علمی، تمدنی اور رفاہی سرگرمیاں

15.7.1 تدوین قرآن:

حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے عہد کا سب سے بڑا علمی کارنامہ امت اسلامیہ کو ایک مصحف اور ایک قرأت پر جمع کرنا تھا، اسی وجہ سے وہ جامع القرآن بھی کہلاتے ہیں۔قرآن کی اولین تدوین خلافت صدیقی میں ہوچکی تھی۔عہد عثمانی میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا، جس کے نتیجہ میں بہت سارے غیر عرب علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوگئے تھے۔ان علاقوں کے باشندے عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پڑھنے میں غلطی کرتے تھے۔ایرانی علاقوں میں قرأت کی ان غلطیوں کو دیکھ کر حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے خلیفۂ وقت سے درخواست کی کہ صحیح اور متفقہ قرأت والے مصاحف کو اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں بھیجا جائے تاکہ قرآن پڑھنے میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہ رہے۔

عہد صدیقی میں قرآن مجید کو مدون کیا جاچکا تھا جسے ''مصحف امام'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس نسخہ کی موجودگی میں دیگر ذاتی مصاحف کا پایا جانا اور عربی زبان سے عدم واقفیت کی بنا قرأت قرآن میں غلطی کرنا آگے چل ایک بڑے فتنہ کا باعث ہوسکتی تھی۔لہٰذا انہوں نے صورت حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے ''مصحف امام'' کی بنیاد پر ایک صحیح نسخہ تیار کرنے کے لیے چار اہم صحابہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔اس کمیٹی نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ ''مصحف امام'' کی بنا پر اس کی سات نقول تیار کیے۔ایک نسخہ کو مرکز خلافت مدینہ میں محفوظ کرتے ہوئے چھ مصاحف کو مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کے والیان کے پاس اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا کہ اب قرآن کی قرأت اسی مصحف کے مطابق کی جائے گی اور مصحف کے دیگر تمام نسخوں کو ضائع کر دیا جائے۔لہٰذا دیگر تمام مصاحف کے نسخوں کو ضائع کر دیا گیا۔اس اقدام کے نتیجہ میں انہوں نے ساری امت اسلامیہ کو ایک قرأت اور ایک مصحف کا پابند دیا اور اس حوالہ سے امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے تمام فتنوں کا سد باب کر دیا۔

اس اہم علمی کام کے علاوہ عہد خلافت عثمانی میں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ جیسے اسلامی فنون میں کسی قدر ترقی ہوئی تھی۔

15.7.2 عہد خلافت عثمانی کے تمدنی ورفاہی کارنامے:

عہد عثمانی میں حرمین کی توسیع کی گئی تھی۔حرم مکی کی توسیع 26ھ میں ہوئی تھی۔اس توسیع کے لیے انہوں نے آس پاس کے مکانات

خرید ے اورانہیں حرم مکی میں شامل کر دیا۔

مسجد نبوی کی تعمیر نو اور توسیع 29ھ میں ہوئی تھی۔ اس تعمیر و توسیع میں دس ماہ لگ گئے تھے اور چونا اور منقش پتھر کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس توسیع کے نتیجہ میں مسجد نبوی کا طول 160 گز اور عرض 150 گز کا ہو گیا تھا۔

حرمین شریفین کے علاوہ عہد عثمانی میں مفتوحہ علاقوں میں نئی مساجد تعمیر کے ساتھ ساتھ پرانی مساجد میں توسیع کا عمل انجام پایا تھا اور مساجد میں امام دار مؤذن رکھے گئے تھے، ساتھ ہی ان کی تنخواہیں بھی مقرر کی گئی تھی۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے عہد خلافت عثمانی میں حرمین اور مساجد کی تعمیر و توسیع کے علاوہ نئے بازاروں کے قیام اور پرانے بازاروں کی توسیع ہونے کی وضاحت کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں تھی۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برخلاف انہوں نے اکابر صحابہ کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

عہد مذکور میں دفاتر کے لیے وسیع عمارتوں کی تعمیر کی گئی، رعایا کے آرام کے لیے سڑکیں، پل اور مسافر خانے اور مہمان خانے بنوائے گئے۔ مدینہ منورہ آنے والے تمام راستوں کو آرام دہ بنانے کی خاطر ان پر جگہ جگہ چوکیاں قائم کی گئیں، سرائے کے ساتھ بازار اور شیریں پانی کے کنویں اور چشمے بنوائے گئے۔

اس عہد کا سب اہم رفاہی کام ''بندمہروز'' کی تعمیر ہے۔ یہ مدینہ کی ایک وادی کا نام ہے جہاں کبھی کبھی سیلابی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، جس کی وجہ سے اہل مدینہ کو پریشانی ہو جاتی تھی۔ اس وادی پر بند باندھنے کی ضرورت کا احساس آپ ﷺ کو بھی تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے وہاں باندھ باندھنے کی ضرورت کا ذکر اپنے ایک فرمان میں کیا تھا۔ آپ ﷺ کی اس خواہش پر عہد خلافت عثمانی میں عمل درآمد کیا جا سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک بند بنوایا اور نہر کھود کر سیلاب کا رخ دوسری طرف کر دیا۔ اس بند کو ''سدمہروز'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ان تعمیری کارناموں کے علاوہ انہوں نے بقول مؤلف تاریخ تہذیب اسلامی (جلد دوم) ''بعض بدعات اور لہو ولعب کے کھیلوں مثلاً کبوتر بازی اور غلیل بازی پر پابندی لگائی اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور مضر عناصر سے اس کے تحفظ کے اقدامات کیے''۔

15.8 عہد خلافت عثمانی کا معاشرہ

عہد خلافت عثمانی کا معاشرہ ایک ترقی پذیر معاشرہ تھا جس میں علوم و فنون، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ فتوحات کی کثرت کی وجہ سے مال غنیمت اور محاصل میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا، جس کے نتیجہ میں پورا معاشرہ خوش حال ہو گیا تھا اور ایک عام آدمی بھی پورے سکون و اطمینان اور عیش و آرام کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے جو وظیفے مقرر کیے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف انہیں جاری رکھا، بلکہ بعض قرائن کے مطابق ان میں اضافہ بھی کیا۔ ان کے زمانہ میں اتنی خوشحالی ہو گئی تھی کہ لوگ عہد عثمانی کو عہد فاروقی پر ترجیح دینے لگے تھے۔ بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی ''حضرت عثمان کی بیدار مغزی، رعایا کی خبر گیری اور حسن نظم و نسق کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک سے افلاس اور تنگ دستی کا خاتمہ اور ہر طرف امن و امان اور خوش حالی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا''۔

یہ کیفیت عہد عثمانی کے نصف اول تک باقی رہی پھر دھیرے دھیرے حالات خراب ہوتے چلے گئے اور مختلف قسم کی پریشانیاں معاشرہ میں در آئیں۔ نتیجتاً سکون و اطمینان میں دھیرے دھیرے کمی آتی چلی گئی۔ اس بگاڑ کے بہت سے داخلی اور خارجی عوامل تھے جیسے اسلامی معاشرہ میں شامل

ہوئے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقامی جذبات کا پایا جانا، بنو ہاشم اور بنو امیہ کی آپسی چشمک، عرب وعجم کا قضیہ، یہودیوں اور مجوسیوں کی اسلام مخالف سازشیں وغیرہ جس کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، حتیٰ کہ خلیفۂ سوم کی شہادت جیسا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالات کی سنگینی میں اضافہ ہونے کا ایک سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فطری نرم دلی، بردباری اور تحمل بھی ہے، جس نے فتنہ پیدا کرنے والوں کے حوصلہ کو بلند کر رکھا تھا۔ اگر وہ ذرا سی بھی سختی سے کام لیتے تو حالات اتنے بدتر نہ ہوتے کہ خود انہیں جام شہادت نوش کرنا پڑتا۔

15.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے حسب ذیل نکات کے بارے میں جانکاری حاصل کی:

- حضرت عثمانؓ کا حسب ونسب، خاندان، نام وکنیت اور القاب اور عہد جاہلیت میں ان کی زندگی کے شب وروز، خصوصاً ان کی تجارت سے واقفیت۔
- حضرت عثمانؓ کے قبول اسلام کے بعد کی زندگی، دختر نبوی سے ان کا نکاح اور ہجرت حبشہ ومدینہ میں ان شمولیت۔
- مدنی زندگی کا آغاز، حضرت ام کلثومؓ سے نکاح، بیعت الرضوان کا سبب، اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ان کی جود وسخا، غزوات نبوی میں شرکت اور عہد خلافت صدیقی وفاروقی میں ان کا مقام ومرتبہ۔
- عہد خلافت عثمانی کا آغاز اور بطور خلیفہ ان کا انتخاب، خلافت عثمانی کی بری وبحری فتوحات کے نتیجہ میں اسلامی مملکت کی توسیع۔
- عہد خلافت عثمانی کے دور ثانی میں شورش کے اسباب وعلل کیا تھے اور ان کی شہادت کا واقعہ کیونکر پیش آیا۔
- حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ذاتی حالات وصفات کیا تھے اور علم وفضل میں ان کا مقام ومرتبہ کیا تھا۔
- عہد خلافت عثمانی کے نظام حکومت، اس عہد کی علمی وتمدنی اور رفاہی سرگرمیوں جیسے تدوین قرآن، حرمین شریفین کی توسیع، سرائے اور مہمان خانے کا قیام، نئی مساجد، پل اور سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کے علاوہ اس عہد کے معاشرہ سے واقفیت ہونا۔

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. ذوالنورین کس کا لقب تھا؟

a. حضرت ابوبکرؓ　b. حضرت عمرؓ　c. حضرت عثمانؓ　d. حضرت علیؓ

2. بئر رومہ کس نے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا؟

a. حضرت علیؓ　b. حضرت عثمانؓ　c. حضرت عمرؓ　d. حضرت ابوبکرؓ

3. قرآن کی پہلی تدوین کس کے عہد خلافت میں ہوئی تھی؟

a. حضرت علیؓ　b. حضرت عثمانؓ　c. حضرت عمرؓ　d. حضرت ابوبکرؓ

4. حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنانے میں کس نے بنیادی کردار ادا کیا تھا؟

a. حضرت سعدؓ   b. حضرت عبدالرحمٰنؓ   c. حضرت علیؓ   d. حضرت زبیرؓ

5. حضرت عثمانؓ کی شہادت کس سنہ میں پیش آئی تھی؟

a. 35ھ/656ء   b. 37ھ/658ء   c. 24ھ/644ء   d. 40ھ/ 661ء

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدنی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بری فتوحات پر ایک نوٹ لکھیے ۔
3. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین اور جامع القرآن کیوں کہلاتے ہیں؟
4. عہد خلافت عثمانی کے معاشرہ پر ایک نوٹ لکھیے ۔
5. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی حالات وصفات کو بیان کیجئے۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کس طرح سے خلیفہ منتخب کیا گیا؟ تفصیل کے ساتھ بیان کیجیے۔
2. اواخر عہد خلافت عثمانی میں انتشار کے اسباب بیان کرتے ہوئے شہادت خلیفہ سوم کے واقعہ پر روشنی ڈالیے۔
3. عہد خلافت عثمانی کی علمی، تمدنی اور رفاہی سرگرمیوں پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے ۔

15.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	عثمان ذوالنورین	پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی
2.	خلفائے راشدین	مولانا حاجی معین الدین احمد
3.	تاریخ اسلام (جلد اول)	مولانا شاہ معین الدین ندوی
4.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت
5.	تاریخ تہذیب اسلامی	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
6.	اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (جلد 12)	پنجاب یونیورسٹی، لاہور

-:oOo:-

اکائی 16 : حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ : حیات اور کارنامے

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقصد
16.2 حضرت علی کرم اللہ وجہہ مکہ میں
16.2.1 خاندان اور پیدائش
16.2.2 کفالت اور اسلام
16.2.3 ہجرت
16.3 حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینہ میں
16.4 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت
16.4.1 تولیت اور اسلوب خلافت
16.4.2 اہم واقعات
16.4.3 حضرت علیؓ کی شہادت
16.5 حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضائت اور علم
16.6 آل علی رضی اللہ عنہ
16.7 اکتسابی نتائج
16.8 کلیدی الفاظ
16.9 نمونہ امتحانی سوالات
16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید

گزشتہ تین اکائیوں میں آپ نے خلفائے ثلاثہ کی سیرت اور کارناموں کا جائزہ لیا۔ ان تمام کے دور میں جو اہم واقعات پیش آئے اور جو

فتوحات ہوئیں ان کا تذکرہ کیا گیا۔ اس اکائی میں ہم روشنی ڈالیں گے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی سیرت اور خلافت پر۔ آپؓ کے دور کے اہم و مشہور واقعات کا جائزہ لیں گے۔ نیز حضرت علیؓ کی خاص شخصیت کا تذکرہ بھی شامل کیا جائے گا۔

16.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی سیرت سے واقف ہو جائیں گے۔ اُن تعلقات سے بھی واقف ہو جائیں گے جو حضرت علیؓ کے خلفاء ثلاثہ سے تھے۔ آپ جان لیں گے کہ خلافت راشدہ میں حضرت علیؓ کا کیا کردار رہا۔ نیز آپ یہ بھی جان لیں گے کہ حضرت علیؓ کی شخصیت کی کیا کیا خصوصیات تھیں۔

16.2 حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ میں

16.2.1 خاندان اور پیدائش:

والد اور والدہ: آپ کے والد ابو طالب کا نام دراصل عبد مناف تھا، مگر وہ اپنی کنیت (ابو طالب) سے مشہور تھے۔ ان کے چار صاحبزادے تھے: طالب، عقیل، جعفر اور علیؓ اور دو صاحبزادیاں تھیں: اُمّ ہانی اور جُمانہ۔ ابو طالب اپنی اولاد میں حضرت عقیل سے زیادہ مانوس تھے۔ حضرت عقیل انساب قریش اور ایام عرب سے بڑے واقف تھے۔ لوگ ان کے پاس آ کر ان سے انساب کے سلسلہ میں رجوع کیا کرتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھا، جو نہ صرف اسلام میں داخل ہونے والی پہلی ہاشمیہ ہیں بلکہ مدینہ ہجرت کرنے والی پہلی خواتین میں سے بھی تھیں۔ ان کے تعلق نبی ﷺ فرماتے ''میری ماں کے انتقال کے بعد یہی میری ماں تھیں''، ''میں ان کا ممنون احسان ہوں''۔ ان کے انتقال پر آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنی قمیص کفن پر پہنائی اور پھر قبر میں اندر جا کر لیٹے۔ اللہ سے دعا کی کہ اپنی رحمت سے قبر کو متبرک، منوّر اور کشادہ کر دے۔ حضرت علیؓ کے والدین چونکہ ہاشمی قریشی تھے اس لحاظ سے حضرت علیؓ، نجیب الطرفین، خالص ھاشمی ہوئے اور آپ کا نسب حضرت عدنان تک، بلا اختلاف، پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنو ہاشم کو تمام عرب میں مذہبی سیادت حاصل تھی، اور خانۂ کعبہ کی خدمت اور اس کا اہتمام خاندان ہاشم کے لیے باعث اعزاز تھا۔

آپ بنی ہاشم میں سب سے پہلے خلیفہ ہیں۔ آپ آنحضرت ﷺ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے اور بعد میں نبی کریم ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ سے آپ کا نکاح ہوا، اور اس طرح نبی ﷺ کے سب سے چھوٹے داماد بھی ہوئے۔ آپ کو اپنے بڑے بھائیوں میں حضرت جعفر سے سب سے زیادہ لگاؤ تھا جن کا شمار 'السابقون الاوّلون فی الاسلام' میں تھا۔ ابن حجر کی کتاب الاصابہ میں ایک روایت ہے جس میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے جب کچھ مانگا اور انھوں نے نہیں دیا تو میں نے جعفر کا واسطہ دیا، انھوں نے فوراً دے دیا **(ما سألت علياً فامتنع فقلت له بحق جعفر إلاّ أعطاني)**۔

نام اور سلسلۂ نسب: علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ۔

'تاریخ مدینہ دمشق' میں ایک روایت کے مطابق آپ کی والدہ نے آپ کا نام ''اسد'' (شیر) رکھا تھا اپنے والد کے نام پر۔ لیکن حضرت ابو طالب نے نام کو بدل کر علی رکھ دیا۔ مجاہد کا کہنا ہے کہ آپؓ کی والدہ ماجدہ نے آپؓ کا نام علی ولادت کے ساتھ ہی رکھا تھا۔ دوسری جگہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''**أنا الذي سمّتني أمي حيدرة**'' (میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر [شیر] رکھا ہے)۔ تمام روایتوں میں اس طرح تطبیق کی جا سکتی

ہے کہ آپ کا نام علی رکھا گیا، پھر والدہ ماجدہ نے اپنے والد کے نام سے متاثر ہو کر یا پھر شخصیت اور جسمانی صفتوں کی وجہ سے آپؓ کا نام حیدر بھی رکھا۔

کنیت اور لقب: آپ کی کنیت ابوالحسن تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے آپ کی کنیت ابوتراب رکھی تھی جس سے آپ زیادہ مشہور تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ: ''یہ کنیت سب سے عزیز ہے مجھ کو'' (کان علیؓ یقول: هی أحب کنیتی الِیّ)۔ آپ کو کوئی اس کنیت سے آواز دیتا تو آپ بہت خوش ہوتے تھے۔ بنی امیہ کے حکمرانوں کے ڈر سے کئی علماء نے حضرت علیؓ کے نام اور مشہور کنیتیں استعمال کرنے سے احتراز کیا۔ جب کبھی حدیث کی روایت میں آپ کا نام آتا، تو ''روی ابوزینب'' یا ''روی قرشی'' کا استعمال کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ آپؓ کی کئی اور کنیتیں تھیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

ابوالسبطین (یعنی الحسن والحسین)، ابومحمد، ابوالحسن وابوالحسین، ابوعبداللہ، ابوالقاسم۔

حضرت علیؓ کے کئی القاب تھے، جن میں سے چند کا ذکر یہاں پیش کیا جاتا ہے:

ابوالقُضَم اور ابوالقُصَم (دشمن کو ہلاک کرنے والا)، ابوالیتامی والمساکین، الصدّیق الاکبر، زوج البتول، مولی المؤمنین، ذوالقرنین، امیر المؤمنین، اخطب الخطباء، اقضی الصحابہ، المرتضی، یعسوب المؤمنین (یعسوب یعنی قوم کا سردار)، باب المدینہ، شبیہ ہارون، اخوالرسول۔

ولادت: مشہور روایتوں کے مطابق آپ کی ولادت شہر مکہ میں بتاریخ 13/رجب بعثت نبوی ﷺ سے دس (10) سال پہلے ہوئی۔ کئی روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ حمل کی حالت میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے قرب میں تھیں کہ ان کو اچانک مخاض (درد زہ) اٹھا تو آپ خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئیں اور وہیں حضرت علیؓ کو جنم دیا۔ جہاں ایک گروہ اس واقعے کو تواتر سے ثابت کرتا ہیں دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہونے والے حکیم بن حزام بن خویلد تھے، نہ کے حضرت علیؓ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں کہ: ''اُنؓ کے مناقب میں سے جواُن کی پیدائش کے وقت ظاہر ہوئے ایک یہ ہے کہ وہ (حضرت علیؓ) جوف کعبہ میں پیدا ہوئے ہیں''۔

صفات: روایتوں کے مطابق علیؓ سب لوگوں سے زیادہ وجیہ اور حسین تھے۔ آپ کا چہرہ گورا اور حسین تھا، پیشانی کشادہ تھی، آنکھیں بڑی اور سیاہ، دانت ضیابار، گردن صراحی دار (لمبی اور خوش نما)، میانہ قامت (متوسط قد)، سینہ چوڑا، کلائیاں ٹھوس، کلائیوں اور بازؤں میں جوڑ کا پتہ نہ چلتا تھا اور چال باوقار تھی۔ آپؓ کی شجاعت ضرب المثل تھی، معاویہؓ نے جنگ صفین میں علیؓ کے بارے میں کہا: جو اُن کے سامنے آ گیا تو ہلاک ہو گیا۔

16.2.2 کفالت اور اسلام:

وفات سے پہلے حضرت عبدالمطلب نے اپنے صاحبزادہ ابوطالب کو ایک بہت اہم وصیت کی تھی کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی ہر حال میں حفاظت کریں گے۔ حضرت ابوطالب نے اس وصیت کو بڑے اہتمام سے نبھایا۔ آپ نے حضرت محمد ﷺ کی کفالت اپنے ذمہ لی اور خوب فکر و اہتمام کے ساتھ آپ کی پرورش کی، نہ صرف ابوطالب بلکہ اُن کی زوجہ جو حضرت محمد ﷺ کی چچی ہوتی تھیں وہ بھی آپ ﷺ کا بہت خیال رکھا کرتی تھیں۔ اس عنایت کو نبی ﷺ نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے ''ابوطالب کے بعد سب سے زیادہ اسی (فاطمہ بنت اسدؓ) نیک سیرت خاتون کا ممنون احسان ہوں''۔

حضرت ابوطالب کی کوئی بڑی ثروت و دولت نہ تھی اور جب حجاز میں قحط پڑا آپ کو اقتصادی مشکلات کا بہت سخت سامنا کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ اس وقت دار خزیمہ میں ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ کے گھر میں رہ رہے تھے اور آپ کی تجارت میں شریک تھے۔ آپ ﷺ اپنے چچا کے یہ حالات دیکھ کر فکر مند ہو گئے تھے اور نیت کی کہ اس مشکل گھڑی میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ ﷺ نے اپنے ایک دوسرے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ

کو، جو مکہ کے خوشحال اور امیر لوگوں میں سے تھے، اپنے ارادہ سے مطلع کیا، اور پھر آپ دونوں مل کر حضرت ابو طالب کی خدمت میں پہنچے اور فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کے بچوں کا کچھ بوجھ اپنے ذمہ لے لیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کی کفالت خود لے لی اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت تین سے چھ سال کی ہوگی۔ اس دن سے آپ نبی ﷺ کے ساتھ رہنے لگے۔ اور آپ کی مکمل پرورش براہ راست نبی ﷺ کی زیر نظر ہونے لگی۔ حضرت عقیل کو حضرت ابو طالب کسی حالت میں اپنے سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت عقیل اور ان کے بڑے بھائی طالب دونوں اپنے والد کے ساتھ رہے۔

حضرت علیؓ کو اللہ تعالیٰ نے شجاعت، جوان مردی اور بہت سے خاندانی فضائل بنی ہاشم سے نوازا تھا اور پھر نبی ﷺ کے زیر نگرانی آپ کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا فیض جاری رہا، نیز آپ بہت کم سنی میں بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ جب آپ پر نبی ﷺ نے اسلام پیش کیا تو آپ نے اُس کی تصدیق بلا تاخیر فرمائی، ایمان آپ کے حواس اور وجدان کا جزء بن گیا اور قلب کو منور کر دیا۔ حبہ عرنی بیان کرتے ہیں کہ میں نے علی کو یہ فرماتے سنا: میں ہی وہ پہلا انسان ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی۔ (فضائل الصحابہ، امام احمد بن حنبل)

اکثر حوالوں کے مطابق حضرت علیؓ کا سن دس (10) برس کے لگ بھگ تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنی نبوت کا اعلان فرمایا۔ دوسری روایت کے مطابق آپ کی عمر پندرہ (15) یا سولہ (16) سال کی تھی۔ حسن وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ خدیجہ کے بعد سب سے پہلے علی اسلام لائے۔ اس وقت ان کی عمر 15-16 سال کی تھی۔ (فضائل الصحابہ، امام احمد بن حنبل)

مختلف روایات کو ہم اگر یکجا کرنا چاہیں (توفیق) تو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ ام المومنین خدیجہؓ خواتین میں، حضرت ابو بکر الصدیقؓ مردوں میں اور حضرت علیؓ کم عمر والوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔

'حامی بیت حرام' یعنی قریش، کعبۃ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اصل وارث تو تھے، مگر ان کے سربراہوں نے اپنے نظریات کے مطابق کئی اسلامی اصول اور احکام قطعی ترک کر دیے تھے اور بت پرستی میں ملوث ہو گئے تھے۔ اپنا مذہبی تسلط اور متکبرانہ رویہ مکہ اور اس کے اردگرد کے قبائل پر برقرار رکھا۔ حنفیت (اس سے مراد توحید الٰہی کو اپنانا اور شرک و بت پرستی سے گریز) پر قائم رہنے والے لوگ اپنے خیالات کا علانیہ اظہار نہیں کر پاتے۔ بتوں کے خلاف آواز اٹھانا منع تھا، یہ عمل اپنی جان و مال عزت و آبرو کو جوکھم میں ڈالنا تھا۔

بعثت کے شروع کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ چھپ کر عبادت کرتے، حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ رکھتے۔ نماز کے وقت کسی گھاٹی (شِعب) میں جا کر عبادت کرتے۔ بعد میں جب دعوت اسلام کا دائرہ خاندان کے باہر ہوا تو آنحضرت ﷺ نے ایام حج کا فائدہ اٹھایا۔ ان دنوں میں شہر مکہ کی طرف مختلف قبائل عرب دوڑے دوڑے چلے آتے تھے۔ مگر نبی ﷺ کو ابھی بھی احتیاط برتنا پڑتا تھا، چنانچہ حضرت علیؓ مسجد حرام کا دورہ لگاتے اور، اللہ کی عطا کی ہوئی صلاحیت اور فطانت سے ان لوگوں کا اندازہ کر لیا کرتے جو حق کی جستجو اور اسلام کی طلب میں مکہ آیا کرتے تھے۔ ان حضرات کی آپ رہنمائی کرتے اور کفار قریش کی نظروں سے بچا کر انھیں نبی ﷺ کی خدمت میں پہونچایا کرتے تھے۔

16.2.3 ہجرت:

مکہ میں ایک ایسا وقت آیا کہ اس شہر میں نبی کریم ﷺ، حضرت ابو بکرؓ حضرت علیؓ کے علاوہ صرف چند معاشی طور پر کمزور مسلمان رہ گئے تھے، جو یا تو کسی مصیبت میں گرفتار تھے یا تو کفار قریش کے حبس (گرفت) میں تھے۔ جب کفار قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمان مدینہ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں کی آبادی میں اسلام پھیل چکا ہے انھیں خیال ہوا کہ حضرت محمد ﷺ اگر مدینہ کو چلے گئے تو اسلام ایک بڑا خطرہ بن جائے گا۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ

پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مشرکین کی اس سازش اوران کے ارادوں سے آگاہ کردیا۔ نبی ﷺ کو جب ہجرت مدینہ کا حکم ہوا آپ ﷺ نے علیؓ کو اپنے بستر اطہر پر، ہجرت کی رات، سونے کا حکم دیا اور مکہ میں رک کر لوگوں کی امانتیں، جو نبی ﷺ کے پاس تھیں، ان کے مالکوں کو پہنچانے کی ذمہ داری دی۔ یہ کام صرف اُس کے حوالے کیا جا سکتا تھا جو ایک بلند عزم شخصیت، مضبوط ایمان والا اور رسول اللہ ﷺ کی بات پر کامل یقین رکھتا ہو۔ وہ شخصیت صرف اور صرف اسداللہ (شیر خدا) تھے۔ مشرکین مکہ کے غصے اور طیش کی حالت میں علیؓ کا قتل کردیا جانا بہت آسان کام تھا، کیوں کے آپ نبی ﷺ کے قریب رشتہ داروں میں سے تھے اور مکہ میں تنہا رہ گئے تھے۔ مگر آپ کے لیے تو نبی کریم ﷺ نے جان کی حفاظت کی ضمانت دیدی تھی: ''تم کو کوئی بھی گزند (نقصان) نہیں پہونچائے گا''۔ حضرت علیؓ مکہ میں تین دن رہے تھے، اور بغیر کسی خوف کے لوگوں کے سامنے آتے جاتے: ''بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے'' (یونس:62)۔ تین دنوں کے بعد آپ چلتے ہوئے مدینہ تشریف لے گئے۔ سواری کا ذکر مشہور روایات میں نہیں ملتا۔ آپ راتوں کو چلا کرتے اور دن کو کہیں چھپ جاتے اور اس طرح آپ قباء پہنچے، وہاں سے آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ دوسری روایت کے مطابق علیؓ مکہ سے براہ راست مدینہ کے لیے نکلے تھے اور جب آپ کی مدینہ میں آمد ہوئی اس وقت نبی ﷺ قباء ہی میں تھے۔

16.3 حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں

ہجرت کے ساتھ مہاجرین کو پہلی بار آزادی کی سانس لینے کا موقع ملا۔ علانیہ اللہ کی عبادت اور احکام شرعیہ پر اطمینان کے ساتھ عمل کرنا ممکن ہوا۔ مہاجرین اپنا گھر بار اور ساز و سامان سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ آئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے مہاجرین اور انصار کو باہم بھائی چارگی میں منسلک کردیا۔ طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ اور ایک انصاری سہل بن حُنَیفؓ کے درمیان مؤاخات کا تعلق قائم کیا تھا۔ یہ سہل بن حنیف اپنے آخری وقت تک حضرت علیؓ کے مخصوص حامیوں میں سے تھے۔ عہد نبوی میں تمام غزوات میں شریک تھے۔ غزوہ احد کے دن نبی کریم ﷺ نے آپ کی بہادری اور قربانی کی تعریف فرمائی تھی۔ جب حضرت علیؓ موقعہ جمل کے لیے نکلے تھے تو آپ نے سہلؓ کو مدینہ پر امیر بنایا تھا۔ کی نماز جنازہ میں حضرت علیؓ نے چار کی جگہ پانچ تکبیرات کیں۔ جب لوگوں نے سوال کیا تو آپ نے جواب دیا کہ بدری ہونے کے ناطے سہل بن حنیف کا فضل دوسروں سے زیادہ ہے۔

اکثر روایات میں آیا ہے کہ مؤ آخات کی مناسبت پر نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کی مؤ آخات خود اپنی ذات سے قائم کی اور فرمایا کہ ''یا علی أنت أخي في الدنيا و الآخرة''، (تو میرا بھائی ہے دنیا اور آخرت میں)۔ لیکن ان روایات کی اسناد پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اسی موضوع پر ایک حدیث سنن ترمذی میں موجود ہے جس کا درجہ حسن بیان کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے۔ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں: (جب اصحاب کے درمیان مؤاخات واقع ہوئی - یعنی ہر ایک کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک بھائی تجویز کیا - تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی فرمایا)۔

مسجد نبوی کی تعمیر: مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، آپ ﷺ کو مسجد تعمیر کرانے کا خیال پیدا ہوا۔ نبی ﷺ نے مسجد اور اس سے لگ کر آپ کے نئے گھر کی تعمیر شروع فرمائی، آپ ﷺ نے خود اس کی تعمیر میں حصہ لیا، تمام صحابہ رفیق کار تھے۔ تعمیر کے دوران عمار بن یاسر نے حضرت علیؓ کو سنا یہ رجز پڑھتے ہوئے: وہ برابر نہیں ہو سکتے: جو مسجد تعمیر کرتا ہے - کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اس مشقت کو برداشت کرتا ہے - اور جو گرد و غبار کے باعث اس کام سے جی چراتا ہے۔

عقد نکاح: آنحضرت ﷺ کو اپنی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء سے بے انتہا محبت اور شفقت تھی۔ مشہور روایتوں کے

مطابق آپ بعثت سے پانچ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں تھیں۔ ہجرت کے وقت آپ کی عمر تقریبا سولہ یا سترہ (۱۶-۱۷) برس کی تھی، اور آپ اپنے والد محمد ﷺ سے بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ ان کے تعلق آپ ﷺ نے فرمایا: فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، مجھے تکلیف دیتی ہے وہ چیز جو اس کو تکلیف دے۔ حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست حضرت علیؓ نے دربار نبی ﷺ میں حیاء اور ادب کے ساتھ کی تھی، حضرت فاطمہؓ کی عمر اس وقت اٹھارہ (18) برس کی تھی۔ عقد نکاح کی درخواست اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی کی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا تھا۔ نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے پوچھا تمہارے پاس مہر ادا کرنے کے لیے کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ آپ کے پاس ایک گھوڑا، ایک تلوار اور ایک زِرہ (یہ آپ کو نبی ﷺ نے بدر کے مال غنیمت میں سے دیا تھا) کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زرہ کو فروخت کر کے مہر ادا کرو۔ اس زرہ کو حضرت عثمانؓ نے خرید لی اور پھر شادی کی مناسبت پر تحفہ کے طور پر انہیں واپس لوٹادی۔ اس مبلغ سے آپ نے مہر ادا کیا اور شادی کی تمام تیاریاں بھی مکمل ہوئیں۔ نکاح کے بعد آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو فرمایا ''میں نے تیرا نکاح ایسے شخص سے کیا ہے جو مجھ کو اپنے اہل بیت میں سب سے زیادہ محبوب ہے''۔

نکاح اور رخصتی کی تاریخ اور ان کے درمیان جو مدت تھی ان دونوں امور کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور قول کے مطابق سنہ۲ ہجری میں عقد ہوا اور کچھ ماہ کے بعد رخصتی رکھی گئی۔ نکاح کے بعد حضرت علیؓ نے نبی ﷺ کے مکان سے قریب ایک گھر کرایہ پر لے لیا تھا۔ سیدہ فاطمہؓ اپنی رخصتی کے بعد اسی گھر میں منتقل ہوئیں۔

ایک بار ابوجہل کی اولاد نے ابوجہل کی بیٹی کا پیغام حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت فاطمہؓ اس خبر سے بے حد غمگین اور ناراض ہوئیں اور آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ اس درمیان لڑکی کے خانداں والے بھی نبی ﷺ سے اس عقد کی اجازت لینے پہنچ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا: ''میں اجازت نہیں دیتا ہوں''، ''فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، وہ چیز مجھے تکلیف دیتی ہے وہ چیز جو اس کو تکلیف دے''۔ حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کی نصیحت پر عمل کیا اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہیں آنے دیا۔

زہد: حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی معیشت انتہائی سادہ، صبر و مشقت کی تھی، آپ کے یہاں اکثر کئی کئی وقت کے فاقہ گزر جاتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کچھ کھانا یا مال جب گھر میں آتا کوئی نا کوئی حاجت مند یا یتیم چوکھٹ آل بیت پر امید باندھے ہوئے کھڑا ہو جاتا اور خالی ہاتھ نہ لوٹتا حتی کہ ''اُکُلَاتٍ یُقِمْنَ صُلْبَه '' تک دے دیتے۔ قرآن کہتا ہے: ''اور وہ اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں'' (الانسان:8)۔ حضرت فاطمہ الزہراءؓ کے انتقال کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب حضرت علیؓ کے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار دینار ہو جایا کرتی تھی۔ پھر بھی آپ کی زندگی میں کچھ نہ بدلا۔ ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں: ''جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بڑے روزہ دار اور عبادت گزار تھے''۔

خاص خدمات: حضرت علیؓ کو رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی پر مکمل یقین اور کامل ایمان تھا۔ رمضان سنہ 8 ہجری میں نبی ﷺ نے فتح مکہ کا ارادہ کیا اور صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ تاکید فرمائی کہ دشمنوں سے یہ مہم پوشیدہ رکھی جائے۔ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمایا اس منصوبہ کے متعلق جس میں قریش کو باخبر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ ان کے ساتھ دو اور صحابہ کو بلا کر فرمایا کہ قریش مکہ کے لیے ایک عورت روانہ ہو چکی ہے، تم لوگ اس کو روضۂ خاخ میں روک لو اور اس کے پاس سے جو خط ہے وہ چھین کر میرے پاس لاؤ۔ آپ تینوں صحابہ گھوڑوں کو سرپٹ بھگاتے ہوئے اس مقام پر پہنچے اور وہ عورت کو روک لیا۔ جب اس سے خط طلب کیا تو اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے خلاف واقعہ بات کہی اور نہ ہم لوگ جھوٹے ہیں لہٰذا تو خط نکال کر ہمیں دے دے ورنہ ہم تجھے برہنہ کر کے تلاشی لیں گے۔ مجبور ہو کر اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں سے وہ خط نکال کر دے دیا۔

شوال سنہ 8 ہجری، فتح مکہ کے بعد، آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کوایک سریۃ پرامیر بنا کر بھیجا بنو جذیمہ کی طرف۔اس سریہ کا مقصد تبلیغ اسلام تھا نا کہ جنگ۔ وہاں خالد بن ولیدؓ نے کچھ لوگوں کو قید کرلیا اور کچھ افراد کو قتل کروادیا۔ جب نبی ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے خالدؓ کے اس فعل سے بہت متفکر ہوئے اور کہا یا اللہ میں خالد کے اس عمل سے لاتعلق ہوں۔آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس غلطی کی تلافی کے لیے فورا روانہ کیا۔حضرت علیؓ نے تمام قیدیوں کو آزاد کیا اور جو قتل ہوئے ان کی دیت ادا کی۔

سنہ 9 ہجری میں غزوہ تبوک کی تیاریاں بڑی اہتمام سے کی جارہی تھیں، یہ ایک اہم جنگ تھی روم اوران کے عرب اتحادیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف یہ جنگ مسلط کی گئی تھی۔حضرت علیؓ نے نبی ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی تھی۔مگر اس موقع پر نبی ﷺ نے آپ کو مدینہ میں اہل البیت کی حفاظت کے لیے مقرر کیا۔حضرت علیؓ کو شرکت جہاد سے محرومی کا غم اور پھر منافقین کی طعنہ زنی نے آپ کو ذہنی اور روحانی تکلیف میں مبتلا کردیا۔

حضور کریم ﷺ کی روانگی کے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور آپ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے آپ کا غم دور کرنے کے لیے فرمایا:’’ أما ترضى أن تكون منّي بمنزلة هارون من موسى ‘‘،(کیا تم اِس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہاری وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی)۔حضرت علیؓ نے کہا: راضی ہوں۔یہ واقعہ صحیح روایات سے منقول ہے۔

سنہ 9 ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حج پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر حج بنا کر تین سو(300) اہل مدینہ کے ساتھ روانہ فرمایا ہی تھا کہ سورۂ برأت نازل ہوئی، آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی عضباء پر نکل جائیں اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکہ جا کر اس سورہ کو قربانی کے دن (10 / ذی الحجہ کو) تمام لوگوں کو سنائیں اور اعلان کردیں کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا، اور اس کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرسکے گا، اور خانہ کعبہ کا طواف کوئی شخص برہنہ نہیں کرسکے گا، اور جس کا نبی کریم ﷺ سے کوئی معاہدہ ہے تو آپ ﷺ اس کو پورا کریں گے۔جب صحابۂ کرام نے نبی ﷺ سے حضرت علیؓ کے انتخاب کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف سے صرف میرے خاندان کا فرد اس کی تبلیغ کرسکتا ہے۔

سنہ 10 ہجری میں نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو یمن کی طرف اسلام کی دعوت دینے کے لیے روانہ کیا۔آپ کی چندروزہ تعلیم کے باعث قبیلہ ہمدان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ جب نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو یمن جانے کا حکم دیا تھا، انہوں نے عرض کیا:’’ آپ مجھے ایسی قوم کی طرف بھیج رہے ہیں جو مجھ سے زیادہ عمر والے (تجربہ کار) ہیں اور میں ایک جوان (ناتجربہ کار) ہوں میں قضاء (لوگوں کے مابین فیصلہ) کرنا نہیں جانتا، تو نبی ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کہا: ’بیشک اللہ تجھے سیدھی راہ پر چلائے گا اور تیری زبان کو مضبوط بنائے گا‘‘‘۔دوسری روایت میں مزید آیا ہے:’’حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد قضاء کے تعلق سے مجھے کبھی کوئی الجھن پیش نہیں آئی‘‘۔

سنہ 10 ہجری میں آنحضرت نے حج کا ارادہ کیا۔ یہ سن کر حضرت علیؓ بھی یمن سے واپس ہوئے اور اس حج (حجۃ الوداع) میں شریک ہوئے۔حج میں اضحیٰ کے دن آپ ﷺ نے کچھ جانور اپنے دست مبارک سے نحر کیے اور علیؓ کو اپنا نائب بنا کر باقی جانوروں کی قربانی ان کے سپرد کردی۔

اہم انتظامی ذمہ داریاں: (1) کاتب وحی، (2) کاتب وثائق رسول اللہ ﷺ، (3) رکن شوریٰ، (4) امیر صدقات (علاقہ : نجران)، (5) امیر سریۃ (فوج کی ایک ٹکڑی - پانچ سے تین سو تک افراد پر مشتمل)۔

خلفاء ثلاثہ کے عہد خلافت میں: حضرت علیؓ کو علم پر استحکام اور قدرت حاصل تھی، آپ کی اسبقیت اسلام، دامادیت رسول اللہ ﷺ، مہارت فقہ اور حاملِ حکمت ہونے کی وجہ سے فضیلت رکھتے ہیں۔تینوں خلفاء کے عہد میں حضرت علیؓ کا مجلس شوریٰ میں وجود ناگزیر تھا۔خلفاء ثلاثہ رضی اللہ

عنہم اپنے اہم معاملات میں آپ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے خواہ وہ امور قضائت سے متعلق ہوں یا انتظامی معاملات سے متعلق ہوں۔اس سلسلہ میں کچھ روایات درج ذیل ہیں، یہ حافظ جلال الدین سیوطی سے منقول ہیں۔

- طلحہ بن عبید اللہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس تقسیم مال کا مسئلہ پیش آیا تو آپؓ نے علیؓ کو فرمایا کہ: آپ کو بھی اپنا مشورہ ضرور دینا ہوگا۔
- حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ) آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ مدینہ شریف میں سب سے زیادہ معاملہ فہم ہیں۔
- حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ سے جب کوئی مسئلہ معتبر ذریعہ سے پہنچے تو اس کے بعد پوچھنے کی ضرورت نہیں۔
- حضرت سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اللہ سے پناہ مانگا کرتے تھے کہ کہیں ایسا معاملہ درپیش نہ ہو جس کا فیصلہ حضرت علیؓ بھی نہ کرسکیں۔
- حضرت سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ مدینہ شریف میں سوائے حضرت علیؓ کے کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکے کہ جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو۔

16.4 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

16.4.1 تولیت اور اسلوب خلافت:

حضرت عثمانؓ پر مصری محاصرہ کرنے والوں نے جو شدت اختیار کی وہ اسلامی اصولوں کے خلاف تھا۔حضرت علیؓ شروع سے ہی اس تصرف کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔آپ نے محاصرین کے پاس جا کر سمجھانے کا کام کئی مرتبہ کیا۔آپ کے مداخلت کے نتیجے معاملہ حل ہو جاتا لوگ وہاں سے ہٹ جاتے، مگر کچھ نیا شوشہ نکل آتا جس سے بات پھر سے بگڑ جاتی۔آپ نے اپنے دو صاحبزادوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے وہاں ٹھہرا دیا تھا، اور بھی صحابہ حفاظت کی نیت سے وہاں مقیم رہے، جن میں سے محمد بن طلحہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ تھے، لیکن مفسدین کا مجمع بہت بڑا تھا اور جب انہوں نے اپنا حملہ کیا تو صحابۂ کرام کو زخمی کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے اور حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔آپ کی شہادت کے بعد اُن لوگوں نے ایک نئے خلیفہ کی بیعت کا مطالبہ کیا۔اہل مدینہ سے یہ کہا کے اگر کوئی نیا خلیفہ نھیں متعین ہوا تو وہ مدینہ میں اپنا مظاہرہ جاری رکھیں گے۔اس دوران کبار صحابہ نے حضرت علیؓ سے بیعت کے قبول کرنے کے لیے اصرار کیا۔آپؓ نے انکار کر دیا اور اپنے گھر میں اپنے آپ کو عزلت نشین کر لیا۔

حضرت حسینؓ نے اپنے والد ماجد سے درخواست کی کہ وہ کچھ وقت کے لیے مدینہ شہر چھوڑ کر مکہ چلے جائیں تا کہ بیعت کو مجبوری میں قبول کرنا نہ پڑے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا حضرت حسینؓ کو خوف تھا۔ مدینہ والوں کا ایک مجمع حضرت علیؓ کے گھر پہنچا اور بیعت کا ہاتھ بڑھانا چاہا۔آپ نے منع کیا اور فرمایا کہ یہ بیعت میں صرف مسجد میں لوں گا جہاں عوام بکثرت سے موجود ہوں۔آپ بیعت نہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو کمزور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ 24 / ذی الحجہ سنہ 35 ہجری کو مسجد نبویؐ میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کے دست اطہر پر بیعت ہوئی۔ چند حضرات کے علاوہ صحابہ کی بڑی اکثریت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، جس کے بعد آپ نے حکمت اور بلاغت کے ساتھ ایک جامع خطبہ دیا۔علماء کا کہنا ہے کہ یہ خطبہ صحیح وقت اور مناسب ترین مقام پر دیا گیا۔حضرت علیؓ نے جن موضوعات پر روشنی ڈالی وہ تمام امور اس حساس وقت کے لیے اہم تھے۔ چند حضرات جنھوں نے بیعت سے انکار کیا: مروان بن حکم، معاویہ بن ابی سفیان اور ان کا حلقہ، سعد بن ابی وقاص۔ وہ حضرات جو بیعت کے وقت مدینہ میں نہیں موجود تھے: ام المؤمنین عائشہؓ، آپ اُس سال حج کے لیے گئیں تھیں، اور مکہ سے واپس نہیں لوٹی تھیں۔

بیعت کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کے سامنے صعوبات اور مشکلات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ایک طرف قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کا دباؤ، دوسری طرف مصریوں کا وہ گروہ جو ابھی بھی مدینہ میں موجود تھا (اگر چہ ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، لیکن آپؓ کا ان لوگوں پر کوئی قابو نہ تھا) اور پھر تیسری طرف فاسد گورنروں اور افسروں کی ایک طویل فہرست جن کی زیادتیوں اور ناانصافیوں نے مسلم مملکت

میں ناراضگی کی لہر پھیلا دی تھی۔

حضرت علیؓ کی شخصیت ایسی تھی کہ کوئی بھی انسان، چاہے کتنا ہی طاقتور ہو، کی یہ جُرأت نہ تھی کہ اُن سے باطل کی تائید میں ذرہ برابر توقع رکھتا۔ بیعت کے بعد آپؓ کی سب سے پہلی کارروائی تمام فاسد گورنروں کو انکے عہدوں سے برطرف کرنا تھا۔ آپؓ نے فرمان جاری کیے اور نئے گورنروں کو تقرر ناموں کے ساتھ روانہ کیا۔ عثمان بن حنیف کو بصرہ بھیجا، عمارہ بن شہاب کو کوفہ، عبیداللہ بن عباس کو یمن، قیس بن سعد کو مصر اور سہل بن حنیف کو بلادشام کو بھیجا لیکن معاویہؓ کے آدمیوں نے اُن کو داخل ہونے سے روک دیا۔ اس واقعہ سے پیشتر حسن بن علیؓ نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں یہ بات رکھی کہ شام کے گورنر معاویہؓ کو فوری معزول کرنے سے فتنہ ہوسکتا ہے۔ حضرت علیؓ نے اُن کو جواب دیا کہ نااہل شخص کو مسلمانوں کے امور پر قائم رکھنا اسلامی اصولوں کے منافی ہے، اور اُن تمام نااہل گورنروں اور منتظمین کو مسلمانوں کے امور کی ذمہ داری سے ہٹانا ہی ہوگا۔ البتہ جن افسروں کو آپؓ نے ایمانداری اور دیانت داری پر قائم پایا اُن کو برقرار رکھا، ان میں سے زیاد بن ابی سفیان جو کہ بصرہ میں بیت المال کے افسر اعلیٰ تھے۔

حضرت علیؓ نے اپنے افسروں کو کئی ہدایتیں دیں: ''بادروا أمر العامة''، (عوام کے معاملات کو پہلے نمٹ لو)، یہ بھی کہتے: ''اِتقوا الله فی عبـــاده''، (اللہ کے بندوں کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرو)۔ فرمایا کرتے کہ: اپنی رعایا کی طرف اپنی توجہ پوری رکھو، اُن سے زیادہ دیر غائب نہ رہو۔ ذمیوں سے جزیہ اور خراج کی وصولی کے سلسلہ میں اپنے افسروں کو فرماتے تھے کہ: ذمیوں سے عفولو، یعنی وہ لو جسے وہ آسانی سے دے سکے۔ وہ شئی جو اس کی ضرورت سے زائد ہو)۔ آپؓ نے وہی شوریٰ کا طریقہ اپنایا تھا جو نبی ﷺ سے آپؓ نے سیکھا تھا۔ ایک دفعہ آپ کی مجلس میں ایک شخص نے آپؓ سے سوال کیا کہ تینوں خلفاء کے دور میں اتنے جھگڑے اور فتنے نہیں پیش آئے جتنے آپ کے دور خلافت میں پیش آرہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اُن کی مدد کرتے تھے مشورہ دے کر اور ہم چاہتے ہیں کے اسی طرح آپ بھی ہماری مدد کریں مشورہ دے کر۔

16.4.2 اہم واقعات:

''پہلے قصاص پھر بیعت'' کا نعرہ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ (سابقین فی الاسلام اور عشرہ مبشرہ بالجنہ میں شامل ہیں) اور حضرت زبیر بن عوامؓ (نبی ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور ابوبکر صدیقؓ کے داماد۔ اور عشرہ مبشرہ بالجنہ میں سے ہیں) کے ذریعہ پھیلا۔ آپ دونوں حضرات بیعت علیؓ میں سبقت والوں میں سے تھے۔ جب تک آپ دونوں حضرات مدینہ میں رہے حضرت علیؓ نے ان کو سمجھانے میں لگے رہے مگر اُن دونوں نے کچھ نہ سنا، اور مدینہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے۔ وہاں مروان بن حکم اور دیگر بنی امیہ بھی موجود تھے، یہ لوگ مدینہ سے فرار ہو کر مکہ میں پناہ گزین تھے، ان کے ساتھ مل کر معاویہؓ نے بیعت علیؓ کے خلاف مزاحمت اور جنگ کا محاذ قائم کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ آپ کی بیعت تمام مسلمانوں پر لازم ہے کیونکہ کبار مہاجرین اور انصار نے اتفاق عام سے آپ کو منتخب کیا تھا، اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ایسی بیعت کو نہ قبول کرنا خلاف شرع ہے اور موجب تعزیر ہے۔ حضرت علیؓ نے معاویہؓ اور عمرو بن العاص کو کئی خط لکھے، لیکن آپؓ کی مصالحت کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ بالآخر صفین کا واقعہ پیش آیا تھا۔

واقعہ جمل: دوسری طرف حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے اپنی حوصلہ افزائی کے لیے ام المؤمنین عائشہؓ کو اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ مکہ سے بصرہ کا رخ کیا۔ بصرہ میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کی دعوت شروع کردی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا یہ عمل نکث بیعت (بیعت توڑنا، عہد برقرار نہ رکھنا) کی دلیل تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اچانک مکہ کے لیے روانہ ہوجاتے ہیں، لیکن اس تنازعہ میں اُن کا موقف غیر جانبدار تھا اور یہ بات انہوں نے حضرت علیؓ کو ظاہر کردی تھی۔ حضرت زبیرؓ کو معاویہؓ نے دعوت دی کے وہ شام آجائیں اور وعدہ کیا کہ اُن کو (یعنی زبیرؓ کو) وہ خلیفہ منتخب کریں گے۔ اس دعوت کو حضرت زبیرؓ نے قبول نہ کیا۔

حضرت علیؓ کو مکہ کی جماعت کے ارادوں کا معلوم ہوا تو آپؓ نے بلا تاخیر بصرہ کا قصد کیا۔ انصار مدینہ نے اُن سے گزارش کی کہ وہ دار الخلافت چھوڑ کر نہ جائیں۔ آپؓ نے انصار کو سمجھایا جس پر وہ راضی ہو گئے اور خلیفہ کا ساتھ دیا۔ حضرت علیؓ مدینہ والوں کے ساتھ عراق کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں آپؓ کو خبر ملی کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بصرہ میں موجود ہیں اور وہاں کے لوگوں نے زبیرؓ کو امیر بنا دیا ہے۔ یہ سن کر حضرت علیؓ ذی قار (کوفہ کے قریب ایک مقام ہے) میں رک گئے، اور وہاں قیام کیا تا کہ کوفہ کو حضرت حسنؓ کو بھیج کر وہاں کے لوگوں کو مرکز کی مدد کے لیے جمع کیا جائے۔ کوفہ سے حضرت حسنؓ کے ساتھ ایک بڑی جماعت مسلح ہو کر ذی قار کے لیے روانہ ہوئی، اور حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہو گئی۔ یہاں سے حضرت علیؓ نے بصرہ کا رخ کیا۔ حضرت علیؓ نے مصالحت کا پیغام لے کر ام المؤمنین عائشہؓ سے ملاقات کی، اس وقت آپ دونوں چاہتے تھے کہ خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے۔ فریقین کی اِن انتھک کوششوں کے نتیجے میں جنگ کے احتمالات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ مگر جماعتوں میں دو ایسے عنصر تھے جو جنگ کروانا چاہتے تھے۔ ایک تو بنی امیہ کے لوگ اور دوسرے وہ شورش پسند جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ اور فساد برپا کیا تھا۔ انہی دو عناصر کی چال میں پھنس کر جماعتوں میں 13 یا 15 / جمادیٰ الاولیٰ سنہ 36 ہجری کو جنگ شروع ہو گئی۔ دوران جنگ حضرت علیؓ نے زبیرؓ کو نبی ﷺ کی پیشین گوئی یاد دلائی جس میں نبی ﷺ نے زبیرؓ کو فرمایا تھا کہ ایک دن تم اس سے (یعنی علیؓ) ناحق لڑو گے۔ یہ سن کر حضرت زبیرؓ میدان جنگ سے نکل گئے، اور ان کو دیکھ کر حضرت طلحہؓ نے حجاز کی طرف لوٹنے کا ارادہ بنا لیا، اس سے پہلے کے طلحہؓ میدان جنگ سے ہٹیں آپ کو مروان بن حکم نے تیر مار کر زخمی کر دیا جس سے وہ بعد میں شہید ہو گئے۔ میدان میں ام المؤمنین عائشہؓ اپنے اونٹ پر سوار تھیں اور آپ کے ارد گرد وفادار بیٹوں کا مجموعہ تھا جو جوش وثبات کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ حضرت علیؓ کو خیال آیا کہ خونریزی کو روکنے ام المؤمنین عائشہؓ کے اونٹ کو بیٹھانا ہی ہوگا۔ اور اسی طرح یہ جنگ ختم ہوئی۔ حضرت علیؓ نے ام المؤمنین عائشہؓ کی ہمراہی کے لیے بصرہ کی معزز چالیس خواتین کو منتخب کیا اور 12000 کی رقم پیش کی اور پورے اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ صحیح ومعقول روایات کے مطابق اس واقعہ میں قریب 3000 لوگ شہید ہوئے تھے جن میں سے تقریباً 500 افراد جیش علیؓ کے تھے۔ واقعہ کے بعد آپؓ کوفہ چلے گئے، جو آپ کا دار خلافت بنا۔

جنگ صفین: یہ دو بڑی فوجوں کے درمیان ایک تنازعہ تھا، نہر فرات کے کنارے میدان صفین میں دونوں فریق نے اپنے اپنے خیمے ربیع الاول سنہ 36 ہجری میں ڈالے، جمادی الاخریٰ میں کچھ نوک جھونک (مناوشہ) کی شروعات ہوئی، یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اشہر حرم میں دونوں طرف نے قتال روک دیا۔ اس درمیان حضرت علیؓ نے مصالحت کرنا چاہا مگر مقابل سے کوئی صحیح جواب نہ ملا۔ ماہ صفر سنہ 37 ہجری کی ابتداء میں عظیم الشان جنگ کا آغاز ہوا اور دوسرے دن جب حضرت علیؓ کا پلہ بھاری ہوتے دیکھا تو معاویہؓ اور عمرو بن العاص نے صلح کا پیغام بھیجا جس میں مناسب شرطیں نہ تھیں چنانچہ حضرت علیؓ نے مصالحت سے انکار کر دیا۔ اگلے ہی دن عمرو بن العاص نے ایک چال چلی جس میں انہوں نے فوج کے مقدمہ پر مصاحف نیزوں پر باندھ کر بلند کروایا اور قرآن پر تحکیم کا نعرہ لگایا۔ یہ سن کر فوج حیدری میں سے ایک لشکر نے جنگ بند کا سختی کے ساتھ اصرار کیا۔ فوج میں فرقے بن گئے اور قریب تھا کہ باہم خون کشت کی نوبت پہنچ جائے۔ عمرو بن العاص کی یہ چال ایسی کامیاب ہوئی کہ حضرت علیؓ کو جنگ بندی پر مجبور کر دیا۔ دونوں فریق کے درمیان بات چیت ہوئی جس کے بعد ''تحکیم'' پر اتفاق ہوا۔ اس درمیان جیش علوی میں سے ایک گروہ الگ ہو گیا، یہ فرقہ ''خوارج'' کے نام سے مشہور ہوا۔ غرض تحکیم کا نتیجہ خلافت علیؓ کی مصلحت میں نہیں تھا، امویوں کا قبضہ شام اور مصر پر قائم رہا، اور عراق، ماوراء النہر اور جزیرۂ عرب پر حضرت علیؓ کی حکومت رہی۔

نہروان: تحکیم سے ناراض ہوئے 12000 / افراد صفین سے واپسی پر فوج حضرت علیؓ سے الگ ہو کر حروراء میں اقامت اختیار کر لیتے

ہیں۔ ان کا شعار تھا ''لاحکم الا اللہ'' اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ معاملات دین میں حکم مقرر کرنا کفر ہے۔ تحکیم میں دونوں حکم (ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص) اور ان کے انتخاب کرنے والے (حضرت علیؓ اور معاویہؓ) کافر ہیں۔ علیؓ کے سمجھانے پر وہ سب کوفہ لوٹ آتے ہیں۔ لیکن جب علیؓ نے تحکیم کے مسئلے پر اپنا فیصلہ قائم رکھا تو وہ جماعت دوبارہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس بار علیؓ کی بیعت توڑ کر نہروان میں جمع ہو جاتے ہیں اور عبداللہ بن وہب الراسبی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ خوارج کا جارحانہ رویہ عوام کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ بالآخر علیؓ کو نہروان کا قصد کرنا ہی پڑا۔ حملہ سے پہلے حضرت علیؓ نے آخری بار اس جماعت کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں ہدایت دی اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہا، اس پر ایک بڑا مجموعہ خارجیوں کا الگ ہو کر شہر لوٹ جاتا ہے ایک دوسرا گروہ توبہ کر کے علیؓ کی فوج میں مل جاتا ہے، اب میدان میں تقریباً 3000/ خارجی باقی رہ جاتے ہیں جو سب کے سب جان باز تھے۔ لشکر حیدری کے حملہ کے بعد چند استثناء کے علاوہ پوری جماعت ہلاک ہوگئی۔

16.4.3 حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

17/ رمضان 40ھ ہجری کو آپ رضی اللہ عنہ صبح کے وقت مسجد کوفہ میں نماز ادا کر رہے تھے اچانک پیچھے سے آپ کے سر مبارک پر ایک خارجی عبدالرحمٰن بن عمرو عرف ابن ملجم الحمیری ثم الکندی نے مسموم (زہر آلود) تلوار سے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ پر یہ قاتلانہ وار راستے میں ہوا جب نماز فجر کے لیے مسجد جا رہے تھے۔ زہر کا اثر آپؓ کے جسم اطہر میں پھیلنے لگا اور دو یا تین دن بعد 20/ رمضان کو نماز فجر کے وقت آپؓ کی شہادت ہوئی۔ آپ کی عمر اس وقت 63 سال تھی ''توفی علی بن أبی طالب وھو ابن ثلاث وستین''۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے تجہیز و تکفین کی۔ والد ماجد کی ہدایت کے مطابق صاحبزادوں نے مکان تدفین کا اعلان نہیں کیا، چنانچہ محل ومقام دفن پر کوئی متفق رائے نہیں ہے۔

اس قتل کے منصوبہ میں ابن ملجم کے ساتھ دو اور خارجی شامل تھے بُرَک بن عبداللہ التمیمی اور عمرو بن بکر التمیمی۔ ان کو اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا تھا، جن کا حضرت علیؓ نے جنگ نہروان میں قتل کیا تھا۔ ان کو یقین تھا کے عالم اسلامی میں تمام جھگڑے، فتنہ و گمراہی کے تین سربراہ ہیں جن کا قتل کرنا شرعاً واجب ہے، حضرت علیؓ، عمرو بن العاصؓ اور معاویہؓ۔

تینوں نے آپس میں عہد کیا اور قسم لی کہ کوئی اس معاہدہ کو نہیں توڑیگا یہاں تک اپنی اپنی ذمہ داری پوری نہ کر دے یا خود ہلاک نہ ہو جائے۔ طے کیا کہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو ہر شخص اپنی مقررہ جگہ میں رات گزارے جہاں اس کو اپنا کام نافذ کرنا ہے۔ حسب مصادر تینوں اپنے اپنے مقررہ شہر کے لیے روانہ ہو گئے اور دوسرے ساتھیوں (یعنی خوارج) سے بھی اپنے اس ارادہ کا اظہار نہیں کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ سازش خوارج کے سرداروں کی بنائی گئی تھی، اور انہوں نے ہی چنا مذکورہ تین لوگوں کو اس حملہ کے لیے۔ بہر حال صرف ابن ملجم قتل کرنے میں کامیاب ہوا، باقی دو کا حملہ ناکام رہا۔ حملہ کے وقت ابن ملجم نے خوارج کا مشہور نعرہ لگایا ''لا حُکْمَ اِلّا لِلّٰہِ''، (حکومت صرف اللہ کی ہے)۔

حضرت علیؓ نے اپنے قاتل کے متعلق اپنے دونوں فرزندوں کو ہدایت دی کہ یہ تمہارا قیدی ہے، اسلامی اصول کے مطابق، اس پر سختی نہ کرنا، جو خود کھانا وہ اسے کھلانا اور اس کو نرم بستر پر سلانا۔ اگر میں اس علت سے نکل گیا تو اس سے معاف کرنے اور قصاص لینے کا مجھے اختیار حاصل ہوگا، لیکن اگر میں اس علت سے مر گیا تو اس سے قصاص لینا۔ حضرت علیؓ نے اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔

16.5 حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضائت اور علم

حضرت علیؓ فقہ اور اجتہاد دونوں میدانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے کئی امتیازات میں سے ایک یہ بھی ہے: ذہن کی تیزی اور اُس کا

سُرعت کے ساتھ حکم کے ماخذ کی طرف منتقل ہونا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا کہ: ''أقضانا علی ''،(ہم میں سب سے بڑا فیصلہ کرنے والا علی ہے)۔ذیل میں آپ کے چند مشہور فیصلوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس کا چھ ماہ میں وضع حمل ہوگیا، آپ نے اس کے رجم کا ارادہ کیا تو اُن سے حضرت علیؓ نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' وحمله و فصاله ثلاثون شهراً ''(اس کے حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس مہینے ہیں)۔حضرت علیؓ کا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اقل حمل چھ ماہ ممکن ہے چناچہ رجم ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اور موقع پر ایک عورت کو زنا کے جرم میں لایا گیا، حضرت عمرؓ نے رجم کا حکم دیا، حکم کی تعمیل کے لیے اس عورت کو لیجایا جا رہا تا کہ راستہ میں حضرت علیؓ نے سوال کیا کہ اس عورت کو کہاں لے جارہے ہو؟ لوگوں نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ کا بتایا۔حضرت علیؓ نے اُن کو واپس بھجوادیا اور حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ یہ عورت مجنونہ ہے، اور اللہ نے مجنون کو مرفوع القلم (غیر مکلّف) قرار دیا ہے۔حضرت عمر بن الخطابؓ کہا کرتے تھے کہ: اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

جب حضرت علیؓ یمن میں تھے ایک واقعہ پیش آیا، ایک گہرے گڑھے میں (جو اس لیے کھودا گیا تھا کہ اس میں شیر کا شکار کیا جائے) چار آدمیوں کی لاشوں کو پایا گیا۔اوّل ایک شخص گرا جس نے گرتے وقت دوسرے سے لپٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے، اس طرح چاروں اندر گر گئے اور ان کی موت شیر کے زخمون سے ہوگئی۔مقتولوں کے وارثین میں جھگڑا ہوا قریب تھا کہ قتال شروع ہو جاتا۔حضرت علیؓ نے ان کو اپنا فیصلہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس فیصلہ سے مطمئن نہیں ہے تو وہ نبی ﷺ کے پاس جا کر فیصلہ کروالیں۔حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اُن سب قبائل سے جنھوں نے گڑھا کھودا تھا جمع کرو 1/4 دیت اور 1/3 دیت اور 1/2 دیت اور ایک کامل دیت۔سب سے پہلے گرنے والے کی دیت (1/4)، اس کے بعد گرنے والے کی دیت (1/3)، اس کے بعد والے کی دیت (1/2) اور چوتھے کی پوری دیت۔اس فیصلہ کو وارثین نے نہیں قبول کیا۔یہ لوگ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور پورا واقعہ آپ کو سنایا اور حضرت علیؓ کا فیصلہ بھی پیش کیا۔آپ ﷺ نے علیؓ کے فیصلہ کو جائز رکھا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے ایک مقدمہ کا ذکر کیا گیا جس میں علیؓ نے اپنا فیصلہ دیا تھا، اس کو سن کر آنحضرت ﷺ خوش ہوئے اور فرمایا کہ: ''اللہ کا شکر ہے جس نے ہم (اهل البيت) میں حکمت رکھی''۔

حضرت علیؓ قرآن اور سنت نبی ﷺ کے سب سے بڑے اور جلیل القدر عالم تھے۔ابن عساکر سے منقول ہے کہ: ''حضرت علی کا ذکر آپ (حضرت عائشہؓ) پاس آیا تو آپ نے فرمایا: ان کی حالت تو یہ ہے کہ اُن سے زیادہ کوئی شخص سنّت کا جاننے والا نہیں ہے'' (ترجمہ: الفضائل)۔

حدیث میں تحریری کاموں میں صحیفۂ علیؓ قابل ذکر ہے۔حضرت علیؓ نے فرمایا: ''ہم نے نبی ﷺ سے قرآن اور اس صحیفہ کے سوا کچھ نہ لکھا''۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ: ''پوچھ لو مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں واللہ کوئی آیت نہیں مگر میں اُس کا حال بخوبی جانتا ہوں کہ وہ رات میں نازل ہوئی یا دن میں میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ میں''۔آپ رضی اللہ عنہ کی مصحف کا ذکر بھی ملتا ہے جس میں آپؓ نے قرآن مجید کو شأن نزول کی ترتیب سے آیات اور سوروں کو جمع فرمایا تھا۔

فتوحات کے ذریعہ مشرق اور مغرب کے متعدد مملک اسلامی حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ان ممالک کے باشندوں میں عربی زبان نہیں بولی جاتی تھی۔عربی زبان کو دنیا کے اس نئے خطہ میں رائج کرنے میں مسلمان علماء کا بڑا ہاتھ رہا۔اس سلسلہ میں مؤرخین کا کہنا ہے کہ امیر المؤمنین علیؓ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے عربی زبان کے اصول و قواعد اور علم نحو کے ابتدائی مسائل درج کیے، آپ کے تحریرات میں سے یہ بھی تھا: ''الكلام

کلمہ اسم وفعل وحرف ... ''۔ایک مرتبہ آپ رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود الدؤلی کونحو کے اصول املا کرائے اوران کو ہدایت دی کہ وہ اسی طرز پر دیگر قواعد لکھیں، '' **قال لی: 'اُنح هذاالنحو'** ''، (آپؓ نے کہا: اسی طرز پر چلو)، یہیں سے اس علم کا نام نحو پڑا۔ دوسری روایت میں آیا ہے ''**قال لی: زده وتتبعه**''، (آپ نے کہا: 'اسی طرز پر مزید لکھو)، (عبقریت امام علی، عباس العقاد)۔

16.6 آل علی رضی اللہ عنہ

اہل البیت (آل البیت): حضرت علی بن ابی طالب باتفاق العلماء اہل البیت میں شامل ہیں۔مباہلہ کے روز نبی ﷺ نے حکم الٰہی کے مطابق اپنے خاندان کو لے کر میدان مباہلہ میں تشریف لے آئے۔آنحضرت ﷺ نے صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو شامل کیا تھا۔کتب تفسیر میں (سورۃ آل عمران، آیت 61 کے تحت) اس واقعہ کی تفصیل ملتی ہے۔

تجرید بخاری میں کتاب الصلح کے تحت ایک روایت ملتی ہے: ''اور حضرت علی سے فرمایا تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں''، یہ ایک صحیح حدیث ہے۔سورۃ احزاب کی آیت (33) میں اہل البیت کا لفظ استعمال ہوا ہے: ''اے نبی کے گھر والو (أهل البيت)! اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے پلیدی کو دور کرے-گناہوں سے محفوظ رکھے- اور خوب پاک صاف کردے)۔اس آیت میں اہل بیت سے کیا مراد ہے؟ کئی روایتوں میں اس کی صراحت ملتی ہے۔درج ذیل حدیث ترمذی کی حسن صحیح ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی آپ ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو جمع فرما کران کو اپنی چادر میں لے لیا اور دعاء فرمائی: ''اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، تو ہر قسم کی ناپاکی سے ان کو دور رکھ اوران کو پاک کردے''۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ: کیا آل البیت اسی مقدس جماعت پر محدود ہے؟

- اہل اسلام کا ایک فرقہ لفظ اہل البیت کا اطلاق اوپر ذکر کردہ صرف اسی پاک دامن جماعت پر کرتا ہے۔
- بعض اہل العلم کا ماننا ہے کہ لفظ ''آل البیت'' میں ازواج مطہرات، یعنی امہات المؤمنین، بھی شامل ہیں، اور سورۃ احزاب کی آیت 32، 33 اور 34 سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ آیت میں مخاطبت دراصل ازواج مطہرات سے ہے اوراس طرح وہ اہل بیت کے مفہوم سے ازواج مطہرات کو خارج نہیں کرتے۔
- تیسرا گروہ کا کہنا ہے کہ آل البیت سے مراد ازواج النبی ﷺ، آل علیؓ، آل جعفرؓ اور آل عقیلؓ ہے۔

ازواج اور اولاد: حضرت فاطمۃ الزہراءؓ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں، ان کی زندگی میں حضرت علیؓ نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ان سے ابناء (بیٹے) حسنؓ، حسینؓ اور محسنؓ ہوئے، اور بنات (لڑکیاں) زینبؓ اور ام کلثومؓ ہوئیں۔علماء اور مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ کے صرف پانچ بیٹوں سے آپ کا سلسلۂ نسل جاری ہے: حسنؓ، حسینؓ، محمد بن حنفیہؒ، عباسؓ اور عمرؒ۔آپ کے انتقال کے وقت آپ کے نکاح میں چار ازواج تھیں امامہ بنت ابی العاص، فاطمہ بنت حزام، اسماء بنت عمیس اور لیلی بنت مسعود التمیمیہ۔

حسنؓ - ان سے آپ کی کنیت ''ابوالحسن'' ہوئی۔ان کا نام علیؓ نے حمزہ رکھا تھا (اپنے چچا کے نام پر)، نبی ﷺ بدل کر حسن کیا۔

حسینؓ - ان کا نام علیؓ نے جعفر رکھا تھا (اپنے بڑے بھائی کے نام پر)، نبی ﷺ نے بدل کر حسین کیا (فضائل: امام احمد)۔

محسنؓ - ان کا انتقال ولادت کے بعد ہو گیا تھا۔

زینبؓ - آپ کربلاء میں موجود تھیں، حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ دمشق لے جائی گئیں، یزید کے دربار میں آپ نے اور پھر حضرت علی زین العابدین بن الحسین نے جو خطبہ دیا تھا اس نے دمشق کے عوام کو عظمت اہل بیت نبی ﷺ کا احساس دلایا۔

ام کلثومؓ - ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا تھا۔

حضرت علیؓ کی دوسری ازواج اوران سے اولاد:

- خولہ بنت جعفر بن قیس الحنفیہ سے اولاد: محمد اکبر، مشہور نام محمد بن حنفیہ، آپ زاہد، صاحب قوت، شجاع، ممتاز قائد، فصیح اور عالم تھے۔
- صہباء بنت ربیعہ (ام حبیبہ) سے اولاد: عمر (بیٹا)، اور رقیہ (بیٹی)۔
- امامہ بنت ابی العاص (بنت زینب بنت النبی ﷺ) سے اولاد: محمد اوسط (بیٹا)۔
- ام البنین فاطمہ بنت حزام سے اولاد: عباسؓ، عثمانؓ، جعفرؓ، عبداللہؓ (بیٹے)۔
- لیلی بنت مسعود التمیمیہ سے اولاد: ابوبکرؓ، عبیداللہؓ (بیٹے)۔
- اسماء بنت عمیس سے اولاد: یحییٰؓ اور محمدؓ (بیٹے) ایک روایت میں عون بن علی بھی۔
- ام سعید بن عروہ سے اولاد: رملہؓ اور ام الحسنؓ (بیٹیاں)۔
- محیاۃ بنت امرئ القیس سے اولاد: ام یعلی (بیٹی)، ان کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔

16.7 اکتسابی نتائج

- نبی ﷺ کے زیر نظر میں حضرت علیؓ کی تعلیم اوراخلاقی تربیت کا فیض جاری رہا، نیز آپ بہت کم سن میں کمال پر پہنچ گئے تھے۔
- ہجرت کی رات علیؓ نبیؐ کے بستر اطہر پر سو گئے تھے، اور مکہ میں رک کر لوگوں کی امانتیں، جو نبیؐ کے پاس تھیں، ان کے مالکوں کو پہنچایا تھا۔
- نبی ﷺ حضرت علیؓ کو اپنے خاندان کا فرد مانتے تھے۔ چنانچہ علیؓ کا انتخاب فرمایا حج میں قبائل عرب کو تبلیغ کرنے کے لیے۔
- عہد نبویؐ میں علیؓ کئی انتظامی ذمہ داریوں کے حامل تھے: کاتب وحی، کاتب وثائق نبیؐ، رکن شوریٰ، امیر صدقات، امیر سریہ۔
- حضرت علیؓ کو علم پر استحکام اور قدرت حاصل تھی اور تینوں خلفاء کے عہد میں حضرت علیؓ کا مجلس شوریٰ میں وجود نا گزیر تھا۔
- عمرؓ اللہ سے پناہ مانگا کرتے تھے کہ کہیں ایسا معاملہ درپیش نہ ہو جس کا فیصلہ علیؓ بھی نہ کر سکیں۔
- حضرت علیؓ کو کبار مہاجرین اور انصار نے اتفاق عام سے منتخب کیا تھا۔
- دو امور پر حضرت علیؓ کو غم اور افسوس ہوتا تھا: واقعہ جمل جس میں کئی اہل الاجتہاد شہید ہوئے، اور واقعہ نہروان کے بعد مسلمانوں کا جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تثاقل (بوجھل ہو کر زمین پر رُک جانا)۔

16.8 کلیدی الفاظ

بازوں	:	بازو (جسم انسان میں) کہنی سے کندھے تک کا حصہ
زِرہ	:	فولادی لباس جو دوران جنگ جسم کی حفاظت کے لیے عام لباس کے اوپر پہنا جاتا ہے
طیش	:	(عقل کا) ہلکا پن، ناسمجھی
فطنت	:	ذہانت، دانائی، سمجھ
گھاٹی	:	عربی میں شِعْب، اس کا جمع شِعَاب۔ مثال: شعاب مکہ، شعاب ابی طالب یا بنی ہاشم، وغیرہ
مخاض	:	درد زہ (وہ تکلیف جو حاملہ کو ولادت سے کچھ دیر پہلے شروع ہوتی ہے)، ''فأجاء ها المخاض'' (مریم:23)

مُسْتَضْعِف : ضعیف، کمزور

السبطین : سِبطُ یعنی پوتا یا نواسہ (نواسہ کے لیے زیادہ مستعمل ہے، پوتے کے لیے 'حفید' ہے)، (نبی ﷺ کے دونواسے)

السابقون الاوّلون : وہ حضرات جو ابتدائی دور میں اسلام لے آیے تھے۔ جن میں علیؓ، ابوبکرؓ، زید بن حارثہؓ، خدیجہ الکبریٰؓ شامل ہیں

16.9 نمونہ امتحانی سوالات

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

		a	b	c	d
.1	موقعہ جمل کس شہر میں واقع ہوا:	کوفہ	بصرہ	طائف	مکہ
.2	صفین کس نہر کے کنارے ہے:	دجلہ	نیل	فرات	تمام غلط
.3	حضرت علیؓ کا دار خلافت کیا تھا؟	کوفہ	مدینہ	بصرہ	حران
.4	علیؓ کی شہادت کس شہر میں ہوئی؟	بصرہ	نجران	کوفہ	مدینہ
.5	علیؓ کہاں کے امیر الصدقات تھے؟	شام	عراق	بحرین	نجران

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

.1 آل البیت سے مراد واضح کرتے ہوئے آل علیؓ پر روشنی ڈالیے۔

.2 حضرت علیؓ کی قضائت اور علم پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

.3 حضرت علیؓ کی تولیت خلافت پر نوٹ لکھیے۔

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

.1 حضرت علیؓ کی حیات اور خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔

.2 حضرت علیؓ کی خلافت کے اہم واقعات کا تعارف کرائیے۔

.3 حضرت علیؓ کی شہادت پر روشنی ڈالیے۔

16.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

.1	خلفائے راشدین	:	حاجی معین الدین ندوی
.2	تاریخ الخلفاء	:	حافظ جلال الدین سیوطی (ترجمہ: شبیر احمد انصاری)
.3	المرتضیٰ	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (اردو)
.4	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (جلد4)	:	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (archive.com)
.5	الفضائل	:	مولانا محمد انورالدین صدیقی
.6	تاریخ مدینہ دمشق	:	الحافظ ابی القاسم علی (ابن عساکر) (عربی)
.7	فضائل امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؓ	:	امام احمد بن حنبل کی کتاب کی منتخب روایات (مرتبہ: خسرو قاسم)

۔:oOo:۔

اکائی 17 : خلافت راشدہ کا نظم ونسق اور خصوصیات

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید
17.1 مقصد
17.2 خلافت راشدہ کا نظم ونسق
17.2.1 خلیفہ
17.2.2 شوریٰ
17.2.3 فوج کا محکمہ
17.2.4 سیکرٹریٹ
17.2.5 محکمہ مالیات
17.2.6 ڈاک کا محکمہ
17.2.7 بیت المال
17.2.8 محکمہ عدالت
17.2.9 پولیس اور جیل کے محکمے
17.3 خلافت راشدہ کا معاشرہ
17.3.1 کثیر قومی اسلامی معاشرہ
17.3.2 غالب خیر پر مبنی معاشرہ
17.3.3 بے جا طبقاتی تقسیم سے پاک معاشرہ
17.4 خلافت راشدہ کی خصوصیات
17.4.1 اسلامی جمہوری حکومت
17.4.2 بین الاقوامی حکومت اور عالمی طاقت
17.4.3 قانون کی بالا دستی
17.4.4 معاشی عدل
17.4.5 ملک گیری نہیں دبے کچلے لوگوں کو انصاف کی فراہمی
17.4.6 سماجی برابری

17.4.7 اخلاق وتعلیم

17.5 اکتسابی نتائج

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

17.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

17.0 تمہید

اس سے پہلے کی اکائیوں میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کا ادارہ کیسے وجود میں آیا، اس کے ارتقائی مراحل کیا رہے، خلفاء راشدین کا انتخاب کن طریقوں سے عمل میں آیا، ان کی سیرت اور ان کے کارناموں کے بارے میں بھی ہم نے ضروری معلومات حاصل کی۔ اِس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ خلافت راشدہ کے دوران اسلامی ریاست کا نظم ونسق کیسا تھا؟ خلافت راشدہ کے مسلم معاشرے کی صورت حال کیا تھی اور یہ بھی کہ خلافت راشدہ کن خصوصیات کی حامل تھی؟

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ خلافت راشدہ کے نظم ونسق کے بارے میں جان سکیں، انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ خلافت راشدہ کا نظم ونسق کیسا تھا؟ کون سے ادارے تھے جن کے ذریعہ خلافت راشدہ کا نظم ونسق چلتا تھا اور ان کی کیا ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔ اسی طرح اس اکائی کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے سماج اور معاشرے کی ایک تصویر آپ کے سامنے آجائے اور وہ یہ جان سکیں کہ اسلامی تاریخ کا بہترین معاشرہ کیسا تھا؟ اس اکائی کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس اکائی کے ذریعہ آپ خلافت راشدہ کی خصوصیات کو تفصیل سے جان سکیں گے۔

17.2 خلافت راشدہ کا نظم ونسق

ہجرت مدینہ کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کو اس کا موقع ملا کہ وہ مدینہ کو مرکز بنا کر ایک ایسے مثالی معاشرے اور ریاست کی تشکیل کریں جو انسان کے خالق و مالک کو مطلوب ہے اور جس کے لیے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ چنانچہ مدینہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران آپ ﷺ نے اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ اور ریاست قائم کر کے عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔ نبی ﷺ نے مدینہ میں مسلم معاشرے کے لیے جو سیاسی ڈھانچہ تیار کیا تھا اور جن خطوط پر نوتشکیل اسلامی ریاست کی تنظیم کی تھی، آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں (خلفاء راشدین) نے انہیں خطوط پر معاشرے اور ریاست کو آگے بڑھایا۔ ریاست میں توسیع کے ساتھ حالات اور تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے خلفاء راشدین نے ریاستی انتظام وانصرام سے متعلق مختلف شعبہ جات اور محکمے قائم کیے، تاکہ ریاست کے نظم ونسق میں کسی طرح کا خلل واقع نہ ہونے پائے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ خلافت راشدہ کے پورے زمانے میں مرکزی انتظامیہ اکابر صحابہ کرام پر مشتمل رہی۔

حالانکہ نبی ﷺ نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا، البتہ آپ نے اپنے ساتھیوں کی تربیت اس انداز میں کی تھی اور

ان کے سامنے اپنی زندگی میں ایسے عملی نمونے پیش فرمائے تھے کہ جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے خود ہی سمجھ لیا کہ اسلام کا مزاج شورائی ہے اور انہیں آپ ﷺ کے بعد آپ کا جانشین اسی طریقے پر منتخب کرنا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین میں سے ہر ایک کا انتخاب شورائی طریقے پر صحابہ کرام کے ذریعہ باہم رائے ،مشورے سے عمل میں آیا۔ اور خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے خلافت اسلامی کے شورائی مزاج کو باقی اور برقرار رکھا۔ ذیل کی سطور میں خلافت راشدہ کے نظم ونسق کے حوالے سے ان اداروں کی تفصیل دی جا رہی ہے جو ریاست کو چلانے کے لیے اس دوران وجود میں آئے اور جن کے سبب خلافت راشدہ نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں ایک مثالی ریاست بن کر ابھری بلکہ آیندہ زمانوں کے لیے بھی مثالی ثابت ہوئی۔

17.2.1 خلیفہ:

خلیفہ کو اسلامی ریاست میں سب سے اہم پوزیشن حاصل تھی، وہ ریاست کا پہلا شہری (First Citizen) ہوتا تھا۔ اسلامی خلافت کے انتظامی ڈھانچے میں خلیفہ کو سب سے زیادہ اہمیت اس لیے بھی حاصل تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی جانشین ہونے کی حیثیت سے اسے دنیوی اور سیاسی امور میں مکمل اختیارات حاصل تھے۔

خلیفہ اسلامی ریاست اور حکومت دونوں کا سربراہ اعلی ہوتا تھا۔ شوری اور اہل الرائے کے مشورے سے اسے صوبائی گورنروں، ججوں اور مقامی وصوبائی افسروں و دیگر اہل کاروں کو مقرر کرنے اور معزول کرنے کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ عدالتی اختیار کے حوالے سے خلیفہ کو ججوں کے تقرر کے ساتھ ان کے فیصلوں کے خلاف سماعت کا اختیار بھی حاصل تھا اور وہ کسی بھی جج کے فیصلے کو بدل سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اسلامی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ بھی ہوتا تھا، فوجی کارروائی کب کہاں اور کیسے ہونی ہے یا نہیں، یہ فیصلہ بھی خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اسے انتظامی امور میں قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل تھے، البتہ اس کے لیے اسے قرآن وسنت سے استفادہ کرنا، شوریٰ اور علما وفقہا کی رائے لینا اور اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہنا ضروری تھا۔ اسی طرح وہ عام لوگوں کے مصالح اور مفادات کے خلاف بھی کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

17.2.2 شوریٰ:

خلافت راشدہ کے تحت اسلامی ریاست میں خلیفہ کے بعد انتظامیہ کا سب سے اہم ادارہ شوریٰ تھا، کیونکہ قرآن وسنت میں جگہ جگہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ انہیں اپنے تمام کام باہم مشورے سے انجام دینے چاہیے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے اہم معاملات میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ لہٰذا خلیفہ اسلام کے لیے ضروری تھا کہ وہ ریاست اور سماج کے تمام معاملات کو مسلمانوں کے باہمی مشورے سے انجام دے۔ خلفاء راشدین میں سے ہر ایک نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ خلفائے راشدین کو مشورہ دینے کے لیے اصحاب رائے صحابہ کرام کی ایک کمیٹی ہوتی تھی، جن سے وہ اہم امور میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں سے زیادہ تر اکابر صحابہ خاص طور پر اولین اہل ایمان اور اصحاب بدر واحد وغیرہ شوریٰ کے رکن ہوتے تھے۔ البتہ یہ کلیہ نہیں تھا بلکہ صلاحیت کی بنیاد پر بعض دیگر صحابہ کو بھی اہل شوری میں شامل کیا گیا، مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ان کی نوعمری کے باوجود محض ان کی ذہانت وفطانت کو دیکھتے ہوئے اپنی مجلس شوری کا رکن بنایا تھا حالانکہ اس فیصلے پر بعض صحابہ کرام کو تردد تھا۔

خلفاء راشدین میں سے کسی نے بھی عام لوگوں پر اپنی رائے تھوپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان لوگوں نے عوام کو رائے کے اظہار کی پوری پوری آزادی دی۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو مسجد نبوی میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اعلان کیا کہ 'اگر میں کتاب وسنت کی پابندی نہ کروں تو لوگوں پر میری اطاعت لازم نہیں'۔ حضرت عمرؓ کا قول مشہور ہے: ''لا خلافة الا عن المشورة '' (مشورے کے بغیر خلافت کا کوئی تصور نہیں)،

انھوں نے ہر سطح پر اظہار رائے اور مشورے کی حوصلہ افزائی کی۔حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا مسجد میں لوگوں کو جمع کرتے اور ان کے سامنے مسئلے کو پیش کر کے اس پر لوگوں کی رائے طلب کرتے۔کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ کسی مسئلے پر بحث طول پکڑ لیتی اور کئی دنوں تک جاری رہتی۔تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کو مسلسل اور بے جا تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا، اس کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اظہار رائے کی آزادی کا گلا نہیں گھونٹا، بلکہ ہمیشہ اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی عوام کے مجمعے میں صفائی دی۔

چونکہ پہلے تین خلفاء راشدین کا دارالحکومت مدینہ رہا تھا اس لیے فطری طور پر شوریٰ میں اہل مدینہ اور اطراف مدینہ کے قبیلوں کے شیوخ کی نمائندگی ہوتی تھی۔اس کے بالمقابل حضرت علیؓ کے زمانے میں چونکہ دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا، اس لیے ان کی شوریٰ میں کوفہ اور اطراف کے اصحاب رائے کا غلبہ تھا۔شوریٰ میں کون لوگ شامل ہوں گے اس سلسلے میں خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ اصحاب رائے میں سے جن لوگوں کو چاہے اپنی شوریٰ میں رکھے۔عام حالات میں خلیفہ شوریٰ کی رائے کا احترام کرتا ہے اور اپنے فیصلوں میں اسے ملحوظ خاطر رکھتا ہے لیکن ہر معاملے میں اس کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں، غیر معمولی حالات میں وہ شوریٰ کے بعض فیصلوں کو نظر انداز بھی کر سکتا ہے۔

17.2.3 فوج کا محکمہ:

فوج کسی بھی ریاست کی اولین اور اہم ضرورت ہوتی ہے۔اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی ریاست قائم کی تو فوج کا محکمہ بھی قائم کیا۔خلفاء راشدین کے زمانے میں فوج کے محکمے کو مزید ترقی دی گئی اور کئی مقامات پر باضابطہ فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں، مثلاً حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں کوفہ، بصرہ اور فسطاط میں فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں۔خلفاء راشدین کے زمانے میں فوج کی بھرتی سے لے کر ان کی تنخواہ اور مال غنیمت کی تقسیم تک تمام نظم و نسق اس محکمہ کے تحت ہوتا تھا۔موقعِ جنگ پر سپہ سالار کون ہو؟ فوج کی تنظیم کیسی ہو؟ کن لوگوں کو کمان دار یا سالار بنایا جائے؟ مال غنیمت کیسے تقسیم ہو؟ غرض فوج سے متعلق تمام امور و معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی اسی محکمہ کی ذمہ داری ہوتی تھی۔مرکزی سطح پر خلیفہ اور صوبوں میں والی (گورنر) اس محکمہ کے سربراہ ہوتے تھے۔لیکن کبھی کبھی الگ سے بھی فوج کے محکمہ کا سربراہ مقرر کیا جاتا تھا اور یہ امیر الجند کہلاتا تھا، مرکزی سطح پر فوج کے محکمے کو دیوان الجند کہا جاتا تھا۔

17.2.4 سیکرٹریٹ:

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا یہ شعبہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا گو الگ سے اسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔آپؐ نے اپنے زمانے میں متعدد کاتبوں (سکریٹریوں) سے سرکاری فرمان، خطوط اور معاہدے وغیرہ لکھوائے مثال کے طور پر وہ خطوط جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حکمرانوں کو اسلام کی دعوت کے لیے لکھوائے یا وہ معاہدے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبیلوں سے کیے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط اور معاہدوں کو مشہور اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب 'الوثائق السیاسیۃ' میں جمع کر دیا ہے۔خلافت راشدہ کے زمانے میں یہ محکمہ زیادہ منظّم اور مستحکم ہوا۔خلفاء راشدین نے متعدد لوگوں کو اپنا خاص سکریٹری بنایا، مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں حضرت عثمانؓ ان کے کاتب خاص(Special Secretary) تھے۔حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن ارقمؓ کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی۔حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں مروان بن حکم ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔حضرت علیؓ حضرت سعید بن حمران اور عبداللہ بن جعفر سے سکریٹری کا کام لیا کرتے تھے۔خلافت راشدہ میں یہ عہدہ بہت ہی اہمیت کا حامل تھا اور اس شعبے کی موجودگی کے سبب ہی اسلامی سرکاری فرامین، خطوط اور معاہدوں کے متن کو تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں محفوظ کیا جا سکا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں سکریٹری کا عہدہ بہت ہی اہم ہوتا تھا اور اسے موجودہ دور کے چیف سکریٹری جیسی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ عام طور پر سرکاری خطوط اور فرامین خلیفہ خود ہی لکھوادیا کرتا تھا اور ان پر سرکاری مہر بھی خود ہی لگاتا تھا۔ البتہ کئی بار یہ ذمہ داری مناسب ہدایات کے ساتھ خلیفہ سکریٹری کے سپرد کردیتا تھا اور سرکاری مہر بھی اس کے حوالے کردی جاتی تھی۔ یہ سرکاری مہر دراصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی (خاتم نبوی) تھی جو چاندی کی بنی ہوئی تھی اور جسے آپ ﷺ پہنے رہتے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس انگوٹھی کو خلفا خود پہنے رہتے تھے یا جیسا کہ بتایا گیا کبھی کبھی اسے سکریٹری کے حوالے بھی کردیا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں یہ خاتم نبوی ان کے ہاتھ سے مدینہ کے ایک کوئیں بئر اریس میں گر گئی اور تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملی۔ بعد کے خلفا نے اپنی مہریں خود بنوائیں۔ سیکریٹریٹ کے لیے 'دیوان الرسائل' کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔

17.2.5 محکمہ مالیات:

مالیات کو کسی بھی ریاست کے نظم ونسق میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ریاست مدینہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں مالیات جیسے کسی محکمے کی تشکیل ہمیں نظر نہیں آتی، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی فتح خیبر کے بعد مدنی ریاست میں مالیات کا محکمہ قائم ہو چکا تھا اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ خزرجی اس محکمہ کے پہلے انچارج افسر تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مالیات کا محکمہ نہ صرف یہ کہ قائم رہا، بلکہ اس میں مسلسل توسیع وترقی ہوتی رہی۔ جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ دراز ہوا اور مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا تو مالیات کے محکمے میں بھی بہت زیادہ وسعت آئی۔ خاص طور پر مسلم حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں صوبوں کی تشکیل کے ساتھ محکمہ مالیات کا کام بہت پھیل گیا، ہر صوبے میں مالیات کے محکمے قائم ہوئے جو ان صوبوں میں خراج وزکوٰۃ وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ مرکزی محکمہ مالیات صوبائی محکموں کو ہدایات جاری کرتا، ان کی دیکھ ریکھ اور نگرانی کا کام کرتا تھا۔ اس محکمے کا کام تمام طرح کی محصولات مثلاً مسلمانوں سے زکوٰۃ وصدقات، عشرو نصف عشر وغیرہ اور غیر مسلموں اور ذمیوں سے خراج و جزیہ وغیرہ کو وصول کرنا اور ان کا حساب کتاب رکھنا تھا۔ اسی طرح مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی کی تقسیم وترسیل وغیرہ کی ذمہ داری بھی اسی محکمے کی ہوتی تھی۔ خلافت راشدہ کے دوران مالیات کے محکمے کو 'دیوان الخراج' کے نام سے جانا جاتا تھا، دیوان الخراج صوبوں اور مرکز دونوں سطح پر ہوتے تھے۔

17.2.6 ڈاک کا محکمہ:

ڈاک کا محکمہ ابتدائی طور پر خلافت راشدہ کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے قائم کیا اور اسے اولیات عمر (یعنی وہ کام جن کا آغاز سب سے پہلے حضرت عمر نے کیا) میں شمار کیا جاتا ہے۔ شروع میں یہ محکمہ صرف سرکاری ڈاک کے لیے خاص تھا۔ اس محکمے کا کام یہ ہوتا تھا کہ سرکاری فرامین اور خطوط وغیرہ کو صوبائی گورنروں اور دیگر افسران وکارکنان تک پہنچایا جائے اور ان کے جوابات حاصل کیے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ مرکزی خلافت کو مختلف امور ومسائل میں فیصلے کرنے اور انہیں متعلقہ حکام وافسران تک پہنچانے اور پھر ان پر عمل درآمد میں تاخیر نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح خلیفۂ وقت ڈاک کے محکمے کے ذریعے خلافت کے دور دراز علاقوں سے بھی بہ آسانی رابطے میں رہتا تھا۔ اس کام کے لیے مختلف مقامات تک جانے والی سڑکوں پر چوکیاں قائم تھیں جہاں ہر وقت تازہ دم گھوڑے اور محکمہ ڈاک کے کارکن موجود رہتے تھے اور کوئی بھی خط یا فرمان ملتے ہی اسے دوسری چوکی تک پہنچا دیتے تھے۔ اس طرح کم مدت میں خطوط اور فرامین متعلقہ حکام تک پہنچ جاتے تھے۔ اس محکمے کو 'دیوان البرید' کہا جاتا تھا۔

17.2.7 بیت المال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی زکوۃ وصدقات اور خراج کی صورت میں جو بھی مال آتا تھا فوراً ضرورت مندوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس دوران مستقل خزانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، حالانکہ ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت صدیقی میں ایک مکان کو بیت المال کے طور پر خاص کیا گیا تھا، لیکن چونکہ مال آتے ہی اسے عام مسلمانوں میں تقسیم کر دینے کی نبوی روایت حضرت ابوبکر صدیق نے بھی جاری رکھی تھی، اس لیے یہ مکان اس دوران خالی ہی پڑا رہتا تھا اور اس میں کسی طرح کے مال کی آمد نہیں ہوتی تھی۔ البتہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں فتوحات کی کثرت کی وجہ سے مال غنیمت، خراج اور زکوۃ وصدقات وغیرہ کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خزانے یا بیت المال کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی چنانچہ انہوں نے اپنی شوری کی منظوری سے ایک بہت بڑا بیت المال (خزانہ) قائم کیا۔

حضرت عمر نے ضرورت مندوں اور مستحقین میں مال کو تقسیم کرنے کے بعد اضافی مال کو محفوظ کرنے کے لیے دار الخلافہ مدینہ میں بیت المال کی باضابطہ عمارت تعمیر کرائی، اس کی نگرانی کے لیے افسر بیت المال کا تقرر ہوتا تھا۔ مرکزی بیت المال کی شاخیں صوبوں اور اضلاع میں بھی قائم کی گئیں اور ہر جگہ ان میں جداگانہ افسر مقرر کیے گئے۔ مرکزی اور صوبائی بیت المالوں میں حساب کتاب کے لیے باضابطہ رجسٹر ہوتے تھے جن میں آمد و خرچ کا اندراج ہوتا تھا۔ بیت المال کا محکمہ آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے علاوہ اس پر بھی نظر رکھتا تھا کہ خلیفہ وقت مال کو اصول وضابطے کے مطابق خرچ کرتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح صوبائی اور اضلاع کے بیت المالوں میں مختلف ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اس میں سے مقامی بیت المال کے مصارف کے بعد جو رقم بچ جاتی تھی اسے سال کے آخر میں مرکزی بیت المال کو منتقل کر دیا جاتا تھا۔

17.2.8 محکمہ عدالت:

عدالت کا محکمہ کسی بھی ریاست میں اس کے شہریوں کے عدل وانصاف کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست مدینہ قائم کی تو اس میں عدالتی نظام بھی قائم کیا جس میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت انہیں خود حاصل تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی حضرت عمرؓ مدینہ کے قاضی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ عدلیہ کا یہ نظام خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی جاری رہا اور خلیفہ ہی قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوا کرتا تھا۔ لیکن حدود مملکت بڑھ جانے کی وجہ سے وہ تمام مقدمات کی سماعت اور فیصلے خود نہیں کر سکتا تھا اس لیے مملکت کے مختلف شہروں میں باصلاحیت لوگوں کو قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانے میں بھی مدینہ کے قاضی کا عہدہ حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ اور جب خود حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت علیؓ کو مدینہ کا قاضی مقرر کیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت زید بن ثابتؓ مدینہ کے قاضی تھے اور حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں قاضی شریح بن الحارث کو کوفہ کا قاضی برقرار رکھا جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے وہاں اس عہدے پر کام کر رہے تھے۔ دراصل عدالت کا محکمہ مرکز سے دور کے شہروں اور علاقوں کے لیے زیادہ اہم تھا کیوں کہ مرکز سے دور دراز کے علاقوں میں عدل وانصاف کو یقینی بنانا اور وقت پر فیصلے کرنا خلیفہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ خلافت راشدہ کے دوران ان کی اکثریت صحابہ کرام کی تھی اور یہ سبھی قرآن وسنت اور فقہ (اسلامی قانون) کے بڑے عالم ہوتے تھے۔

17.2.9 پولیس اور جیل کے محکمے:

پولیس اور جیل کے محکمے خلافت راشدہ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں وجود میں آئے۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں پولس کا بنیادی کام امن و امان کو قائم رکھنے کے علاوہ احتساب کرنا بھی تھا۔احتساب کے دائرے میں وہ تمام امور آتے ہیں جن کا تعلق مفاد عامہ سے ہو یا شریعت اسلامی کے احترام سے ہو،مثلا پولس کا کام یہ یقینی بنانا تھا کہ دوکان دار ناپ تول میں کمی نہ کریں،کوئی بھی شخص عام راستے پر مکان نہ بنائے، جانوروں پر ان کی سکت سے زیادہ سامان نہ لادا جائے،شراب کی خرید وفروخت نہ ہو۔(بعد میں احتساب اور بازار کی نگرانی وغیرہ کے علاحدہ محکمے قائم کیے گئے) پولیس کے محکمے کا نام احداث تھا اور اس کا افسر اعلیٰ صاحب الاحداث کہلاتا تھا۔حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا صاحب الاحداث مقرر کیا تھا۔حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں پولس کے محکمے کو مزید ترقی اور تقویت دی گئی اور اس کا نیا نام ''شرطہ'' رکھا گیا جو اب تک عرب دنیا میں رائج ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت سے پہلے مسلم دنیا میں جیل خانے نہیں تھے۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں مجرموں کی اصلاح کے مقصد سے اسلامی دنیا میں پہلی جیل قائم ہوئی۔انہوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت صفوان بن امیہؓ کے مکان کو خرید کر پہلا جیل خانہ بنایا۔بعد میں دیگر مقامات خاص طور پر صوبائی دارالحکومتوں میں بھی جیل خانے تعمیر کیے گئے۔

اس کے علاوہ بعض دیگر محکمے بھی وجود میں آئے مثلاً احتساب کا محکمہ جس کی ذمہ داری عمال کی کارکردگی کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے اخلاق اور دینی حالات پر نظر رکھنی ہوتی تھی۔مملکت میں ذمیوں کے حالات پر نظر رکھنے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک الگ محکمہ قائم تھا اور اس کا ایک الگ افسر مقرر ہوتا تھا۔اسی طرح آب پاشی کا محکمہ بھی قائم تھا اور بازار پر نظر رکھنے اور قیمتوں وغیرہ کی نگرانی کے لیے ایک الگ محکمہ قائم تھا۔مرکز کی طرز پر یہ سبھی محکمے صوبوں میں بھی قائم کیے جاتے تھے اور ان کی نگرانی کے لیے افسروں کا تقرر گورنر کرتا تھا۔

17.3 خلافت راشدہ کا معاشرہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں جس معاشرے کی تشکیل کی تھی وہ بنیادی طور پر ایک عرب معاشرہ تھا۔عرب معاشرے کے بارے میں یہ بات ہم پہلے ہی جان چکے ہیں کہ وہ ایک قبائلی معاشرہ تھا اور عرب قبائل کے اصول واقدار ہی اس معاشرے کو بنیاد فراہم کرتے تھے۔اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں قبائلی معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کی اور اسے اسلامی اصولوں اور تعلیمات سے آراستہ کر کے اسلامی معاشرے میں تبدیل کر دیا۔عربوں کے علاوہ عرب علاقوں میں سکونت پذیر کچھ یہودی،عیسائی اور مجوسی قبائل بھی تھے جو دیگر مذاہب سے متعلق ہونے کے باوجود وسیع تر اسلامی معاشرے کا حصہ تھے۔

17.3.1 کثیر قومی اسلامی معاشرہ:

چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اسلامی ریاست کی حدود عرب علاقوں تک ہی محدود رہی تھیں،اس لیے اسلامی معاشرے میں اکا دکا غیر عرب لوگوں کی شمولیت کے باوجود عہد نبوی کا معاشرہ بنیادی طور پر عرب معاشرہ ہی رہا۔خلافت راشدہ کے دوران جب فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا تو بڑے پیمانے پر غیر عرب علاقے بھی اسلامی ریاست کا حصہ بنے۔ان علاقوں میں ایرانی، مجوسی،ترکی قبطی، بربر اور بودھ مذہبی روایات کے ماننے والے لوگ آباد تھے،ان لوگوں کے مذہبی عقائد سے لے کر رہن سہن،لباس،زبان وغیرہ بہت ساری چیزیں عربوں سے مختلف تھیں۔اسلامی فتوحات کے بعد ان علاقوں میں رہنے والے لوگ بھی اسلامی معاشرے کا حصہ بن گئے۔حالانکہ مفتوحہ علاقوں میں عام لوگوں کی ایک تعداد نے اسلام قبول کر لیا،البتہ بڑی تعداد نے ذمی بن کر رہنے کو ترجیح دی۔ان نسلی و مذہبی طبقات کے علاوہ مختلف زبانیں بھی اسلامی معاشرے کا حصہ بنیں

اورانہوں نے اس کی رنگا رنگی میں اضافہ کیا، خاص طور پر فارسی، پہلوی، ترکی، سیریائی، قبطی اور عبرانی زبانوں کا رول اس میں بہت اہم رہا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلامی معاشرہ عرب معاشرے سے آگے بڑھ کر ایک کثیر قومی یا بین الاقوامی معاشرے کی شکل اختیار کر گیا جس میں مختلف نسلوں، رنگوں، مذہبوں اور قومیتوں کے لوگ شامل تھے، ان سب کو اسلامی اصول وضوابط کے تحت حقوق و اختیار حاصل تھے مگر اسلامی اصول واقدار کا رنگ غالب تھا۔

17.3.2 غالب خیر پر مبنی معاشرہ:

عہد خلافت راشدہ میں ایک طرف اسلامی معاشرہ روز افزوں وسعت و ترقی پذیر تھا تو دوسری طرف اس کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ کرام جو نبوی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے اور اکثریت میں تھے وہ رفتہ رفتہ اقلیت میں آ گئے۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکابر صحابہ کی تعداد میں بھی کمی آتی گئی اور ان کی جگہ اصاغر (نوعمر) صحابہ اور تابعین نے لے لی۔ بڑے پیمانے پر ہونے والی فتوحات کے نتیجے میں وہ لوگ بھی اسلامی ریاست اور معاشرے کا حصہ بن رہے تھے جن کی اسلامی تربیت نہیں ہوئی تھی یا بہت کم ہوئی تھی؛ یہ وہ لوگ تھے جو اسلام کے مقابلے میں غیر اسلامی روایات اور اپنے سابقہ مذہبی ورثے سے زیادہ متاثر تھے۔ عراق، شام، مصر اور ایران کے علاقوں میں ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے جو یا تو اپنی سابقہ مذہبی روایتوں پر عمل پیرا تھے یا پھر انھوں نے اسلام قبول تو کر لیا تھا لیکن سابقہ مذہبی رسوم وعقائد سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح خلافت راشدہ کے دوران عہد نبوی کی مہاجرین وانصار کی تقسیم بھی اب اپنی معنویت کھوتی جا رہی تھی، یہ دونوں طبقے روز بروز کم ہو رہے تھے اور ان کی جگہ دوسری شناختیں (مثلاً عراقی، ایرانی، شامی، مصری وغیرہ) لے رہی تھیں۔

خلافت راشدہ کا معاشرہ غالب خیر پر مبنی معاشرہ تھا اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اختلافات کے باوجود خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے میں گروہی وقبائلی تعصّبات اور علاقائیت پرستی کو کبھی بھی رسوخ حاصل نہیں ہوا۔ خلافت راشدہ میں سماجی مساوات اور برابری معاشرے کی روح تھی، رنگ ونسل یا کسی بھی دوسرے امتیاز کے سبب کسی کو کسی پر فوقیت یا برتری حاصل نہیں تھی، صرف مسجد میں ہی نہیں معاشرے میں بھی بطور مسلمان سب کو یکساں حقوق اور مراعات حاصل تھیں۔ نسل، علاقے، قوم اور زبان کی بنیاد پر مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ سیاسی مناصب ہوں، فوجی عہدے ہوں یا دینی امور کی انجام دہی، یہ ذمہ داریاں انہیں افراد کو دی جاتی تھیں جو اس کے اہل ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کے مخصوص سماجی وسیاسی حالات میں قریش اور عرب کے بعض دوسرے طبقات اپنی انتظامی صلاحیتوں کے سبب سیاسی مناصب پر سب سے زیادہ فائز ہوئے، اس طرح خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرہ میں قریش کا انتظامی ذمہ داریوں میں غلبہ تھا، البتہ یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ایسا کسی تعصب یا بے جا حمایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صلاحیتوں اور خدمات کی بنیاد پر تھا۔

17.3.3 بے جا طبقاتی تقسیم سے پاک معاشرہ:

حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے من جملہ مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسانوں کے درمیان مختلف وجوہ سے جو طبقاتی تقسیم وجود میں آ گئی تھی اور جس میں انسان ہی انسانوں کا خدا بن بیٹھا تھا، انسانی سماج کو اس ناجائز تقسیم سے آزادی دلائی جائے۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شرافت ورذالت کی انسانی تقسیم کو ختم کرنے کے متعدد اقدامات کیے اور بالآخر انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزادی دلا کر اخوت ومساوات پر مبنی معاشرہ قائم کیا۔ عہد خلافت راشدہ میں بھی اسلامی معاشرہ انہیں عناصر پر مشتمل رہا جن پر کہ عہد نبوی میں تھا۔ آزاد لوگوں کے علاوہ غلام، آزاد کردہ غلام (موالی) اور عجمی نژاد مسلمان بھی خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرہ کا اہم حصہ تھے۔ اسی طرح غیر مسلم بھی مکمل مذہبی و

سماجی آزادی کے ساتھ اسلامی معاشرے کا حصہ تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے طبقہ کو جو درجہ اور مرتبہ اسلامی معاشرہ میں دیا تھا، خلافت راشدہ میں بھی وہ مرتبہ انہیں حاصل رہا۔ یہ لوگ اپنے مخصوص احوال کے سبب سیاسی وفوجی مناصب تو نہیں حاصل کر سکتے تھے، لیکن علوم وفنون کے میدانوں میں انہیں ترقی کرنے کے سنہرے مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ اسلامی علوم کو پروان چڑھانے اور اس دور کے تہذیب وتمدن کی تشکیل میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے سبب اہم رول ادا کیا، اور بہت سارے میدانوں میں آزاد عربوں سے آگے بڑھ گئے۔ اسی طرح خواتین کے طبقے کو بھی خلافت راشدہ میں وہ تمام حقوق حاصل تھے جو انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حاصل تھے۔ خواتین نے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ازواج مطہرات، دیگر صحابیات اور ان کی تربیت یافتہ تابعات نے اپنی صلاحیتوں اور خدمات سے اسلامی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے ارتقا میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ان کی شاگردہ عمرہ بنت عبدالرحمان وغیرھا خواتین کا جو کردار رہا ہے وہ ہمیشہ زریں حروف میں لکھا جائے گا۔ اس طرح دیکھا جائے تو خلافت راشدہ کا اسلامی معاشرہ عہد نبوی کے اسلامی معاشرے کی توسیع تھا اور اس میں نبوی معاشرے کی خصوصیات بحیثیت مجموعی موجود اور غالب تھیں۔

17.4 خلافت راشدہ کی خصوصیات

نبی ﷺ کے زمانے میں اسلام صرف عرب دنیا کے اندر پھیلا تھا۔ خلافت راشدہ کے دوران اسلامی حکومت کی سرحدیں عرب دنیا سے بہت آگے تک پھیل گئیں، ایران وخراسان، شام ومصر اور افریقہ تک کے دور دراز علاقے خلافت راشدہ کا حصہ بن گئے۔ اس دوران ہی خلافت راشدہ نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کی اور ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ خلافت راشدہ کے تیس برس کے دورانیے میں اسلامی سماج نے چوطرفہ تعمیر وترقی کے مراحل طے کیے۔ اسلام کے سیاسی واجتماعی نظام کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور ایک بے مثال اسلامی تمدن وجود میں آیا۔ اس طرح یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اسلام جس پیغام کا علم بردار ہے وہ صرف عرب کے بدوی سماج کے لیے ہی مناسب وموزوں نہیں بلکہ اس کی بنیاد پر دنیا میں کہیں بھی جدید ترین تہذیب وتمدن کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ ذیل میں خلافت راشدہ کی کچھ خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:

17.4.1 اسلامی جمہوری حکومت:

ایک ایسے دور میں جب کہ دنیا کے ہر علاقے اور خطے میں خاندانی اور جبری بادشاہتیں قائم تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے زیر سایہ عرب کے بدو سماج میں ایک مستحکم اور اقدار پر مبنی نظریاتی ریاست کی تشکیل کی، ایک ایسی حکومت قائم کی جو نظم وقانون کی پابند تھی اور جس میں عام آدمی سے لے کر حکمراں تک ہر ایک جواب دہ اور ذمہ دار تھا۔ ایک ایسے تمدن اور تہذیب کی بنیاد استوار کی جو بہترین انسانی قدروں کا حامل تھا اور جس میں عوام وخواص یکساں طور پر شامل تھے۔ انہوں نے اپنے بعد ایک ایسا معاشرہ چھوڑا جس کے افراد کو یہ معلوم تھا کہ اسلام کا مزاج ملوکیت وبادشاہت نہیں بلکہ جمہوریت کا تقاضا کرتا ہے:

> ''خلافت راشدہ میں جو سیاسی نظام قائم تھا اگر چہ وہ جمہوریت کی ٹھیٹ مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوری نظام نہ تھا، کیونکہ اس میں حاکمیت اور اقتدار اعلی عوام کو حاصل نہ تھا، لیکن اپنی روح کے لحاظ سے وہ ہر دور کی جمہوریت کے مقابلے میں زیادہ جمہوری تھا۔ حتی کہ جدید مغربی اور اشترا کی حکومتوں کے مقابلے میں بھی زیادہ جمہوری تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظام میں حاکمیت صرف اللہ کو حاصل تھی۔ اللہ

اور رسول کے بعد عوام کو سارے حقوق حاصل تھے اور وہ قرآن وسنت کے مقرر کردہ رہنما اصولوں کے دائرے میں مکمل طور پر بالادستی رکھتے تھے۔ اللہ کی اس حاکمیت نے خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے کو نہ صرف ان مظالم اور ناانصافیوں سے نجات دلادی تھی جو شخصی اور استبدادی حکومتوں کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس قسم کے مظالم، بے انصافیوں اور گمراہیوں سے بھی نجات دلائی جو جدید دور میں عوام کی حاکمیت کے نام پر عام ہیں اور جن کی وجہ سے نہ صرف دوسری قوموں کو نقصان پہنچتا ہے، بلکہ خود اپنی قوم بھی نقصان اٹھاتی ہے۔''

(ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد اول، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، 2003ء ص115)

چنانچہ نبی ﷺ کے بعد کے اسلامی معاشرے میں ہر سطح پر جمہوریت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خلفاء راشدین میں سے ہر ایک نے خود کو عوام کے سامنے جواب دہ بنایا۔ انہیں حقوق اور آزادیاں دیں اور انہوں نے اسلامی سماج کے اندر جمہوریت کی روح کو جاری وساری رکھنے کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو جمہوریت کی روح کے تقاضوں کے مطابق عام لوگوں کے مجمعوں میں لوگوں نے خلفاء تک سے جواب طلب کیے اور خلفا نے بھی ان پر چیں بہ جبیں ہونے کے بجائے خندہ پیشانی سے ان کی بات سنی اور جواب سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ قانون کی نظر میں سبھی یکساں اور برابر تھے۔

17.4.2 بین الاقوامی حکومت اور عالمی طاقت:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکومت اور معاشرہ اپنے زمانے میں تشکیل دیا تھا وہ جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں تک محدود تھا۔ خلافت راشدہ کے دوران اسلامی حکومت اور سماج دونوں نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر فتوحات حاصل ہوئیں۔ شام، مصر، افریقہ، ایران، خراسان اور افغانستان وغیرہ کے علاقے اسلامی حکومت کا نہ صرف یہ کہ حصہ بنے بلکہ بہت سارے مسلمانوں نے ان علاقوں میں بود وباش اختیار کر لی اور بڑی تعداد میں مقامی لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ خلافت راشدہ کے دوران جب مسلمانوں نے شام اور ایران جیسی اس زمانے کی بڑی طاقتوں (سپر پاورز) پر غلبہ حاصل کر لیا تو پہلی مرتبہ اسلامی حکومت کو عالمی طاقت کی حیثیت بھی حاصل ہوئی اور جو بعد کے ادوار میں بھی صدیوں برقرار رہی۔

17.4.3 قانون کی بالادستی:

خلافت راشدہ کی ایک اہم اور بڑی خوبی قانون کی بالادستی تھی، یعنی قانون کی نظر میں سب لوگ نہ صرف یہ کہ یکساں اور برابر تھے بلکہ قانون لوگوں کے تمام طرح کے حقوق کی حفاظت بھی کرتا تھا اور اس بات کی ضمانت فراہم کرتا تھا کہ ریاست کے کسی بھی شہری کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ پوری اسلامی ریاست میں عدالتیں قائم تھیں اور ان میں قاضی (خلافت راشدہ کے دوران جج کو قاضی کہا جاتا تھا) مقرر ہوتے تھے جن کے سامنے لوگ اپنے مقدمات پیش کرتے تھے اور یہ قاضی کسی دباؤ کے بغیر آزادی کے ساتھ فیصلے کرتے تھے، یہاں تک کہ خلیفہ اور گورنروں کے خلاف بھی مقدمات کی سماعت کا اختیار انہیں حاصل ہوتا تھا، وہ انہیں اپنی عدالت میں طلب کر سکتے تھے، ان کے خلاف مقدمے کی سماعت کر سکتے تھے اور ان کے خلاف فیصلہ بھی دے سکتے تھے۔

خلافت راشدہ کے دوران قانون کی بالادستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں خود ان کے

صاحب زادے (ابوشحمہ) کے خلاف عدالتی کارروائی ہوئی اور جرم ثابت ہونے پر انہیں کوڑوں کی سزا بھی دی گئی۔حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ایک خارجی کو پکڑ کرلایا گیا جو برسرعام کہہ رہا تھا کہ میں علیؓ کو قتل کردوں گا۔حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیا کہ اس کی مخالفت صرف زبانی ہے عملاً اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے اسے سزا دی جائے۔

یہاں ایک بات یہ بھی واضح رہے کہ خلیفہ صرف اپنی ذات تک ہی قانون کی بالادستی کو یقینی نہیں بناتا تھا بلکہ صوبے کے گورنروں اور دیگر حکام کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے زیرانتظام علاقوں میں قانون کی حکمرانی قائم کریں اور عام لوگوں کے حقوق کی حفاظت کریں،اس حوالے سے ان کی جواب دہی بھی طے کی جاتی تھی۔چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر سال حج کے دنوں میں مکہ میں حاضر رہا کریں تا کہ لوگوں کو ان کے خلاف اگر کوئی شکایت ہو تو اس کا ازالہ کیا جا سکے۔واضح رہے کہ حج کے دنوں میں پوری اسلامی مملکت سے لوگ حج کے لیے مکہ پہنچتے تھے،لہٰذا اس موقعے پر ان کے لیے اپنی شکایتیں خلیفۂ وقت تک پہنچانا آسان ہوتا تھا۔

17.4.4 معاشی عدل:

اسلام عدل کا مذہب ہے اور اسلامی ریاست اپنی حدود کے اندر ہر سطح پر عدل وانصاف کا خیال رکھتی ہے۔چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ریاست مدینہ میں ہر سطح پر عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔مدنی ریاست کی ایک بہت بڑی خوبی معاشی عدل وانصاف تھا۔ریاست کی یہ خوبی خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی باقی رہی اور ریاست کی وسعت کے باوجود خلفاء نے ہمیشہ وسائل کی منصفانہ تقسیم پر زور دیا، کیونکہ معاشی عدل کے بغیر کوئی بھی معاشرہ تعمیر وترقی کی منزلیں نہیں طے کرسکتا۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے پورے زمانے میں حکومت کی آمدنی کو سماج کے مختلف طبقات میں اور رفاہی کاموں میں صرف کیا جاتا تھا۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں وظائف کا جو نظام شروع ہوا وہ ایک حقیقی رفاہی مملکت کے قیام کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ زمانے تک اسے کسی بھی رفاہی مملکت کے لیے نمونہ اور ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔وظائف کا یہ نظام خلافت راشدہ کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔خلافت راشدہ کے دوران اسلامی حکومت کی آمدنی کے سات بڑے ذرائع تھے:

1. زمینوں کا خراج
2. جزیہ (یہ دونوں ٹیکس غیر مسلموں سے لیے جاتے تھے)۔
3. عشر (ایک طرح کا زرعی ٹیکس جو زراعت پیشہ مسلمانوں پر عائد ہوتا تھا)۔
4. زکوٰۃ (یہ دونوں ٹیکس یعنی عشر اور زکوٰۃ مسلمانوں سے لیے جاتے تھے)۔
5. مال غنیمت (چونکہ اس زمانے میں بڑے پیمانے پر فتوحات ہوئیں اس لیے مال غنیمت بھی سرکاری آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا، واضح رہے کہ مال غنیمت کا صرف پانچواں حصہ ہی سرکاری بیت المال میں جاتا تھا، چار حصے فوجیوں میں تقسیم کردیے جاتے تھے)۔
6. کنوز ومعادن (یعنی زمین سے نکلنے والی معدنیات اور دفینے) اگر یہ کسی شخصی ملکیت والی زمین میں سے بھی نکلتے تو اس کا 20% حصہ بیت المال کا حق ہوتا تھا)۔
7. عشور، یہ ایک طرح کا تجارتی ٹیکس تھا جو اسلامی ریاست میں تجارت کرنے والے ریاست سے باہر کے غیر مسلم تاجروں سے لیا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کے تحت انہیں اپنے مال تجارت کا دسواں حصہ اسلامی ریاست کو ادا کرنا ہوتا تھا۔حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اس ٹیکس کو اس

لیے لاگو کیا گیا کہ غیر مسلم علاقوں میں مسلمان تاجروں کو بھی اس طرح کا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔

مذکورہ ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے پہلے مقامی ضروریات پوری کی جاتی تھیں اور جو رقم بچ رہتی تھی اسے سال کے آخر میں مرکزی بیت المال میں جمع کرادیا جاتا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں بیت المال قوم کی امانت ہوتا تھا۔ خلفاء اور حکام اس کے نگراں اور ذمہ دار ہوتے تھے۔ اور اس کی آمدنی کو اپنے اوپر خرچ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی تنخواہیں مقرر ہوتی تھیں جن سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کفالت حکومت کی ذمہ داری تھی۔ غیر مسلم رعایا میں بھی جو لوگ کسی وجہ سے اپنے اخراجات پورے کرنے کے اہل نہیں تھے ان کی کفالت بیت المال (سرکاری خزانے) سے کی جاتی تھی۔

17.4.5 ملک گیری نہیں، دبے کچلے لوگوں کو انصاف کی فراہمی:

اسلام ملک گیری، اقتدار اور شہرت کے حصول کے لیے جنگ کو جائز نہیں کرتا، اس کا نظریہ جنگ دفاع اور ظلم و استحصال کے خاتمے کے ساتھ مربوط ہے اور اسی لیے اسلام کے لیے جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ اسلام نے جنگ میں وحشت و بربریت کو منع کیا ہے اور انسانی جان کی حرمت اور تحفظ کے لیے قوانین بنائے ہیں۔ جنگ سے متعلق اسلامی قوانین اور اصولوں کی عہد خلافت راشدہ میں مکمل پابندی کی گئی۔ خلافت راشدہ کے دوران حالانکہ اسلامی ریاست کے حدود میں بہت زیادہ توسیع ہوئی اور بڑے پیمانے پر جنگیں بھی لڑی گئیں البتہ اس دوران جنگ کی تباہ کاریوں کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے تو ایران اور مصر میں جاری جنگوں کو بھی محدود کرنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ عراق کے بعد ایران کے علاقے میں جنگ پھیلے، اسی طرح مصر پر لشکر کشی کا حکم بھی انہوں نے مجبوری میں دیا تھا۔ اپنے دور خلافت میں انہوں نے بحری مہمات کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔

جنگ اور اصول جنگ کے حوالے سے پہلے خلیفہ راشد سیدنا حضرت ابوبکر صدیق کی وہ نصیحت انسانی تاریخ کا لازوال ہدایت نامہ ہے جس میں انہوں نے شام کی لشکر کشی کے موقعے پر اپنے کمانڈر اسامہ بن زید کو کچھ ہدایات دی تھیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

1. کسی طرح کی بددیانتی نہ کرنا
2. کسی کا مثلہ نہ کرنا
3. پھل دار درخت نہ کاٹنا
4. نخلستان نہ جلانا
5. عیسائی راہبوں اور عبادت گزاروں کو قتل نہ کرنا
6. مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا
7. چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا
8. بغیر ضرورت بکری اور اونٹ ذبح نہ کرنا
9. آبادیوں کو ویران نہ کرنا
10. بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دی جانے والی ان ہدایات کا نتیجہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دوران ہونے والی فتوحات کے بعد نہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی، نہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، نہ کہیں قتل عام ہوا، نہ کہیں آبادیوں کو لوٹا اور اجاڑا گیا اور نہ کہیں عورتوں کی عزت و آبرو پر حملہ کیا گیا۔ اس کے برعکس خلافت راشدہ کے دوران ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شخص کے کھیتوں کو اسلامی فوج سے نقصان پہنچا تو اس نے خلیفہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور خلیفہ وقت (حضرت عمرؓ) نے اسے اس کا ہرجانہ دلوایا۔

17.4.6 سماجی برابری:

خلافت راشدہ کے اسلامی معاشرے میں سماجی برابری کا دور دورہ تھا۔ رنگ، نسل، علاقے، قومیت اور زبان کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان

کسی طرح کا کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔سماج میں رہنے والے تمام مسلمانوں کو یکساں اور برابر کے سماجی، معاشی، سیاسی اور دینی حقوق حاصل تھے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا درجہ برابر تھا۔ مسجد اور معاشرے میں ہر جگہ ان کو یکساں مقام حاصل ہوتا تھا۔ ہر مسلمان کو سماج میں رہتے ہوئے کام کرنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل تھے اور اس میں کسی کے ساتھ کسی طرح کا کوئی تعصب نہیں برتا جاتا تھا۔

اسلام نے غلاموں اور موالی جیسے طبقات کو جو درجہ اور مقام عطا کیا اس کے نتیجے میں انہیں علوم وفنون کے میدان میں خاص طور پر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے سنہرے مواقع ملے اور انہوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کو بنانے اور سنوارنے میں بھرپور حصہ لیا۔ اسی طرح خواتین کا طبقہ جو ہمیشہ سے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حقوق سے محروم چلا آتا تھا، اسلام نے جب انہیں یہ حقوق دیئے تو عہد نبوی کی طرح خواتین نے عہد خلافت راشدہ میں بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لیا اور اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کے سیاسی سرگرمیوں اور ان کی خاص شاگردہ عمرہ بنت عبدالرحمان کی علوم وفنون کے فروغ اور تہذیب وتمدن کے ارتقا میں خدمات کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

البتہ سماجی برابری کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ صلاحیتوں اور دیگر اوصاف کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہو۔ عہد نبوی کی طرح خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی یہ طریقہ رائج رہا کہ سرکاری مناصب اور سیاسی ذمہ داریاں وغیرہ خاص طور پر لوگوں کو صلاحیت اور تجربے کی بنیاد پر دیئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دور نبوی کی طرح خلافت راشدہ کے دوران بھی اسلامی معاشرے سے غلاموں اور موالی طبقات کی سیاسی سرگرمیوں میں نمائندگی بہت ہی کم یا نہیں تھی۔ گورنر یا امیر جیسے اہم سیاسی عہدوں پر خال خال ہی کسی کا نام ملے گا۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت سلمان فارسی کو بصرہ کا گورنر بنایا گیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد ہی انہوں نے استعفادے دیا۔ اہم سیاسی مناصب پر غلام یا موالی طبقے سے تقرر کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی تعداد کم تھی اور صلاحیتیں محدود ہوتی تھیں۔

17.4.7 اخلاق وتعلیم:

خلافت راشدہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ معاشرے میں برائیاں ختم ہوگئیں اور جرائم کم ہوگئے۔ چوری، زنا، شراب، رشوت ستانی اور بدعنوانی جیسے، جرائم پر سخت سزاؤں اور اخلاقی تعلیم وتربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ ذمہ دار اور با اخلاق شہری بن گئے تھے۔ حکومت عوام اور حکام دونوں کے اخلاق وکردار کی نگرانی کرتی تھی اور جن چیزوں سے لوگوں کے برائی میں پڑنے کا اندیشہ ہو، ان پر پابندی عائد کردی جاتی تھی۔

اسی طرح عام لوگوں میں حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مناسب تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کیا جائے، خلافت راشدہ کے دوران چاروں خلفاء نے اس جانب خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے عوام کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا۔ حکومت کے تمام ذمہ داروں کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ وہ عام لوگوں اور خاص طور پر اسلامی سماج کے نئے شہریوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے جزیرہ نمائے عرب کے متعدد شہروں میں لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے معلم مقرر کیے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے زمانہ خلافت میں عوام کی تعلیم وتربیت کے لیے صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد کو مختلف صوبوں میں بھیجا گیا تھا۔ مثلاً کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کو اور شام کے مختلف شہروں میں معاذ بن جبل، عبادہ بن صامت، ابی بن کعب وغیرھم کو معلم مقرر کیا گیا۔ یہ معلمین لکھنا پڑھنا سکھانے کے علاوہ ناظرہ وحفظ قرآن مجید، ان کا مفہوم ومطلب، احادیث، عربی زبان وادب، احکام ومسائل اور سیرت واخلاق کی تعلیم دیتے تھے۔ شروع میں تعلیم کا انتظام مساجد میں ہوتا تھا یا معلمین اپنے گھروں میں طلبہ کو پڑھاتے تھے، بعد میں اس کام کے لیے مکاتب بھی قائم کیے گئے۔ تعلیم مردوں، عورتوں اور بچوں سب کے لیے عام تھی۔ معلمین کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں، البتہ صحابہ کرام عام طور پر تنخواہ نہیں لیتے تھے۔

17.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- خلافت راشدہ کا معاشرہ بنیادی طور پر نبوی معاشرے کی توسیع تھا اور لہٰذا اس میں عہد نبوی کے معاشرے کی خصوصیات باقی رہیں۔
- خلافت راشدہ میں خلفاء راشدین نے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق انتظام حکومت و ریاست میں مختلف طرح کی اصلاحات کیں۔
- خلافت راشدہ میں انتظامیہ اور اس کے نظم و نسق کو زیادہ بہتر اور موثر بنانے کے لیے مختلف شعبے اور محکمے بنائے گئے۔
- خلافت راشدہ میں معاشرے کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی کے لیے مؤثر اقدامات کیے گئے۔
- خلافت راشدہ میں تعلیم کے مراکز قائم کیے گئے اور سماج کے ہر طبقہ میں تعلیم کو عام کیا گیا۔
- خلافت راشدہ میں وظائف کا مثالی نظام جاری کیا گیا جو اسے حقیقی معنی میں دنیا کی پہلی فلاحی ریاست بناتا ہے۔
- خلافت راشدہ میں نظام حکومت جمہوری اور شورائی تھا۔ حکومت کو عام لوگوں کے سامنے جواب دہ بنایا گیا۔
- خلافت راشدہ میں قانون سب کے لیے یکساں تھا اور سب پر یکساں طور پر لاگو بھی ہوتا تھا۔
- خلافت راشدہ کے زمانے کا معاشرہ خیر کا معاشرہ تھا جس میں نیکی اور بھلائی کا ہر طرف چرچا تھا۔

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. خلافت راشدہ میں فوج کا محکمہ کیا کہلاتا تھا؟

a. دیوان الاحداث　b. شرطہ　c. دیوان الجند　d. دیوان الحکم

2. حضرت عثمانؓ کے ذاتی سکریٹری کون تھے؟

a. علی ابن ابی طالب　b. ابوعبیدہ　c. عبداللہ بن عمر　d. مروان بن حکم

3. اضافی مال کو محفوظ کرنے کے لیے بیت المال کی باضابطہ عمارت کس نے تعمیر کرائی تھی؟

a. حضرت. ابوبکرؓ　b. حضرت عمرؓ　c. حضرت عثمانؓ　d. حضرت علیؓ

4. حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ کے قاضی کون تھے؟

a. اسامہ بن زیدؓ　b. عبدالرحمان بن عوفؓ　c. زید بن ثابتؓ　d. قاضی شریح

5. شخصی ملکیت والی زمین سے حاصل ہونے والے کنوز و معادن میں بیت المال کا حق کتنا ہوتا تھا؟

a. 20 فی صد(٪)　b. 50 فی صد(٪)　c. 25 فی صد(٪)　d. 10 فی صد(٪)

6. خلافت راشدہ کے دوران پولس کے محکمہ کا سربراہ کیا کہلاتا تھا؟

a. صاحب الاحداث　b. صاحب الجند　c. صاحب الرائے　d. صاحب البرید

7. ''لا خلافة الا عن المشورة'' کس کا قول ہے؟

a. حضرت ابوبکر کا　b. حضرت عمر کا　c. حضرت عثمان کا　d. حضرت علی کا

8. عشور کس سے متعلق ایک طرح کا ٹیکس تھا؟

a. تجارت سے متعلق　b. زراعت سے متعلق　c. آمدنی سے متعلق　d. حفاظت سے متعلق

9. حضرت عمرؓ کی خلافت میں حضرت سلمان فارسی کو کہاں کا گورنر بنایا گیا تھا؟

a. بغداد کا　b. فسطاط کا　c. بصرہ کا　d. کوفہ کا

10. حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں کسے کوفہ کا معلم بنا کر بھیجا گیا تھا؟

a. زید بن ثابت کو　b. عبداللہ بن مسعود کو　c. ابی بن کعب کو　d. عبداللہ بن عمر کو

17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. خلافت راشدہ کے معاشرہ کی تعمیر وترقی میں غلاموں اور خواتین کا کیا رول تھا؟ بیان کیجیے۔
2. خلافت راشدہ کے محکمہ عدالت اور محکمہ احداث سے بحث کیجیے۔
3. خلافت راشدہ کی انتظامیہ کے تین محکموں پر نوٹ لکھیں۔
4. خلافت راشدہ کی کوئی دو خصوصیتیں تفصیل سے لکھیں۔
5. خلافت راشدہ کے دور میں حکومت کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے؟ تحریر کیجیے۔

17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. خلافت راشدہ کے نظم ونسق سے بحث کیجیے۔
2. خلافت راشدہ کے معاشرے پر روشنی ڈالیے۔
3. خلافت راشدہ کی خصوصیات بیان کیجیے۔

17.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. خلفاء راشدین : حاجی معین الدین ندوی
2. تاریخ تہذیب اسلامی (حصہ دوم) : پروفیسر یسین مظہر صدیقی
3. الفاروق : علامہ شبلی نعمانی
4. مختصر تاریخ اسلام : غلام رسول مہر
5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد اول) : ثروت صولت

-:oOo:-

اکائی 18 : بنوامیہ کا قیام واستحکام

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید

18.1 مقصد

18.2 بنوامیہ کا قیام واستحکام

18.2.1 خوارج

18.2.2 شیعہ

18.2.3 اموی خاندانی اختلاف

18.2.4 حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت

18.2.5 دیگر بغاوتیں

18.2.6 حضرت زید بن علی کی خلافت

18.2.7 بازنطینیوں/رومیوں کے حملے

18.3 اکتسابی نتائج

18.4 کلیدی الفاظ

18.5 نمونہ امتحانی سوالات

18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

18.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

18.0 تمہید

اموی حکومت کے بانی حضرت امیر معاویہؓ تھے، صحابہ کرام میں وہ آخری شخص ہیں جن کے پاس باقاعدہ خلافت رہی، ان کے بعد کوئی صحابی خلافت کے منصب پر فائز نہیں ہوئے۔ اسے 'خلافت بنوامیہ'، 'اموی خلافت' اور 'اموی حکومت' کا نام دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس حکومت کے تمام خلفاء کا تعلق بنوامیہ سے تھا۔

اموی حکومت کا قیام 661ء بمطابق 41ھ میں عمل میں آیا، اس کا پایۂ تخت دمشق (شام) تھا۔ یہ حکومت تقریباً نوے (90) سال یعنی

750ء بمطابق 132ھ تک قائم رہی۔ اس دوران کل چودہ (14) خلیفہ ہوئے۔ ان میں سے پہلے تین خلیفہ کا تعلق سفیانی خاندان سے تھا جنھوں نے تقریباً پچیس (25) سالوں تک حکومت کی اور باقی گیارہ (11) کا تعلق مروانی خاندان سے تھا، جنھوں نے پینسٹھ (65) سال خلافت کی۔ اگرچہ بیچ میں ایسی صورت حال بھی ہوئی کہ خلافت دوحصوں میں تقسیم ہوگئی اور بیک وقت دوخلیفہ امت مسلمہ میں ہوگئے، جس کا تذکرہ آگے آئے گا، لیکن پھر امت کا اجماع ایک خلیفہ پر ہوگیا۔ ذیل میں اموی حکومت کے قیام واستحکام پر گفتگو کی جائے گی۔

18.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اموی خلافت کس نے اور کیسے قائم کی؟ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اموی خلافت کا قیام عمل میں آیا؟ اموی خلافت اور خلفائے راشدین کی خلافت میں بنیادی فرق کیا تھا؟ اموی خلافت اسلامی تھی یا غیر اسلامی؟ اسے کن خلفاء نے مزید استحکام بخشا؟ اس عہد میں خلافت کے خلاف اندرونی اور بیرونی طور پر سازش کرنے والے کون کون سے طبقات تھے؟ ان سے خلیفۂ وقت نے کس طرح کا برتاؤ کیا؟ کن سپہ سالاروں نے اس خلافت کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا؟

18.2 بنوامیہ کا قیام واستحکام

خلفائے راشدین کے تحت ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح سے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی اور اس کے بعد کیا صورت حال بنی؟ بنوامیہ کے قیام میں ان تمام عناصر کا اہم کردار رہا ہے، جن کا مختصراً ذکر کیا جارہا ہے:

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ تسلیم کرلیا گیا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے مختلف وجوہات کی بنا پر بالخصوص قاتلین عثمان سے قصاص لینے میں تاخیر کی وجہ سے انہیں خلیفہ ماننے میں تامل کیا، اس کا نتیجہ جنگ جمل کی صورت میں نکلا، جس میں ایک طرف حضرت علیؓ اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے عظیم صحابی تھے۔ دونوں فریق میں مصالحت کی کوششیں ہوتی رہیں جس سے حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ واپس لوٹ گئے، قریب تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی واپس ہوجاتیں، لیکن فسادیوں (یہ دوعنصر تھے جو جنگ کروانا چاہتے تھے، ایک تو بنی امیہ کے لوگ اور دوسرے وہ شورش پسند جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ اور فساد برپا کیا تھا) نے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر دونوں فوج پر حملہ کردیا۔ اس طرح سے جنگ شروع ہوئی اور دونوں طرف سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی۔ حضرت علیؓ کو اس جنگ میں کامیابی ملی اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کو تمام مسائل ومشکلات سے باخبر کردیا، چنانچہ وہ مطمئن ہوکر مدینہ واپس ہوگئیں۔ حضرت علیؓ نے تمام نا اہل گورنروں اور منتظمین کو جو حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ تھے ان کو معزول کردیا اور اپنے نئے عمال مقرر کیے۔ لیکن امیر معاویہؓ جو کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں دمشق کے حاکم مقرر ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو شام کا والی بنادیا تھا۔ ایک لمبا عرصہ گزرجانے کی وجہ سے شام کا علاقہ امیر معاویہؓ کے مکمل کنٹرول میں تھا۔

حضرت علیؓ نے جب ان کو معزول کیا تو انہوں نے ان کے اس حکم کو تسلیم نہیں کیا اور ان سے پہلے حضرت عثمانؓ کے قصاص لینے کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران حضرت امیر معاویہؓ نے دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر حضرت عثمانؓ کا خون آلود کُرتا اور ان کی اہلیہ حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں رکھ دیں، جس سے پورے شام میں غم وغصہ اور ہیجان کا لاوا پھوٹ پڑا۔ اس کا نتیجہ 'جنگ صفین' کی صورت میں سامنے آیا جو فرات کے مغربی کنارے پر، رقہ کے جنوب میں واقع صفین کے میدان میں ہوئی تھی، اس میں ایک طرف حضرت علیؓ اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ کئی دنوں تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں، بالآخر 26/جولائی 657ء بمطابق 37ھ کو آخری معرکہ ہوا جسے 'لیلۃ الحر' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس میں حضرت

علیؓ کو تقریباً فتح مل چکی تھی کہ امیر معاویہؓ کی فوجوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے کہنے پر اپنے اپنے نیزوں پر قرآن کریم بلند کر لیے، یعنی اب قرآن کریم ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ تاریخ میں اسے 'واقعہ تحکیم' کا نام دیا گیا ہے۔

حضرت علیؓ کی جانب سے ان کی مرضی (عبداللہ ابن عباسؓ) کے برخلاف حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ حکم بنائے گئے، دونوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں، فریقین کو اسے قبول کرنا ہوگا۔ دونوں گروہوں کی طرف سے چار چار سو افراد موجود رہیں گے اور یہ آٹھ سو افراد تمام مسلمانوں کے جانشین سمجھے جائیں گے۔ اس حوالے سے مسلمانوں کی ایک بڑی مجلس جنوری/659ء بمطابق 39ھ کو اذرج/دومۃ الجندل کے مقام پر منعقد ہوئی، یہ جگہ معان اور بترا کے بیچ میں دمشق سے مدینہ کی سڑک پر واقع تھی۔ دونوں حکم نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ حضرت علیؓ و حضرت امیر معاویہؓ کو معزول کر دیا جائے اور مسلمان کسی تیسرے کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیں، لیکن جب فیصلہ سنانے کا وقت آیا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری اپنی سادہ لوحی میں دھوکہ کھا گئے اور پہلے انہوں نے حضرت علیؓ کو معزول کر دیا، اس کے برعکس حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے وعدے سے مکر گئے اور انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو معزول نہیں کیا، بلکہ اس کی توثیق کر دی۔

حضرت علیؓ واقعہ تحکیم سے مطمئن اور خوش نہیں تھے، کیوں کہ اس میں انہیں کئی جہت سے نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اول یہ کہ ان کی نظر میں یہ فیصلہ قرآن وسنت کے مطابق نہیں تھا۔ دوم حضرت عمرو بن العاصؓ نے وعدہ خلافی کی تھی۔ سوم ان کی فوج سے خوارج کا ایک بڑا گروہ نکل کر سامنے آیا جس نے نہ صرف ان کی فوجی قوت کو کمزور کیا بلکہ ان کے خلاف بغاوتیں بھی کیں، نہروان اور بصرہ وغیرہ کی جنگیں ان ہی لوگوں کا شاخسانہ ہیں۔ رہی سہی کسر واقعہ تحکیم نے پوری کر دی کیوں کہ اس فیصلے سے اصل نقصان تو حضرت علیؓ کو ہی ہوا تھا، معزول وہی کیے گئے تھے۔ اس کے برعکس حضرت امیر معاویہؓ کو واقعہ تحکیم سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہ صرف ایک صوبے کے والی تھے، نہ کہ خلیفہ، لیکن امت مسلمہ کی جانب سے تحکیم کو قبول کر لینے سے ان کا مقام و مرتبہ حضرت علیؓ کے برابر ہو گیا، جس کا فائدہ انہیں آنے والے وقت میں یقیناً ملا۔

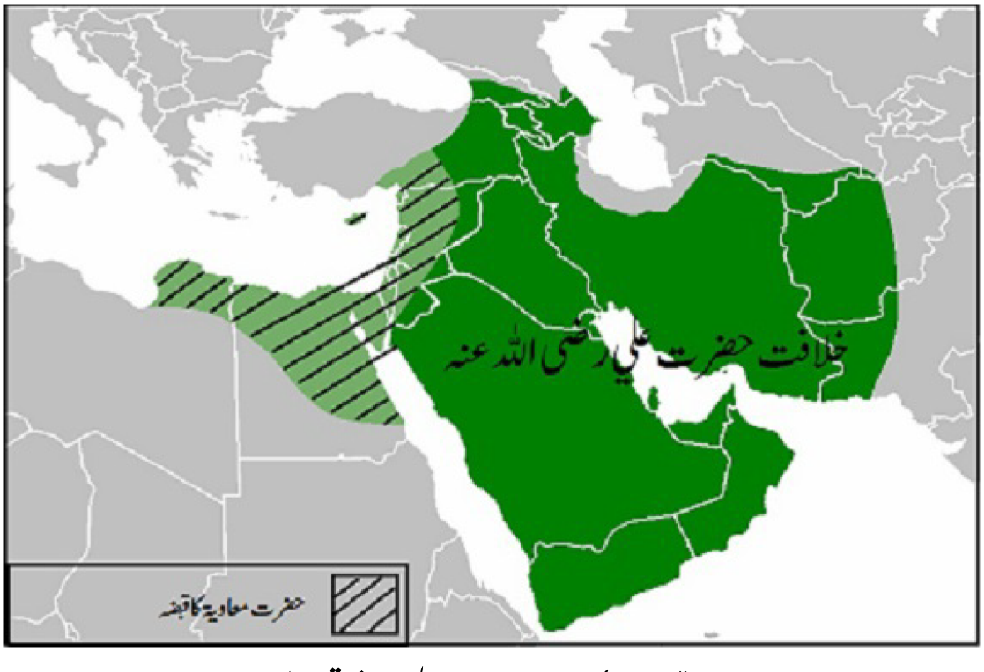

معاویہؓ کا قبضہ شام، مصر اور مغربی علاقوں پر قائم رہا۔ عراق، ماوراء النہر (مشرقی ممالک) اور تمام جزیرۂ عرب پر حضرت علیؓ کی حکومت رہی۔ 660ء بمطابق 40ھ میں ان کی شہادت ہوئی۔ ان کے بعد حضرت حسنؓ کوفہ میں خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔ اس طرح بیک وقت امت مسلمہ

میں دو خلیفہ ہو گئے، اگر چہ امیر معاویہؓ کا پلڑا بھاری تھا۔اسی دوران انہوں نے عراق پر حملہ کیا۔حضرت امام حسنؓ کے مزاج میں فطری طور پر نرمی اور شفقت تھی، اسی وجہ سے وہ خوں ریزی پسند نہیں کرتے تھے، نیز انہیں ماضی کے حالات وواقعات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جنگ میں شہید نہیں ہوگی، کسی کے حق میں فیصلہ ممکن نہ ہوگا، اس لیے انہوں نے امت مسلمہ کو نا قابل تلافی نقصان سے محفوظ رکھنے اور مسلمانوں کو آپسی خانہ جنگی سے بچانے کے لیے قربانی دی اور وہ خلافت سے امیر معاویہؓ کے حق میں بعض شرائط کے ساتھ دست بردار ہو گئے۔حضرت امیر معاویہؓ نے ان کی اس قربانی کی تہہ دل سے قدر کی اور ان کے فضائل ومناقب کا احترام کرتے ہوئے انہیں لکھا:

''مجھے اعتراف ہے کہ خاندان کے اعتبار سے آپ اس جلیل منصب کا زیادہ حق رکھتے ہیں اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ آپ اس کے فرائض انجام دینے کے مجھ سے زیادہ اہل ہیں تو میں بلا تامل آپ کی اطاعت کا حلف اٹھالیتا۔اب جو کچھ آپ چاہیں مجھ سے طلب کر لیں''۔

حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے درج ذیل شرائط پوری کرنے کا مطالبہ کیا، جسے انہوں نے پورا بھی کر دیا:

1. اہل عراق کو کلی طور سے معاف کر دیا جائے۔
2. حضرت حسنؓ کے نام علاقہ ابجرد کا خراج ہمیشہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔
3. دولاکھ درہم سالانہ وظیفہ اور کوفہ کے بیت المال کی ساری رقم حضرت حسنؓ کو دی جائے۔

اسی لیے اس سال کو اسلامی تاریخ میں 'عام الجماعۃ' (اتحاد واتفاق کا سال) کا نام دیا گیا، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی:

''حضرت حسنؓ سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہ میں صلح کرائیں گے۔''

حضرت حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد حضرت امیر معاویہؓ 661ء بمطابق 40ھ میں متفقہ طور پر امت مسلمہ کے خلیفہ بن گئے اور 'امیر المومنین' کہے جانے لگے، اس سے پہلے انہیں شام میں 'امیر' کہا جاتا تھا۔اسی سال اس کا باقاعدہ اعلان ایلیا (بیت المقدس) میں کیا گیا۔دمشق دارالسلطنت قرار پایا۔اس طرح سے بنو امیہ کی حکومت کا آغاز ہوا۔اگر چہ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت سابقہ خلفائے راشدین کی طرح انتخابی نہیں تھی، بلکہ انہوں نے اسے اپنی سیاسی مہارت اور فوجی طاقت سے حاصل کیا تھا اور عوام الناس کو کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی آزادی نہیں دی گئی تھی۔مسلمان اگر بیعت نہ کرتے تو بھی وہ خلیفہ کے عہدے پر فائز رہتے اور آپسی خانہ جنگی برقرار رہتی، نیز انہوں نے اپنے صاحب زادے یزید بن معاویہؒ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور موروثی بادشاہت یا حکمرانی کی شروعات کی جسے کم وبیش بعد کے تمام خلفاء نے جاری رکھا۔اگر چہ بیعت کی رسم کو برقرار رکھا گیا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ خلیفۂ وقت اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹوں یا عزیزوں میں سے جسے مناسب سمجھتا اپنا جانشین مقرر کر دیا کرتا تھا اور اس کے حق میں وہ حکومت کے اہم عہدے داران سے وفاداری کی بیعت لیتا تھا، اس کے بعد دارالحکومت اور دیگر صوبوں کے وفود آکر بیعت کرتے تھے۔اس طرح سے اسلامی تاریخ میں پہلی بار ملوکیت کا آغاز ہوا۔چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے عظیم المرتبہ صحابی نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے ان کو 'السلام علیکم یا ایھا الملک' (اے بادشاہ! تم پر اللہ کی سلامتی ہو) کہہ کر ملاقات کی، لیکن وہ ان سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہ کر سکے کیوں کہ وہ بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ انہوں نے سابقہ روایت کو تبدیل کیا ہے اور اس حوالے سے وہ پہلے شخص ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ان کے ساتھ بعض نامور اصحاب الرائے اور اہل سیاست کا ہونا ہے جن میں عمرو بن العاصؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن خالد، زیاد بن ابیہ (زیاد بن ابی سفیان)، قیس بن سعدؓ اور عبداللہ بن بدیل الخزاعی وغیرھم کے نام قابل ذکر

ہیں۔ان میں سے بعض شروع میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، پھر بعد میں وہ وقت اور حالات کی نزاکت اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ ہوگئے تھے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت امیر معاویہؓ نے زوروزبردستی سے اپنی خلافت قائم کی تھی تو وہ اسلامی ہوئی یا غیر اسلامی؟ اسے بادشاہت اور شہنشاہیت سے تشبیہ دی جائے گی یا اسلامیت اور راشدیت کے درجے میں رکھا جائے گا؟ اس سلسلے میں سیرت نگاروں اور تاریخ نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔اکثر و بیشتر مؤرخین نے عہد اموی کو بادشاہت اور ملوکیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے جب کہ بعض سیرت نگاروں نے اسے اسلامی خلافت کا ہی ایک حصہ قرار دیا ہے جو عہد نبوی یا عہد خلفائے راشدین کی طرح تو نہیں رہا، لیکن بہ حیثیت مجموعی اسلامی ہی تھا، کیوں کہ یہ عہد خلفائے راشدین کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے اور اس میں مختلف عظیم المرتبہ صحابہ کرام، تابعین کرام، مفسرین کرام اور محدثین کرام موجود تھے، جو نہ صرف اموی خلافت کے استحکام میں شامل تھے، بلکہ انہوں نے شوریٰ، قاضی القضاۃ، عدالت، فوج، امامت اور تعلیم و تدریس وغیرہ جیسے اہم عہدوں اور منصبوں کو قبول کیا۔اگر اموی خلافت اسلامی نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اس کا حصہ کیوں کر بن سکتے تھے؟ نیز اس دور میں کلمۃ اللہ، اسلامی شریعت وقانون اور جہاد کا نفاذ تھا۔درج بالا دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ اموی خلافت اسلامی خلافت ہی کا حصہ ہے جس کی شروعات مکہ و مدینہ سے ہوئی تھی اور وہاں سے کوفہ ہوتے ہوئے دمشق منتقل ہوگئی۔

اموی خلافت کے استحکام میں بعض اموی خلفاء جیسے حضرت امیر معاویہؓ، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک وغیرہ کا اہم کردار ہے۔اس حوالے سے انہیں مختلف جہات یعنی خوارج، شیعہ حضرات، گورنروں، بعض دیگر طبقات اور افراد کی جانب سے بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔حضرت حسینؓ کی شہادت اور حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی خلافت وغیرہ بھی اسی کا حصہ ہیں، نیز مسلمانوں کے آپسی اختلافات کو دیکھتے ہوئے رومی (بازنطینی) حکومت نے بھی آنکھیں دکھانی شروع کردی تھیں۔اس طرح کے اندرونی اور بیرونی مسائل سے نپٹنا اموی حکومت کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا۔لیکن بہرحال تمام ہی خلفاء نے اپنی بساط بھر کوششیں کیں اور وہ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے میں کامیاب بھی رہے۔ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں حجاج بن یوسف، عقبہ بن نافع، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، قتیبہ ابن مسلم، محمد بن قاسم، عبدالرحمٰن بن الاشعث الکندی، مسلمہ بن عبدالملک اور عبداللہ البطال وغیرھم جیسے عظیم سپہ سالار حاصل تھے جن کی ذہانت فراست، سیاسی بصیرت، شجاعت و بہادری اور سپہ سالاری اپنی مثال آپ تھی۔دوسرا اہم کردار اموی گورنروں کا تھا جنہوں نے اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے اموی خلفاء کی حکمت عملیوں کو پوری کامیابی کے ساتھ نافذ کیا۔واضح رہے کہ اموی دور خلافت کے عروج میں خلفاء کی اکثریت اپنے گورنروں اور سپہ سالاروں کے لیے انتہائی سخت رہی، جہاں انہوں نے ان کے اچھے کاموں کی ستائش کی اور انعامات سے نوازا، وہیں دوسری طرف ان کی جانب سے ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں کا مواخذہ بھی کیا گیا، جیسے عبدالملک بن مروان کے عہد میں جب مدینہ کے حاکم ہشام بن عبدالملک نے حضرت سعید بن مسیّب پر مسئلہ جانشینی میں اختلاف کی وجہ سے سختی کی اور انہیں کوڑوں کی سزا دی تو خلیفۂ وقت نے حاکم مدینہ کو ان سے معافی مانگنے پر مجبور کیا اور خود بھی معافی مانگی۔اسی طرح جب حجاج بن یوسف نے حضرت انس بن مالکؓ کی شان میں گستاخی کی تو انہیں بھی معافی مانگنے کا حکم دیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز نے والی خراسان یزید بن مہلب ازدی سے حساب طلب کیا اور جب وہ نہ دے سکا تو اسے عہدے سے خیانت کے جرم میں معزول کردیا۔اسی طرح بیت المال سے ایک دینار غائب ہونے پر نگراں وقت سے باز پرس کی گئی۔ان وجوہات کی بنا پر اکثر و بیشتر عمالوں و گورنروں کی ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ کام انجام دینے کی عادت ہوگئی، چنانچہ ان نایاب نگینوں نے جہاں ایک طرف اموی حکومت کو وسعت دی، وہیں دوسری طرف

اندرونی بغاوتوں کا خاتمہ کر کے اموی حکومت کو استحکام بخشا۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ اندرونی و بیرونی مسائل کا جائزہ لیا جائے گا جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اموی حکومت کس طرح سے مستحکم ہوئی اور اپنے عروج پر پہنچی۔

18.2.1 خوارج:

جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی فوج سے ایک گروہ نکلا جو صرف خود کو مسلم مانتے تھے اور اسلامی ریاست یا مسلمانوں سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں تھی، بلکہ وہ نقصان پہنچانے میں پیش پیش رہے، اس لیے تمام اموی خلفاء نے ان پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے حضرت علیؓ کے دور سے ہی مخالفت اور بغاوت شروع کر دی تھی جو اموی دور میں بھی جاری رہی، اگرچہ وقفہ وقفہ سے ان کا زور کم ہوتا گیا۔

عہد اموی میں خوارج کی جو بھی بغاوتیں ہوئیں ان کو اموی گورنروں نے بڑی خوش اسلوبی سے کچل دیا جس میں سرفہرست حضرت مغیرہ بن شعبہ اور مہلب بن ابی صفرہ اور حجاج بن یوسف نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بسا اوقات ایسا بھی کیا گیا کہ جس علاقے میں خوارج کا زور زیادہ ہوا، خلیفۂ وقت کی جانب سے اہل شہر کو ہی ذمے داری دے دی گئی کہ وہ ان خارجیوں کو اپنے یہاں سے نکال باہر کریں یا انہیں قتل کر دیں، ورنہ انہیں بھی بغاوتوں میں شریک سمجھا جائے گا، جیسے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اہل کوفہ کے سرداروں سے عہد لیا تھا کہ وہ اپنے علاقوں میں خارجیوں کو پناہ نہیں دیں گے بلکہ ان کی سازشوں کا پتہ لگا کر ان کا خاتمہ کریں گے، ورنہ اس کے نتائج خود ان کو بھی بھگتنے ہوں گے۔

18.2.2 شیعہ:

شیعہ حضرات (عربی میں شیعہ کا معنی کسی شخص کے پیروان، یہاں اس سے مراد حضرت علیؓ کے پیروان) حضرت علیؓ اور اہل بیت (آل بیت رسول اللہ) کو خلافت کا حقدار سمجھتے رہے ہیں، جب اموی خلافت قائم ہوئی اور حضرت حسنؓ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تو ان میں سے بعض نے خاموشی اختیار کر لی لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو در پردہ اس حکومت کے خلاف تھے۔ کوفہ اور بصرہ شیعان علیؓ کا خصوصی گڑھ تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے دور میں ان پر خصوصی توجہ دی، اور اپنے گورنروں کے ذریعہ ان دو شہروں پر کنٹرول رکھا۔

یزید بن معاویہ کے دور میں شیعوں نے پھر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور اس بار انہوں نے حضرت حسین بن علیؓ کا ساتھ دیا۔ حسینؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کوفہ بھیجا اور پھر وہاں کا قصد بھی کیا۔ جن حضرات نے امام حسینؓ کو اس عمل سے روکا ان میں عمر بن عبدالرحمٰن بن حرث، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ وغیرھم جیسے اکابرین شامل ہیں۔

صحیح ہے کہ کوفی شیعوں نے اس کثرت سے اپنے وفود اور خطوط حضرت حسینؓ کے پاس بھیجے کہ وہ ان کی مدد سے ظالمانہ ملوکیت کو ختم کر کے واپس پھر خلافت کو قائم کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ واضح رہے کہ انہوں نے صرف حضرت امیر معاویہ کی خلافت کو قبول کیا تھا، ان کے جانشین یزید بن معاویہ کی خلافت تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہی انہوں نے اس کے نام پر بیعت کی تھی۔ کوفہ کے والی النعمان بن بشیر الانصاریؓ (انہونے یزید کی موت کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے اہل شام نے ان کو شہید کر دیا) کو ان تمام واقعات کی اطلاع برابر مل رہی تھی لیکن آپ نے کسی قسم کی کاروائی کرنے سے گریز کرنا چاہا۔ کوفہ میں بنی امیہ کے حامیوں نے جب یزید بن معاویہ کو اس کی خبر بھیجی تو اس نے سختی کے پیش نظر عبیداللہ بن زیاد (بصرہ کے گورنر) کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا، جس نے آتے ہی مسلم بن عقیلؓ کو گرفتار کر لیا اور اہل کوفہ کی نقل اور حرکت پر پابندی لگا دی، اس کی وجہ شیعوں کو اُن کا ساتھ دینا محال (ناممکن) ہو گیا، باوجود اس کے کہ تقریباً اٹھارہ ہزار کوفی شیعوں نے ان کے ہاتھ پر حضرت امام حسینؓ کے لیے بیعت کی تھی۔ بعد میں پھر مسلم بن عقیلؓ اور ان کے ساتھیوں کو عبیداللہ بن زیاد نے شہید کر دیا۔

حضرت حسینؓ کوتمام واقعات کی جان کاری اس وقت ملی جب وہ کوفہ کے قریب پہنچ چکے تھے،انہوں نے واپس ہونا چاہا لیکن مسلم بن عقیل کے بھائیوں اور رشتے داروں کی طرف سے قصاص کے مطالبے اور بعض دیگر وجوہات کی بنیاد پر وہ واپس نہ جا سکے اور بالآخر کربلا کے میدان میں مقیم ہوگئے ۔اسی دوران کوفہ کے اموی گورنر کی طرف سے **حر بن یزید تمیمی** کا لشکر بھی آ گیا، نیز عمرو بن سعد کا کوفی لشکر بھی موجود تھا۔فریقین میں آپسی گفتگو اور بحث ومباحثہ کے بعد حضرت حسینؓ نے تین شرطیں پیش کیں ۔اول انہیں واپس جانے دیا جائے ،دوم جہاد کے لیے نامعلوم سرحدوں کی طرف بھیج دیا جائے اور سوم دمشق یزید بن معاویہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ان میں سے کوئی شرط منظور نہیں کی گئی اوران کو احساس ہوگیا کہ اب لڑائی ہوکر رہے گی ،اس لیے انہوں نے سب کو مکمل آزادی دی کہ جو چاہے ساتھ دے یا چلا جائے ۔قریبی اعزہ واقارب کے علاوہ ۷۲ اور بعض روایات کے مطابق ۸۲ شیعان حسینؓ آپؓ کے ساتھ رہ گئے اور تمام شہید ہوئے ۔اس کے بعد ہی 10 /محرم 61ھ یعنی یکم /اکتوبر 680ء کو واقعہ کربلا پیش آیا جس کا افسوس تمام مسلمانوں کو ہوا۔سوال یہ ہے کہ ان کا یہ قدم درست تھا یا غلط؟ اس حوالے سے سیرت نگاروں اور مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض اسے جائز اور درست فیصلہ قرار دیتے ہیں اور وہ اسے ولیعہدی کے خلاف ایک مجتہدانہ عمل سے تعبیر کرتے ہیں ،جب کہ کچھ مؤرخین اسے غلط فیصلہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ صحابہ کرام مخلصین اوران کے بھائیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا اور نہ ہی وہ ساتھ میں گئے تھے۔بہر حال حالات واجتہاد جو کچھ بھی ہوں ،انہیں اس طرح سے شہید کیا جانا ،اسلامی تاریخ کے داغدار حصوں میں سے ایک ہے ،جس میں اموی خاندان اور منتظمین کا اہم کردار رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور میں ،شہادتِ حسین کے پانچ چھ سالوں بعد یعنی 685ء میں ،بعض کوفی شیعان حسینؓ کو ان کی مظلومانہ شہادت پر ندامت ہوئی اورانہیں اپنے اس عمل کو توبہ کے ذریعے درست کرنے کا خیال آیا ،اسی وجہ سے انہیں ''توابین'' کا خطاب دیا گیا۔انہوں نے باقاعدہ ایک لشکر ترتیب دیا جس کا نام ''توابین'' ہی رکھا ،اس کے سردار سلیمان بن صرد خزاعیؓ (صحابی اور راوی بھی ،حضرت علیؓ کے ساتھ تمام جنگیں لڑیں) تھے۔شمال مشرقی شام کے علاقے میں عین الوردہ (راس العین ،سوریا) نامی جگہ پر ۲۰/ہزار اموی فوجیوں (عبیداللہ بن زیاد کی سربراہی میں) سے ان کا مقابلہ ہوا اورانہیں شہید کردیا گیا۔آپؓ کے ۴/ہزار جنگجوؤں میں سے صرف چند سو ہی بچ کر مختار ثقفی (حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بہن کے شوہر) کی لشکر میں شامل ہوگئے ۔اس کے بعد توابین کی تحریک نے ایک نئی شکل لے لی مختار ثقفی کے رہنمائی میں ۔

عبدالملک بن مروان کے دور میں مختار ثقفی نے بھی حضرت حسینؓ اور باوفا اصحاب کے قاتلین سے بدلہ لینے کی نیت سے قیام کا آغاز کیا۔نیز آپ نے 685ء میں عوام الناس کو حضرت حسینؓ کے انتقام کی طرف بلایا اور کوفہ ،موصل ،آزربایجان ،ارمینیا وغیرہ پر قابض ہوگئے ۔ابراہیم بن مالک اشتر نخعی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔قاتلان شہدائے کربلا سے بدلہ لیا ،جن میں سے عبیداللہ بن زیاد ،عمر بن سعد ،شمر بن ذی جوشن اور سنان بن انس وغیرہ شامل تھے۔مختار ثقفی نے بصرہ پر قبضے کے ارادے سے دھاوا بولا ،لیکن مصعب بن زبیر (عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی) نے ان کو شکست فاش سے دوچار کیا اور قتل کر کے ان کا خاتمہ کردیا۔بعد میں عبدالملک بن مروان کی فوج نے مصعب بن زبیر کو شہید کردیا اور عراق پر واپس قبضہ کرلیا۔پھر انہی اموی فوجوں نے مکہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کر کے دشمنان بنی امیہ کی تمام سازشوں کو ناکام بنادیا ،اگر چہ وہ ان کو مکمل طور سے ختم نہیں کر سکے جو اموی حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

18.2.3 اموی خاندانی اختلاف:

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا کہ اموی حکومت کے ابتدائی تین خلیفہ سفیانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔تیسرے خلیفہ معاویہ بن یزید نے

خلافت سے اپنے مزاج کی ہم آہنگی نہ ہونے پر دست برداری حاصل کر لی اور کسی کو اپنا جانشین بھی نہیں بنایا۔ایسی صورت حال میں اختلاف ہونا لازمی امر تھا۔اس بات پر تو سب کا اتفاق تھا کہ خلیفہ اموی خاندان سے ہوگا،لیکن وہ سفیانی خاندان سے ہوگا یا کسی اور خاندان سے؟اس پر بنوامیہ میں اتفاق نہیں ہوسکا۔ایک طبقہ یزید بن معاویہ کے دوسرے بیٹے خالد بن یزید کو خلیفہ بنانے کا قائل تھا جو نوجوان تھے۔اس کی قیادت حسان بن بحدل اور بنوکلب وغیرہ کے افراد کررہے تھے تو دوسرا طبقہ مروان بن حکم کو خلیفہ بنانے پر مصر تھا جس میں بنوجذام اور بعض دیگر شامی قبائل شامل تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ اموی قبائل عبداللہ بن زبیرؓ اور عمرو بن سعید کے حق میں تھے۔آخر میں طے پایا کہ تمام لوگ مقام جابیہ میں جمع ہوں اور باہمی مشوروں سے طے کیا جائے کہ اب خلیفہ کسے بنایا جائے؟ چنانچہ اس مقام پر بنوامیہ کے تمام بڑے شیوخ جمع ہوئے اور تقریباً چالیس دن تک گفت وشنید ہوتی رہی۔مالک بن ہبیرہ سکونی نے خالد بن یزید کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے والد محترم کا ہم لوگوں پر بڑا احسان وکرم ہے اور قوی امید ہے کہ ان کا بیٹا بھی ہمارے ساتھ بہترین سلوک کرے گا،اس لیے انہیں خلیفہ تسلیم کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔اس کے برعکس حصین بن نمیر نے مروان بن حکم کا نام پیش کرتے ہوئے کہا کہ اہل حجاز حضرت عبداللہ بن زبیر کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں،ایسے میں ضرورت ہے کہ ان کے مقابلے میں ایک مضبوط اعصاب کے مالک تقریباً ہم عمر شخص یعنی مروان بن حکم کو خلافت دی جائے۔اس طرح سے اموی خاندان کے بزرگوں،دیگر اصحاب الرائے کے مشوروں،انتخاب اور بالخصوص روح بن زنباع جذامی کی رائے کے مطابق ''مروان بن حکم کو خلیفہ منتخب کیا جائے،اس کے بعد بالترتیب خالد بن یزید اور عمرو بن سعید بن عاص کو خلیفہ نامزد کیا جائے''،اس کے بعد متفقہ طور پر مروان بن حکم کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔اس طرح سے ایک بڑا اور اہم اختلاف جو آپسی خانہ جنگی کا سبب بھی بن سکتا تھا ختم ہوا۔

18.2.4 حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت:

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد اپنی خلافت کا اعلان کیا۔اس حوالے سے انہیں حجاز کے اکثریتی طبقات اور بعض شامی واموی قبائل کی تائید بھی حاصل تھی۔حصین بن نمیر نے یزید کی وفات کے بعد مکہ مکرمہ کے محاصرے کے دوران حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ آپ سے زیادہ اس وقت کوئی دوسرا خلافت کا حق دار نہیں ہے،میں اور میرے ساتھی آپ سے ہاتھ ملانے کو تیار ہیں اور آپ ہمارے ساتھ دمشق چلیں۔میرے ساتھ شام کے دیگر معزز حضرات بھی ہیں جو آپ کی حمایت کریں گے اس لیے کوئی آپ کی مخالفت نہیں کر سکتا۔آپ بس اپنے دشمنوں اور ہم لوگوں کو معاف کر دیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حصین بن نمیر کے مشورے کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی شام کی طرف جانے کو تیار ہوئے۔اس کا نقصان انہیں بعد میں یقیناً ہوا،کیونکہ صحابہ کرام کی اکثریت ان کے ساتھ نہیں تھی۔ان کے پاس کوفہ،بصرہ اور مصر وغیرہ کے علاقے تھے۔اموی خلیفہ عبدالملک نے 688ء میں عراق پر حملہ کیا اور دوسال کی مدت میں ہی پورا عراق ان کے قبضے میں تھا،پھر انہوں نے حجاج بن یوسف ثقفی کی سربراہی میں ایک فوج مکہ مکرمہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف بھیجی۔انہوں نے آتے ہی طائف کی طرف سے مکہ کا سخت ترین محاصرہ کر لیا،اسی دوران شہر میں قحط بھی پڑ گیا جس کی وجہ سے روز بروز عبداللہ بن زبیر کی طاقت کم ہونے لگی،آخر کار تنگ آکر حضرت عبداللہ کے بیٹوں،بھائیوں،ساتھیوں اور فوجیوں کی اکثریت نے حجاج بن یوسف کا ساتھ دیا اور انہیں دھوکہ دے دیا۔اس طرح سے شامی فوج کامیاب ہوئی اور حضرت ابن زبیرؓ نے شہادت حاصل کی۔حجاج بن یوسف نے ان کا سر عبدالملک کے پاس بھیج دیا اور ان کی نعش کو مقام حجون میں پھانسی پر لٹکا دیا۔حضرت اسماء کا ادھر سے گزر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ کیا ابھی شہسوار کو اپنی سواری سے اترنے کا وقت نہیں ملا؟ خلیفہ وقت کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے حجاج بن یوسف کو اس حرکت پر پھٹکار لگائی اور نعش کو

حضرت اسماء کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف نے پوری عزت وتکریم کے ساتھ ان کی نعش کو سپرد خاک کرایا۔اس طرح سے ایک بار پھر امت مسلمہ کا اتفاق ایک خلیفہ یعنی عبدالملک بن مروان پر ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ناکامی کے مختلف اسباب رہے۔اول انہوں نے یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد خلافت کا اعلان تو کیا،لیکن بعض اموی وشامی قبائل کے مطالبے کے باوجود وہ اموی حکومت کے دارالحکومت دمشق نہیں گئے،جس کا انہیں بعد میں نقصان ہوا۔دوم ان کا مزاج سخت تھا جس کی وجہ سے مخالفین کے ساتھ ساتھ اپنے بھی ان سے دور ہو گئے۔سوم انہوں نے اپنے حریفوں اور غیر جانب دار لوگوں کے ساتھ نہایت سخت رویہ اختیار کیا،اس میں بعض صحابہ کرام بھی شامل تھے جو ان کے عتاب کا شکار ہوئے جس سے ان کی شبیہ متاثر ہوئی۔چہارم انہوں نے اپنے علاقوں بالخصوص حجاز سے اموی افراد کو در بدر کر دیا جس کی وجہ سے ان لوگوں نے مخالفت کی۔پنجم خوارج نے ان کو سخت نقصان پہنچایا۔ان تمام اسباب کی وجہ سے انہیں زیادہ دنوں تک اپنی خلافت برقرار رکھنے کا موقع نہیں ملا اور شہید کر دیئے گئے۔

واضح رہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے اپنے فرزند ارجمند کی ولی عہدی کے اصول پر ان کی زندگی ہی میں اختلاف کیا تھا۔جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنا جانشین اپنی حیات میں ہی مقرر کرنا چاہا اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے خصوصی رفقائے کار،مشیروں،گورنروں اور مختلف علاقوں کے دیگر اصحاب الرائے سے مشورہ کیا تو سب نے ان کے اس عمل کی تائید کی،البتہ جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد خلیفہ بنانا چاہا تو بعض صحابہ کرام نے اس پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ یہ عجمی طریقہ ہے،اس میں درج بالا اصحاب کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔آخرالذکر نے حضرت امیر معاویہؓ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنے بیٹے کو جانشین بنانا شیخین کی سنتوں میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ عمل قیصر وکسریٰ سے میل کھاتا ہے۔یزید بن معاویہ کے دور میں مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کی جانب سے اول الذکر دونوں اصحاب سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا،لیکن وہ مدینہ منورہ سے مکہ چلے گئے تھے اور مکہ کے گورنر عمرو بن سعید نے انہیں ان کے مقام ومرتبہ کے احترام میں نظرانداز کیا۔

18.2.5 دیگر بغاوتیں:

اموی دور میں بالخصوص جب بیک وقت دو خلیفہ ہوئے یا کم زور خلیفہ ہوئے تو حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں،اگرچہ بہت جلد ان پر قابو پاتے ہوئے خاتمہ کر دیا گیا۔حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں ایران،خراسان اور جنوبی ایشیا کے مختلف علاقوں جیسے بلخ،ہرات،بوشنج،بادغیس، کابل،بست،رزان،طخارستان،رخج،غزنہ اور غور وغیرہ میں بغاوتیں ہوئیں جن کو قیس بن ہیثم،عبداللہ بن حازم،عبدالرحمٰن بن سمرہ اور حکم بن عمرو غفاری وغیرھم نے ختم کیا اور اموی حکومت کو استحکام بخشا۔

یزید بن معاویہ کے عہد میں ترکستانی علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کو مسلم بن زیاد،والی خراسان نے پوری مستعدی سے ختم کیا۔اسی دور میں مدینہ منورہ میں بھی بغاوت ہوئی جسے تاریخ میں 'واقعہ حرہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس میں مدینہ منورہ کے صحابہ کرام کی اکثریت شامل نہیں تھی۔اس بغاوت کو مسلم بن عقبہ مری نے ختم کیا۔

مروان بن حکم کے دور میں ضحاک بن قیس فہری نے اموی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں 684 میں 'مرج راہط' کی جنگ ہوئی۔اس میں مروان بن حکم کو کامیابی ملی اور انہوں نے ضحاک فہری کا خاتمہ کر کے اس بغاوت کو ختم کیا۔

عبدالملک بن مروان کے عہد میں اموی حکومت کے لیے اندرونی وبیرونی دونوں طرح کے مسائل بڑھ گئے تھے جس کا انہوں نے یقیناً اپنی

سیاسی بصیرت اور بہادری وشجاعت سے سامنا کیا اور خلافت بنوامیہ کو استحکام بخشا۔ان کے دور میں عمرو بن سعید الاٗ شدق نے دمشق میں اپنی خلافت کا اعلان اس وقت کیا جب وہ عراقی بغاوتوں کو ختم کرنے میں مشغول تھے۔انہوں نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور اسے قتل کرنے کے بعد دمشق پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

ولید بن عبدالملک کا عہد اموی دور کا زریں دور ہے۔اس میں کثرت سے فتوحات ہوئیں اور اسلامی ریاست چین سے لے کر مغربی یورپ تک پھیل گئی،اس لیے انہیں بہت کم علاقوں میں بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا،جب طخارستان کے ایک بڑے سردار نیزک نے بغاوت کردی اور یہ بغاوت بلخ سے لے کر کابل تک پھیل گئی تھی۔قتیبہ باہلی نے اس بغاوت کا خاتمہ 709ء میں کیا۔اسی طرح جب خلیفہٗ وقت نے افریقہ کے والی حسان بن نعمان 708ء میں معزول کیا تو ناراض بربروں نے حکومت کے خلاف بغاوت کردی،اس کا خاتمہ موسیٰ بن نصیر نے کیا۔

سلیمان بن عبدالملک کو بھی اپنے عہد میں مختلف بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا،جیسے خراسان کے والی قتیبہ بن مسلم نے خلیفہٗ وقت کے خلاف بعض اسباب کی بنا پر بغاوت کی لیکن وہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں مارے گئے اور فوج نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔اسی عہد میں جرجان،قہستان اور طبرستان کے پہاڑی علاقوں میں بھی بغاوتیں ہوئیں جس کا خاتمہ یزید بن مہلب ازدی نے کامیابی کے ساتھ کیا،اگرچہ ان جنگوں میں مسلمانوں کو بھی کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

یزید بن عبدالملک کے دور میں بھی حکومت کے خلاف مختلف بغاوتیں ہوئیں۔سب سے پہلی بغاوت یزید بن مہلب نے 720ء میں کی،وہ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں خراسان کا گورنر تھا۔عمر بن عبدالعزیز نے جب اس سے وہاں کا حساب طلب کیا تو وہ اسے پیش کرنے میں ناکام رہا جس کی وجہ سے اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔یزید بن عبدالملک کے دور میں اسے کئی اسباب کی وجہ سے اپنے قتل کا اندیشہ ہوا چنانچہ وہ عراق کی طرف چلا گیا اور اپنے قبیلے کے ساتھ اس نے اموی حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔خلیفہٗ وقت نے مسلمہ بن عبدالملک کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور انہوں نے اسے شکست دے کر قتل کردیا۔اس طرح سے یہ بغاوت بھی ختم ہوئی۔اسی طرح 723-721ء میں خراسان کے ایک علاقے سغد،کش اور نسف وغیرہ میں بغاوتیں ہوئیں جسے وقفہ وقفہ سے عثمان بن عبداللہ،مسیّب بن بشر ریاحی،سعید بن عبدالعزیز اور سعید بن ہبیرہ فزاری نے ختم کیا۔یمن،بحرین اور ترکستان میں بھی حکومت کے خلاف محاذ کھولا گیا۔ترکستان میں جراح بن عبداللہ حکمی کی سربراہی میں رباب دریائے ران،بلنجر اور ابوبندر کی جنگوں میں باغیوں کو سزا دی گئی،اگرچہ مکمل طور سے انہیں ختم نہیں کیا جاسکا۔اس زمانے میں خوارجوں نے بھی سر اٹھایا اور عفان خارجی،مسعود عبدی اور ہلال بن مدلج کی قیادت میں بغاوتیں کی گئیں لیکن خلیفہ وقت نے بروقت ان کو بزور طاقت دبا دیا۔

ہشام بن عبدالملک بھی اپنے عہد کو بغاوتوں سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔اس کی مختلف وجوہات رہیں جیسے مملکت کا انتہائی وسیع ہونا،عباسی حکومت کے قیام کی تیاری،شیعہ حضرات کی تحریک،خوارج کی فتنہ پروری،غیر مسلموں کی اندرونی سازشیں،نومسلموں کا اسلام کو پورے طور سے نہ سمجھ پانا،ترکوں اور دیگر قبائل کا حکومت کے خلاف ہوجانا وغیرہ۔اموی خلیفہ نے حتی الامکان ان تمام بغاوتوں کو ختم کرنے کی کوششیں کیں،لیکن وہ اپنے اس مقصد میں مکمل طور سے کامیاب نہیں ہوسکے۔سازشوں کا مرکز خراسان اور وسط ایشیا تھا۔خلیفہ وقت کی جانب سے اول الذکر میں کثرت سے گورنر تبدیل کیے گئے کہ کسی طرح سے حالات قابو میں آجائیں،بہت حد تک وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔خراسان کے گورنروں میں اسد بن عبداللہ قسری،اشرس بن عبداللہ سلمی،جنید بن عبدالرحمٰن مری،عاصم بن عبداللہ ہلالی اور نصر بن سیار کنانی کے نام قابل ذکر ہیں۔حکومت کے خلاف مختلف اوقات میں جن افراد یا قبائل نے بغاوتیں کیں،ان میں غوری،ترک،سغد و بخارا کے نومسلم قبائل،خاقانِ چین اور حارث بن شریح وغیرہ

سرفہرست ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو بغاوتوں کوختم کرنے میں والی خراسان نصر بن سیار کنانی کا اہم کردار رہا۔اسی عہد میں سندھ کے علاقوں میں بھی بغاوتیں ہوئیں جن کو والی سندھ جنید بن عبدالرحمٰن، حکم بن عوانہ اور عمرو بن محمد نے ختم کیں، نیز کردستان کے علاقوں بالخصوص آرمینیا اور خزر وغیرہ میں بھی 724ء سے بغاوتیں شروع ہوگئیں تھیں جسے والیان آرمینیا جراح بن عبداللہ حکمی،سعید حرشی ،مسلمہ بن عبدالملک اور مروان بن محمد اموی نے اپنے اپنے دور میں بزور طاقت ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ان بغاوتوں میں فریقین ہار جیت دونوں کا مزہ چکھتے رہے،لیکن بغاوتوں کا پورے طور سے خاتمہ ممکن نہ ہوسکا۔

ہشام بن عبدالملک کے آخری دور میں افریقہ اور اندلس میں کثرت سے بغاوتیں ہوئیں۔اس میں بربر اور خوارج پیش پیش تھے، جہاں ایک طرف ان کی باغیانہ روش رہی وہیں دوسری طرف اموی حکومت کی خراب پالیسی اور بدنظمی کا بھی اہم کردار رہا۔باغیوں میں ایک بربر عثمان بن ابی نعسہ نے بہت نام کمایا۔والیان اندلس سمح بن مالک خولانی،عنبسہ بن سحیم،عبدالرحمٰن غافقی،عبدالملک بن قطن فہری اور عقبہ بن حجاج وغیرھم نے اگرچہ ان بغاوتوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ پورے طور سے کامیاب نہ ہوسکے۔بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے حکیمانہ بصیرت اور سیاسی حکمت کے ساتھ اپنے عہد کی بغاوتوں کا خاتمہ کیا اور اموی حکومت کو زوال سے بچاتے ہوئے بہت حد تک مستحکم کیا۔

18.2.6 حضرت زید بن علیؑ کی خلافت:

حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپؓ کے خاندان میں جو اگلا شخص جس نے بنی امیہ کی اسلام کی تعلیمات کے منافی اور استبدادی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی اور قیام کا آغاز کیا وہ حضرت زید بن علی بن زین العابدینؒ تھے۔اس حوالے سے اگرچہ انہیں ان کے چچیرے بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد نے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔حضرت زید بن علیؒ کے نظر میں اسلام میں کسی ظالم آمر کی بیعت حرام تھی اور ایسے حاکم کو معزول کرنا واجب تھا۔ چچازاد بھائی ابوجعفر نے ان سے کہا کہ اہل عراق پر قطعی بھروسہ نہ کریں،انہوں نے ہمارے باپ اور دادا کے ساتھ بھی دغابازی کی ہے۔درحقیقت ان کو اس مقام تک پہنچانے میں کوفیوں کا بڑا ہاتھ تھا اور ہمیشہ کی طرح پھر سے انہوں نے خاندانِ علوی کو عین وقت پر دھوکہ دیا۔اہل کوفہ میں سے پندرہ ہزار افراد نے خفیہ طور پر ان کے ہاتھ بیعت کی اور طے شدہ تاریخ کے مطابق بغاوت کرنے کا وعدہ کیا۔اس کی خبر جب عراق کے گورنر یوسف بن عمر ثقفی کو ملی اس نے عوام کی حرکت پر پابندی لگادی اور اگلے ہی دن حضرت زید بن علیؒ اور ان کے ساتھ کے چند سو اصحاب پر حملہ کردیا،اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔

18.2.7 بازنطینیوں/رومیوں کے حملے:

اسلام کی مخالفت اہل روم نے خلفائے راشدین کے عہد سے ہی شروع کردی تھی اور وہ برابر اسلامی ریاست کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جانب سے جوابی کاروائی کا آغاز کیا گیا تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تیزی آتی گئی اور نہ صرف باغیوں سے مقبوضہ علاقوں کو واپس لیا گیا بلکہ مزید فتوحات بھی ہوئیں۔حضرت علیؓ کے زمانے میں جب ان کا حضرت امیر معاویہؓ سے سیاسی اختلاف ہوا تو اس صورت حال کا فائدہ اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں نے بھی اٹھانا چاہا، چنانچہ رومی بادشاہ نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا اور بعض حصوں پر قبضہ بھی جمالیا۔اپنی اس کامیابی سے متاثر ہوکر اس کے دل میں پورے عالم اسلام پر حکومت کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

حضرت امیر معاویہؓ نے جب حکومت کی گدی سنبھالی تو وہ اندرونی مسائل سے گھرے ہوئے تھے۔ایسے حالات میں انہیں بہتر معلوم ہوا کہ وہ وقتی طور پر رومی بادشاہ قیصر کونس تانس ثانی (668-642) سے صلح کرلیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور تھیوفانس کی متعین کردہ رقم بطور

معاوضہ اسے دینے لگے، اگر چہ ان کا یہ عمل زیادہ دن جاری نہیں رہ سکا اور انہوں نے اسے کہلا بھیجا کہ اگر تم اپنی ان گھٹیا حرکتوں سے باز نہیں آئے تو میں اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ سے صلح کرلوں گا اور پھر ہم دونوں مل کر تمہاری حکومت کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس دھمکی سے مرعوب ہو کر اس نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی۔

حضرت امیر معاویہؓ کو جب اندرونی بغاوتوں وغیرہ سے فرصت ملی تو انہوں نے رومی سلطنت پر توجہ دی اور ان کی چھیڑ چھاڑ اور سازشوں کا جواب دینے کے لیے باقاعدہ ایک فوج تشکیل دی جسے 'گرمائی فوج' کا نام دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ سردیوں میں ان علاقوں کی طرف جانا ممکن نہیں تھا، اس لیے جنگ روک دی جاتی تھی اور گرمی میں پھر سے جنگیں شروع کر دی جاتی تھیں۔ اسی طرح انہوں نے ایک خصوصی بحری بیڑا تیار کرایا جو سمندری راستوں سے رومی سلطنت پر حملے کیا کرتا تھا۔ اس کا انہیں ایک فائدہ یہ بھی ملا کہ اسلامی فوج پھر سے جہاد کے لیے تیار ہو گئی جس پر حضرت علیؓ کے عہد سے زنگ لگ گیا تھا اور وہ آپسی خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔

حضرت امیر معاویہؓ نے 668ء میں اپنے جانشین اور بیٹے یزید بن معاویہ کی سربراہی میں ایک فوج رومیوں کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجی۔ اس میں حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ جیسے عظیم المرتبت بزرگ ہستیاں شامل تھیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ رومیوں سے جہاد کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دی تھی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا اس مہم میں انتقال ہو گیا تھا تو انہیں ان کی وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے ہی دفن کر دیا گیا۔ رومی اپنے وقت میں ان کی قبر پر آ کے بارش کی دعائیں مانگا کرتے تھے، اور جب عثمانی سلطنت کے تحت 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کیا گیا تو ان کی قبر پر ایک مقبرہ اور مسجد بنادی گئی جس میں خلیفۂ وقت کی تاج پوشی ہوا کرتی تھی۔ امیر معاویہ کے ذریعہ بھیجی گئی اس مہم میں اگر چہ قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا لیکن رومی علاقوں میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کے بعد تو بحری و بری جنگی مہموں کا ایک سلسلہ چل پڑا اور 674ء سے 680ء تک اس طرح کی جنگیں ہوتی رہیں جس میں مسلمانوں کو بے شمار کامیابی ملی۔

عبدالملک بن مروان کے اولین عہد میں اسلامی ریاست پھر سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی یعنی امت مسلمہ کے بیک وقت دو خلیفہ ہو گئے تھے، نیز شیعہ اور خوارج کی فتنہ پروری اور سازشیں بھی در پردہ جاری تھیں۔ ایسے حالات میں رومیوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اسلامی سرحدوں پر پھر سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ خلیفۂ وقت نے ان سے صلح کر کے خراج دینے میں بھلائی سمجھی، کیونکہ ان کے اندرونی مسائل اتنے تھے کہ ان سے نپٹنا مشکل ہو رہا تھا، لیکن ان کا یہ عمل وقتی تھا پھر جیسے ہی ان کو فرصت ملی، انہوں نے رومیوں کے خلاف جہاد شروع کرتے ہوئے متعدد دفعہ اپنی فوجوں کو جنگ کے لیے بھیجا جس نے بہت کم وقت میں ہی مختلف رومی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس میں اسلامی فوج کے سربراہ مسلمہ بن عبدالملک کی حکمت و بصیرت کا اہم کردار رہا ہے۔ انہیں اس عہدے پر ولید بن عبدالملک نے بھی برقرار رکھا، جس کے نتیجے میں بعض بازنطینی علاقے جس میں طوانہ، قلعہ عموریہ، اردلیہ اور سوریہ کے پانچ قلعے وغیرہ شامل تھے، مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ دوسری طرف عباس اموی نے ارزن، باب، طرسوس اور انطاکیہ کو فتح کیا۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں بھی رومی سلطنت پر مسلمانوں کی جانب سے حملے کیے جاتے رہے۔ اس عہد میں بازنطینی حکومت آپسی اختلافات اور خانہ جنگی کی وجہ سے بہت کم زور ہو گئی تھی جس کا فائدہ یقیناً مسلم سپہ سالاروں کو ہوا اور مروان بن محمد اموی، مسلمہ بن عبدالملک، معاویہ بن ہشام اور مسلمہ بن ہشام وغیرھم نے روم کے اہم علاقوں جیسے قونیہ، کنج، قیساریہ، صملہ، قلعہ طیبہ، خرشنہ اور قلعہ مطمورہ کو اسلامی ریاست کا حصہ بنا

دیا۔ یہ تمام فتوحات 723ء سے لے کر 738ء کے بیچ ہوئیں۔اس طرح سے اموی حکومت نہ صرف مضبوط اور مستحکم ہوئی بلکہ اسلامی ریاست بھی وسیع ہوئی۔

18.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اموی حکومت کا قیام خلفائے راشدین کے عہد کے فوراً بعد عمل میں آیا۔اس حکومت کے بانی حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ یہ حکومت 661ء سے 750ء تک قائم رہی۔اس دوران کل چودہ خلیفہ ہوئے جن میں سے پہلے تین سفیانی خاندان سے تھے اور باقی گیارہ مروانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے خلیفہ حضرت امیر معاویہؓ اورآخری خلیفہ مروان بن محمد ہوئے۔
- اموی حکومت غیر اسلامی حکومت نہیں تھی اور نہ ہی وہ خلافت راشدہ سے الگ تھی۔دونوں میں فرق بس اتنا تھا کہ خلافت راشدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین تربیت یافتہ لوگوں کے ذریعے قائم ہوئی تھی جب کہ اموی حکومت دوئم درجے کے صحابہ کرام اور تابعین کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اموی حکومت میں اسلامی شریعت کا حتیٰ الامکان پاس ولحاظ رکھا گیا تھا۔
- اموی حکومت کو مستحکم کرنے میں بعض اموی خلفاء جیسے حضرت امیر معاویہؓ،عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک وغیرہ کا اہم کردار رہا ہے۔اسی وجہ سے عبدالملک بن مروان کو اموی خلافت کا 'دوسرا بانی' کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے عہد میں اسلامی ریاست نے وہی استحکام حاصل کیا تھا جو ان سے پہلے اموی حکومت کو حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں حاصل تھا۔اسی طرح عمر بن عبدالعزیز کو ان کی حکیمانہ بصیرت، سیاسی فہم وشعور اور عدل وانصاف کی وجہ سے 'عمر ثانی' کا خطاب دیا گیا۔
- یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی حکومت کے استحکام میں فوج اور اس کے سپہ سالاروں کا اہم کردار ہوا کرتا ہے، کیونکہ وہی حکومت کے خلاف اندرونی و بیرونی بغاوتوں کا خاتمہ کرتی ہے اور اس کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔اس لحاظ سے اموی حکومت بہت خوش قسمت نظر آتی ہے کہ اسے کئی ذہین وفطین، شجاع اور جنگی حکمت کے ماہر سپہ سالار ملے جنہوں نے نہ صرف اموی حکومت کے خلاف ہونے والی بغاوتوں اور سازشوں کا سد باب کیا بلکہ اسے عروج پر بھی پہنچایا۔ان میں مسلمہ بن عبدالملک،عقبہ بن نافع،حسان بن نعمان،قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کے نام قابل ذکر ہیں۔ان سپہ سالاروں کی بدولت اسلامی خلافت کی سرحدیں کاشغر سے بحر اوقیانوس تک تھیں جن کی لمبائی پانچ ہزار میل سے زائد تھی۔اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگر کوئی انسان ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل جانا چاہے تو اسے روزانہ بیس میل چلنے کی صورت میں سال بھر سے زائد کا عرصہ درکار ہوتا تھا۔اسی طرح اموی حکومت کے استحکام میں گورنروں کا بھی اہم کردار رہا جن میں حجاج بن یوسف، زیاد بن ابیہ، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن العاص وغیرھم کے نام قابل ذکر ہیں۔
- اموی حکومت کے استحکام میں بری اور بحری دونوں طرح کی فوجوں نے اہم کردار ادا کیا۔حضرت امیر معاویہؓ نے اس سلسلے میں خصوصی توجہ دی اور انہوں نے باقاعدہ بحری فوج اور بیڑے تیار کرائے جس کی مدد سے مسلم فوجوں نے اندلس اور روم پر حملہ کیا۔ ہشام بن عبدالملک نے اسے مزید ترقی دی اور شمالی افریقہ کے ساحلی مقامات پر جہاز سازی کے کارخانے قائم کرائے۔
- عہد اموی میں دو دفعہ امت مسلمہ میں بیک وقت دو خلیفہ ہوئے۔ایسا اس وقت ہوا جب حضرت امام حسنؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ خلیفہ

بنے،اگر چہ یہ صورت حال وقتی رہی اور بہت جلد ہی امت مسلمہ کا ایک خلیفہ پر اتفاق ہو گیا۔پہلی دفعہ حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ خلیفہ رہے اااور دوسری دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور معاویہ ثانی بن یزید، مروان بن حکم اور عبدالملک بن مروان خلیفہ رہے۔آخرالذکر کے عہد میں تمام امت کا ایک خلیفہ یعنی عبدالملک بن مروان پر اجماع ہو گیا۔

- اموی حکومت کو شیعہ حضرات، خوارج، رومی/ بازنطینی حکومت اور بسا اوقات اپنے گورنروں اور افسروں کی جانب سے بھی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا اس نے کامیابی کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے خاتمہ کیا، البتہ آخری دور میں حکومت جب نا اہلوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو وہ اس طرح کے معاملات کو سنبھال نہیں سکے جس کے نتیجے میں اموی حکومت کا خاتمہ ہوا۔
- واقعہ کربلا(61A.H/680AD)، مرج راہط کی جنگ(65A.H/684AD)، توابین کی جنگ (65A.H/685AD)، اسلامی سکوں کا احیاء (75A.H/693AD)، جامع اموی کی تعمیر کا آغاز (65A.H/684AD)، قسطنطنیہ پر پہلا حملہ (84A.H/668AD)، سندھ کی فتح(92A.H-95A.H/711AD-714AD)، قیروان کی بنیاد(50A,H/670AD)

18.4 کلیدی الفاظ

بانی حکومت	:	حکومت کی داغ بیل ڈالنے والا
قیام واستحکام	:	استقلال ومضبوطی
تحکیم	:	ثالثی بنانا(جنگ صفین میں جب قرآن کو حکم بنایا گیا اس کو واقعہ تحکیم کے نام سے جانتے ہیں)

18.5 نمونہ امتحانی سوالات

18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی حکومت کا بانی کون تھا؟

a. عمر بن عبدالعزیز　b. یزید بن معاویہ　c. امیر معاویہؓ　d. معاویہ بن یزید

2. اموی حکومت کب سے کب تک قائم رہی؟

a. 638ءتا763ء　b. 644ءتا755ء　c. 643ءتا753ء　d. 641ءتا750ء

3. اموی حکومت میں کل کتنے خلیفہ ہوئے؟

a. 12　b. 13　c. 14　d. 16

4. اموی حکومت کے دارالحکومت کہاں تھا؟

a. مدینہ منورہ　b. کوفہ　c. بصرہ　d. دمشق

5. جنگ صفین کن دولوگوں کے درمیان ہوئی؟

a. حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ　b. علیؓ اور امیر معاویہؓ　c. امیر معاویہؓ اور عائشہؓ　d. علیؓ اور عائشہؓ

6. حضرت امیر معاویہ نے کسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا؟

a. یزید بن معاویہ　b. معاویہ بن یزید　c. ولید بن عبدالملک　d. عمر بن عبدالعزیز

7. اموی حکومت کا 'دوسرا بانی' کسے کہا جاتا ہے؟

a. عبدالملک بن مروان b. عمر بن عبدالعزیز c. یزید بن معاویہ d. ہشام بن عبدالملک

8. اموی حکومت کے کس خلیفہ کو 'عمر ثانی' کہا جاتا ہے؟

a. امیر معاویہ b. عمر بن عبدالعزیز c. یزید بن معاویہ d. عبدالملک بن مروان

9. عبدالملک بن مروان کے عہد میں کس نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا؟

a. حسینؓ b. حسنؓ c. زبیرؓ بن العوام d. عبداللہ بن زبیرؓ

10. حضرت زید بن علی نے کس اموی خلیفہ کے عہد میں خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی؟

a. ہشام بن عبدالملک b. عبدالملک بن مروان c. ولید بن عبدالملک d. معاویہ بن یزید

18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی حکومت کے قیام میں حضرت امیر معاویہؓ کے کردار پر مختصر نوٹ لکھیں۔
2. حضرت امام حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان صلح کیسے اور کن شرائط پر ہوئی؟ مختصراً بیان کریں۔
3. حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بیان کریں۔
4. حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت پر تبصرہ کریں۔
5. عہد اموی کی بغاوتوں کا مختصراً تجزیہ پیش کریں۔

18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. عبدالملک بن مروان کی حیات وخدمات پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیں۔
3. عہد اموی میں بازنطینیوں/رومیوں کے خلاف جہاد کا تجزیاتی مطالعہ پیش کریں۔

18.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

---

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد اول) : ثروت صولت
2. تاریخ تہذیب اسلامی (جلد دوم) : پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
3. تاریخ اسلام (جلد دوم) : شاہ معین الدین احمد ندوی
4. خلفائے راشدین : شاہ معین الدین احمد ندوی
5. مسلم تاریخ : محمد مبشر نذیر

-:oOo:-

اکائی 19 : بنوامیہ کے اہم حکمراں (حصہ اول)

اکائی کے اجزا

19.0 تمہید

19.1 مقصد

19.2 بنوامیہ کے اہم حکمراں

19.2.1 حضرت امیر معاویہؓ

19.2.2 یزید بن معاویہؓ

19.2.3 معاویہ بن یزید

19.2.4 مروان بن حکم

19.2.5 عبدالملک بن مروان

19.2.6 ولید بن عبدالملک

19.3 اکتسابی نتائج

19.4 کلیدی الفاظ

19.5 نمونہ امتحانی سوالات

19.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

19.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

19.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

19.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

19.0 تمہید

حضرت امیر معاویہؓ کے ذریعہ اموی حکومت قائم ہوئی۔اس کے قیام واستحکام کی تفصیل اکائی اٹھارہ میں آچکی ہے۔اس لیے یہاں تکرار سے بچتے ہوئے صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ اموی حکومت 41ھ بمطابق 661ء میں قائم ہوئی اور اس کا خاتمہ 132ھ بمطابق 750ء میں ہوا۔اس میں کل چودہ(14) حکمراں ہوئے جنھوں نے اپنے دور حکومت میں حتی الامکان وسعت بخشی۔ابتدائی سات یا آٹھ حکمراں ایسے تھے جنھوں نے اموی حکومت کو اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا،البتہ ان کے بعد کے خلفاء اسلامی ریاست کو مختلف وجوہات کی بنا پر زوال سے روک نہیں سکے اور بالآخر تقریباً نوے سال بعد اس عظیم الشان حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔اموی حکمرانوں کے تفصیلی جائزہ کے لیے انہیں دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے،اس اکائی

میں ابتدائی چھ حکمرانوں کا تذکرہ کیا جائے گا، اور بقیہ حکمرانوں کا ذکر بیسویں اکائی کے تحت کیا جائے گا۔

19.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ کو اس بات کی واقفیت ہو جائے گی کہ اموی حکمراں کون کون تھے؟ انہیں کس طرح خلیفہ منتخب کیا گیا؟ ان کی ذاتی زندگی کیسی تھی؟ انہیں دورانِ خلافت کن مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے کس طرح ان کو حل کیا؟ ان کے دور میں کن علاقوں کو فتح کیا گیا؟ اہم واقعات اور اصلاحات کیا ہیں؟ نیز ان کی خدمات کس طرح کی ہیں؟

19.2 بنوامیہ کے اہم حکمراں

19.2.1 حضرت امیر معاویہؓ (660-680ء)/(41-60ھ):

حضرت امیر معاویہؓ کا تعلق بنی عبد مناف کے ممتاز ترین خانوادے بنوامیہ سے تھا۔ ان کا شجرہ نسب معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف ہے، یعنی ان کا یہ سلسلہ نسب پانچویں پشت پر نبی کریم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی۔ ایک روایت کے مطابق ان کی پیدائش ہجرت نبوی ﷺ سے پندرہ سال قبل مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ابوسفیان بن حرب تھا جو عہد جاہلیت میں قبیلہ قریش کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ والدہ محترمہ کا نام ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ اسلام کب لائے؟ اس حوالے سے مؤرخین اور سیرت نگار الگ الگ رائے رکھتے ہیں۔ ایک طبقے کا ماننا ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ ہی فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے جب کہ دوسرے طبقے کا ماننا ہے کہ وہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی چھاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کا شمار مکہ کے چند پڑھے لکھے نوجوانوں میں ہوتا تھا، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے انہیں کاتبین وحی میں شامل کیا تھا۔ آپؐ کے ساتھ ان کا تعلق تقریباً چار برس تک رہا۔ آپؐ نے ان کے حق میں دعا کی تھی اور ان کی خلافت کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ وہ قرآن و حدیث، فقہ اور عربی زبان و ادب کے ماہر تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد احادیث ان سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی بھی ان کے 'تفقُّہ فی الدین' کے قائل تھے۔ وہ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور فصیح و بلیغ تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ فیاضی، سخاوت، حلم اور بردباری میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی مشکل بس یہ رہی کہ وہ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی ریاست کے خلیفہ ہوئے، اسی وجہ سے لوگوں کی توقعات ان سے بہت بڑھ گئی تھیں۔ پھر حضرت علیؓ سے ان کے سیاسی اختلافات بھی ہوئے جن کی وجہ سے بعض طبقات نے ان کے خلاف فرضی واقعات، بہتان طرازیوں، جھوٹے پروپیگنڈوں اور فرضی احادیث کا انبار لگا کر اسلامی تاریخ میں ان کی شبیہ خراب کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ جیسے امیر معاویہؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حکومت الٰہیہ کی جگہ بادشاہی حکومت قائم کی اور اسے دنیاوی رنگ میں رنگ دیا۔ اسی طرح ان پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ منبر پر بیٹھے بیٹھے جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے، نیز انہوں نے اپنے ذاتی محافظ رکھے اور مسجد میں الگ سے اپنے لیے جگہ مقرر کی، لیکن انہوں نے ایسا اس وقت کیا تھا جب انہیں دشمنان اسلام کی جانب سے قاتلانہ حملوں کو سامنا کرنا پڑا تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ عہد نبوی سے ہی مختلف غزوات اور سرایا کا حصہ رہے تھے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں بھی وہ فوجی مہمات میں شامل تھے۔ شام کے ساحلی علاقے صیدا، عرقہ، جلیل، بیروت، جزیرہ قبرص، ملطیہ، طرابلس الشام، عموریہ وغیرہ کی فتوحات اور قیساریہ کی جنگ میں ان کا نمایاں کردار رہا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں ان کو پہلے دمشق کا گورنر بنایا اور پھر ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر پورے شام کا والی بنا دیا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی انہیں اس عہدے پر باقی رکھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق خلیفہ دوم نے انہیں صرف دمشق کا گورنر بنایا تھا، پھر خلیفہ سوم نے

انہیں پورے شام کا والی بنا دیا تھا، اس طرح سے وہ تقریباً بیس سال تک شام کے مقبول و معروف گورنر رہے، لیکن حضرت علیؓ نے انہیں اپنے عہد میں معزول کرنا چاہا، اگر چہ وہ اس میں مختلف وجوہات کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکے۔

حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد 41ھ میں عالم اسلام میں متفقہ طور پر خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ ان کا زمانہ امن و سلامتی، تعمیر و ترقی، جہاد و فتوحات اور دعوت الی اللہ کا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اندرونی و بیرونی بغاوتوں کا خاتمہ کرتے ہوئے اسلامی ریاست کو مستحکم کیا بلکہ مزید فتوحات کے ذریعے اسے وسعت بخشی۔ ان کا تذکرہ سابقہ اکائی ''بنوامیہ کا قیام و استحکام'' میں گزر چکا ہے۔

حضرت امیر معاویہ کے عہد میں صوبوں کی تقسیم وغیرہ سابقہ نظام کی طرح ہی تھی۔ نئی فتوحات میں مغربی علاقوں کو مصر کے تحت جب کہ مشرقی علاقوں کو خراسان کے ماتحت رکھا گیا۔ شورائی نظام میں بھی خلفائے راشدین کی تقلید کی گئی، البتہ اس میں دمشق اور شام کے شیوخ کو ترجیح دی گئی تھی۔ بعض نازک مواقع پر انہوں نے تمام صوبوں کے شیوخ اور اہل الرائے سے مشورے طلب کیے تھے۔ اموی حکومت کے بانی نے ایک کام ضرور سابق الاولین سے ہٹ کر کیا جس پر بعض صحابہ کرام کی طرف سے اعتراض بھی کیا گیا یعنی عرف عام میں خلافت کو بادشاہت میں تبدیل کرنا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے قبل اسلامی ریاست کے لیے جب اپنا جانشین اپنی زندگی میں ہی مقرر کرنا چاہا اور اس کے لیے مجلس شوریٰ، دیگر صوبوں کے ممتاز اہل الرائے اور شیوخ سے مشورہ کیا تو سب نے ان کے اس عمل کی تائید کی، لیکن انہوں نے اس کے لیے اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کا نام پیش کیا تو بعض عظیم صحابہ کرام نے اس پر سخت اعتراض کیا اور اسے قیصر و کسریٰ کے عمل سے تشبیہ دی۔ اگر چہ بعد میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب نے مختلف مصلحتوں کے پیش نظر ان کے بیٹے کی جانشینی سے اتفاق کر لیا تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے بنیادی طور پر خلفائے راشدین کے نظام کو باقی رکھا، البتہ حسب ضرورت اس میں مزید اضافے کیے جیسے 'دیوان خاتم' کے نام سے ایک نیا محکمہ قائم کیا جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ ماضی میں سرکاری احکام کی نقلوں کو محفوظ رکھنے کا رواج نہیں تھا، جس کی وجہ سے لوگ اس میں ردوبدل کر لیا کرتے تھے، چنانچہ بسا اوقات سنگین مسائل کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے پھر اس شعبہ کو قائم کیا جس میں سرکاری احکام لفافوں میں رکھنے کے بعد مہر لگا کر متعلقہ افراد کی طرف بھیجے جاتے تھے، نیز ان کی نقل دفتر میں محفوظ رکھی جاتی تھی، تا کہ بہ وقت ضرورت انہیں دیکھا جا سکے۔ اسی طرح انہوں نے دیوان برید یعنی ڈاک کے نظام کو ترقی دی، انہوں نے پوری اسلامی ریاست میں ڈاک لانے اور لے جانے کے لیے تھوڑی تھوڑی دوری پر تازہ دم ہرکارے اور گھوڑے مقرر کیے جس سے انہیں تمام جگہوں کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں۔ اسی طرح باقاعدہ بری و بحری فوج تشکیل دی، جس میں گرمائی اور سرمائی فوجوں کی تقسیم کی۔ اس حوالے سے انہوں نے شامی عربوں پر اعتماد کیا اور انہیں اپنی فوج میں خصوصی جگہ دی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کی فوج میں شامی عیسائی بھی شامل تھے جو اسلام نہیں لائے تھے۔ اسی طرح سے انہوں نے فوج کی تنظیم اور جنگ کے فرسودہ طور طریقوں کو چھوڑ دیا اور اسے جدید شکل دی، بحری فوج میں بری فوج کی طرح عہدے قائم کیے۔ جہاز سازی کے کارخانوں کی شروعات کی جس کی وجہ سے بحری فوجوں کو بہت ترقی ملی۔ افریقہ، مصر اور شام کے ساحلی علاقے ان کے مراکز تھے۔ انہوں نے قلعوں کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی، نئے قلعوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ پرانے قلعوں کی بھی مرمت کرائی۔ انصرطوس، بلینارس، مرقیہ اور روڈس وغیرہ میں نئے قلعے تعمیر کرائے۔ رومیوں کا پرانہ قلعہ جبلہ کو دوبارہ مرمت کرا کے آباد کیا۔ اسی طرح سے پولیس کے محکمہ کو ترقی دی، تا کہ ملک میں امن و امان قائم رہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ امن کا عالم یہ تھا کہ لوگ راستے میں گری پڑی چیزوں کو بھی اٹھانے سے ڈرتے تھے، نیز عورتوں کی عزت و عصمت بالکل محفوظ تھی۔

حضرت امیر معاویہؓ نے رفاہ عامہ پر بھی خصوصی توجہ دی۔ زراعت کی ترقی کے لیے کثرت سے نہریں کھدوائیں اور پرانی نہروں کی صفائی

کرائی، نہر کظامہ، نہر ازرق، نہر شہدا، نہر معقل وغیرہ ان ہی کے دور کی ہیں، نیز پہاڑی علاقوں میں تالاب بندھوائے جن میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ ان انتظامات سے زراعت میں بہت ترقی ہوئی۔ اسی طرح مختلف جگہوں پر نئی آبادیاں قائم کیں، نئے اور پرانے شہروں کو آباد کرایا، مرعش اور قیروان وغیرہ اسی کا حصہ ہیں۔ غیر مسلموں اور ذمیوں وغیرہ کو فوج کے علاوہ دیگر اہم عہدوں پر بھی فائز کیا، جیسے ان کے عہد میں ملک شام کا دفتر حکومت رومی زبان میں تھا اور سرجون رومی جو نصرانی تھا، وہ اس کا چیف سکریٹری تھا۔ انہیں اسلام کی اشاعت وتبلیغ سے بھی بہت دلچسپی تھی، اسی لیے مختلف صوبوں میں لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے معلمین بھیجے، مساجد تعمیر کرائیں، حرمین شریفین کی خدمت کے لیے افراد متعین کیے، کعبہ کے غلاف کو مزین و آراستہ کرایا۔ مجاہدوں، کمزور اور غریب لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے۔ انہوں نے اہل بیت، صحابہ کرام، قریش کے دیگر شرفاء اورامہات المومنین کا خصوصی خیال رکھا اور وہ ان کی خدمت میں برابر ہدایہ وتحائف بھیجا کرتے تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں اسلامی ریاست ایران، خراسان، ترکستان، سندھ، افریقہ اور روم وغیرہ تک پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی وفات سے قبل اموی حکومت کو اتنا مضبوط و مستحکم کر دیا تھا کہ بعد میں آنے والوں خلفاء کے لیے حکومت کرنا اور انتظام وانصرام سنبھالنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ اس طرح سے انہوں نے بیس سال شام میں بطور گورنر اور بیس سال بطور خلیفہ حکومت کرنے کے بعد 60ھ یعنی 680ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور دمشق میں مدفون ہوئے۔ انہوں نے چار شادیاں کیں جن کے نام میسون بنت مجدل، فاختہ بنت عبد عمرو، نائلہ بنت عمارہ کلابیہ اور کنوہ بنت قرظہ ہیں۔ اول الذکر سے یزید بن معاویہ اور ثانی الذکر سے عبدالرحمٰن اور عبداللہ پیدا ہوئے۔

19.2.2 یزید بن معاویہ (680-683ء)/(60-64ھ):

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین یزید بن معاویہ اسلامی ریاست کے خلیفہ بنے۔ ان کی پیدائش 26ھ میں حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اس وقت ہوئی جب ان کے والد پورے شام کے والی تھے۔ اس لیے پرورش اور تعلیم وتربیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رکھی گئی۔ انہوں نے خلافت کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے بے فکری اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کی تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے جب انہیں خلیفہ کے لیے نامزد کرنا چاہا تو انہوں نے ان کی اصلاح کے لیے بہت کوششیں کیں۔ انہیں فوج کا سپہ سالار بنایا اور قسطنطنیہ کی مہم پر بھیجا، اگرچہ وہ اسے فتح نہیں کر سکے، لیکن وہاں بہادری اور شجاعت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، جس کی وجہ سے انہیں 'فتی العرب' کا خطاب دیا گیا یعنی 'نوجوان عرب سورما'، اسی طرح انہیں دو مرتبہ حج کا امیر بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اپنی کوششوں میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔

تاریخ اور سیرت نگاری میں یزید بن معاویہ کے حوالے سے بہت افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔ بعض مؤرخین نے انہیں کافر، فاسق اور فاجر قرار دے دیا ہے تو کچھ نے انہیں اس قدر معصوم بنا کر پیش کیا ہے کہ ان پر صحابی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اعتدال کی راہ یہ ہے کہ انہیں بھی عام اموی خلیفہ سمجھا جائے جن سے جہاں ایک طرف انتہائی افسوسناک غلطیاں بھی ہوئی ہیں تو دوسری طرف ان کے ذریعے چند قابل قدر کام بھی انجام پائے ہیں۔ اگر سیر وتفریح، شکار اور شعر وشاعری وغیرہ سے شغل فرمانا ان کا مشغلہ تھا تو وہ قرآن وحدیث اور تاریخ کا بھی وسیع علم رکھتے تھے، نیز فیاضی، سخاوت، شجاعت اور بہادری میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اگرچہ ان کے عہد میں واقعہ کربلا اور حرہ جیسے دردناک حادثے پیش آئے، لیکن ان کے اردگرد جھوٹ اور دروغ گوئی کا اس قدر تانا بانا بن دیا گیا ہے کہ صحیح صورت حال کا ادراک کرنا مشکل ترین مرحلہ ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کی زندگی ہی میں عوام الناس کی جانب سے یزید بن معاویہ کو ولی عہد تسلیم کر لیا گیا تھا اور انہیں اسلامی ریاست، شام اور اپنے خاندان بنو امیہ کی حمایت حاصل تھی، اس لیے خلیفہ بننے کے بعد انہیں کچھ زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، البتہ بعض حسب ونسب میں بڑے

اور اثر و رسوخ والے صحابہ کرام جیسے حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی طرف سے انہیں ضرور اس سلسلے میں خدشہ تھا جس کا اظہار حضرت امیر معاویہؓ بھی کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے سب سے پہلے ان حضرات کی طرف توجہ دی اور ان سے بیعت لینے کی کوششیں شروع کیں، اس وقت مدینہ منورہ کے گورنر ولید بن عتبہ اموی اور مکہ مکرمہ کے گورنر عمرو بن سعید اموی تھے۔ خلیفہ وقت نے مدینہ کے گورنر سے کہا کہ حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور دیگر شیوخ سے بیعت لے لو۔ انہوں نے اس حوالے سے مروان بن حکم سے مشورہ کیا تو اس نے کہا:

''عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی فکر نہ کرو، ان کو حکومت کی طلب نہیں ہے، البتہ حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اسی وقت بلا کر ان سے بیعت لے لو۔ اگر نہ مانیں تو زندہ واپس مت جانے دو۔ اگر امیر معاویہؓ کی وفات کی خبر عام ہو گئی اور ان لوگوں نے بیعت نہیں کی تو پھر بہت مشکل ہو جائے گی، کیونکہ یہ لوگ اپنے خیر خواہوں کے ساتھ اموی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے''۔

والی مدینہ نے مروان بن حکم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنے پاس بلایا۔ دونوں بزرگوں کو پہلے ہی حالات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے دورانِ ملاقات اسے ٹال دیا اور پھر دونوں نے ہی یکے بعد دیگرے مکہ مکرمہ کی راہ لی۔ ولید بن عتبہ نرم مزاج اور نیک طبیعت کے تھے اور انہیں اہل بیت سے محبت بھی تھی، اس لیے انہوں نے سختی سے کام لینے کے بجائے نرم روش اختیار کی۔ اسی طرح مکہ مکرمہ کے والی عمرو بن سعید نے بھی ان دونوں حضرات سے بیعت کا مطالبہ ضرور کیا، لیکن اس میں سختی اور اصرار شامل نہیں تھا۔ اسی دوران حضرت امام حسینؓ کے پاس کوفہ سے خطوط آنے لگے کہ وہ وہاں تشریف لائیں، کوفی شیعہ ان کے ساتھ ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ نواسہ رسول کو خلافت مل جائے۔ جب اہل کوفہ نے کثرت سے اصرار کیا تو امام حسینؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو صحیح صورت حال جاننے کے لیے کوفہ بھیجا اور ان کے کہنے پر کوفہ کا قصد کیا۔ اس کے بعد ہی شہادت حسینؓ کا واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل سابقہ اکائی میں گزر چکی ہے۔

یزید بن معاویہ کے عہد میں ہی واقعہ حرہ پیش آیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ 63ھ بمطابق 683ء میں مدینہ منورہ میں حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت ہوئی، جسے مسلم بن عقبہ کے ماتحت شامی لشکر نے طاقت کے زور پر دبا دیا۔ اس میں تمام اہل مدینہ بالخصوص اہل بیت شامل نہیں تھے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ شہادت حسینؓ کے بعد اہل مدینہ میں اموی حکومت کے خلاف غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ اسی دوران عثمان بن محمد کو والی حجاز بنایا گیا جس نے حکومت کے حق میں رائے ہموار کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے ایک وفد جس میں عبداللہ بن حنظلہ، عبداللہ بن ابی عمرو، منذر بن زبیر وغیرھم جیسے اکابرین کو دمشق بھیجا۔ یزید بن معاویہ نے اس وفد کی خصوصی خاطر مدارات کی اور مال و دولت سے بھی نوازا، عبداللہ بن حنظلہ اور منذر بن زبیر کو ایک لاکھ درہم اور اول الذکر کے آٹھ بیٹوں کو دس دس ہزار درہم دیئے گئے۔ اسی طرح دیگر افراد کو بھی کثیر رقمیں دی گئیں، لیکن وہ انہیں متاثر نہ کر سکا اور جب ان لوگوں نے ان کی حرکات و سکنات دیکھیں تو عبداللہ بن حنظلہ نے مدینہ آ کر فرمایا:

''ہم ایسے نااہل کے پاس سے آ رہے ہیں جس کا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی مذہب، شراب پیتا ہے اور راگ باجا سنتا ہے، واللہ اگر کوئی مہدی من اللہ ہوتا تو اس سے جہاد کرتا۔ ہم اس کی بیعت کو ختم کرتے ہیں اور اس کی دی ہوئی رقم سے اس کا مقابلہ کریں گے۔''

اس سے اہل مدینہ یزید سے مزید متنفر ہو گئے اور انہوں نے عبداللہ بن حنظلہ کی سربراہی میں بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں واقعہ حرہ پیش آیا۔ یزید بن معاویہ نے پہلے اہل مدینہ اور اہل مکہ کو سمجھانے کی کوشش کی، اسی لیے انہوں نے نعمان بن بشیر کو دونوں جگہ بھیجا، تاکہ معاملہ بات چیت سے حل کر لیا جائے، لیکن جب کوئی راستہ نہیں ملا تو انہوں نے بغاوت کے خاتمے کے لیے مسلم بن عقبہ کو فوج کے ساتھ مدینہ بھیجا اور ہدایت کی کہ تین بار

انہیں بیعت کے لیے کہنا اور اگر نہ مانیں تو پھر جنگ شروع کرنا اور صرف تین دن تک مدینہ کو لوٹنا، نیز علی بن حسین سے تعارض مت کرنا۔ ادھر جب اہل مدینہ کو شامی فوج کے آنے کی خبر ملی تو انہوں نے مدینہ میں مقیم امویوں پر سختی شروع کی اور بعض کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر ان کی اکثریت نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیا جائے، ہمارا وعدہ ہے کہ ہم آپ لوگوں کا کوئی راز ظاہر نہیں کریں گے، اہل مدینہ نے انہیں چھوڑ دیا۔ ان میں سے بعض کی ملاقات مسلم بن عقبہ سے ہوئی اور عبدالملک بن مروان، جو بعد میں خلیفہ بھی بنے، انہیں مدینہ کے حالات بتاتے ہوئے کہا:

''آپ لوگ مقام ذی نخلہ میں قیام کریں اور وہاں کی پیداوار سے لطف اندوز ہوں۔ دوسرے دن صبح میں مشرق کی جانب سے مقام حرہ سے مدینہ میں داخل ہو جائیں، اس سے آپ لوگوں کو سورج کی روشنی سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور آپ کی خود، تلوار، زرہ، نیزہ اور بھالے وغیرہ کی چمک سے اہل مدینہ کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔''

مسلم بن عقبہ نے عبدالملک بن مروان کی رائے کے مطابق مدینہ کا محاصرہ کیا اور انہیں تین بار بیعت کی دعوت دی، لیکن اہل مدینہ نے جنگ کو ترجیح دی اور شدید مقابلے کے بعد شکست کھائی۔ اس جنگ میں مدینہ کے کئی اکابرین اور شیوخ شہید ہوئے، مدینہ منورہ میں تین دن تک لوٹ مار ہوتی رہی اور اموی حکومت کے مخالفین کو قتل کر دیا گیا۔ تاریخ میں اس واقعہ کو لے کر بہت سے افسانے مل جائیں گے، لیکن معتبر مؤرخین اور علماء کرام نے اسے من گھڑت اور بے بنیاد قرار دیا ہے، اس میں علامہ ابن تیمیہ کا نام قابل ذکر ہے۔

مسلم بن عقبہ نے مدینہ منورہ کے بعد مکہ مکرمہ کا رخ کیا، کیونکہ وہاں عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید بن معاویہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ خلیفہ وقت کے سفیر نعمان بن بشیر نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔ دورانِ سفر مسلم بن عقبہ بیمار پڑ گیا اور مکہ پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنی وفات سے قبل حصین بن نمیر کو فوج کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس نے 64ھ یعنی 684ء میں فوج کے ساتھ مکہ کا محاصرہ کر لیا اور اہل مکہ کو یزید کی بیعت کی دعوت دی، لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا اور عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس میں اہل مکہ، حجاز اور مدینہ کے افراد شامل تھے۔ اس طرح سے امت مسلمہ میں دو خلیفہ ہو گئے تھے۔ حجاز کے علاقے ابن زبیرؓ کے پاس تھے اور باقی تمام علاقے یزید بن معاویہ کے قبضے میں رہے۔ یہی وجہ رہی کہ کئی اکابرین نے ابن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ ایک خلیفہ تو پہلے سے ہی موجود تھے۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے اموی فوج کا مقابلہ مکہ سے باہر نکل کر کیا اور فریقین میں سخت مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پالیسی تبدیل کی اور مکہ میں محصور ہو کر ہی جنگ شروع کی۔ حصین بن نمیر نے منجنیقوں کی مدد سے خانہ کعبہ پر سنگ باری کی، جس کی وجہ سے اس کے کچھ حصوں کو نقصان پہنچا اور اس کے پردے اور لکڑیاں وغیرہ جل گئیں۔ فریقین میں لڑائی جاری تھی کہ یزید بن معاویہ کا انتقال ہو گیا، جب اس کی خبر حصین بن نمیر کو ملی تو اس نے عبداللہ بن زبیرؓ سے رازداری کے ساتھ ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ شام چلیں، تاکہ ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت لی جا سکے، نیز اس نے اپنی اور شام کے دیگر اکابرین و شیوخ کی حمایت کا یقین دلایا۔ بدقسمتی سے عبداللہ بن زبیرؓ نے اس کی رائے کو قبول نہیں کیا اور کہا کہ اہل حرم میں خون بہانا جرم ہے اور جنہوں نے بھی اس قبیح عمل کو انجام دیا ہے، میں ان کو معاف نہیں کروں گا اور ایک حجازی کے بدلے میں دس شامی کو بطور قصاص قتل کروں گا۔ یہ سن کر حصین بن نمیر نے کہا:

''میں آپ کو انتہائی چالاک اور سمجھ دار انسان سمجھتا تھا، لیکن آپ تو اس کے برعکس نکلے۔ میں آپ سے نرمی و محبت سے گفتگو کر رہا ہوں اور آپ مجھ سے چیخ چلا کر بات کر رہے ہیں، میں آپ سے خلافت حاصل کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں اور آپ میرے سامنے قتل و غارت گری کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں''۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً اپنے قاصد حصین بن نمیر کے پاس بھیجے کہ میں عام معافی دینے کو تیار ہوں، لیکن شام نہیں جاؤں گا۔اس پر اس نے کہا کہ شام کا قصد کیے بنا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اس طرح سے یہ گفتگو ناکام ہوگئی اور انہوں نے پوری خلافت حاصل کرنے کے اس عمدہ موقع کو کھو دیا، اگر چہ وہ حجاز اور بعض دیگر علاقوں کے خلیفہ بنے رہے۔

یزید بن معاویہ کے عہد میں اسلامی ریاست کے خلاف بعض علاقوں جیسے ترکستان، افریقہ اور روم وغیرہ میں بغاوتیں ہوئیں جن کو کامیابی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ 61ھ یعنی 680ء میں مسلم بن زیاد کے ذریعے ترکستان کی بغاوتوں کا خاتمہ ہوا اور اسی سال سمرقند و بخارا میں فتوحات بھی ہوئیں۔62ھ یعنی 681ء میں عقبہ بن نافع نے افریقہ میں ہونے والی بغاوتوں کو ختم کیا، نیز لمبیس، طنجہ، سبتہ، تاہرت، قفصہ، قسطلیہ اور زاب وغیرہ کو فتح کیا جس سے اسلامی ریاست کی سرحدیں افریقہ کے آخری حصوں تک پھیل گئیں۔

یزید بن معاویہ کا نکاح ام ہاشم بنت عتبہ سے ہوا جن سے معاویہ اور خالد پیدا ہوئے۔دوسرا نکاح ام کلثوم بنت عبداللہ سے ہوا جن کے بطن سے عبداللہ دنیا میں تشریف لائے۔

19.2.3 معاویہ(ثانی) بن یزید (683-684ء)/(64ھ):

یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے معاویہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔جب انہوں نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کی عمر اکیس برس تھی، لیکن وہ انتہائی نیک اور صالح نوجوان تھے۔اپنے والد محترم کے دور میں انہوں نے مسلمانوں کی آپسی جنگ میں جو کشت وخون دیکھا، اس سے ان کی طبیعت خلافت سے اچاٹ ہوگئی اور جلد ہی مسلمانوں سے معذرت کرتے ہوئے وہ اس بوجھ سے دستبردار ہوگئے۔ان کی خاص بات یہ رہی کہ انہوں نے اپنا کوئی جانشین بھی مقرر نہیں کیا۔اس کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اسی حال میں ان کا انتقال ہوگیا۔کچھ روایتوں میں آتا ہے کہ انہیں زہر دے کر مار دیا گیا۔ایک طرح سے انہوں نے بھی حضرت حسنؓ جیسی مثال پیش کی اور دنیا و آخرت میں سے اول الذکر کو کنارے کر دیا۔انہوں نے کتنے دن خلافت کی؟ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض کا ماننا ہے کہ بیعت کے چالیس دن بعد خلافت سے دست بردار ہوئے اور کچھ کا کہنا ہے کہ وہ تین ماہ بعد گوشہ نشین ہوگئے تھے۔واضح رہے کہ ان کے عہد میں بھی عبداللہ بن زبیر حجاز کے خلیفہ بنے رہے۔

19.2.4 مروان بن حکم (684-685ء)/(64-65ھ):

معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد اموی خاندان میں ہی اختلاف پیدا ہوگیا کہ اگلا خلیفہ کون ہوگا؟ اس بات پر تو سب کا اتفاق تھا کہ خلیفہ بنو امیہ میں سے ہوگا، لیکن وہ کس خاندان سے ہو؟ اس حوالے سے دو گروہ سامنے آئے۔ایک گروہ کا ماننا تھا کہ خلیفہ سفیانی خاندان سے ہی ہو اور وہ یزید بن معاویہ کے دوسرے نوجوان بیٹے خالد بن یزید کو اس عہدے پر دیکھنا چاہتے تھے۔اس کے برعکس دوسرا گروہ کسی تجربہ کار شخص جیسے مروان بن حکم کے حق میں تھا۔وہیں بعض افراد عبداللہ بن زبیر اور عمرو بن سعید بن عاص کو اس منصب کے لائق سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں بنو امیہ کے درمیان تصادم بھی ہوا۔طویل گفت و شنید اور بحث و مباحثہ کے بعد مجلس شوریٰ نے آخری فیصلہ جابیہ کے مقام پر کیا اور طے پایا کہ مروان بن حکم اسلامی ریاست کے خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد خالد بن یزید اور عمرو بن سعید ان کے جانشین ہوں گے۔اس مجلس میں بنو امیہ اور شام کے معزز اکابرین اور شیوخ شامل تھے۔

مروان بن حکم 64ھ میں اسلامی ریاست کا خلیفہ بنے۔ان کی پیدائش 3ھ میں ہوئی تھی اور ان کی والدہ کا نام آمنہ بنت علقمہ تھا۔ان کے والد حکم نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا، لیکن وہ دل سے ایمان نہیں لائے تھے اور مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کیا کرتے تھے۔اس لیے نبی

کریم ﷺ نے انہیں جلاوطن کردیا تھا۔حضرت عثمانؓ کے وہ حقیقی چچا تھے۔انہوں نے اپنے زمانے میں ان کے بیٹے مروان کو کاتب وسکریٹری کے عہدے پر رکھا تھا۔خلیفہ کی مہر بھی ان کے پاس رہتی تھی، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خلیفہ کی جانب سے مصر کے باغیوں کے قتل کا حکم لکھ کر اس پر ان کی مہر بھی لگادی تھی، جس کے بعد خلیفہ سوم کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، نیز وہ حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں مدینہ کے والی بھی مقرر کیے گئے تھے۔

درحقیقت عبداللہ بن زبیرؓ کے بعض غلط سیاسی فیصلوں نے مروان بن حکم کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع فراہم کیا کیوں کہ انہوں نے ہی مروان بن حکم کو مدینہ منورہ چھوڑنے پر مجبور کیا، وہ عبدالملک کے ساتھ شام پہنچے جہاں انہیں بنوامیہ اور عبیداللہ بن زیاد کا ساتھ ملا اور انہوں نے بنوامیہ کے استحکام کے لیے کوششیں شروع کردیں، اور مصر، شام، فلسطین وغیرہ پر اپنی حکومت قائم کرلی۔حجاز کے خلیفہ بدستور عبداللہ بن زبیر بنے رہے۔رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کیا اور کوفہ، بصرہ کے علاوہ عراق اور خراسان کے مزید کچھ حصے ان کے قبضے میں آ گئے۔اسی دوران 65ھ یعنی 685ء میں مرج راہط کی جنگ ہوئی جس میں ایک طرف عبداللہ بن زبیر کے پرزور حامی ضحاک بن قیس فہری اور دوسری طرف مروان بن حکم تھے۔فریقین میں زبردست جنگ ہوئی اور آخر میں مروان بن حکم کو فتح ملی۔قبیلہ قیس کے سردار ضحاک فہری قتل کردیے گئے۔اس شکست سے عبداللہ بن زبیر کی ساکھ متاثر ہوئی، کیوں کہ یہی وہ قبیلہ تھا جس نے سب سے زیادہ ان کی حمایت کی تھی۔

مروان بن حکم نے اسی دوران ایک بڑا اجرأت بھرا اور اہم فیصلہ لیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ولی عہدی میں تبدیلی کرتے ہوئے خالد بن یزید اور عمرو بن سعید کی جگہ اپنے بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کیا۔اس کے کچھ عرصے کے بعد ہی ان کا نیند کی حالت میں اچانک انتقال ہوگیا۔ان کی مدت خلافت بہت مختصر رہی یعنی کل نو ماہ، اس لیے ان کے عہد میں کسی قسم کی کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوسکی۔تاریخ نگاروں میں سببِ وفات کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ایک طبقے کا ماننا ہے کہ ان کی بیوی ام خالد نے انہیں زہر دے کر یا سوتے میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک بار بھرے دربار میں خالد بن یزید کی بے عزتی کی تھی، جب کہ دوسرا طبقہ اسے طبعی موت بتاتا ہے اور ان روایات کو بے بنیاد قرار دیتا ہے۔

19.2.5 عبدالملک بن مروان (707-686ء)/(86-65ھ):

مروان بن حکم کے بعد ان کے بیٹے عبدالملک بن مروان اسلامی ریاست کے خلیفہ بنے۔ان کی پیدائش 26ھ میں ہوئی۔ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت مدینہ منورہ جیسے مقدس شہر میں ہوئی، اس لیے انہیں مختلف صحابہ کرام اور تابعین کرام کی صحبت بھی میسر رہی اور انہوں نے حتیٰ المقدور ان سے کسب فیض کیا۔خود ان کا شمار اپنے وقت کے عظیم علمائے کرام میں ہوا کرتا تھا۔روایتوں میں آتا ہے کہ وہ اپنے شہر کے دس جید فقہاء اور علماء میں سے تھے اور حضرت زید بن ثابتؓ کے بعد مدینہ منورہ کے قاضی اور مفتی بھی تھے۔ان کی فقہی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے عظیم صحابی انہیں فقیہ تسلیم کرتے تھے اور عوام الناس کو ان سے فقہی مسائل میں رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔حضرت امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سوائے عبدالملک بن مروان کے سب پر اپنے آپ کو برتر پایا، کیونکہ جب بھی میں نے علم حدیث اور شعر وشاعری پر ان سے گفتگو کی، انہوں نے میرے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا۔ابوالزیاد کہتے ہیں کہ اس زمانے کے مدینہ منورہ میں چار فقہاء میں عبدالملک بن مروان بھی شامل تھے، یعنی سعید بن مسیّبؒ، عروہ بن زبیرؓ، قبیصہ بن ذویب اور خلیفہ وقت۔وہ قرآن وتفسیر سے خصوصی شغف رکھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے سعید بن مسیّب سے ایک تفسیر بھی لکھوائی تھی۔نیز انہیں سیرت، تاریخ، حدیث اور عربی زبان وادب کا بھی وسیع علم تھا۔وہ 75ھ/694ء میں امیر الحج بھی رہے۔انہیں دین اسلام سے محبت اس قدر تھی کہ ان کے فرامین وخطوط اللہ اور رسول اکرم ﷺ سے شروع ہوتے تھے۔اسی طرح ان کی انگوٹھی پر بھی "آمنت

باللہ مخلصا"،(میں خلوص دل سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا) نقش تھا۔انہیں عبادت وریاضت اور تلاوت قرآن سے خصوصی دلچسپی تھی،البتہ خلیفہ بننے کے بعد وہ سابقہ زندگی کو بعینہ برقرار نہیں رکھ سکے، چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ انہیں خلیفہ ہونے کی خبر اس وقت ملی جب وہ قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے،تو انہوں نے اسے بند کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اس سے آخری صحبت ہے۔ان کے مخالفین نے اسی وجہ سے ان پر الزام لگایا ہے کہ خلیفہ بننے کے بعد وہ مذہب سے دور ہو گئے تھے،حالانکہ ایسا بالکل نہ تھا،وہ خلیفہ بننے کے بعد بھی دین سے قریب رہے۔البتہ خلافت کی ذمہ داریوں نے یقیناً اسے متاثر کیا،اسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا۔

عبدالملک بن مروان کو اللہ رب العزت نے جہاں ایک طرف علم وفضل کی دولت سے نوازا تھا وہیں دوسری طرف انہیں شجاعت، بہادری، دوراندیشی،مردم شناسی،حکمت وتدبر،مستقل مزاجی اور سیاسی بصیرت جیسی اہم خصوصیات سے بھی سرفراز کیا تھا۔جس وقت انہوں نے مسند خلافت پر قدم رکھا،اسلامی ریاست کو اندرونی و بیرونی سازشوں اور بغاوتوں سے گھرا ہوا پایا۔ان کے پاس صرف مصر،شام اور بعض دیگر مغربی علاقے تھے اور باقی حصے سورش زدہ تھے۔انہیں بیک وقت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ،شیعان علی،خوارج،مختار ثقفی،روم،عراق،افریقہ اور دوسرے مختلف علاقوں میں بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا،لیکن انہوں نے اپنی ذہانت وفراست سے ان تمام عناصر کا بہ خوبی مقابلہ کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی اموی حکومت کو پھر سے مستحکم کیا۔اسی بنیاد پر عبدالملک بن مروان کو اسلامی خلافت کا 'دوسرا بانی' بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے عہد میں اسلامی ریاست نے حضرت امیر معاویہؓ کے عہد جیسا استحکام حاصل کر لیا تھا۔

عبدالملک بن مروان کی کامیابی کے مختلف اسباب رہے،ان میں سے ایک اہم سبب خلیفہ وقت کے ساتھ لائق وفائق گورنروں بالخصوص حجاج بن یوسف کا ہونا ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنے گورنروں کے حوالے سے بہت بیدار رہا کرتے تھے اور ان کے ہر عمل پر کڑی نظر رکھتے تھے۔جہاں ایک طرف وہ ان کے اچھے کاموں کو سراہتے تھے اور انعام واکرام سے نوازتے تھے،وہیں دوسری طرف ان کے برے رویئے اور غلطیوں پر محاسبہ بھی کرتے تھے۔حجاج بن یوسف اور ہشام بن عبدالملک کی جانب سے حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سعید بن میسّب کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف ان کا بروقت ردعمل اور سرزنش کرنا،یقیناً اس دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے۔اگرچہ ان کے عہد میں بعض واقعات ایسے ضرور ہوئے جن سے ان کی شبیہ داغ دار ہوئی جیسے خانہ کعبہ پر سنگ ساری اور بعض صحابہ کرام یا تابعین کے ساتھ غیر اخلاقی برتاؤ کیا جانا وغیرہ،لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض واقعات کا علم انہیں بعد میں ہوا اور کچھ وقت،حالات اور اپنوں یا غیروں کی سازشوں کی وجہ سے پیش آئے۔بہرحال انہوں نے اپنے دور خلافت میں ایک ایسی عظیم الشان اسلامی ریاست قائم کی،جس کی وجہ سے دشمنان اسلام کو ایک طویل عرصے تک سازشوں کا موقع نہیں مل سکا،چنانچہ اسلام اور اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کی اشاعت وتبلیغ آسانی کے ساتھ ہوتی رہی۔

عبدالملک بن مروان کے عہد میں حجاج بن یوسف ثقفی کے ذریعے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کا خاتمہ ہوا اور اسی کے ساتھ ہی امت مسلمہ کا پھر سے دوبارہ ایک خلیفہ پر اتفاق ہو گیا۔اسی عہد میں شیعوں کی جانب سے حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں جن میں 'توابین' (65ھ/685ء) کے سردار صرد بن سلیمان خزاعی،مختار بن عبید ثقفی اور ابراہیم بن مالک اشتر نخعی وغیرھم کا اہم کردار تھا، کا خاتمہ کیا گیا۔اسی طرح خلیفہ وقت کی جانب سے خوارج کے خلاف باقاعدہ فوجی مہم چلائی گئی جس سے ان کا زور ٹوٹ گیا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ابتداء میں حکومت مخالف طاقتوں کو آپس میں لڑنے مرنے دیا،تاکہ ان کی قوت کم زور ہو جائے،اور جب دیکھا کہ ان میں اب بہت زیادہ دم خم نہیں رہ گیا ہے تب انہوں نے ان پر اپنا شکنجہ کسا اور ان کا خاتمہ کیا۔اس سے ان کی ذہانت وفراست کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان تمام واقعات کی تفصیل

سابقہ اکائی میں گزر چکی ہے۔

عبدالملک بن مروان کے عہد میں چونکہ آپسی خانہ جنگی اور بغاوتیں زیادہ تھیں اس وجہ سے بہت زیادہ مزید فتوحات نہیں ہوسکیں، بلکہ آغاز میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ انہیں اندرونی مسائل کی وجہ سے رومیوں سے دب کر صلح کرنی پڑی اور خراج بھی دینا پڑا ،لیکن جب انہیں تھوڑا اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے بیرونی محاذ پر بھی توجہ دی۔ان کا یہ عمل بالکل حضرت امیر معاویہؓ کی طرح تھا۔ان کے زمانے میں افریقہ، روم، وسط ایشیا وغیرہ کے بعض علاقے فتح کیے گئے۔اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہی علاقوں کی فتوحات کی بنیاد رکھی جسے ان کے جانشینوں نے مزید آگے بڑھایا۔ان فتوحات میں حجاج بن یوسف، مسلمہ بن عبدالملک، مہلب بن ابی صفرہ ازدی، یزید بن مہلب اور حسان بن نعمان وغیرھم کا اہم کردار رہا تھا۔

عبدالملک بن مروان نے بعض تہذیبی وتمدنی کارنامے ایسے انجام دیے جن سے ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے درج ہو گیا جیسے انہوں نے 75ھ یعنی 693ء میں اسلامی سکوں کا اجراء کیا۔اس میں ایک طرف کلمہ طیبہ تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا نام ہوا کرتا تھا۔بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ایک طرف 'قل هو الله احد' تو دوسری طرف 'لا اله الا الله' نقش ہوا کرتا تھا، نیز تاریخ ومقام کا بھی اندراج رہتا تھا۔اس سے پہلے اسلامی ریاست میں ایرانی اور رومی سکے رائج تھے۔اسی طرح چاندی کے حمیری سکوں کا بھی رواج تھا۔کہا جاتا ہے کہ ایک بار روم کے بادشاہ نے اپنے سکوں پر نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی بھرے الفاظ کندہ کرانے کی دھمکی دی تھی۔اس کا پس منظر یہ تھا کہ عبدالملک بن مروان حکمرانوں اور بادشاہوں کو بھیجے جانے والے اپنے احکام وفرامین پر اللہ اور نبی کریم ﷺ کے نام لکھا کرتے تھے، جس پر ایک رومی حکمراں کو اعتراض ہوا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے غلط الفاظ استعمال کرنے کی بات کہی، جس کے جواب میں انہوں نے یہ قدم اٹھایا اور دیگر تمام غیر اسلامی سکوں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔عراق اور شام کے مختلف علاقوں میں اس کے لیے ٹکسال قائم کی گئیں، جہاں ایمان دار اور قابل اعتماد افسروں کی نگرانی میں سکے بنائے جاتے تھے۔اس سلسلے میں نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی تھی کہ حکومت کے متعین کردہ افراد کے علاوہ کوئی دوسرا شخص سکوں کو نہ ڈھالے۔چنانچہ جب سمیر نامی ایک یہودی نے سکہ بنایا تو اسے گرفتار کرلیا گیا اور حجاج بن یوسف کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔حضرت امیر معاویہؓ نے بھی اپنے عہد میں اسلامی سکوں کو رواج دینے کی کوشش کی تھی، لیکن ساتھ میں رومی وایرانی سکوں کو بھی برقرار رکھا اس لیے وہ مکمل طور سے اس میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔اسی طرح ان کا ایک اہم کارنامہ عربی زبان کو سرکاری زبان قرار دینا ہے۔اس سے پہلے دفتری کام کاج میں عربی زبان کے علاوہ دیگر مقامی زبانیں جیسے قبطی، مصری اور فارسی وغیرہ بھی رائج تھیں جس سے بسا اوقات مختلف مسائل پیدا ہوا کرتے تھے۔اس سے بچنے کے لیے انہوں نے حجاج بن یوسف کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا، کیونکہ وہ اس حوالے سے عراق میں کامیاب تجربہ کر چکے تھے۔انہوں نے 697ء میں اپنے گورنر صالح بن عبدالرحمٰن کو تمام سرکاری کاغذات کو عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے بہت کم مدت میں یہ کام کر دیا تھا۔اس کے بعد ہی خلیفہ وقت نے پوری اسلامی ریاست میں عربی زبان کو واحد سرکاری زبان قرار دی جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔

عبدالملک بن مروان کا اہم کارنامہ قبۃ الصخرۃ کی تعمیر ہے۔اسی طرح انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ذریعے مسجد حرم میں اضافے کو ختم کر کے اسے سابقہ حالت پر لوٹا دیا، یعنی حطیم کو خانہ کعبہ کی عمارت سے الگ کر دیا جسے ابن زبیرؓ کے دور میں ملا دیا گیا تھا، کیوں کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک سنا تھا کہ اگر قریش جدید الاسلام نہیں ہوتے تو میں کعبہ کو بنیاد ابراہیم پر لے آتا اور حجر اسماعیل (کعبہ کا چھوٹا ہوا حصہ) بھی اس میں شامل کر دیتا۔عبدالملک بن مروان نے اسے سابقہ حالت پر اس لیے لوٹا دیا کہ آپؐ کے عہد میں حطیم خانہ کعبہ سے باہر

تھا۔ نیز وہ ہر سال حرمین شریفین کے لیے غلاف، قالین اور عود و دیگر خوشبوؤں کو بھیجنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں اکثر وبیشتر پہاڑی علاقوں سے سیلاب آیا کرتا تھا جس سے خانہ کعبہ اور آس پاس کی عمارتوں کو کافی نقصان پہنچتا تھا۔ خلیفہ وقت نے اس پر خصوصی توجہ دی اور انہوں نے 80ھ / 699ء میں بڑے بڑے حصار اور بند تعمیر کرا کے انہیں ان مصیبتوں سے محفوظ کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے عہد میں متعدد علاقوں میں مساجد تعمیر کرائیں، جیسے جامع اموی (65ھ/684ء) کے علاوہ واسط، بروعہ، اردبیل اور مصر وغیرہ میں جہاں نئی مساجد تعمیر ہوئیں وہیں پرانی مساجد کی بھی تزئین و آرائش کی گئی۔ اسی طرح ان کے عہد میں متعدد نئے شہر بسائے گئے اور پرانے شہروں کی توسیع بھی کی گئی جن میں واسط، اردبیل، بروعہ اور قیروان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عبدالملک بن مروان نے اپنے بھائی اور ولی عہد عبدالعزیز کی وفات (85ھ/704ء) کے بعد اپنے دو بیٹوں ولید اور سلیمان کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس سلسلے میں تمام لوگوں سے بیعت لی۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کی زندگی میں ہی انہیں ولی عہدی سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن قبیصہ بن ذویب کے سمجھانے بجھانے سے وہ باز آ گئے تھے، پھر اتفاق سے ان کے بھائی کی وفات ہو گئی۔

عبدالملک بن مروان نے کثرت سے شادیاں کیں۔ ان کی بیویوں کے نام ولادہ بنت عباس، عاتکہ بنت یزید، ام ہشام بنت ہشام مخزومی، عائشہ بنت موسیٰ، ام ایوب بنت عمرو، ام مغیرہ بنت مغیرہ، شقراء بنت مسلمہ طائی، ام ابیہا بنت عبداللہ وغیرہ ہیں۔ اول الذکر کے بطن سے ولید اور سلیمان پیدا ہوئے۔ اس عظیم خلیفہ کی وفات 86ھ/705ء میں ہوئی اور تدفین دمشق میں ہوئی۔

19.2.6 ولید (اول) بن عبدالملک (707-715ء)/(86-96ھ):

عبدالملک بن مروان کے بعد ان کے بیٹے ولید بن عبدالملک اسلامی ریاست کے خلیفہ بنے۔ ان کی والدہ کا نام ولادہ بنت عباس تھا۔ وہ 50ھ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کی طرح ان کی بھی مدینہ منورہ میں تعلیم و تربیت ہوئی، البتہ اس میں انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی جو ان کے والد کی تھی۔ انہیں علوم و فنون سے زیادہ سیاست، آلات حرب اور جنگی امور سے دلچسپی تھی۔ اس کا فائدہ انہیں خلیفہ بننے کے بعد یقیناً ملا۔ وہ انتہائی جری، بہادر اور معتدل مزاج انسان تھے، اسلام اور اس کی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ارکان اسلام کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور امارت میں دو مرتبہ حج بھی کیا۔ انہیں قرآن کریم سے خصوصی شغف تھا، اسی لیے صرف تین دن میں قرآن ختم کر لیتے تھے اور رمضان کریم میں اس کی تعداد بڑھ کر تقریباً سترہ ہو جاتی تھی، نیز وہ حقوق العباد پر بھی توجہ دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ، قبیلے اور اسلامی ریاست میں ہر دل عزیز تھے۔

ولید بن عبدالملک کا عہد اموی دور کا زریں عہد کہلاتا ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں بہ کثرت فتوحات ہوئیں۔ اسی طرح ان کے دور میں غیر معمولی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، معاشی اور علمی ترقی ہوئی۔ جس طرح سے حضرت امیر معاویہ اور عبدالملک بن مروان کے دور کو اموی حکومت کے استحکام کا دور سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سے ولید بن عبدالملک کے دور کو فتوحات کا دور سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مغربی مؤرخین نے انہیں دیگر تمام مسلم خلفاء پر ترجیح دی ہے۔ ان کے عہد میں وسط ایشیا، ہندوستان، روم، افریقہ اور اندلس تک اسلامی ریاست کی سرحدیں پہنچ گئیں اور ان کے بیشتر علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو وسط ایشیا کو قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا اور سندھ کو محمد بن قاسم نے جب کہ یورپ کے علاقوں کو موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے فتح کیا۔

ولید بن عبدالملک کے دور میں فتوحات کی کثرت کی تین اہم وجوہات رہیں۔ اول یہ کہ عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد میں حکومت

کے خلاف ہونے والی تقریباً تمام سازشوں کا خاتمہ کر دیا تھا، جیسے شیعہ، خوارج، خاندانی اور بعض دیگر باغیوں کا زور ختم ہو چکا تھا، اس لیے انہیں اطمینان وسکون کے ساتھ بیرونی محاذوں پر توجہ دینے کا بھرپور موقع ملا۔ دوم ان کے پاس دنیا کے بہترین فوجی دماغ اور سپہ سالار یعنی حجاج بن یوسف ثقفی، قتیبہ بن مسلم باہلی، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم ثقفی اور مسلمہ بن عبدالملک موجود تھے، جنہوں نے اموی حکومت کو وسیع کرنے میں نمایاں اور اہم ترین کردار ادا کیا۔ سوم یہ کہ اس عہد میں اسلامی ریاست کے پاس عالم اسلام کا جدید ترین فوجی نظام تھا، ظاہر ہے کہ فتوحات ان ہی فوجوں کو نصیب ہوتی ہیں جو جدید ترین ہتھیاروں اور انتظامی وسائل میں مضبوط ہوں۔

ولید بن عبدالملک کے عہد کو فتوحات کے علاوہ معاشرتی، تمدنی، معاشی اور مذہبی ترقی کے لیے بھی یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے اسلامی ریاست میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور ان کا محور دارالخلیفہ دمشق کو بنایا۔ نیز سڑکوں کے کنارے سنگ میل نصب کرائے جس سے مسافروں کو مسافت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح سفر کرنے والوں کے لیے تھوڑی تھوڑی دوری پر مسافر خانے اور کنوئیں وغیرہ تعمیر کرائے تاکہ انہیں کھانے اور پینے کے تعلق سے کوئی مشکل نہ ہو۔ مزید برآں پوری اسلامی ریاست میں جدید طرز کے شفاخانے قائم کیے گئے جن میں دواؤں، تجربہ کار ڈاکٹروں اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کو مقرر کیا گیا۔ ان کی تنخواہیں حکومت کے ذمے ہوتی تھیں۔ جان لیوا امراض میں مبتلا افراد کو شفاخانے میں داخل کیے جانے کی بھی سہولت دی گئی تھی اور عام بیماری والوں کو دوا دے کر رخصت کر دیا جاتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ تمام شہریوں کا علاج مفت میں کیا جاتا تھا۔ عوام الناس کی تعلیم وتربیت کا خصوصی نظم کیا گیا اور اس کے لیے جگہ جگہ اسکول اور مکاتب کھولے گئے۔ اساتذہ کرام کی تنخواہیں اور طلبہ کے وظائف مقرر کیے گئے۔

ولید بن عبدالملک کو قرآن کریم سے خصوصی دلچسپی تھی اس لیے انہوں نے اس کی تلاوت اور علم تفسیر کے حصول پر بہت توجہ دی۔ چنانچہ حفاظ کرام کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا اور اس سے غفلت کرنے والوں کو سزا بھی دی جاتی تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے اسی عہد میں قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگائے، تاکہ عجمیوں کو اس کی تلاوت میں دقت نہ ہو۔ مساجد و مکاتب میں روشنی کا معقول انتظام کیا، رمضان میں مساجد میں روزے داروں کے لیے افطار اور سحری کا بھی نظم کیا۔ انہوں نے فقیروں، مسکینوں، معذوروں، مفلسوں، بیواؤں، یتیموں، مظلوموں کی دادرسی کی اور ان کی پرورش وکفالت نیز تعلیم وتربیت کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا۔ اول الذکر طبقات کو بھیک مانگ کر گزارہ کرنے سے روک دیا۔ اسی طرح بازاروں میں ایماندار افسر مقرر کیے، تاکہ دوکاندار خریداروں کو دھوکہ اور فریب نہ دے سکیں، نیز اشیاء کی قیمتیں بھی متعین کیں اور اس سے زیادہ رقم لینے پر سزا دی جاتی تھی۔

ولید بن عبدالملک کو تعمیرات کا بھی بہت شوق تھا۔ اس لیے انہوں نے بہ کثرت عالیشان مساجد، مکاتب اور نہریں وغیرہ بنوائیں اور پرانی مسجدوں کی نئے سرے سے توسیع وتزئین کرائی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ جب آپس میں ملتے تو ان کی گفتگو کا مرکز فن تعمیر، عمارتوں کی خوب صورتی اور ان کی خصوصیات وغیرہ ہوتی تھیں، جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ہر طرف لوگوں کے درمیان قرآن وحدیث اور دینی مسائل پر اور سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں ظروف اور نساء کے حوالے سے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ 88ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذریعے مسجد نبوی کی توسیع وآرائش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں مسجد سے متصل حجروں کو بھی قیمت دے کر شامل کر لیا گیا۔ خلیفہ وقت نے اس حوالے سے قیصر روم سے بھی مدد لی اور وہاں سے تعمیر کے ساز وسامان اور کاریگر وغیرہ منگائے۔ اسی طرح جامع اموی کی تکمیل بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ مسجد آٹھ نو سال میں بن کر تیار ہوئی۔ اس کی وسعت اتنی تھی کہ بیس ہزار افراد ایک ساتھ نماز پڑھ سکتے تھے۔ اس کی تعمیر کے لیے ایران، ہند، روم اور مغرب سے کاریگر اور

سازوسامان منگائے گئے۔ بارہ ہزار مزدور یہاں بیک وقت کام کرتے تھے۔ اسے سونا، چاندی، قیمتی پتھر، سیسہ، ہیرے جواہرات اور سنگ مرمر سے آراستہ کیا گیا۔عوام الناس کی ایک بڑی تعداد دور دراز علاقوں سے اسے دیکھنے آتی تھی۔ روم سے آئے ہوئے وفد نے اس مسجد کو دیکھ کر کہا کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج چند روزہ ہے، لیکن اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ایک زندہ رہنے والی قوم ہے۔ نبی کریم ﷺ کے روضہ مبارک کے اردگرد دہری دیواریں تعمیر کرائی گئیں تاکہ اسے کسی قسم کی آفت ناگہانی سے محفوظ رکھا جاسکے۔

ولید بن عبدالملک کا عہد یوں تو اندرونی سازشوں سے پاک وصاف رہا، ایک دو بار خوارج نے سر اٹھانے کی کوشش ضرور کی، لیکن معمولی سرزنش سے ہی وہ ٹھیک ہوگئے۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا دور امن وسکون اور سلامتی کا دور تھا، مگر ان کے عہد میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس کا افسوس خود ان کو بھی رہا، یعنی حجاج بن یوسف کے ذریعے حضرت سعید بن مسیّبؒ کا شہید کیا جانا۔ انہوں نے سعید بن مسیّب کو عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت میں ساتھ دینے اور سرکاری مال ودولت کے اصراف کے جرم میں قتل کرادیا تھا۔ ابن یوسف نے انہیں ابن اشعث الکندی کی فوج کا خازن بنا کر بھیجا تھا اور انہوں نے حکومت کی ساری دولت الکندی کو دے دی جس کو بغاوت میں خرچ کر دیا گیا۔ حجاج بن یوسف نے جب ان سے دولت واپس مانگی تو وہ واپس کرنے میں ناکام رہے، آخر کار بات بڑھتے بڑھتے قتل تک پہنچ گئی، جس کا خود انہیں بھی افسوس ہوا۔ خلیفہ وقت نے ولی عہدی میں تبدیلی کا ارادہ کرتے ہوئے سلیمان بن عبدالملک کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد نامزد کرنا چاہا اور اس سلسلے میں اپنے مشیروں اور گورنروں سے بھی مشورہ کیا، مسلم بن قتیبہ، حجاج بن یوسف اور چند ایک کو چھوڑ کر کسی نے ان کے لیے ہاں نہیں کی۔ خود سلیمان بن عبدالملک بھی اس پر راضی نہیں تھے اور ولید کے بلانے کے باوجود ان کے پاس نہیں گئے۔

ولید بن عبدالملک ابھی اسی جوڑ توڑ میں لگے تھے کہ 96ھ میں اللہ تعالی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے جنازے کی نماز پڑھائی اور دمشق میں تدفین ہوئی۔ مدت خلافت لگ بھگ نو سال کچھ ماہ تھی۔

19.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اموی حکومت 661 سے 750 تک رہی۔ اس کے بانی حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ اس دوران کل چودہ خلیفہ ہوئے جن میں سے چھ خلفاء کا تعارف اس اکائی کے تحت پیش کیا گیا ہے۔
- اموی دور حکومت میں حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اموی حکومت کے خلاف تھے کیوں کہ ان دونوں عظیم صحابی کے نزدیک یہ حکومت حق پر نہیں تھی، اس لیے اسے ہٹانا ضروری تھا۔ اسی کوششوں میں ان کی شہادتیں بھی ہوئیں۔
- اموی حکومت کے اول چھ خلفاء نے بہ حیثیت مجموعی اسلامی ریاست کو اس قدر وسعت بخشی کہ اس کی سرحدیں بحر اوقیانوس اور کوہستان پای رین سے پھیلتی ہوئی حدود چین اور دریائے سندھ تک جاتی تھیں۔ اس کی نظیر سابقہ دور میں نہیں ملتی ہے۔
- حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ہندوستان پر 44ھ / 665ء میں سندھ اور درہ خیبر کی طرف سے حملہ کیا گیا اور قلات، مکران، کش اور قندھار وغیرہ فتح کیے گئے۔ اسی طرح 54ھ /674ء میں علاقہ سغد کے رامنی، نصف اور بیکند فتح کیے گئے۔ 55ھ /675ء میں بخارا، 41ھ /661ء میں مرو، 43ھ /663ء میں برقہ، لیبیا کے بعض علاقے، تیونس، لواتہ، زناتہ، غدامش، سوڈان کا کچھ حصہ، برزت، تسوسہ اور جلولاء وغیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

- ولید بن عبدالملک کے عہد میں بہ کثرت فتوحات ہوئیں، مثلاً بخارا، سمرقند، کاشغر وسط ایشیا کے علاقوں کو قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا، اسی طرح سندھ کے علاقوں جیسے قزپور، دیبل، برہمن آباد، اور ملتان وغیرہ کے علاقوں کو محمد بن قاسم نے فتح کیا، اور مسلمہ بن عبدالملک نے روم کے مختلف علاقوں پر فتح حاصل کی، افریقہ اور اندلس کے مختلف علاقوں کو طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے فتح کیا۔
- عہد اموی کی فتوحات میں جہاں ایک طرف خلیفہ وقت، گورنروں اور فوج کے سپہ سالاروں کے دماغ کام کر رہے تھے وہیں دوسری طرف فوج کی کثرت، جدید اسلحہ اور تنظیم نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح بحری فوج بھی انتہائی منظّم اور مضبوط تھی۔ جہاز سازی کے کارخانے شام، مصر اور تونس وغیرہ میں قائم کیے گئے جن کو 'دار الصناعۃ' کہا جاتا تھا۔
- عہد اموی میں سماجی، معاشی، دینی اور تہذیبی و تمدنی ترقی بھی ہوئی۔ اس سلسلے میں اموی خلفاء بالخصوص امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک نے کلیدی کردار نبھایا۔

19.4 کلیدی الفاظ

واقعہ حرہ	:	یزید کی فوج نے مدینہ میں فتح حاصل کرنے کے بعد شہر میں لوٹ مار کی۔
دیوان خاتم	:	سرکاری احکام کی نقل اس محکمہ کی ذمہ داری ہوتی تھی۔
فتی العرب	:	نوجوان عرب سورما

19.5 نمونہ امتحانی سوالات

19.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی حکومت کا پہلا خلیفہ کون تھا؟

a. عمر بن عبدالعزیز　b. یزید بن معاویہ　c. امیر معاویہؓ　d. معاویہ بن یزید

2. اموی حکومت کا قیام کس سن میں ہوا؟

a. 763ء　b. 668ء　c. 661ء　d. 644ء

3. دیوان خاتم کا شعبہ کس خلیفہ کے دور میں قائم ہوا؟

a. یزید بن معاویہ　b. معاویہ بن یزید　c. امیر معاویہؓ　d. عمر بن عبدالعزیز

4. واقعہ حرہ کب پیش آیا؟

a. 60ھ　b. 70ھ　c. 63ھ　d. 68ھ

5. قبۃ الصخراء کس خلیفہ نے تعمیر کرایا؟

a. ولید بن عبدالملک　b. امیر معاویہؓ　c. ہشام بن عبدالملک　d. عبدالملک بن مروان

6. فتی العرب کا لقب کس خلیفہ کو ملا؟

a. ہشام بن عبدالملک　b. عبدالملک بن مروان　c. ولید بن عبدالملک　d. یزید بن معاویہ

7. جامع اموی کس خلیفہ کے عہد میں مکمل ہوئی؟

a. عبدالملک بن مروان b. عمر بن عبدالعزیز c. یزید بن معاویہ d. ولید بن عبدالملک

8. حجاج بن یوسف کی وفات کس سن میں ہوئی ؟

a. 95ھ b. 85ھ c. 75ھ d. 65ھ

9. قبۃ الصخرۃ کی تعمیر کس خلیفہ کے عہد میں ہوئی ؟

a. عبدالملک بن مروان b. ولید بن عبدالملک c. ہشام بن عبدالملک d. عمر بن عبدالعزیز

10. عبدالملک بن مروان نے کسے اپنا ولی عہد بنایا؟

a. ہشام بن عبدالملک b. مروان بن حکم c. ولید بن عبدالملک d. معاویہ بن یزید

19.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت امیر معاویہؓ کی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔
2. واقعہ حرہ پر مختصر نوٹ لکھیں۔
3. معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد بنو امیہ میں جانشینی کے مسئلے پر اختلاف کا جائزہ پیش کریں۔
4. حضرت سعید بن مسیّب کی شہادت کا واقعہ قلم بند کریں۔
5. ولید بن عبدالملک کے عہد میں فن تعمیر پر تبصرہ کریں۔

19.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی حکومت کے استحکام میں حضرت امیر معاویہ اور عبدالملک بن مروان کا اہم کردار رہا ہے۔ مفصل وضاحت کریں۔
2. عبدالملک بن مروان کے کارناموں پر تبصرہ کریں۔
3. ولید بن عبدالملک کے عہد میں فتوحات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں۔

19.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد اول) : ثروت صولت
2. تاریخ تہذیب اسلامی (جلد دوم) : پروفیسر محمد لیٰسین مظہر صدیقی
3. اردو دائرۃ المعارف : دانش گاہ پنجاب، لاہور
4. تاریخ اسلام (جلد دوم) : شاہ معین الدین احمد ندوی
5. تاریخ ملت (جلد اول) : مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی انتظام اللہ شہابی

-:oOo:-

اکائی 20 : بنوامیہ کے اہم حکمراں (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید
20.1 مقصد
20.2 بنوامیہ کے اہم حکمراں
20.2.1 سلیمان بن عبدالملک
20.2.2 عمر بن عبدالعزیز
20.2.3 یزید (دوم) بن عبدالملک
20.2.4 ہشام بن عبدالملک
20.2.5 ولید (دوم) بن یزید
20.2.6 یزید (سوم) بن ولید
20.2.7 ابراہیم بن ولید (اول)
20.2.8 مروان (ثانی) بن محمد
20.3 اکتسابی نتائج
20.4 کلیدی الفاظ
20.5 نمونہ امتحانی سوالات
20.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
20.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
20.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
20.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

20.0 تمہید

اموی حکومت کا قیام حضرت امیر معاویہؓ کے ذریعے عمل میں آیا۔ یہ حکومت 41ھ بمطابق 661ء میں قائم ہوئی اور اس کا خاتمہ 132ھ بمطابق 750ء میں ہوا۔ اس میں کل چودہ (14) حکمراں ہوئے جنھوں نے عالم اسلام پر حکمرانی کی۔ ان میں سے ابتدائی چھ حکمرانوں کا ذکر انیسویں اکائی کے تحت کیا جا چکا ہے، اس اکائی میں باقی آٹھ حکمرانوں کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے ہی

مختلف اسباب کی بنا پر اموی حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا، البتہ ہشام بن عبدالملک کی وفات کے بعد اس میں تیزی آ گئی اور سات سال کے مختصر عرصے میں ہی اس عظیم الشان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کے بعد ایسا کوئی خلیفہ پیدا نہیں ہوا جو حکومت کی باگ ڈور کو صحیح طریقے سے سنبھال سکے اور اسے ماضی کی آن بان اور شان کے ساتھ رواں دواں رکھ سکے۔ اس سلسلے میں آخری خلیفہ مروان ثانی نے اگرچہ بہت کوششیں کیں، لیکن وہ وقت اور حالات کے سامنے بے بس اور مجبور تھے، اس لیے حکومت کے خاتمے کو روک نہیں سکے۔

20.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آخری آٹھ اموی حکمراں کون تھے؟ وہ کس طرح خلیفہ بنے؟ ان کی خصوصیات کیا تھیں؟ ان کے کیا کارنامے رہے؟ انہیں کس طرح کے مسائل اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا؟ فتوحات کہاں اور کیسے ہوئیں؟ ان کے دور کے اہم واقعات اور اصلاحات کیا ہیں؟

20.2 بنوامیہ کے اہم حکمراں

20.2.1 سلیمان بن عبدالملک (717-715ء)/(99-96ھ):

عبدالملک بن مروان کی وصیت کے مطابق ولید بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کی پیدائش 54ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی، البتہ تعلیم و تربیت شام میں ہوئی۔ انہوں نے اس میدان میں اپنے بڑے بھائی کے مقابلے زیادہ نام کمایا، اسی لیے ان کا شمار اہل علم و دانش میں کیا جاتا ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ راوی حدیث بھی تھے، نیز نماز، روزہ اور تہجد کے بھی پابند تھے، اول وقت میں نماز ادا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، اس سے پہلے اموی خلفاء سے اس سلسلے میں کبھی کبھی کوتاہی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اہل علم کی صحبتوں اور مجلسوں کو پسند کرتے تھے، ان کے مشیروں میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور رجاء بن حیوۃ الکندی وغیرہ جیسی عظیم شخصیات کے نام قابل ذکر ہیں، جن کے گراں قدر مشوروں اور محاسن کے اثرات نمایاں طور پر خلیفہ وقت کے کارناموں میں نظر آتے ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک کے مزاج میں نرمی و لطافت اور دین داری پائی جاتی تھی، اس کا ثبوت ان کے عہد میں اموی حکومت کی سیاسی پالیسیوں میں تبدیلی ہونا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی ولید بن عبدالملک کے برخلاف سیاسی میدان میں نرم روش اختیار کی اور نہ صرف خود انہوں نے اس پر عمل کیا، بلکہ اپنے عمال اور گورنروں کو بھی اس کی تاکید کی، نیز انہیں جن عہدے داران کے بارے میں سختی اور شدت پسندی کے رویے کی خبر ملی، انہیں معزول بھی کر دیا۔ البتہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو کمزور تھا یعنی ان میں انتقام لینے کا جذبہ موجود تھا جس کی وجہ سے ان کے عہد میں اموی حکومت کو بعض اہم سپہ سالاروں سے ہاتھ دھونا پڑا اور امت مسلمہ کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس میں محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، عبداللہ بن موسیٰ اور عبدالعزیز بن موسیٰ وغیرھم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کو تکلیفیں اور اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا اور کچھ پر جرمانہ عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ان کے ان اقدام کی ایک وجہ یہ تھی کہ ولید بن عبدالملک نے اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو ہٹا کر اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد نامزد کرنا چاہا تھا اور اس میں قتیبہ بن مسلم، حجاج بن یوسف کے علاوہ بعض دیگر قریبی احباب نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا، اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ جب سلیمان خلیفہ بنے تو ان کے ذہن میں یہ بات کہیں نہ کہیں موجود تھی اور پھر انہوں نے ان عظیم سپہ سالاروں سے انتقام لیا۔ اسی طرح وہ حجاج بن یوسف کی مخالفت، سختی اور بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر ناخوش اور ناراض تھے، چنانچہ انہوں نے خلیفہ بننے کے بعد ان تمام گورنروں اور سپہ سالاروں کو معزول کر دیا جن کو ابن یوسف نے اپنے عہد میں متعین کیا تھا۔ نیز حجاج بن یوسف کے

خاندان سے بدلہ لیا، کیونکہ وہ تو ان کی خلافت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔

محمد بن قاسم کا معزول اور قتل کیا جانا خلیفہ وقت کے انتقامی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ بننے کے بعد فاتح سندھ کو ان کے عہدے سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو والی بنایا۔ ابن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا گیا جہاں کے والی صالح بن عبدالرحمٰن تھے، ان کے بھائی آدم کو حجاج بن یوسف نے خارجیت کے جرم میں قتل کرایا تھا تو انہوں نے اس کا انتقام ابن یوسف کے بھتیجے محمد بن قاسم سے لیا اور انہیں انتہائی تکلیفوں اور اذیتوں کے ساتھ قتل کرا دیا۔

کچھ ایسا ہی حال قتیبہ بن مسلم، ایک عظیم سپہ سالار اور والی خراسان کا بھی ہوا جنہوں نے ولید بن عبدالملک کا ساتھ دیتے ہوئے ان کے بیٹے کی ولی عہدی میں حصہ لیا تھا، نیز انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں سلیمان بن عبدالملک ان کو معزول کر کے یزید بن مہلب ازدی کو والی خراسان نہ بنا دے اور ان کا خدشہ بعد میں سچ بھی ثابت ہوا کیوں کہ ابن مسلم کے قتل کے بعد اسی کو خراسان کا ولی عہد بنایا گیا۔ لیکن قتیبہ بن مسلم نے جلد بازی سے کام کیا اور سلیمان بن عبدالملک کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس میں قتیبہ بن مسلم کو شکست ہوئی اور سر کاٹ کر سلیمان بن عبدالملک کے پاس بھیج دیا گیا۔

اسی طرح فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر کو بھی اپنے عہدے سے معزول ہونا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں جب وہ اندلس سے فاتح کی حیثیت سے گراں قدر مال غنیمت کے ساتھ واپس دمشق لوٹ رہے تھے تو اس وقت خلیفہ کی زندگی کا آخری وقت تھا۔ ایسے حالات میں سلیمان بن عبدالملک نے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ ان کی وفات کے بعد دمشق پہنچیں لیکن فاتح افریقہ کی خواہش تھی کہ ولید کی زندگی میں ہی وہاں پہنچ جائیں، تاکہ وہ ان کی کارکردگی اور مال و دولت کو دیکھ لیں، اس لیے انہوں نے سلیمان کے حکم کو نظر انداز کیا۔ ان کا یہ عمل سلیمان کو پسند نہیں آیا اور اس کا بدلہ انہوں نے اپنے دور خلافت میں لیا۔ مؤرخین نے مزید اسباب کا تذکرہ کیا ہے جیسے ولید بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر اور اس کے خاندان کو غیر معمولی داد و دہش سے نوازا، جس کی وجہ سے مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ ان پر ہی خرچ ہو گیا، یہ بات سلیمان بن عبدالملک کو ناگوار گزری۔ بعض کے مطابق موسیٰ بن نصیر سے خلیفہ نے افریقہ کے خراج کی بقایا رقم کا مطالبہ کیا جو وہ ادا نہیں کر سکے تو ان پر جرمانہ لگایا دیا گیا اور اسے نہیں ادا کر پانے پر انہیں قید کر دیا گیا جس میں ان کی وفات ہو گئی۔ وہ 97ھ میں اپنے انتقال سے پہلے سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ بہ حیثیت قیدی حج میں شریک تھے اور مدینہ منورہ میں ہی ان کی وفات ہوئی۔

تاریخ میں آتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے اپنے ایک بیٹے عبدالعزیز کو اندلس کا اور دوسرے بیٹے عبداللہ کو پورے شمالی افریقہ کا والی بنا دیا جس کی وجہ سے سلیمان بن عبدالملک کو خوف محسوس ہوا کہ آگے چل کر کہیں یہ خاندان اموی حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، کیونکہ شمالی افریقہ سے فرانس تک کی حکومت ایک ہی گھر میں ہے اور جب انہوں نے اس عمل پر موسیٰ بن نصیر سے باز پرس کی تو انہوں نے ان کی باتوں کا نامناسب جواب دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طارق بن زیاد نے سلیمان بن عبدالملک کو بھڑکایا تھا جس کی وجہ سے وہ ان سے بدگمان ہو گئے۔ بہر حال وجہ جو بھی رہی ہو، ایک عظیم سپہ سالار کی اس طرح سے ناقدری اور تحقیر تاریخ کے سیاہ دھبوں میں سے ایک ہے۔ اسی عہد میں ان کے بیٹے عبدالعزیز بن موسیٰ کے قتل کا بھی واقعہ پیش آیا۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح انتہائی بہادر، شجاع، نڈر اور جنگی و سیاسی حکمت و بصیرت رکھنے والے شخص تھے۔ مؤرخین نے ان کی موت کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے عیسائی بادشاہ راڈرک کی بیوی سے شادی کی تھی اور انہوں نے اپنی بیوی کے کہنے پر ایک تاج بنوایا تھا جسے وہ تنہائی میں پہنتے تھے، اس کی خبر جب فوجیوں کو ملی تو انہوں نے سمجھا کہ وہ بیوی کی محبت میں عیسائی ہو گئے ہیں، اس لیے قتل کر دیا گیا اور کچھ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے قتل میں سلیمان بن عبدالملک کا ہاتھ تھا۔

فاتح اندلس طارق بن زیاد کے ساتھ بھی کچھ اچھا معاملہ نہیں ہوا اور وہ بھی گمنامی میں انتقال کر گئے۔ ان عظیم سپہ سالاروں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ، خواہ کسی بھی وجہ سے ہوا ہو، اموی حکومت اور ملت اسلامیہ کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا اور اس کا سیدھا اثر ملکی نظم ونسق اور بالخصوص فتوحات پر ہوا چنانچہ اس کی رفتار کم ہوگئی۔ ان کے عہد میں یزید بن مہلب ازدی، والی خراسان نے 718-717ئمیں جرجان اور طبرستان جیسے دشوار گذار پہاڑی علاقوں کو فتح کیا، بعض علاقوں کی بغاوتوں کا خاتمہ کیا اور انہیں پھر سے اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے، نیز خراج دینے پر مجبور کیا۔ ان مہمات میں مسلمانوں کو بھی کئی بار جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن آخر میں وہ کامیاب ہوئے۔ والی خراسان نے جرجان میں مسلم آبادی بھی قائم کی، تاکہ بغاوت دوبارہ نہ ہو سکے اور جہم بن قیس کو اس کا امیر مقرر کیا۔ ابن مہلب نے خلیفہ وقت کو متاثر کرنے کے لیے اپنے کارناموں کو بہت بڑھا چڑھا کر ان کے سامنے پیش کیا اور خراج کی رقم بھی حقیقت کے برعکس بہت زیادہ دکھائی، حالانکہ اس سے انہیں بعد میں نقصان پہنچا۔

سلیمان بن عبدالملک کے عہد کا ایک بڑا واقعہ 98ھ میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ انہوں نے پوری اسلامی ریاست سے فوجوں اور جنگی ساز وسامان کو جمع کیا اور انہیں مسلمہ بن عبدالملک کی سربراہی میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ اس میں بحری اور بری دونوں طرح کی فوج شامل تھی۔ مسلمہ بن عبدالملک نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا اور وہیں مکانات بنا کر کھیتی باڑی بھی کرانے لگے تاکہ فوج کو کھانے پینے اور رہنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ محاصرے کی سختی سے تنگ آ کر اہل شہر نے صلح کرنی چاہی لیکن وہ فتح کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دی، لیکن بعد میں پانسہ پلٹ گیا اور وہ لیون سوم کے جال میں پھنس گئے۔ اسی دوران سخت سردی شروع ہوگئی، چنانچہ مسلم فوج کی ایک بڑی تعداد ٹھنڈ، بھوک اور جنگ کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ پھر خود 99ھ میں سلیمان بن عبدالملک کی وفات ہوگئی اور نئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے بچی کھچی فوج واپس ہوئی۔

سلیمان بن عبدالملک کا دور اگرچہ مختصر رہا، لیکن اس دوران انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں، جیسے مکہ مکرمہ میں میٹھے پانی کی شدید قلت تھی۔ چنانچہ ان کے حکم سے والی مکہ خالد بن عبداللہ نے ایک چشمہ جاری کیا، اس کے پانی کو کوہ شبیر کے دامن میں جمع کیا گیا اور پھر سیسوں کے پائپ کے ذریعے مسجد حرام اور مکہ میں لایا گیا۔ اسی طرح انہوں نے فلسطین میں شہر رملہ آباد کرایا اور اس میں جامع مسجد، حوض، سرکاری عمارتیں، دفاتر اور مدارس وغیرہ قائم کرائے اور مختلف جگہوں سے افراد بلا کر یہاں آباد کرائے۔ انہیں قبیلہ قریش اور اہل مدینہ سے بہت محبت تھی، چنانچہ جب وہ 97ھ میں حج کے سلسلے میں مکہ و مدینہ گئے تو قریش کے لیے چار ہزار اور ان کے حلیفوں وغیرہ کے لیے گراں قدر سالانہ وظائف متعین کیے۔ اسی طرح اہل مدینہ میں مال و دولت کی تقسیم کی، قیدیوں کو آزادی دی وہ بھی اس طرح سے کہ تمام قید خانے لگ بھگ خالی ہو گئے اور بہ حیثیت مجموعی عوام الناس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ جامع دمشق کی تکمیل بھی ان کے ہی عہد میں ہوئی۔ سلیمان بن عبدالملک کا سب سے اہم کارنامہ اپنے بیٹوں اور حقیقی بھائیوں کو چھوڑ کر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنانا ہے۔ ان تمام بھلے کاموں کی وجہ سے انہیں 'مفتاح الخیر' (بھلائی کی کنجی) کا خطاب دیا گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پینتالیس سال تھی اور انہوں نے دو سال آٹھ مہینہ حکومت کی۔ جنازے کی نماز عمر بن عبدالعزیز نے پڑھائی۔

20.2.2 عمر بن عبدالعزیز (720-717ء)/(101-99ھ):

سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کے جانشین عمر بن عبدالعزیز خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام عبدالعزیز تھا جو مصر کے والی تھے اور دادا مروان بن حکم تھے جو خود اموی دور حکومت کے نامور خلیفہ تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام ام عاصم بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھا۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ عمر ثانی کی رگوں میں بھی فاروقی خون دوڑ رہا تھا۔ ان کی پیدائش 61ھ میں ہوئی۔ انہوں نے

انتہائی عیش وعشرت کے ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم وتربیت جس میں حفظ قرآن بھی شامل تھا، کے بعد والد محترم نے ان کے تعلیمی ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے مدینہ منورہ مشہور عالم دین اور محدث صالح بن کیسان کے پاس بھیج دیا، جہاں انہوں نے دیگر اہل علم سے بھی کسب فیض کیا۔ ان کی شخصیت کو جلا بخشنے میں حضرت انس بن مالکؓ، سلیمان بن یسار، امام شعبی، امام زہری، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی اور امام حسن بصری جیسے عظیم صحابہ کرام، تابعین اور علماء وفقہاء وغیرہ کا نمایاں کردار رہا ہے۔ بلاشبہ وہ علمی میدان میں اپنے زمانے کے امام تھے، ان کے علم وفضل کا اعتراف ابونصر مدینی، سلیمان بن یسار، امام مجاہد اور لیث جیسے عظیم علماء کرتے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کی بیعتِ خلافت کا واقعہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ سلیمان بن عبدالملک نے اپنی زندگی ہی میں تحریری طور پر ان کو اپنا ولی عہد بنا دیا تھا اور اپنے اس مہر بند وصیت نامہ کو رجاء بن حیوۃ کے حوالے کیا اور ان سے کہا کہ میرے خاندان والوں کو جمع کر کے میری طرف سے بغیر ولی عہد کا نام بتائے ہوئے بیعت لو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور سب اس پر راضی بھی تھے۔ عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک دونوں نے ابن حیوۃ سے نام جاننے کی خواہش کی، لیکن انہوں نے راز کھولنے سے صاف انکار کر دیا اور سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے اعلان سے پہلے احتیاطی طور پر دوبارہ سب سے بیعت لی، تب کہیں جا کر انہوں نے خلیفہ کی وفات کی خبر دی اور ان کے ولی عہد عمر بن عبدالعزیز کا نام لیا۔ ان کے اس حکیمانہ فعل نے لوگوں کی مخالفت کا دروازہ بند کر دیا۔ البتہ ہشام بن عبدالملک نے تھوڑی بہت ناراضگی ظاہر کی اور بیعت سے انکار کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے دھمکی دے کر ان سے بھی بیعت لے لی۔ اسی طرح عبدالعزیز بن ولید نے جو سلیمان بن عبدالملک کی وصیت سے بے خبر تھے، خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ سلیمان نے اپنا ایک جانشین مقرر کیا ہے اور وہ کوئی اور نہیں عمرؒ بن عبدالعزیز ہیں تو انہوں نے بخوشی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

عمرؒ بن عبدالعزیز خلافت ملنے سے پہلے جہاں ایک طرف انتہائی نیک وصالح اور علم وفضل میں یکتائے روزگار شخص تھے، وہیں دوسری طرف پرتعیش زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ چنانچہ جو کپڑا ایک بار پہن لیتے، اسے دوبارہ کبھی زیب تن نہیں کرتے تھے۔ قیمتی خوشبوؤں کا استعمال بھی اسی کثرت سے کرتے تھے، ان کا مزاج، رہن سہن اور طور طریقہ سب کچھ شاہانہ تھا، لیکن جب سلیمان بن عبدالملک کی وصیت ان کے سامنے آئی کہ ان کو خلیفہ بنایا گیا ہے تو وہ ساکت رہ گئے، کیونکہ ان کو اس کی امید ہی نہیں تھی۔ پھر یہیں سے ان کی زندگی میں تبدیلی کا دور شروع ہوتا ہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں حضرت عمر فاروقؓ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں 'عمر ثانی' بھی کہا جاتا ہے۔ امام احمدؒ بن حنبل اور بعض دوسرے جلیل القدر علماء کے نزدیک آپؒ پہلی صدی ہجری کے مجدد تھے اور امام شافعیؒ وسفیان ثوریؒ کے مطابق آپؒ پانچویں خلیفہ تھے۔

عمرؒ بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے جامع اموی میں عوام الناس سے اپنی خلافت کی منظوری لی، کیونکہ ان کے نزدیک ان کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے نہیں بلکہ خلیفہ وقت کی نامزدگی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ 'میری خواہش کے برخلاف اور عام مسلمانوں سے پوچھے بغیر مجھ پر خلافت کی ذمے داری ڈال دی گئی ہے، اس لیے بیعت کا طوق جو آپ لوگوں کی گردنوں میں ہے، میں خود اتار دیتا ہوں، اب آپ لوگ جسے چاہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیں'۔ لیکن سب نے آپ کے نام پر اتفاق کیا جس سے انہیں اطمینان ہوا اور پھر انہوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان کا مزاج انتہائی صالحانہ تھا، چنانچہ ان کی پوری کوشش رہی کہ وہ اموی حکومت میں در آئی خرابیوں کا سدباب کریں اور اسے خلافت راشدہ سے قریب تر لے آئیں۔ اس حوالے سے انہیں کافی حد تک کامیابی بھی ملی، البتہ وہ بھی نظام حکومت کو مکمل طور سے تبدیل نہیں کر سکے اور نہ ہی بادشاہت دوبارہ سے جمہوریت میں تبدیل ہو سکی۔ سچائی یہ تھی کہ ایسا کرنا ان کے اختیار میں تھا ہی نہیں۔ ہاں! بعض

اصلاحات انہوں نے ضرور کیں اور یہ بھی کوئی آسان کام نہیں تھا، اپنوں ہی نے ان کی مخالفت شروع کر دی تھی اور ان کی جان کے در پے ہو گئے تھے۔

عمر بن عبد العزیز نے اصلاحات کی شروعات خود سے کی، چنانچہ شاہی سواری اور قصر خلافت چھوڑ کر اپنے گھوڑے یا خچر سے چلنے لگے اور اپنے ہی مکان میں رہے، اپنی اہلیہ فاطمہ بنت عبد الملک سے کہا کہ گھر کی تمام قیمتی اشیاء کو بیت المال میں داخل کر دیں اور میری طرز زندگی کو جھیل سکیں تو ساتھ رہیں ورنہ اپنے میکہ چلی جائیں۔ اسی طرح خاندان کے دیگر افراد سے ان کی غلط جائیداد اور مال و دولت کو لے کر ان کے اصل مالکوں کو لوٹایا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اموی دور کے آغاز سے ہی خلفاء اپنے خاندان اور اعزہ و اقارب کو مختلف مواقع پر مال و دولت اور جائیداد (قطائع) سے نوازتے رہتے تھے جو بسا اوقات غاصبانہ طریقے سے حاصل کی جاتی تھی۔ عمرؒ بن عبد العزیز نے ان سب کو واپس اصل مالکوں تک پہنچایا اور اس کی شروعات اپنے گھر سے کی تا کہ دوسرے اس سے سبق حاصل کر سکیں۔ اسی طرح عوام الناس کے غصب شدہ مال و دولت اور جائیداد وغیرہ کو بھی معمولی سے معمولی شہادتوں کی بنیاد پر حقیقی مالک تک اور اس کے فوت ہو جانے پر اس کے ورثاء کے حوالے کر دیا گیا، خواہ وہ بیت المال میں ہو یا پھر کسی اموی حکومت کے کارندے کے پاس ہو۔ مزید یہ کہ ان سے متعلق تمام دستاویز اور اسناد وغیرہ کو کاٹ کر پھینک دیا گیا، تا کہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ اس حکم کی وجہ سے صوبوں کے خزانے خالی ہو گئے اور کام چلانے کے لیے مرکز سے پیسے منگانے پڑے۔ اسی طرح انہوں نے متعدد ناجائز محاصل جیسے نومسلموں پر جزیہ، شادی، نکاح، گھر، پانی کی فراہمی، ٹکسال کے مصارف، عرائض نویسی، مہرجان اور نوروز کے تحائف وغیرہ کے محاصل کو کالعدم قرار دے دیا۔ اموی خلفاء اور ان کے اعزہ و اقارب پر ہونے والے بے جا مصارف کو بھی بند کر دیا، سرکاری و دفتری اخراجات میں بھی کٹوتی کر دی، بیت المال کی نگرانی پر ایماندار افسروں کا تقرر کیا اور ان کا بھی سختی سے محاسبہ کیا، چنانچہ یمن کے بیت المال سے ایک اشرفی گم ہونے پر متعلقہ افسر سے جواب طلب کیا گیا۔ امراء، وزراء اور گورنروں سے سرکاری اخراجات کا حساب مانگا، چنانچہ یزید بن مہلب ازدی کو اسی بنیاد پر عہدے سے برطرف کیا گیا اور بقایہ نہ دینے کی صورت میں انہیں قید کر دیا گیا۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے فدک کی جائیداد کی تولیت اور اس کی آمدنی کو عہد فاروقی کی طرح بنو ہاشم کے حوالے کر دیا تھا، جسے مروان بن حکم نے اپنے عہد میں خلیفہ وقت کے تحت کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے دور تک بھی وہ اسی طرح تھی، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے بعض مصلحتوں کی بنا پر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اسے بنو ہاشم کے حوالے کر دیا تھا۔ البتہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ابن عبد العزیز نے اس معاملہ کو عہد نبوی کی طرح کر دیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اموی خلفاء اور ان کے والیوں و عاملوں کی جانب سے حضرت علیؓ پر خطبوں میں ہونے والی لعن طعن اور سب و شتم کو بند کرا کے سورۃ النحل:90 کی تلاوت کا حکم دیا، البتہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ حضرت علیؓ پر نہیں قاتلین عثمان کو برا بھلا کہتے تھے۔ بہر حال انہوں نے اس قبیح رسم کا خاتمہ کیا گیا۔

حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے اپنے مزاج کے مطابق سیاسی معاملات میں حتی الامکان نرم پالیسی اختیار کی۔ نیز ہر اس عہدے دار کو برطرف کیا جس کے بارے میں ان کو معلوم ہوا کہ وہ معاملات میں بے جا سختی اور ظلم و ستم سے کام لیتا ہے، پھر انہوں نے ان کی جگہوں پر نیک، صالح، ایماندار اور حکمت و بصیرت سے کام لینے والے افراد کو بھیجا اور ان کو تاکید کی کہ وہ کسی پر شک و شبہ کی بنیاد پر سزا نہ دیں، گرفتار نہ کریں، بے جا سختیاں نہ کریں، جزیہ اور خراج کی وصولی میں سختی نہ کریں اور بازار سے کم قیمت پر سامان نہ خریدیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر اگر کسی عہدہ دار سے متعلق کوئی شکایت ملتی تو فوراً اس کی تحقیق کراتے تھے۔ خلیفہ وقت کی نرم پالیسی کی وجہ سے فتوحات میں بھی کمی آئی، کیونکہ وہ اندرونی معاملات پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ ریاست کو مزید وسیع کرنے کے بجائے اسی کو عدل و انصاف کے ذریعے مضبوط و مستحکم بنانا چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے مختلف محاذوں سے اسلامی فوجوں کو واپس بلا لیا گیا۔ البتہ اندلس اور سندھ کے بعض علاقے فتح کیے گئے، لیکن وہ بھی بحالت مجبوری، کیونکہ حالات اسی کے متقاضی تھے۔

عمرؒ بن عبدالعزیز نے رفاہی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی خدمات بھی انجام دیں۔ مال غنیمت کے سرکاری حصے خمس کو غرباء اور مساکین کے لیے مخصوص کیا، قرض داروں کے قرض کو ادا کیا، نومولود بچوں کے لیے وظائف مقرر کیے، سرکاری لنگر خانے قائم کیے، زکوۃ وصدقات کو ان کے حق داروں تک پہنچانے کا بہترین انتظام کیا، سڑکیں، کنویں، سواریوں کے علاوہ مسافر خانے بنوائے، ذمیوں کو ان کے حقوق دلائے اوران کا خصوصی خیال رکھا۔ چنانچہ ان کے گرجوں کو آزاد کرایا، ان کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر کردی، ان کی زمینیں انہیں واپس دلائیں، جزیہ اور خراج کی رقم کی وصولی میں نرمی سے کام لیا، مقدمات میں مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز کو ختم کیا، شراب کی دوکانیں بند کرائیں، جنازوں میں عورتوں کی شرکت کو روک دیا، حماموں میں مرد وعورت کے یکجا ہونے سے منع کردیا، تصاویر ہٹوائیں، تہہ بند میں نہانا لازمی قرار دیا، شریعت کا نفاذ کیا، عقائد کی درستگی کا خصوصی اہتمام کیا، نمازوں کو اول وقت میں ادا کرنے کی تاکید کی اور اسلامی ریاست میں اشاعت اسلام اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے معلمین اور مدرسین کا تقرر کیا، مساجد میں مکاتب قائم کیے، طلبہ کے وظائف مقرر کیے، اسی طرح مختلف صوبوں میں دین کے داعیوں، مبلغوں، واعظوں اور قاضیوں کو بھیجا، نیز اپنے گورنروں، والیوں اور عاملوں کو بھی اس کی خصوصی تاکید کی۔ انہوں نے احادیث کی ترویج واشاعت پر بھی توجہ دی، چنانچہ ابوبکر بن عمرو بن حزم اور امام زہری وغیرہ سے احادیث کے صحیفے، سعید بن مسیّبؒ سے تفسیر اور عاصم بن عمر بن قتادہؓ سے سیرت ومغازی کے مجموعے تیار کرائے، مؤخر الذکر کو جامع دمشق میں سیرت کے درس کے لیے متعین کیا، انہوں نے دینی ودنیاوی دونوں طرح کی تعلیم پر توجہ دی۔ چنانچہ مروان بن حکم کے زمانے میں ماسرجویہ کی ترجمہ کی ہوئی طبی کتاب کی مختلف کاپیاں تیار کرا کے تمام صوبوں میں بھیجا۔ خلیفہ وقت کی ان کوششوں سے ہزاروں ذمی اسلام لائے، خوارج بھی ان کی غیر معمولی خدمات سے بہت متاثر ہوئے، چنانچہ ان کی اکثریت نے فتنہ وفساد پھیلانے سے توبہ کرلی۔ البتہ اس میں خلیفہ وقت کے سمجھانے بجھانے اور ان سے مناظرہ وغیرہ کا بھی اہم کردار رہا تھا۔ ہر طرف دین اسلام کا چرچا ہوگیا اور کہا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں جب لوگ آپس میں ملتے تھے تو موضوع گفتگو دین اسلام اور اس کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس عظیم خلیفہ کا انتقال 720ء میں طبعی بیماری میں ہوا۔ البتہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ بنوامیہ کے ناراض لوگوں نے انہیں زہر دلوادیا تھا۔ وفات کے وقت ان کی عمر انتالیس یا چالیس سال تھی اور مدت خلافت دوسال پانچ ماہ رہی۔ ان کی تدفین دیر سمعان میں ہوئی۔ انہوں نے دوران علالت یزید بن عبدالملک کو وصیت لکھوائی جو ان کے جانشین تھے۔

20.2.3 یزید (دوم) بن عبدالملک (724-720ء)/(105-101ھ):

عمرؒ بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک کی وصیت کے مطابق یزید بن عبدالملک نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام عاتکہ تھا جو یزید بن معاویہ کی بیٹی اور حجاج بن یوسف کی بھتیجی تھیں۔ ابن عبدالملک کی پیدائش بعض کے مطابق 65ھ اور بعض کے مطابق 71ھ میں ہوئی تھی۔ مؤرخین کے نزدیک وہ آرام، عیش وعشرت اور حرم کے دلدادہ تھے۔ یزید بن عبدالملک نے کچھ دن تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے طرز عمل کی پیروی کی، لیکن پھر وہ اسے برقرار نہیں رکھ سکے اور زیادہ تر اصلاحات کو منسوخ کرکے گزشتہ نظام کو واپس لے آئے۔

یزید بن عبدالملک کے دور کو ان کی کمزوریوں اور سیاسی بصیرت کی کمی کی وجہ سے مختلف بغاوتوں اور چند ایک فتوحات کے لیے جانا جاتا ہے۔ ان کے عہد میں سابق خلفاء کے برعکس رفاہی، تعلیمی، معاشی، تعمیری اور دیگر سرگرمیوں کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس دور میں سب سے پہلے یزید بن مہلب ازدی نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ یہ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں والی خراسان تھا اور ان کے ولی عہد عمرؒ بن عبدالعزیز کو جب وہاں کا حساب کتاب صحیح سے نہیں دے سکا، تو انہوں نے اسے قید کردیا تھا۔ ان کی وفات سے قبل یہ جیل سے فرار ہوگیا تھا، کیونکہ ابن عبدالعزیز کے جانشین یزید بن

عبدالملک سے اس کو قتل کیے جانے کا اندیشہ تھا۔اس نے عراق جا کر اپنے قبیلے اور بعض دیگر طبقات کے ساتھ مل کر یزید بن عبدالملک کے خلاف 720ء میں بغاوت کی، جس کا خاتمہ مسلمہ بن عبدالملک نے اسے قتل کر کے کیا۔اسی طرح خراسان، کش اور نسف میں 723-721ء میں بغاوتیں ہوئیں، جن کو سعید بن عبدالعزیز اور سعید بن ہبیرہ فزاری نے ختم کیا۔723ء میں ترکستان کے بعض علاقوں خزر اور یمن وغیرہ میں بھی حکومت کے خلاف محاذ آرائی ہوئی جسے جراح بن عبداللہ حکمی نے کچلنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکے۔723ء میں خوارج نے پھر سر اٹھایا اور بحرین وغیرہ میں کثرت سے سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں، لیکن ان سب کا آسانی سے خاتمہ کر دیا گیا۔ان کے سرداروں میں عفان خارجی، مسعود بن ابی زینب عبدی اور ہلال بن مدلج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی دور میں شیعہ اور عباسی تحریکوں نے بھی اپنی رفتار پکڑ لی تھی۔ان کے مقاصد اگرچہ الگ تھے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ اموی حکومت کا خاتمہ کیا جائے، اس لیے دونوں نے آپس میں اتحاد کر لیا تھا۔عہد یزیدی میں بہت کم فتوحات ہوئیں چنانچہ 722ء میں عباس بن ولید اموی نے دلسہ کے قلعہ کو اور 724ء میں مروان بن محمد اموی نے قونیہ فتح کیا۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یزید بن عبدالملک کے دور میں کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی، البتہ ایک پہلو ایسا ضرور تھا جس پر اس عہد میں خصوصی توجہ دی گئی، یعنی حدیث کی جمع و تدوین، چنانچہ محدثین اور فقہاء نے اس حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔اسی طرح انہوں نے عراق کی آراضی کا نئے سرے سے بندوبست کیا جسے حضرت عہد فاروقیؓ کے بعد نہیں کیا گیا تھا۔

یزید بن عبدالملک کا 105ھ میں انتقال ہو گیا اور کل چار سال ایک ماہ کچھ دن خلافت کی۔اپنی وفات سے قبل انہوں نے ہشام بن عبدالملک اور ولید بن یزید کو جانشین مقرر کیا تھا۔انہوں نے کئی شادیاں کیں جن سے دس اولادیں ہوئیں، ان میں ولید، یحییٰ، محمد، عمر، عبدالجبار، داؤد، سلیمان اور ہاشم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

20.2.4 ہشام بن عبدالملک (743-724ء)/(125-105ھ):

یزید بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ہشام بن عبدالملک نے مسند خلافت سنبھالی۔والدہ محترمہ کا نام عائشہ بنت ہشام تھا۔ہشام کی پیدائش 72ھ میں اس وقت ہوئی، جب عبدالملک بن مروان، مصعب بن زبیرؓ سے مقابلہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے کا نام منصور رکھا تھا، لیکن ماں نے اپنے والد ہشام کی مناسبت سے ان کا نام بھی ہشام کر دیا تھا، اور وہ اسی نام سے مشہور بھی ہوئے، البتہ کنیت ابوالولید تھی۔وہ اپنے اسلاف کی طرح انتہائی جری، بہادر، حلیم، عفیف، مدبر، کفایت شعار، صاحب فراست و بصیرت اور اچھے اخلاق و کردار کے حامل تھے۔بنو ہاشم اور قریش سے انتہائی محبت اور مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔سادگی اور قناعت کا خود عملی نمونہ پیش کرتے تھے اور اہل خانہ کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔روایتوں میں آتا ہے کہ وہ ایک لباس کئی سالوں تک پہنتے تھے۔

ہشام بن عبدالملک کو خلیفہ بنائے جانے کی خبر شہر رصافہ میں ملی، کیونکہ اس وقت وہ وہیں مقیم تھے، چنانچہ ان کی خدمت میں بطور نشانی عصاء و خاتم پیش کیا گیا اور پھر ایک ماہ بعد دمشق پہنچ کر انہوں نے عام بیعت لی۔خلیفہ بننے کے بعد انہیں بیک وقت اندرونی و بیرونی دونوں محاذوں پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور اپنے عزم و حوصلہ سے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے لگ بھگ بیس سالہ دور میں اموی حکومت کو زوال سے بچائے رکھا، کیونکہ ان کے بعد پھر کوئی ایسا خلیفہ نہیں ہوا جو ایسا کر سکے۔اسی وجہ سے انہیں مؤرخین نے اموی خلفاء میں حضرت امیر معاویہؓ اور عبدالملک بن مروان کے بعد تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ان میں حضرت امیر معاویہؓ کا حلم و بردباری اور عبدالملک بن مروان کی سیاسی بصیرت جمع ہو گئی تھیں۔

ہشام بن عبدالملک نے خلیفہ بننے کے بعد ان تمام رسومات اور طور طریقوں کو ختم کر دیا جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ نیز انتظامیہ، افسروں، عاملوں اور گورنروں کو سادگی اور قناعت سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ ان کے عہد میں کچھ نئی اصلاحات ہوئیں جو خلیفہ وقت کی بیدار مغزی اور سیاسی بصیرت کے واضح ثبوت ہیں، جیسے پوری ریاست کے شعبوں اور دفاتر کی از سر نو تنظیم کی گئی، کچھ اصول وضوابط بنائے گئے جن کی پابندی متعلقہ افسروں اور دیگر عہدے داران کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ نیز رجسٹر اور کاغذات وغیرہ کو درست کیا گیا اور انہیں محفوظ رکھنے کے لیے ایک شعبہ قائم کیا گیا، چنانچہ عبداللہ بن علی عباسی کے مطابق "میں نے بنوامیہ کے تمام خلفاء کے دفاتر کی جانچ پڑتال کی مگر ہشام کے دفاتر راعی اور رعایا کے حق میں سب سے بہتر پائے"۔ اسی طرح بیت المال کے نظم ونسق کو بھی درست کیا گیا۔ اس لیے انہوں نے اس کی اصلاح کی اور یہ ضابطہ طے کیا کہ جب تک چالیس معتبر افراد اس بات کی گواہی نہیں دیں گے کہ اس میں آنے والی رقم جائز ہے تب تک اسے نہیں لیا جائے گا، مزید یہ کہ اخراجات کے بھی قاعدے وقوانین بنائے تا کہ اس میں غبن نہ ہو سکے۔ عدالتی نظام کی بھی درستگی کی، اسی لیے ان کے عہد میں کمزور اور طاقتور کو ایک نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ ایک بار ان کے چہیتے خادم کو ایک ذمی کو تکلیف دینے پر سزا دی گئی۔ اسی طرح بری وبحری فوجی نظام میں بھی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئیں، ان میں جہاز سازی کے کارخانے، قلعوں کی تعمیر، جاسوسی کا شعبہ، نئے اسلحے، گھوڑوں کا پالن اور بہ وقت ضرورت ان کی فراہمی، اچھی تنخواہ، کھانے پینے اور رسد کا بہترین نظم قابل ذکر ہیں۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں مختلف بغاوتیں اور فتوحات ہوئی جن کا ذکر اٹھارہویں اکائی کے تحت کیا جا چکا ہے، یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ان کے زمانے کے مشرق ومغرب میں تمام سورشوں اور سازشوں کے باوجود اسلام کا علم بلند رہا۔ ترکستان اور آذربائیجان میں ترکوں اور تاتاریوں کی بغاوتوں کا خاتمہ کیا گیا۔ اسی طرح سندھ کی بغاوتوں کا سد باب کیا گیا اور وہاں نئی آبادیاں قائم کی گئیں۔ اسی دور میں حضرت علیؓ کے خاندان کے ایک فرد زید بن علیؒ جو حضرت زین العابدینؒ کے فرزند تھے، کوفہ سے بنی امیہ کی استبدادی حکومت کے خلاف تحریک قائم کی تھی۔ لیکن آپؒ کو اموی گورنر نے شہید کر دیا۔ اس طرح سے یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ اسی طرح ان کے دور میں عباسیوں کی تحریک میں بھی تیزی آئی، جس کا آغاز سلیمان بن عبدالملک کے دور میں ہی خفیہ طریقے سے ہو گیا تھا۔ اس کی شروعات محمد بن حنفیہؒ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہؒ نے کی تھی۔ انہوں نے اپنا جانشین محمد بن علی عباسیؒ کو بنایا جس نے اس تحریک کے اصول وضوابط بنائے اور اسے خفیہ رکھنے کے لیے کچھ مخصوص الفاظ متعین کیے، جیسے سربراہ کے لیے لفظ 'امام' رائج کیا گیا اور چند مخصوص لوگ ہی اس کا علم رکھتے تھے کہ اس سے مراد کون ہے؟ نیز راز داری کے لیے عام لوگوں سے صرف 'امام آل محمدؐ' سے وفاداری کی بیعت لی جاتی تھی، تا کہ مشکل حالات میں وہ امام کا نام نہ بتا سکیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنا ایک وزیر مقرر کیا جو 'وزیر آل محمدؐ' کہلاتا تھا جس کا کام اپنے ہم نواؤں کو اس تحریک میں شامل کرنا تھا۔ حامیان عباسی اسلامی ریاست کے مختلف حصوں میں تاجروں اور مبلغوں کے بھیس میں گھوم پھر کر لوگوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کرتے تھے، ان میں سے بعض پکڑے اور قتل بھی کر دیئے جاتے تھے۔ ان کے مراکز عراق، خراسان اور کوفہ تھے۔ اس تحریک کی خبر جب خلیفہ وقت کو ملی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور ان کا آخری وقت قریب تھا، اس لیے ان لوگوں کے خلاف کوئی بڑی کارروائی نہیں کی جاسکی۔ بعد میں اس کا خمیازہ اموی حکومت کو بھگتنا پڑا، چنانچہ یہ اس کے زوال اور خاتمے کی مختلف وجوہات میں سے ایک اہم وجہ ثابت ہوئی۔ جہاں تک اس عہد کی فتوحات کی بات ہے تو ایشیائے کوچک میں رومیوں کے کئی قلعوں پر قبضہ کیا گیا اور شمالی افریقہ اور اندلس میں بغاوتوں کو دباتے ہوئے امن وسکون قائم کیا گیا، نیز وہاں سے فرانس پر حملے کیے گئے۔

ہشام بن عبدالملک نے متعدد رفاہی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی خدمات بھی انجام دیں، چنانچہ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں

مساجد، مسافر خانے، کنویں، حوض اور تالاب تعمیر کرائے۔ اسی طرح کئی شہر آباد کرائے ان میں قنسرین میں رصافہ، سندھ میں منصورہ اور محفوظہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رصافہ کو دمشق کے بعد دوسرے دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی اور منصورہ کو سندھ کی راجدھانی کا درجہ حاصل تھا۔ اسی عہد میں صنعت وحرفت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی، ریشمی کپڑوں کے متعدد کارخانے لگائے گئے اور بنجر زمینوں کو آباد کیا گیا۔ اس میں یہ اصول بنایا گیا کہ جو جس زمین کو آباد کرے گا وہی اس کا مالک ہوگا اور اس سے صرف خراج یا عشر لیا جائے گا، نیز اس حوالے سے حکومت اس کی مدد بھی کرے گی۔ اس ترکیب سے نہ صرف بہ کثرت زمین آباد ہوگئیں، بلکہ ملک کی پیداوار میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔

ہشام بن عبدالملک کو علوم وفنون سے بھی بہت دلچسپی تھی، چنانچہ انہوں نے بہت سے مکاتب قائم کرائے اور مساجد میں درس وتدریس کا انتظام کیا۔ انہوں نے عقلی اور نقلی دونوں علوم پر توجہ دی اور اس سلسلے میں معلمین اور طلبہ کے وظائف مقرر کیے۔ اسی عہد میں امام زہریؒ نے ان کے کہنے پر 400 احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ اسی طرح سیاسی امور پر فارسی زبان میں موجود ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کرایا اور اس کی مختلف کاپیاں تیار کرا کے اپنے عاملوں اور والیوں کو بھیجا تاکہ وہ اس سے سیاست میں رہنمائی حاصل کرسکیں۔ 743ء میں اس عظیم خلیفہ کا مرض خناق میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر پچپن سال تھی اور مدت خلافت انیس سال نو مہینہ رہی۔ ان کی تدفین رصافہ میں ہوئی۔ اپنی وفات سے قبل انہوں نے یزید بن عبدالملک کے متعین کردہ ولی عہد ولید بن یزید کو ہٹا کر اپنے بیٹے مسلمہ کو جانشین بنانا چاہا تھا، لیکن بعض امراء کی شدید مخالفت اور اچانک موت کی وجہ سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

20.2.5 ولید بن یزید بن عبدالملک (743-744ء)/(125-126ھ):

ہشام بن عبدالملک کی وفات کے بعد ان کا بھتیجا اور جانشین ولید دوم بن یزید خلیفہ بنا جو عبدالملک بن مروان کے پوتا تھا۔ وہ 90ھ میں پیدا ہوا۔ شروع سے ہی انتہائی نالائق، بداخلاق وکردار اور عیش وعشرت کا دلدادہ تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے اس کی اصلاح کی بہت کوششیں کیں، اس کو سمجھایا بجھایا، خاندانی شرافت کا احساس دلایا، ولی عہد ہونے اور خلیفہ بننے کا پاس ولحاظ رکھنے کو کہا، مختلف طرح کی پابندیاں لگائیں، خراب دوستوں کی صحبت سے روکا، سرکاری وظیفوں سے محروم کیا اور امیر الحج بنا کر بھیجا تاکہ وہ سنبھل جائے لیکن اس پر ان تدابیر کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بھاگ کر اردن چلا گیا جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ مے نوشی کا بھی عادی ہو گیا تھا، البتہ وہ اس میں اتنا خیال ضرور رکھتا تھا کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو کپڑے بدل کر نماز ادا کرتا اور پھر سے اپنے غیر اخلاقی کاموں میں مصروف ہو جاتا تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے تھک ہار کر اسے امام زہری، بعض نامور فقہاء، علماء اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے مشوروں سے ولی عہدی سے خارج کرنا چاہا، لیکن موت نے ان کو اس کام کی تکمیل کی مہلت نہیں دی۔ ابن یزید میں اگرچہ درج بالا خرابیاں موجود تھیں لیکن اس میں کچھ اچھائیاں اور خوبیاں بھی تھیں جیسے اس نے فقراء، مساکین محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لیے وظائف مقرر کیے، گھڑسواری، شعر وشاعری اور فن موسیقی کو ترقی دی اور وہ خود بھی شاعری کا ذوق رکھتا تھا، اس لیے شعراء کرام کو اکثر فضول خرچی کی حد تک داد ودہش سے نوازتا رہتا تھا۔

ولید بن یزید نے خلافت سنبھالتے ہی سب سے پہلے ہشام بن عبدالملک کے اہل خانہ اور اس کے تمام والیوں اور عمالوں کو معزول کیا، کیونکہ اسے ان سے سخت نفرت تھی۔ نیز اس نے ان تمام لوگوں سے بدلہ لیا جنھوں نے اس کو ولی عہدی سے ہٹانے میں ہشام بن عبدالملک کا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ ولید نے سابق خلیفہ کے ماموں ہشام بن اسماعیل کو مکہ کی ولایت سے معزول کر دیا اور ان کے دو بیٹوں ابراہیم اور محمد، نیز سلیمان بن ہشام، یزید بن ہشام اور والی عراق خالد بن عبداللہ قسری وغیرھم کو سخت آزمائش سے دوچار کیا۔ ان میں سے بعض کو شدید تکلیفوں

کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کچھ کو جلاوطن کر دیا گیا۔

خلیفہ وقت کے ان احمقانہ اقدام سے پوری اسلامی ریاست میں انتشار اور بدامنی پھیل گئی، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 125ھ میں خاندان علوی سے تعلق رکھنے والے زید بن علی کے بیٹے یحییٰ نے خلافت کا دعویٰ کیا اور حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ حالانکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے اور والی خراسان کے سپہ سالار مسلم بن احور مازنی کے ہاتھوں شہید کیے گئے۔ اسی دوران خالد بن عبداللہ قسری کے مظلومانہ قتل کی وجہ سے یمنی اور مضری قبائل میں اختلاف پیدا ہو گیا، یہ دونوں ہی قبیلے بنوامیہ کے دست و بازو تھے۔ ان اختلافات کی وجہ سے بنوامیہ میں پھوٹ پڑ گئی اور رہی سہی کسر ولید دوم کے ذریعے سلیمان بن ولید کی بے عزتی اور بدسلوکی نے پوری کر دی چنانچہ یمنی قبائل نے یزید بن ولید اول جو ولید دوم کے چچا تھے، کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہوئے اس کے خلاف مسلح بغاوت کر دی اور معمولی جھڑپ کے بعد ولید دوم کو اس کے محل میں 744ء میں قتل کر دیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا تو وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف ہو گیا اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں اسی طرح شہید کیا جاؤں، جس طرح حضرت عثمانؓ شہید کیے گئے تھے۔ قتل کے وقت اس کی عمر بیالیس سال تھی اور مدت خلافت ایک سال دو ماہ رہی۔ اس نے شروع میں ہی اپنے بیٹوں حکم اور عثمان کو اپنا ولی عہد متعین کیا تھا لیکن بعد میں حالات کچھ ایسے بنے کہ اس کے حکم پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

20.2.6 یزید (سوم) بن ولید اول (744ء)/(126ھ):

ولید دوم بن یزید کو قتل کرنے کے بعد ان کے چچا یزید بن ولید اول خلافت کے درجے پر فائز ہوئے۔ ان کی والدہ شاہ آفرید بنت فیروز بن یزدگرد شہنشاہ ایران کی بیٹی تھیں۔ انہیں 'یزید ناقص' بھی کہا جاتا تھا، کیونکہ انہوں نے سابق خلیفہ کے عہد میں فوجیوں کی تنخواہوں میں ہونے والے اضافوں کو روک دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطاب مروان بن محمد کے ذریعے دیا گیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ انتہائی نیک و صالح اور عبادت گزار شخص تھے۔ عوام الناس کی اکثریت نے یزید بن ولید کی نیک نامی، نرم دلی اور ان کی جانب سے سیاست میں نرم پالیسی اختیار کرنے کے باوجود مختلف اسباب کی بنا پر ان کی خلافت کو پسند نہیں کیا اور جلد ہی بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس میں اموی خاندان کی تقسیم، آپسی رنجش، قبائلی عصبیت، یمنی اور مضری قبائل میں اختلافات، عباسی تحریک اور شامی وفاداری کے خاتمے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ سب سے پہلے اہل حمص نے بغاوت کی اور مروان بن عبداللہ بن عبدالملک، اس کے بیٹے یزید اور والی حمص کو قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح عباس بن ولید کے گھر کو لوٹ لیا گیا۔ کچھ ایسا ہی حال فلسطین اور اردن میں بھی ہوا اور ان لوگوں نے بھی حکومت وقت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اگرچہ یزید سوم نے ان بغاوتوں کو فوج کی مدد سے دبا دیا لیکن اس کی طاقت اور رعب و دبدبہ کا خاتمہ ہو گیا۔ رہی سہی کسر اموی خاندان کی تقسیم نے پوری کر دی کیوں کہ مروان بن محمد ولید دوم کے قتل سے ناراض ہو کر یزید سوم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے دمشق پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا، اگرچہ خلیفہ وقت نے انہیں جزیرہ، آرمینیہ، موصل اور آذربائیجان کی گورنری دے کر خاموش کر دیا لیکن اسے حکومت کی کمزوری ثابت ہو ہی گئی اور بعد میں اس کا فائدہ سب نے اٹھایا۔ اسی طرح مصر، یمن، عراق اور خراسان میں بھی بغاوتیں ہوئیں۔ اسی دوران یزید سوم کی موت ہو گئی۔ ان کی مدت خلافت صرف چھ ماہ رہی۔ ان کا انتقال چونسٹھ سال کی عمر میں ہوا۔ انہوں نے اپنی وفات سے قبل اپنے بھائی ابراہیم بن ولید اور اس کے بعد عبدالعزیز بن حجاج کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔

20.2.7 ابراہیم بن ولید (744-745ء)/(126-127ھ):

یزید بن ولید کی وفات کے بعد اس کا بھائی اور جانشین ابراہیم بن ولید تخت نشین ہوا، لیکن اس کی خلافت کو متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور نہ ہی سابق خلفاء کی طرح اس کے لیے عام بیعت لی گئی، کیونکہ اسے اس مقام کا اہل ہی نہیں سمجھا گیا تھا۔ اسی لیے اکثر و بیشتر مؤرخین نے اسے مستقل

خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ابراہیم کو ابھی خلیفہ بنے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مروان بن محمد نے اس کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے شام پر فوج کشی کر دی۔ راستے میں اس نے قنسرین اور حمص کو فتح کیا، پھر اس کا مقابلہ 744ء میں عین الجر نامی مقام پر سلیمان بن ہشام کی فوج سے ہوا جو خلیفہ کی جانب سے بھیجی گئی تھی، اس جنگ میں مروان کو فتح ملی۔ جنگ سے پہلے اس نے ابراہیم بن ولید کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ ولید کے دونوں بیٹوں حکم اور عثمان کو قید سے آزاد کر دے تو وہ واپس ہو جائے گا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوا، بلکہ اس نے ان دونوں کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد مروان نے دارالحکومت دمشق پر قبضہ کر لیا اور خود خلیفہ بن گیا۔ ابراہیم دمشق سے فرار ہو گیا تھا، لیکن مروان نے اس کو معاف کر دیا، یوں بھی اس نے خلافت سے دست برداری حاصل کر لی تھی۔ اس طرح سے ابراہیم بن ولید کی حکومت تین یا چار ماہ سے زائد نہیں چل سکی۔ اس کا انتقال 132ھ میں ہوا۔

20.2.8 مروان (ثانی) بن محمد (750-745ء)/(132-127ھ):

مروان ثانی بن محمد اموی دور کے آخری خلیفہ ہوئے۔ ان کی پیدائش 72ھ میں ہوئی۔ ان کے والد محمد بن مروان خلیفہ عبدالملک کے بھائی تھے اور والدہ کردی ام ولد تھیں۔ وہ شروع ہی سے انتہائی جری، بہادر، عزم و حوصلہ کے پیکر اور صبر و استقلال کے ماہر تھے۔ اسی لیے انہیں 'الحمار' کا خطاب دیا گیا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر جنگ لڑتے ہوئے گزرا اور وہ کبھی اس سے گھبرائے نہیں۔ اپنی تمام تر خصوصیات و صفات کے باوجود وہ اموی خلافت کو بچا نہیں سکے، کیونکہ اندرونی سازشیں اتنی زیادہ بڑھ گئیں تھیں کہ اب ان کے یا کسی کے بس میں قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان کے عہد میں عبداللہ بن معاویہ، سلیمان بن ہشام، اہل خوارج اور عباسی تحریک نے مختلف مواقع پر بغاوتیں کیں۔ ان میں سے بعض بغاوتوں کو خلیفہ مروان بن محمد نے خود اور کچھ کو اپنے سپہ سالاروں کے ذریعے ختم کرایا، لیکن وہ اس میں مکمل طور سے کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ ان تمام عناصر نے آپسی نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود حکومت وقت کے خلاف اتحاد و اتفاق کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ وقت کے لیے بیک وقت سب سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ ذیل میں ان سب کا مختصراً جائزہ لیا جا رہا ہے:

خلیفہ مروان بن محمد کو سب سے پہلے شام میں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جہاں یمنی قبیلے کی اکثریت موجود تھی اور چونکہ وہ مضری قبائل کی حمایت سے خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یمنی اور مضری قبیلوں کی پرانی دشمنی اور عصبیت واپس لوٹ آئی تھی، چنانچہ اس کا نقصان مروان بن محمد کو ہوا۔ ان کی خلافت کی بیعت حمص، فلسطین اور تدمر سمیت مختلف مقامات پر نہیں ہو سکی اور ان میں سے بعض جیسے یمنی اور اہل حمص نے ان کے مقابلے میں سلیمان بن ہشام کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کر لی۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں سلیمان کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گئے پھر انہیں ضحاک خارجی کا تعاون ملا تو دوبارہ حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح کوفہ کی ولایت کے سلسلے میں بھی یمنیوں اور مضریوں میں سخت اختلاف ہوا اور دونوں میں جنگ ہوئی۔ امویوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خوارج بھی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سربراہ ضحاک بن قیس نے کوفہ پر قبضہ کر لیا، لیکن پھر وہ مروان بن محمد سے جنگ میں ہار گیا اور قتل ہوا۔ اس کے بعد تو خوارج کی بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور خیبری، شیبان بن عبدالعزیز اور ابوحمزہ نے عراق، موصل، مکہ، منیٰ اور مدینہ وغیرہ میں بغاوتوں کا علم بلند کیا۔ ان تمام کو خلیفہ وقت نے یکے بعد دیگرے ختم تو کیا، لیکن ان کی وجہ سے ان کی طاقت کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔

عباسی تحریک نے اموی خلافت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔ اس تحریک کے روح رواں امام ابراہیم نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ انہوں نے حمیمہ، کوفہ اور خراسان تک عباسی دعوت کو پھیلا دیا، باقی کام ابو مسلم خراسانی نے پورا کیا اور اس نے خراسان، کوفہ اور عراق وغیرہ پر قبضہ کر کے سیاہ عباسی پرچم لہرا دیا۔ کوفہ میں ہی 749ء کو ابوالعباس عبداللہ بن علی کے ہاتھوں پر بطور اولین عباسی خلیفہ بیعت کی گئی۔ مروان ثانی ان تمام

حالات سے باخبر تھے، لیکن وہ خوارج اور بعض دیگر طبقات کی بغاوتوں کو دور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، اس لیے وہ کچھ نہیں کر سکے اور جب ان کو فرصت ملی تو انہوں نے عباسیوں سے مقابلے کے لیے دریائے زاب کے کنارے قیام کیا، جہاں 750ء میں فریقین میں جنگ ہوئی۔ اس میں مروان بن محمد کو شکست ہوئی اور وہ موصل، حران، دمشق ہوتے ہوئے مصر پہنچے اور وہیں ان کو عباسی لشکر نے قتل کر دیا۔ انہوں نے کل پانچ سال دس ماہ حکومت کی۔ اسی کے ساتھ ہی اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

20.3 اکتسابی نتائج

- اموی حکومت 661 سے 750 تک قائم رہی۔ اس کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ سے اور اختتام مروان بن محمد پر ہوا۔ اس دوران کل چودہ خلیفہ ہوئے۔
- بنوامیہ کے آخری آٹھ خلفاء میں سے اکثریت نے مختلف اسباب کی وجہ سے فتوحات کی رفتار پر روک لگا دی جس کی وجہ سے ان کے ادوار میں اسلامی ریاست کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوا۔
- اموی عہد میں سماجی، معاشی، مذہبی اور تعلیمی خدمات ضرور دی گئیں اور اس حوالے سے سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک نے اہم کردار ادا کیا۔
- اموی حکومت کے زوال کی شروعات ہشام بن عبدالملک کے عہد سے پہلے ہو چکی تھی لیکن انہوں نے اپنے عزم و حوصلہ اور جرأت مندانہ اقدام سے اس سیلاب کو کافی حد تک روکے رکھا، ان کی وفات کے بعد حکومت کا زوال بہت تیزی سے شروع ہو گیا۔
- اموی حکومت کو ختم کرنے کی انا میں شیعہ، خوارج اور عباسی تحریک نے آپس میں اتحاد کر لیا جس کی وجہ سے حکومت کو بہت نقصان پہنچا اور بنوامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔
- رہی سہی کسر مخالفین کی جانب سے پھیلائے جانے والے پروپیگنڈوں نے پوری کر دی۔ عوام الناس میں ان کی طرف سے بار بار یہ باتیں کہی گئیں کہ اموی حکومت کتاب و سنت سے ہٹ گئی ہے اور اب اسے ہٹا کر عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے منہج پر حکومت قائم کرنی ہے۔ مروان ثانی نے اسے دمشق سے عراق کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اہل شام کی حمایت اور وفاداری سے محروم ہو گئے۔

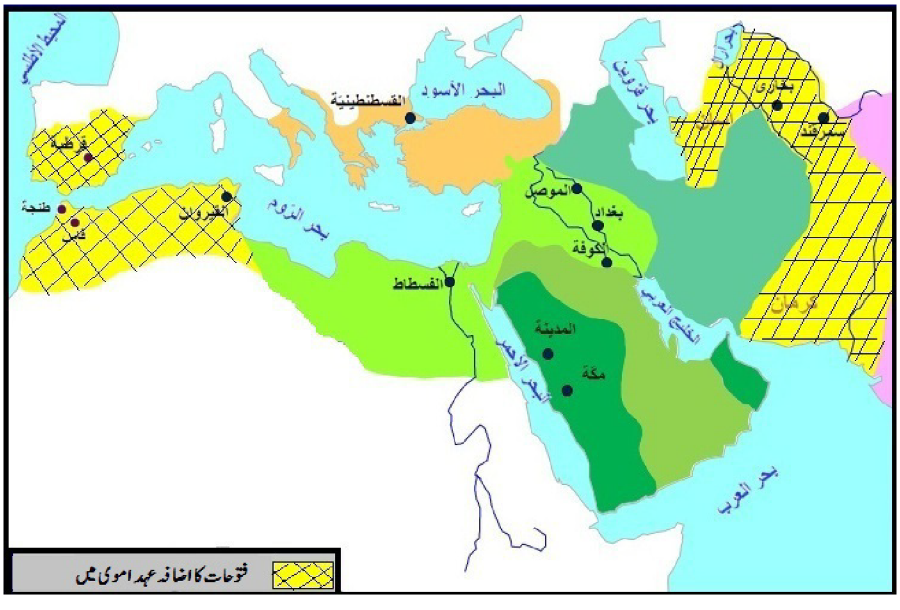

20.4 کلیدی الفاظ

مفتاح الخیر : خیر کی کنجی

فقدان : گم شدگی، کھو جانا، کمی واقع ہونا

الحمار : اصل معنی گدھا، لیکن عرب میں صابر اور صعوبت کش شخص کو حمار کا لقب دیا جاتا تھا۔

روح رواں : اصل چیز، وہ چیز یا شخص جس پر کسی کام کا دارو مدار ہو

20.5 نمونہ امتحانی سوالات

20.5.1 معروضی کے حامل سوالات:

1. 'مفتاح الخیر' کس اموی حکمراں کا لقب ہے؟

a. عمر بن عبدالعزیز b. سلیمان بن عبدالملک c. ہشام بن عبدالملک d. ولید بن عبدالملک

2. شہر رملہ کس نے آباد کرایا؟

a. عمر بن عبدالعزیز b. حضرت امیر معاویہؓ c. ولید بن عبدالملک d. سلیمان بن عبدالملک

3. 'عمر ثانی' کس خلیفہ کو کہا جاتا ہے؟

a. ہشام بن عبدالملک b. حضرت عمر فاروقؓ c. عمرؒ بن عبدالعزیز d. عمر بن ہشام

4. عمر بن عبدالعزیز نے کس مفسر قرآن کو تفسیر لکھنے کا حکم دیا؟

a. عبداللہ بن عمرؓ b. عبداللہ بن مسعودؓ c. سعید بن مسیّبؒ d. امام زہریؒ

5. عمر بن عبدالعزیز کی تدفین کہاں ہوئی؟

a. دیر سمعان b. مکہ c. مدینہ d. افریقہ

6. علوی خاندان سے تعلق رکھنے والے زید بن علی نے کس کے عہد میں خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی؟

a. ولید بن عبدالملک b. عبدالملک بن مروان c. عمر بن عبدالعزیز d. ہشام بن عبدالملک

7. زید بن علی کے بیٹے یحییٰ نے کس اموی خلیفہ کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے خلافت حاصل کرنی چاہی تھی؟

a. عبدالملک بن مروان b. یزید بن معاویہ c. ولید بن یزید d. ولید بن عبدالملک

8. امام زہریؒ نے احادیث کا مجموعہ کس اموی خلیفہ کے کہنے پر تیار کیا تھا؟

a. سلیمان بن عبدالملک b. عمر بن عبدالعزیز c. ہشام بن عبدالملک d. ولید بن عبدالملک

9. عباسی تحریک کی شروعات کس نے کی تھی؟

a. محمد بن ابراہیم b. ابو ہاشم عبداللہ c. قاسم بن عبداللہ d. زید بن علی

10. 'الحمار' کس اموی خلیفہ کا لقب تھا؟

a. ہشام بن عبدالملک b. عبدالملک بن مروان c. مروان بن محمد d. ولید بن عبدالملک

20.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں مشہور سپہ سالاروں کی معزولی اور قتل پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. سلیمان بن عبدالملک کے دور میں قسطنطنیہ پر حملے کے واقعہ کو قلم بند کریں۔
3. اموی دور میں عباسی تحریک کا مختصراً جائزہ لیں۔
4. اموی عہد میں علوی خاندان کی طرف سے خلافت کے حصول میں کی گئی کوششوں کا جائزہ پیش کریں۔
5. خلیفہ مروان (دوم) کے زمانے کی بغاوتوں کو مختصراً قلم بند کریں ۔

20.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں کی گئی اصلاحات کا تفصیلی جائزہ لیں۔
2. ہشام بن عبدالملک کی حیات وخدمات پر تبصرہ کریں۔
3. بنوامیہ کے زوال اوراس کے خاتمے کا تجزیہ پیش کریں۔

20.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلداول)	:	ثروت صولت
2.	تاریخ تہذیب اسلامی (جلددوم)	:	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
3.	اردو دائرۃ المعارف	:	دانش گاہ پنجاب، لاہور
4.	تاریخ اسلام (جلددوم)	:	شاہ معین الدین احمد ندوی
5.	تاریخ ملت (جلداول)	:	مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی انتظام اللہ شہابی

-:oOo:-

اکائی 21 : اموی حکومت کی توسیع

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید
21.1 مقصد
21.2 تعارف
21.3 مشرق میں حکومت کی توسیع
21.3.1 ماوراء النہر کے ممالک کی فتح
21.3.2 سندھ کی فتح
21.4 بازنطینی محاذ
21.4.1 قسطنطنیہ پر حملے
21.4.2 قسطنطنیہ پر تیسرا حملہ
21.5 شمالی افریقہ میں توسیع حکومت
21.5.1 توسیع حکومت کے ابتدائی مراحل
21.5.2 تیسرا اور چوتھا مرحلہ
21.5.3 پانچواں اور چھٹا مرحلہ
21.5.4 ساتواں مرحلہ
21.5.5 اندلس کی فتح اور اس کے اسباب
21.5.6 اندلس کی فتح کے اثرات
21.6 اکتسابی نتائج
21.7 کلیدی الفاظ
21.8 نمونہ امتحانی سوالات
21.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
21.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
21.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
21.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

21.0 تمہید

اموی دور کو اسلامی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے، کیوں کہ تاریخ کے اس دور میں دنیا کا وسیع ترین علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ مسلمانوں نے تین براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں ایک ساتھ پیش قدمی کی، اور ساٹھ سال کے قلیل عرصہ میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ آئندہ صفحات میں ہم اموی دور میں ہونے والی توسیعی کاروائیوں کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

21.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اموی حکومت کی توسیع سے واقف کرایا جائے، آپ کو بتایا جائے گا کہ کس طرح ایک قلیل مدت میں دنیا کا وسیع رقبہ ان کے زیر حکومت آیا، اس اکائی کو پڑھ کر آپ اموی دور کے ان خلفاء کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے، جن کے زیر انتظام یہ توسیعی کاروائیاں انجام دی گئیں، نیز آپ کو ان سپہ سالاروں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوں گی، جن کی زیر قیادت یہ علاقے فتح ہوئے، طلبہ قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، مسلمہ بن عبدالملک، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔

21.2 تعارف

اموی حکومت کا زمانہ تقریباً 92 برس ہے، خارجی فتوحات اور توسیع حکومت ابتدائی ساٹھ سالوں میں انجام پائیں۔ اموی دور میں کل چودہ خلیفہ ہوئے، امیر معاویہؓ پہلے خلیفہ تھے، انہوں نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد مدینہ یا کوفہ کے بجائے دمشق کو مرکز خلافت بنایا۔ حضرت معاویہؓ کو حکومت کی توسیع سے زیادہ استحکام سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے حکومت کو مستحکم کرنے اور اندرونی سرکشی کو ختم کرنے کی طرف پہلے توجہ دی، انہوں نے فارس کی قوم میں اسلام کی نشر واشاعت کے لیے بیسیوں عرب خاندانوں کو ایران میں بسایا، تاکہ اسلام کی تعلیمات ان کے درمیان عام ہوں، نیز عربی زبان اور اسلامی تہذیب کو فروغ ملے۔ ساتھ ہی انہوں نے سرحدوں کی حفاظت کی طرف بھی توجہ دی۔ چنانچہ ملک سندھ سے ماوراء النہر کے علاقوں تک فوجی دستوں کی آمد ورفت مسلسل جاری رہتی تھی۔

اموی حکومت سے پہلے خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی سلطنت میں تین طرف توسیعی کاروائیاں جاری تھیں، جو مسلمانوں کے باہمی مسائل کی وجہ سے رکی ہوئی تھیں۔ اموی دور کے آغاز میں عالم اسلام کے تین محاذ تھے، ایک مشرقی محاذ، جو سندھ اور ماوراء النہر کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے بازنطینی محاذ، جو ملک شام سے شمال کی جانب تھا۔ تیسرے مغربی محاذ، جو شمالی افریقہ میں تھا۔ آئندہ سطروں میں ان تین سمتوں میں ہونے والی توسیعی کاروائیوں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

21.3 مشرق میں حکومت کی توسیع

اسلامی مملکت کے مشرق میں سندھ، خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ تھا۔ یہاں فتوحات کا آغاز خلافت راشدہ میں ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مسلمان 'کچھ' کے علاقے تک پہونچ چکے تھے، جو سندھ کے قریب ایک شہر ہے۔ جب زیاد بن ابی سفیان کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا تو اس نے مشرقی سمت حکومت کی توسیع کی، اور کابل فتح کرلیا۔ ان علاقوں میں توسیع کا اصل آغاز اس وقت ہوا، جب حجاج نے 86ھ/705ء میں قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔

21.3.1 ماوراء النہر کے ممالک کی فتح:

ماوراء النہر کا لفظ مؤرخین اور جغرافیہ دانوں نے اس علاقے کے لیے استعمال کیا ہے، جس کے جنوب میں نہر جیحون اور شمال میں نہر سیحون واقع ہیں۔ یہ علاقہ سلطنت فارس کے شمال مشرقی سمت واقع ہے، یہاں کے باشندے ترکی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں کئی اہم ممالک تھے، مثلاً:

1. مملکت طخارستان: جو جیحون کے دونوں کناروں پر آباد تھی، اس کی راج دھانی بلخ تھی۔
2. مملکت ختل: جس کا مرکز ہلیک نامی شہر تھا۔
3. مملکت صغانیان: جس کا مرکز صغانیان نامی شہر تھا۔
4. مملکت صغد: جس کا مرکز سمرقند تھا۔
5. مملکت خوارزم: جس کا مرکز جرجانیہ نامی شہر تھا۔

ان ممالک میں آپس میں مسلسل چپقلش چلتی رہتی تھی، یہ ممالک آپس میں تو لڑتے تھے، لیکن جب کوئی بیرونی خطرہ محسوس کرتے، تو ایک ہوجاتے، مسلمان ملکوں سے سرحد متصل ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومت کو بھی ان سے خطرہ رہتا تھا۔ عبدالملک کے آخری دور میں جب اموی حکومت کو داخلی انتشار سے نجات ملی، تو بیرونی مہمات بھی شروع ہوئیں۔ حجاج بن یوسف نے قتیبہ بن مسلم باہلی کو خراسان کا امیر مقرر کیا۔

قتیبہ نے 86ھ/705ء میں 'مرو' کو اپنا فوجی مرکز بنا کر جنگی کاروائیاں شروع کیں، اور کئی کامیاب فوجی مہمات کے بعد ان تمام لوگوں کو سزا دی، جنہوں نے مسلمانوں کے داخلی انتشار کا فائدہ اٹھا کر اسلامی مملکت سے بغاوت کی تھی، اور معاہدے توڑے تھے۔ طخارستان، جو اسلامی مملکت میں شامل تھا، اس کو دوبارہ فتح کیا۔ پھر مرو کی جانب واپس ہوئے۔ اس علاقے کے امراء نے جب دیکھا کہ مسلمان فوج واپس جا چکی ہے، تو دوبارہ صلح کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی، اور اسلامی حکومت کے خلاف ایک محاذ تشکیل دیا۔ یہ دیکھ کر قتیبہ کو لوٹنا پڑا، اس نے واپس آ کر ان سب کو سزا دی، نیزک نامی سپہ سالار اس فتنہ کا سرغنہ تھا، اس کو گرفتار کیا، اور اس طرح یہ فتنہ ختم ہوا۔

اس کے بعد قتیبہ بخارا کے علاقے کی طرف بڑھے، 87ھ/706ء میں 'بیکند' شہر کا محاصرہ کیا، اہل شہر نے صلح کی پیش کش کی، اور شہر حوالہ کر دیا۔ لیکن جیسے ہی قتیبہ واپس ہوا، بغاوت کر دی، اور قتیبہ کے مقرر کردہ مسلمان والی کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر قتیبہ کو واپس آنا پڑا، انہوں نے تلوار کے زور پر دوبارہ شہر فتح کیا، پھر مرو واپس لوٹے۔ تین سال تک بخارا اور اس کے اطراف کے علاقوں پر حملے جاری رہے، قتیبہ گرمی کے موسم میں حملہ کرتے، اور سردی کے موسم میں مرو چلے آتے۔ تین سال میں پورا بخارا فتح ہوا۔

اس کے بعد سنہ 90ھ/709ء میں سمرقند فتح کیا، سمرقند کے باشندوں نے مسلمانوں سے صلح کر کے شہر حوالہ کر دیا۔ سمرقند بلاد صغد کا سب سے بڑا شہر تھا۔ سمرقند کے بعد مملکت خوارزم کے کئی شہر 93ھ/712ء میں فتح ہوئے، یہ شہر بھی مصالحت کے نتیجہ میں ہاتھ آئے۔ کچھ دنوں بعد اہل سمرقند نے بغاوت کی، اور معاہدہ توڑ دیا تو قتیبہ کو دوبارہ فوج کشی کرنی پڑی، اور اس مرتبہ انہوں نے مسلمانوں کے قدم یہاں مضبوط کر دیئے۔ سمرقند کی فتح کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہاں کاغذ سازی کا کارخانہ تھا۔ کاغذ سازی ملک چین سے چند چینی کاریگروں نے یہاں منتقل کی تھی، سمرقند مسلمانوں کے ہاتھ میں آنے کے بعد مسلم ممالک میں کاغذ کی فراہمی آسان ہوگئی، آگے چل کر یہ صنعت دمشق اور بغداد منتقل ہوئی، اور مسلمانوں کی علمی ترقی میں اس شہر نے اہم کردار ادا کیا۔

94ھ/713ء میں قتیبہ بن مسلم نے چچ، فرغانہ اور کاشغر کا رخ کیا، جو ترکوں کے قبضہ میں تھے، یہاں ان کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا،

کئی مقابلوں کے بعد 95ھ/714ء میں یہ علاقہ فتح ہوا۔اس کے بعد قتیبہ نے مرو کو چھوڑ کر کاشغر کو اپنا مرکز بنایا۔جو چین کی سرحد کے قریب واقع تھا، ان کے اس اقدام سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ چین کی سرحدوں تک اسلامی مملکت کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔کاشغر منتقل ہونے کے بعد چینی شہنشاہ نے ایک قاصد بھیج کر قتیبہ کو چین میں مدعو کیا، تاکہ معلوم کرے کہ مسلمانوں کے یہاں منتقل ہونے کا کیا مقصد ہے۔قتیبہ نے اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے ایک وفد ہبیرہ بن مشمرج کی سربراہی میں چین کے شہنشاہ کے پاس روانہ کیا۔اس سفارتی وفد نے سیاسی اور تجارتی تعلقات کو مضبوط کرنے پر گفتگو کی، اور چین کی جانب مزید فتوحات رک گئیں۔اس پیش قدمی کو روکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چین جیسی مضبوط مملکت سے مقابلے کے لیے جس قدر تیاری ہونی چاہئے، قتیبہ کے پاس نہیں تھی، دارالخلافہ بہت دور تھا، فوجی امداد کے لیے کافی وقت مطلوب تھا۔اس لیے قتیبہ نے اس جانب مزید پیش قدمی روک دی۔لیکن مسلمانوں نے دین اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں، جس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا۔

21.3.2 سندھ کی فتح:

ولید بن عبدالملک کے دور کا اہم واقعہ سندھ کی فتح ہے۔ماوراءالنہر کی فتوحات کے ساتھ ہی مسلمانوں نے سندھ کے علاقے میں پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ یہ دونوں علاقے ایک ہی خلیفہ یعنی ولید بن عبدالملک اور ایک ہی گورنر یعنی حجاج بن یوسف کے زمانہ اور نگرانی میں فتح ہوئے۔ سندھ کے علاقے کے لیے حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو امیر اور سپہ سالار بنا کر روانہ کیا، جس کی عمر بیس سال کی تھی۔محمد بن قاسم نے مکران منتقل ہو کر اس علاقے کو اپنا مرکز بنایا، اور دیبل کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے راستہ کے کئی قلعوں کو فتح کر لیا۔دیبل پہنچ کر اس شہر کا محاصرہ کیا، اور تین دن میں شہر فتح کر لیا، شہر پر سندھ کے راجہ داہر کی جانب سے جو عامل مقرر تھا، اس نے راہ فرار اختیار کی۔

دیبل کے بعد محمد بن قاسم مہران کی طرف روانہ ہوا، جس کا دوسرا نام بیرون تھا۔ یہاں کے باشندوں نے بھی صلح کر لی۔اسی طرح سر بیدوس، سہبان اور سدوسان کے باشندوں نے بھی صلح کا پرچم لہرایا۔

مہران کے علاقے میں راجہ داہر سے مقابلہ ہوا، جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور راجہ داہر جنگ میں مارا گیا۔راجہ داہر کی موت سے سندھ کا بڑا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر شمال مشرق کا رخ کیا، جہاں برہمن آباد شہر میں راجہ داہر کا بیٹا جئے سنگ بقیہ فوج کو لے کر قلعہ بند ہو گیا تھا۔محمد بن قاسم نے یہ شہر بزور شمشیر فتح کیا۔ جئے سنگ یہاں سے بھاگ کر سندھ کی راج دھانی روڑ میں قلعہ بند ہو گیا۔ مسلمانوں نے چار ماہ تک اس شہر کا محاصرہ کیا، اور بالآخر اس کو فتح کر لیا۔

اس کے بعد مسلمان فوج آگے بڑھی، بہر بیاس عبور کر کے ملتان پہنچی، اور شہر کا محاصرہ کر لیا، کچھ مدت ہی میں یہ شہر فتح ہو گیا۔اس کے بعد ایک لشکر کو بیلمان کی جانب روانہ کیا، جس نے بیلمان فتح کیا۔سرست نامی شہر کے باشندوں نے صلح کی پیش کش کی، جو قبول ہوئی۔

ان فتوحات کے نتیجہ میں پورا سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔محمد بن قاسم نے پیش قدمی روک کر ملک کی تنظیم واصلاح کی طرف توجہ دی۔آگے ان کا ارادہ قنوج کی جانب پیش قدمی کرنے کا تھا، اسی دوران حجاج کی وفات کی خبر آئی، پھر خبر آئی کہ خلیفہ ولید کا بھی انتقال ہو گیا ہے، اور ولید کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بن چکا ہے، اس لیے 96ھ/715ء میں اس جانب فتوحات کا سلسلہ تھم گیا۔

21.4 بازنطینی محاذ

پہلی صدی ہجری کے درمیان میں مسلم-بازنطینی تعلقات میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، فوجی میدانوں میں کبھی ایک فریق کو فتح ہوئی تو کبھی

دوسرے فریق کو۔ حضرت معاویہؓ کو اس ضمن میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے بازنطینی سلطنت کے خلاف واضح سیاسی اور فوجی اہداف مقرر کئے۔ اور اسلامی مملکت پر حملہ سے باز رکھنے کے لیے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ حضرت معاویہ نے سرحدی اور ساحلی علاقوں کی حفاظت کا بندوبست کیا، رومی سلطنت کی سرحدوں اور پہاڑی دروں پر پہرے بٹھائے۔ انطاکیہ شہر پر بازنطینی فوج کے وقت بے وقت حملے ہوتے رہتے تھے، اس لیے اس شہر پر خصوصی توجہ دی، سنہ 42ھ/662ء میں ایران، بعلبک، حمص، بصرہ، کوفہ اور عراق سے لوگوں کو لے جا کر وہاں آباد کیا۔ سمیساط اور ملطیہ کے شہروں کو فتح کیا، اور کئی نئے قلعے بنائے، ساحلی شہروں کی نئے سرے سے مرمت کرائی، اور ان کے حفاظتی انتظامات بڑھا دیئے، تاکہ سمندر کی جانب سے ہونے والے بازنطینی حملوں کا مقابلہ وہیں کر سکیں۔

ان انتظامات کے ساتھ فوج میں ایک نئی قسم کا اضافہ کیا، جس کو 'شواتی' اور 'صوافی' کہا جاتا تھا، یہ سرمائی اور گرمائی فوج تھی، جس کو موسم کے لحاظ سے لڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ سرمائی اور گرمائی فوج کے یہ منظّم دستے ماہر سالاروں کی سرکردگی میں ایشائے کوچک کے بازنطینی علاقوں کو اپنی آماج گاہ بناتے رہتے تھے، ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اندر گھس کر قلعوں اور پہاڑی علاقوں میں فوجی اہمیت کے مقامات پر قبضہ کریں، اور اگر بازنطینی فوج مسلم ممالک پر قبضہ کرنے آگے بڑھے تو اس کو روکیں۔

حضرت معاویہ نے اسلامی بحری بیڑا تیار کیا، ان میں 'بنواز د' کے قبیلہ سے تعلق رکھنے والے عرب ملاحوں کو مقرر کیا۔ اس بیڑے کی وجہ سے مسلمان فوج کے لیے بلاد شام کے ساحلوں پر اپنا قبضہ جمائے رکھنا آسان ہو سکا، نیز اسی کی مدد سے مسلمانوں نے بحر متوسط کے جزیروں پر بھی قبضہ بنائے رکھا۔ اس طرح حضرت معاویہؓ پہلے شخص تھے، جنہوں نے بحری بیڑا تیار کیا، انہوں نے ہی بحر متوسط میں سب سے پہلے اسلامی فوج کو حملہ کے لیے روانہ کیا تھا۔

21.4.1 قسطنطنیہ پر حملے:

بازنطینی محاذ پر امیر معاویہؓ کے دور میں ہونے والی اہم کاروائی قسطنطنیہ پر حملہ تھا، انہوں نے بازنطینی مملکت پر دھاک بٹھانے اور مصر وشام میں اس کی امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے آگے بڑھ کر دار السلطنت پر کئی حملے کئے۔

پہلا حملہ سنہ 49ھ/669ء میں ہوا، جس میں حضرت معاویہ نے ایک زبردست زمینی فوج کو قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لیے بھیجا، اس لشکر کے امیر فضالہ بن عبید انصاری تھے۔ یہ لشکر بازنطینی سلطنت کے اندر گھستا چلا گیا، یہاں تک کہ دار السلطنت کے قریب خلقدونیہ تک پہنچ گیا۔ فضالہ نے سردی کا موسم یہیں گذارا، حضرت معاویہؓ اس کو برابر کمک پہنچاتے رہے۔ اس حملہ کی اہمیت کی وجہ سے حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں ایک اور فوج بھیجا، جس کی وجہ سے محاصرہ جاری رکھنے میں مدد ملی۔ قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے مسلمانوں اور عیسائیوں میں گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن مسلمانوں کو قابل ذکر فتوحات حاصل نہیں ہوئیں۔ اور مسلمانوں کو محاصرہ ختم کر کے واپس ہونا پڑا۔ اس غزوہ میں صحابی جلیل حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی وفات ہوئی، اور ان کو قسطنطنیہ کی فصیلوں کے نیچے دفن کیا گیا۔ اس حملہ کے کامیاب نہ ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ نے قریبی جزیروں کو فتح کرنے کی طرف توجہ کی، چنانچہ 52ھ/672ء کو مسلمانوں نے روڈوس کا جزیرہ فتح کیا۔ اسلامی بحری بیڑے نے جزیرہ خیوس پر قبضہ کیا، اور ازمیر ولیکا اور قیلیقیا کو بھی زیر کیا۔

قسطنطنیہ پر دوسرا حملہ سنہ 54ھ/674ء میں ہوا۔ اس مرتبہ خشکی اور سمندر دونوں طرف سے شہر کا محاصرہ کیا گیا، ایک طرف سمندر میں جنگ جاری تھی، دوسری طرف خشکی میں قسطنطنیہ کے قریب زمینی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہ محاصرہ سات سال تک جاری رہا، جاڑے میں محاصرہ مشکل ہونے

کی وجہ سے جنگی کاروائیاں صرف گرمی اور بہار کے موسم میں جاری رکھی گئیں، سات سال تک اسلامی فوج کوشش کرتی رہی، لیکن شہر فتح نہیں ہوسکا۔

سنہ 60ھ/680ء میں حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی۔ان کی وفات کے بعد سے عبدالملک کے دور تک مسلمان اندرونی اختلافات میں الجھے رہے۔عبدالملک کے بعد اس کا لڑکا ولید تخت نشین ہوا، اس کے دور میں اس محاذ پر اموی شہزادہ اور سپہ سالار مسلمہ بن عبدالملک نے فوجی کاروائیوں کی قیادت کی۔قسطنطنیہ کے راستہ میں پڑنے والے کئی اہم قلعے مثلاطوانہ، ہرثومہ اور ہرقلہ فتح کر لئے، یہ قلعے فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے تھے،اور قسطنطنیہ کے راستہ میں واقع تھے۔یہ دیکھ کر بازنطینی حکومت نے ایشائے کوچک میں اپنے مورچوں کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ یہاں کے شہروں کی باز آبادکاری کرائی، 'ارمن' قوم کولاکر ان میں بسایا، سرحدی علاقوں میں نئے قائدین مقرر کئے، بحری فوج پر خصوصی توجہ دی۔ان ساری تیاریوں کا مقصد یہ تھا کہ دارالسلطنت قسطنطنیہ کا دفاع کیا جائے۔اسی درمیان ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا۔

21.4.2 قسطنطنیہ پر تیسرا حملہ:

سلیمان کے دور میں اس محاذ پر قابل ذکر کام یہ ہوا کہ اس نے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے پھر سے کوشش کی، سب سے پہلے ایشائے کوچک میں بازنطینی مقبوضات پر حملے شروع کئے، 96ھ/715ء میں مسلمانوں نے حصن الحدود نامی قلعہ فتح کیا۔اگلے سال حصن المرنامی قلعہ فتح کیا۔ خلیفہ نے قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے ایک بڑا بحری بیڑا تیار کیا۔اس کی قیادت عمر بن ہبیرہ فزاری کے سپرد کی، خلیفہ نے ذاتی نگرانی میں مہم کی تیاریوں میں حصہ لیا۔ زمینی فوج کی قیادت اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کے سپرد کی، جو بجائے خود ایک زبردست سپہ سالار تھا،اور بازنطینی فوج سے کئی بار ٹکر لے چکا تھا۔

مسلمہ نے مہم کی کامیابی کے لیے تمام تر احتیاطی تدبیریں اختیار کیں، سامان رسد ساتھ لیا۔سردی سے بچاؤ کے لیے گھر بنانے کے لیے لکڑیاں تک ساتھ لے لیں۔خلیفہ نے اس کی ماتحتی میں ایک لاکھ اسی ہزار سپاہیوں کو جمع کردیا۔اٹھارہ سو بحری ٹکڑیاں اس کے علاوہ تھیں۔ یہ زبردست لشکر 98ھ/717ء میں بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت کی طرف روانہ ہوا۔

بازنطینی شہنشاہ تھیوڈوسیوس سوم نے اس حملہ سے نمٹنے کے لیے فصیل کی مرمت کرائی، غلہ کے ذخیرے جمع کرائے۔راستہ میں اسلامی فوج کو روکنے کے لیے دستے روانہ کئے۔لیکن اسلامی فوج رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی، راستہ میں عموریہ کا محاصرہ کرلیا۔اس علاقے کا والی لیو تھا، جس نے آگے بڑھ کر پیش کش کی کہ وہ قسطنطنیہ فتح کرنے میں مسلمانوں کی مدد کرے گا، دراصل وہ خود چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی مدد سے بازنطینی سلطنت کے تخت حکومت پر قابض ہوجائے۔اس نے مسلمہ سے مل کر قسطنطنیہ فتح کرنے کا منصوبہ پیش کیا،اور مسلمہ نے بھی اتفاق کیا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کے بعد اس کو حاکم بنایا جائے گا۔اس کے بعد مسلمان بلاکسی رکاوٹ کے آگے بڑھتے ہوئے باسفورس کے کنارے پہنچ گئے۔اسی دوران قسطنطنیہ کے اندر بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں، لیو کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ وہی قسطنطنیہ کو بچاسکتا ہے، تھیوڈور سوم کو تخت سے اتار دیا گیا، لیو نے مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو بھلا دیا،اور آسانی سے تخت پر براجمان ہوگیا۔اب اس نے کوششیں شروع کردیں کہ مسلمانوں کی رسد بند کردی جائے۔

مسلمانوں نے سمندر عبور کرکے شہر پناہ کے پاس پہنچ کر خشکی کی جانب سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا۔دوسری جانب مسلمانوں کا بحری بیڑا 'بحیرہ مرمرہ' کی طرف بڑھا،اور بحر اسود کے تمام راستوں کو بند کرکے سمندر کی جانب سے شہر کا محاصرہ کرلیا۔قسطنطنیہ بری اور بحری دونوں طرف سے بہت سخت حصار میں آگیا۔

قتیبہ نے بھاری بھر کم منجنیقیں لگاکر فصیل پر حملے شروع کئے، لیکن شہر کی سخت جان فصیل کا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔لیو نے باسفورس سے نکلنے

والی سمندری شاخ پر لوہے کی ایک زبردست زنجیر باندھ دی، فصیل پر فوج تعینات کر دی، اور مسلمانوں تک پہنچنے والی رسد اور کمک روکنے کے لیے الگ سے فوج روانہ کی۔ لیو کے ان سب اقدامات کے باوجود مسلمانوں کی ہمت میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ مسلمہ نے سردی سے بچنے کے لیے لکڑی کے گھر بنا لئے، جس میں موسم سرما گذارا۔ افریقہ سے اس کو خشکی کے راستہ کمک اور رسد بھی پہنچی، ان میں کئی مسیحی جہاز راں بھی تھے۔ اس کمک کے ذریعہ مسلمہ نے حصار سخت کر دیا۔

اسی دوران شمالی سمت سے شہر کا گھیرا کمزور ہو گیا۔ اور بازنطینی فوج بحر اسود تک رسائی حاصل کر لی، اس کو تازہ کمک اور رسد پہنچنے لگی۔ مسلمانوں تک پہنچنے والی رسد میں کمی ہونے لگی۔ اس برس نہایت سخت سردی پڑنے لگی۔ بلغاریوں نے لیو سے معاہدہ کرتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، مسلمان بحری بیڑے کو قسطنطنیہ سے دور دھکیل دیا۔ فصیل کے اوپر سے آگ کے گولوں نے جہازوں کو سخت نقصان پہونچایا۔ مسلمان کی مدد کے لیے افریقہ سے آنے والے مسیحی جہاز راں بھی لیو سے مل گئے، اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ محاصرہ کرتے کرتے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا، ادھر سلیمان کا انتقال ہو گیا، اور عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے پیش نظر مسلمہ کو حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا دیں، اور ملک شام واپس آ جائیں۔ اس طرح قسطنطنیہ کی یہ مہم بھی ناکام ہو گئی۔

قسطنطنیہ پر کیے جانے والے ان تمام حملوں کی ناکامی کے درج ذیل اسباب تھے۔

1. شہر کی فصیل بہت مضبوط تھی، رومی انجینئر بہت تیزی اور مہارت سے مرمت کا کام کر رہے تھے۔
2. اہل شہر کے پاس دفاعی آلات بھی فراوانی سے تھے۔
3. موسمی حالات مسلمانوں کے موافق نہ تھے۔ تیز آندھی سمندر میں کشتیوں کو دور تک ڈھکیل رہی تھی۔
4. بازنطینی فوج نے آگ کے گولے استعمال کر کے بہت سی کشتیوں کو سخت نقصان پہونچایا تھا۔ اس آگ کو وہ یونانی آگ کہتے تھے۔
5. تیسرے حملہ میں مسلمان فوج میں شامل ہونے والے مسیحی جہاز رانوں نے غداری کی تھی۔
6. تیسرے حملہ جنگ میں بازنطینی حکومت کی جانب سے بلغاری بھی شامل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کرنے لگے تھے۔

یہ اموی دور میں مسلمانوں کا قسطنطنیہ پر آخری حملہ تھا۔ مسلمہ بن عبد الملک نے 99ھ/718ء میں محاصرہ کو ختم کر دیا تھا۔

21.5 شمالی افریقہ میں توسیع حکومت

شمالی افریقہ میں توسیعی کارروائیاں خلافت راشدہ کے عہد میں شروع ہو گئیں تھیں، اموی دور میں پورا شمال مغربی افریقہ اسلامی قلمرو میں داخل ہو گیا، اور مسلمان آگے بڑھ کر اندلس میں بھی داخل ہو گئے۔ عرب مورخین نے مصر کے آگے شمال مغربی افریقہ کے لیے 'مغرب' کا لفظ استعمال کیا ہے، کیوں کہ یہ علاقہ مسلمانوں کے مرکزی علاقے سے مغربی سمت میں واقع تھا۔ اس علاقے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

1. برقہ اور طرابلس . 2 مغرب ادنی یعنی موجودہ تونس
3. مغرب اوسط یعنی موجودہ جزائر 4. مغرب اقصی یعنی مراکش

21.5.1 توسیع حکومت کے ابتدائی مراحل:

اس وقت اس علاقے میں دو سیاسی قوتیں موجود تھیں، پہلی قوت بربری قبائل کی تھی، جو یہاں کے مقامی باشندے تھے۔ دوسری قوت بازنطینی حکومت کی تھی، جو اس علاقے کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتے تھے۔ شمالی افریقہ میں توسیع حکومت کے سات مراحل تھے، ان مراحل سے گذر کر

شمالی افریقہ کی فتح کی کاروائیاں مکمل ہوئیں، اور ولید بن عبدالملک کے دور میں پورا علاقہ زیرنگیں ہوا۔ پہلا مرحلہ 'برقہ' کی فتح کا تھا۔ جوملک مصر کی فتح کی تکمیل کے طور پر تھا۔ یہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں 22ھ/643ء میں مکمل ہوا۔ حضرت عمرو بن عاص نے اس کے بعد طرابلس، صبراتا اور فزان بھی فتح کرلیا تھا۔ دوسرا مرحلہ حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ کے ہاتھوں 27ھ/648ء میں مکمل ہوا، انہوں نے سبیطلہ فتح کیا، اور پورے علاقے میں اپنی فوجیں پھیلا دیں، قفصہ اور حصن الاجم کے علاقے فتح کیے، یہ علاقے قیروان کے جنوب میں واقع تھے۔

اس کے بعد اس شمالی افریقہ میں فتوحات رک گئی تھیں، اور مسلمان اپنے داخلی مسائل میں مشغول ہو گئے تھے۔ اگلے مراحل اموی دور حکومت میں انجام پائے۔ حضرت معاویہ نے 45ھ/665ء میں معاویہ بن حدیج سکونی کی قیادت میں ایک مہم بھیجی، ان کو حکم دیا کہ طرابلس کے مغرب میں واقع علاقوں پر جا کر حملہ کریں۔ معاویہ بن حدیج آگے بڑھتے ہوئے 'قمونیہ' تک پہنچ گئے، جو قرطاجنہ کے جنوب میں واقع تھا۔ اور سوسہ، جلولا اور بنزرت وغیرہ فتح کیے۔

49ھ/669ء میں حضرت معاویہؓ نے برقہ اور طرابلس کو مصر سے علاحدہ صوبہ بنا دیا، اور اس علاقے پر عقبہ بن نافع کو والی مقرر کیا۔ یہ حضرت معاویہ کا بہت اہم فیصلہ تھا، عقبہ کی تقرری سے شمالی افریقہ میں فتوحات اور توسیع کا نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں عقبہ نے نئی حکمت عملی وضع کی، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اس علاقے میں استقرار نصیب ہوا، اور شمال مغربی افریقہ عالم اسلامی کا ناقابل تقسیم جز بن گیا۔

عقبہ بن نافع نے سب سے پہلے ان علاقوں کو فتح کیا، جو مغرب ادنی میں جغرافیائی لحاظ سے اہم تھے، شہروں اور دیہاتوں میں لشکر کی چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں بنائیں۔ انہوں نے سابقہ تجربات سے سمجھ لیا تھا کہ یہاں کے باشندے اس وقت تک مسلمانوں کی اطاعت کرتے ہیں جب تک کہ مسلمان یہاں قیام کرتے ہیں، اور جیسے ہی وہ اس علاقے کو چھوڑ کر جاتے ہیں، وہ اسلام سے پھر کر بغاوت کر دیتے ہیں۔ برقہ اور زویلہ دو اہم مراکز تھے، جہاں سے فتوحات کے لیے اسلامی لشکر روانہ ہوتے تھے، لیکن انہی دونوں شہروں کے باشندے اہل افریقہ کو بغاوت کے وقت مدد فراہم کرتے تھے، اس لیے انہوں نے محسوس کیا کہ شمالی افریقہ میں مسلمانوں کا ایک ایسا مرکز ہونا چاہئے، جو اس پورے منطقہ پر حکومت کرنے کا مضبوط مرکز ہو، جہاں سے مسلمان افواج حملہ کے وقت کوچ کریں، اور واپس آکر باطمینان رہ سکیں۔ یہیں سے علاقے کا حفاظتی بندوبست کیا جائے۔ نیز اس مرکز کو بربری قبائل میں دعوت اسلامی کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انہوں نے 50ھ/670ء میں ایک صحرائی علاقے میں 'قیروان' شہر کی بنیاد ڈالی، یہ علاقہ قرطاجنہ کے جنوب میں واقع تھا، یہاں چراہ گاہیں بھی موجود تھیں، اور جغرافیائی لحاظ سے اہم مقام پر واقع تھا، بازنطینی حکومت کے بحری حملوں سے بھی محفوظ تھا۔ قیروان کی بنیاد ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی فوج کا اس علاقے سے واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس شہر نے پورے شمالی افریقہ کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ بلکہ آگے بڑھ کر اندلس کی فتح میں بھی اس کا اہم کردار تھا۔ یہیں سے شمال مغربی افریقہ میں اسلام کی نشرو اشاعت ہوئی۔ اور یہ شہر اسلامی تہذیب کا اہم مرکز بن گیا۔

شمالی افریقہ میں حضرت عقبہ بن عامر کی پالیسی کسی قدر سختی پر مبنی تھی، جس کی وجہ سے بربری قبائل بازنطینی حکومت سے اتحاد کر لیتے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے 55ھ/675ء میں ان کو معزول کر دیا، اور ابوالمہاجر دینار انصاری کو ان کی جگہ اس علاقے کا والی بنایا۔

21.5.2 تیسرا اور چوتھا مرحلہ:

ابوالمہاجر کی ولایت کے ساتھ اس علاقے میں فتوحات کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے بربری قبائل کے ساتھ اعتدال کا رویہ

اختیار کیا، جس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں اسلام تیزی سے پھیلا۔ انہوں نے اپنی پوری توجہ اس علاقے سے بازنطینی اثر ونفوذ ختم کرنے پر مرکوز کی۔ قرطاجنہ اور ساحلی علاقوں کو بازنطینی افواج سے واپس لیا، اور جزیرہ شریک فتح کیا، جو ایک اہم فوجی مقام تھا۔ اور اس کو فوجی اڈہ بنا کر بازنطینی فوج کی تمام نقل وحرکت کی نگرانی شروع کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے 'میلہ' نامی شہر فتح کیا، جو مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط کے درمیان تھا، اس شہر میں قیام کیا، اور مغرب ادنیٰ میں جن بربری قبائل نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی تربیت کی فکر کی۔ جب اس پورے علاقے سے مطمئن ہو گئے تو ابوالمہاجر نے مغرب اوسط کا رخ کیا۔

مغرب اوسط کے بربر قبائل نے بازنطینی حکومت کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا، اور دونوں مل کر اسلامی فتوحات پر روک لگانا چاہ رہے تھے۔ بربری قبائل میں سب سے اہم 'اوربا' نامی قبیلہ تھا، جس کے قائد کا نام کسیلہ بن لمزم تھا، اس نے مقابلے کے لیے ایک بڑا لشکر جمع کیا، اور تلمسان میں ٹھہر کر مسلمان افواج کی راہ دیکھنے لگا۔ جب مسلمان لشکر تلمسان پہنچا، تو دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا، جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور کسیلہ کا لشکر پیٹھ پھیر کر بھاگا، خود کسیلہ گرفتار ہو کر ابوالمہاجر کے سامنے پیش ہوا۔ ابوالمہاجر انصاری نے اس کے ساتھ نرمی برتی، اور اچھا سلوک کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسیلہ اسلام قبول کر لے، کیونکہ اس کو اپنی قوم میں بلند مقام ومرتبہ حاصل تھا۔ ان کی کوشش سے کسیلہ نے اور اس کو دیکھ کر اس کی قوم نے اسلام قبول کیا، اور انہی کی مدد سے ابوالمہاجر نے تلمسان فتح کیا۔ اور پھر قیروان واپس آ گئے۔

اسی دوران حضرت معاویہؓ کا انتقال ہو گیا، اور یزید بن معاویہ خلیفہ بنے، اس نے ابوالمہاجر کو معزول کر کے عقبہ بن نافع کو دوبارہ اس علاقے کا والی مقرر کر دیا۔ سنہ 62ھ/682ء میں عقبہ بن نافع دوبارہ والی بن کر قیروان آئے، اور ان کی دوبارہ ولایت سے شمالی افریقہ کی فتوحات کا چوتھا مرحلہ شروع ہوا۔

عقبہ بن نافع کے آنے سے بربری قبائل اور بازنطینی فوج میں دوبارہ اتحاد ہو گیا، دونوں کو عقبہ سے خطرہ تھا۔ عقبہ بن نافع نے دوبارہ مہم شروع کی، ایک بڑے لشکر کو لے کر مغربی سمت روانہ ہوئے، ان کے ساتھ کسیلہ کی سربراہی میں قبیلہ 'اوربا' کی بربری فوج تھی۔ سب سے پہلے وہ شہر 'بجایہ' پہنچے، جہاں بازنطینی فوج سے چھڑپیں ہوئیں، بازنطینی فوج شہر میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو گئی۔ عقبہ نے مناسب سمجھا کہ محاصرہ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آگے بڑھیں، اور اندرونی علاقوں پر اپنا تسلط قائم کریں، تاکہ بازنطینیوں کو شمالی افریقہ سے نکالنا ممکن ہو۔ چنانچہ محاصرہ ترک کر کے مغرب اوسط میں زاب کے زرخیز علاقے کا رخ کیا، اور یہاں کے مرکزی شہر مسیلہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس توسیع کی وجہ سے یہ علاقہ مکمل مسلمانوں کے کنٹرول میں آ گیا، کیوں کہ مسلمان بربری قبائل کے بالکل اندرونی علاقے پر قابض ہو گئے تھے، 'لواتہ' اور 'ہوارہ' وغیرہ اہم بربری قبائل کی آبادیاں ان کے قبضہ میں آ گئی تھیں۔ عقبہ بن نافع نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی، اور تاہرت پہنچے، جو اس علاقے کا اہم شہر تھا۔ یہاں بربری - بازنطینی اتحادی فوجوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوا، جس میں عقبہ کو فتح ہوئی، اور شہر پر مسلمان فوج کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انہوں نے مغرب اقصیٰ کا رخ کیا، یہاں کے قبائل کو زیر کر کے طنجہ شہر پر قبضہ کر لیا۔

یہاں تک پہنچ کر عقبہ بن نافع نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کیا، اور قیروان واپس ہوئے۔ ان کا یہ فیصلہ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے مناسب نہ تھا، کیونکہ ابھی تک اس علاقے سے بازنطینی اقتدار کا خاتمہ نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ جن قبائل نے ان سے اتحاد کیا تھا، وہ بھی کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ بالآخر جو اندیشہ تھا، پیش آیا۔ جس کی ظاہری وجوہات یہ تھیں کہ عقبہ نے بربری قبائل کے ساتھ مناسب معاملہ نہیں رکھا تھا، جس کی وجہ سے کسیلہ اور اس کی جماعت ان سے الگ ہو کر دشمن سے جا ملی۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جلد از جلد قیروان پہنچنے کے لیے فوج کی مختلف ٹکڑیوں

کو اجازت دے دی کہ وہ ان سے الگ ہو کر روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ صرف پانچ ہزار سپاہی رکھے، ان کو لے کر وہ 'تہودہ' نامی شہر فتح کرنے کے لیے پہنچے، یہاں پہنچ کر انہیں محسوس ہوا کہ وہ دشمن کے نرغہ میں آچکے ہیں، کسیلہ بربری اور بازنطینی فوجوں پر مشتمل ایک بڑے لشکر کے ساتھ گھیرا ڈال چکا تھا۔ عقبہ نے مقابلہ کیا، لیکن یہ برابری کا مقابلہ نہیں تھا، اسی معرکہ میں عقبہ بن نافع کی شہادت ہوئی، ان کی فوج کا بڑا حصہ شہید ہوا۔ یہ معرکہ 65ھ/684ء کے قریب پیش آیا۔ جس نے مسلمانوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر ڈالا۔ چنانچہ وہ قیروان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے، اور کسیلہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عقبہ کی شہادت پر شمالی افریقہ میں توسیع کا چوتھا مرحلہ اختتام کو پہنچتا ہے۔ اسی دوران دمشق میں یزید بن معاویہ کا 64ھ/683ء میں انتقال ہو گیا۔

21.5.3 پانچواں اور چھٹا مرحلہ:

عبدالملک کو ابتدا میں داخلی انتشار اور خلفشار کو روکنے میں کافی محنت صرف کرنی پڑی۔ داخلی امور سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شمالی افریقہ کے محاذ کی جانب توجہ کی، اور زہیر بن قیس بلوی کو عقبہ کی شہادت کے بعد یہاں کا امیر مقرر کیا۔ تاکہ وہ کسیلہ سے انتقام لے، اور چھینے گئے علاقوں کو واپس لے۔ شمالی افریقہ میں زہیر کی امارت سے یہاں کی فتوحات کا پانچواں مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

زہیر نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے کسیلہ سے مقابلہ کیا، اور اس کو عبرت ناک شکست دے کر قیروان پر قبضہ کر لیا۔ سنہ 74ھ/693ء میں اس نے حسان بن نعمان غسانی کو شمالی افریقہ کے محاذ کا نیا قائد مقرر کیا۔ حسان کی قیادت سے شمالی افریقہ میں فتوحات کا چھٹا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ حسان نے سب سے پہلے بازنطینی طاقت کے گڑھ قرطاجنہ پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا، یہاں پر موجود بندرگاہ کو ناکارہ بنا دیا، تاکہ دوبارہ بازنطینی فوج سمندری راستہ سے داخل نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تیزی سے ساحلی شہروں کو فتح کرتا گیا۔ 'سبتہ' اور 'جیوب' کے علاوہ سبھی اہم مقامات اس کے قبضہ میں آ گئے۔

اسی دوران بربری قبائل میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ 'اوراس' کے پہاڑی علاقے میں ایک عورت نے بربری قبائل کو بغاوت پر آمادہ کیا، اس عورت کا تعلق قبیلہ 'زناتیہ' سے تھا، اس کو کاہنہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے گرد عقیدت مندوں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی، جن کے ساتھ مل کر اس نے ساحلی شہر 'باغایہ' پر قبضہ کر لیا۔ پھر مسلمانوں پر حملہ کے لیے آگے بڑھی۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ حسان کو مجبوراً پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ وہ پسپا ہو کر برقہ واپس آ گئے۔ اس دوران کاہنہ نے مسلمانوں کو مشکلات میں ڈالنے کے لیے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ کھیتوں میں آگ لگا دیں، درختوں کو کاٹ ڈالیں، اور زرخیز زمینوں کو برباد کر دیں۔ پانچ سال تک یہ تخریبی کاروائی جاری رہی۔ لیکن اس کے نتیجہ میں مقامی عوام اور بہت سے بربری قبائل اس سے بدظن ہو گئے۔ اس دوران حسان کے پاس دمشق سے کمک آ گئی، اس نے جب حالات سازگار دیکھے، تو کاہنہ سے مقابلے کے لیے فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ کسان، باغبان، بربر قبائل اور دوسرے مقامی لوگوں نے اس کا استقبال کیا، اس کی اطاعت قبول کر کے مقابلے کے لیے مال و زر فراہم کیا۔ کاہنہ نے جب دیکھا کہ اس میں مسلمانوں سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، تو پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا، اور 'اوراس' کے پہاڑوں میں پناہ لی، حسان دو سال تک اس کو کھدیڑتے رہے، اور دو سال بعد 'بئر کاہنہ' نامی مقام کے پاس ایک فیصلہ کن جنگ میں اس کی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی، خود کاہنہ بھی اس معرکہ میں ماری گئی، اور اس طرح یہ فتنہ ختم ہوا۔

کاہنہ کا فتنہ فرو ہونے اور دیگر مزاحمتوں کو ختم کرنے کے بعد مراکش میں اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی۔ بازنطینیوں نے سنہ 82ھ/701ء میں ایک بحری بیڑے کے ذریعہ قرطاجنہ پر قبضہ کی کوشش کی، اور شہر میں داخل بھی ہو گئے، لیکن حسان بن نعمان نے مقابلہ کر کے ان کو پسپا ہونے پر مجبور

کر دیا، اوران کے جانے کے بعد قرطاجنہ کو نیست ونابود کردیا، تاکہ وہ دوبارہ اس راستہ سے واپس نہ آسکیں، اوراس کی جگہ پر اس کے مشرقی جانب ایک شہر بسایا، جس کا نام تونس پڑا۔

سنہ 86ھ/705ء میں دمشق میں خلیفہ عبدالملک کی وفات ہوئی۔اس کے بعد ولید بن عبدالملک خلیفہ بنے۔

حسان بن نعمان بربری بغاوت کو ختم کرنے اور مسلمانوں کے قدم جمانے کے سلسلہ میں اپنی کاروائیوں میں مشغول ہی تھے کہ شمالی افریقہ کے محاذ پر ایک دوسرے قائد موسی بن نصیر کا تقرر ہوا۔ یہ سنہ 85ھ/704ء کا واقعہ ہے۔موسی بن نصیر کے تقرر سے شمالی افریقہ میں اسلامی توسیع کے ساتویں اور آخری مرحلہ کا آغاز ہوتا ہے۔

21.5.4 ساتواں مرحلہ:

موسیٰ بن نصیر نے سب سے پہلے قیروان کے عسکری محاذ کو مضبوط کیا، پھر 'مغرب اوسط' اور 'مغرب ادنی' میں فتوحات حاصل کرنی شروع کیں۔سنہ 85 کے اواخر/ 86ھ کے اوائل میں 'زاغون' کا قلعہ فتح کیا، جو قیروان اور تونس کے درمیان پہاڑی علاقے میں واقع تھا۔اس کے بعد 'صنہاجہ' اور 'سجومۃ' شہر فتح کئے، جو افریقہ کے شمالی مغربی کنارے پر واقع ہیں۔'سجومۃ' کی فتح بہت اہم تھی، کیونکہ یہ علاقہ بربری سردار کسیلہ کے قبیلہ کا مرکزی مقام تھا، ساتھ ہی یہ 'سبتہ' اور 'طنجہ' کے شہروں کا راستہ تھا۔'سجومۃ' کے بعد مسلمانوں کے جلد ہی طنجہ اور سبتہ کو فتح کرلیا، اس علاقے کو ایک الگ صوبہ بنادیا۔

موسی بن نصیر نے ان فتوحات کے بعد پورے مغرب اوسط پر تسلط حاصل کرلیا، سرکش قبائل کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ جو بربری باشندے اسلام میں داخل ہوئے، ان کو اپنی فوج میں داخل کیا۔ یہ بربری قبائل آئندہ چل کر اسلام اور مسلمانوں کی حکومت کے اہم معاون ثابت ہوئے۔موسی بن نصیر کے ساتھ اس کے چاروں بیٹے بھی تھے، جو فوجی تربیت میں مہارت رکھتے تھے، موسی بن نصیر نے چاروں کو پورے مفتوحہ علاقے میں بھیج دیا، تاکہ نظم وضبط قائم کریں، اس اقدام سے مسلمانوں کے قدم اس علاقے میں جم گئے۔

موسی بن نصیر نے خشکی کے علاوہ سمندر میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، 86ھ/705ء میں موسی بن نصیر نے صقلیہ پر حملہ کیا، جس میں بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔موسی کے ایک سالار عیاش نے جزیرہ سرقوسہ پر اور دوسرے سالار عبداللہ بن مرہ نے جزیرہ 'سردینیا' پر حملے کئے۔شمال مغربی افریقہ کے ساحل کو بازنطینی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے، بحری فوج طلایہ گردی کرتی رہتی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازنطینی بحری بیڑے کی نقل وحرکت کو محدود کیا جاسکا۔اور ساحلی علاقے ان کے حملوں سے محفوظ رہے۔

21.5.5 اندلس کی فتح اور اس کے اسباب:

ساتویں مرحلہ کی تکمیل کے ساتھ ہی شمالی افریقہ اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا۔ممکن ہے کہ اس کے بعد مسلمان آگے اندلس کی جانب قدم نہ بڑھاتے، اگر اس کے لیے دوسرے اسباب نہ ہوتے۔مسلمانوں کو اندلس پر حملہ کرنے کے لیے ایک عیسائی سردار کانٹ جولین نے آمادہ کیا، جس کو اندلس کے بادشاہ کی جانب سے ظلم وستم سہنا پڑا تھا۔

ساتویں صدی کے آخر میں اندلس کی صورت حال یہ تھی کہ یہاں گاتھ قبائل کی حکومت تھی، جنہوں نے چھٹی صدی عیسوی میں ونڈال نامی قبائل کو بے دخل کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی۔گاتھ قبائل نے اپنی حکومت کے لیے مخصوص اصول وقوانین وضع کئے، جن پر رومانی تہذیب کی چھاپ تھی، انہوں نے مسیحیت قبول کرلی تھی۔مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے سیاسی نظام میں بہت اتھل پتھل تھی، 89ھ/708ء میں بادشاہ وٹیزا کی

وفات ہوئی، وٹیزا کو عربی مصادر میں غیطشہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی اخیلا اور سپہ سالار راڈرک کے درمیان تخت نشینی کے لیے چپقلش شروع ہوگئی تھی، راڈرک کو شرفاء اور مذہبی طبقہ کی حمایت مل گئی، جس کی مدد سے اس نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔

شمالی افریقہ کا شہر سبتہ بازنطینی حکومت کے تابع تھا، یہاں کا حاکم کانٹ جولین تھا لیکن دارالحکومت سے دور ہونے کی وجہ سے وہ خودمختاری سے حکومت کرتا تھا، اور مشکل کے وقت اندلس کی گاتھ حکومت سے مدد لیتا تھا۔ اس کے ایک طرف وٹیزا (غیطشہ) کے خاندان سے عمدہ تعلقات تھے، جس کی وجہ سے اس نے اخیلا کے ساتھ اتحاد کرلیا تھا، جو اسپین کے تخت کا دعویدار تھا۔ راڈرک نے جولین کے خاندان کے ساتھ نازیبا حرکت کی تھی۔ جس کی وجہ سے جولین اس سے ناراض تھا۔

جب مسلمانوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو یہاں کا والی مقرر کیا، کانٹ جولین نے طارق سے مل کر اندلس پر حملہ کی دعوت دی، اور اس کے سامنے اندلس کے محاسن بیان کئے۔ طارق نے موسیٰ بن نصیر کو خط لکھا، جو اس وقت قیروان میں قیام پذیر تھے۔ چونکہ اس معاملہ میں خطرہ زیادہ تھا، سمندر عبور کرکے دوسرے علاقے پر حملہ کرنا مقصود تھا، اس لیے موسیٰ بن نصیر نے خود فیصلہ لینے کے بجائے خلیفہ سے اجازت طلب کی، خلیفہ نے علاقے کی سیاسی صورت حال دیکھتے ہوئے کچھ ردوکد کے بعد اجازت دے دی۔

موسیٰ نے سب سے پہلے طریف بن مالک معافری کو جو ایک بربری سردار تھا، پانچ سو کی ٹکڑی دے کر روانہ کیا، اس مہم کا مقصد خبر فراہم کرنا تھا۔ طریف نے 91ھ/710ء میں اسپین کے جنوبی ساحل پر اتر کر حملہ کیا۔ بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے کر کامیاب واپس ہوا۔ اس کامیاب مہم سے موسیٰ کو اندازہ ہوگیا کہ اندلس میں مسلمانوں کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے اس نے رمضان 92ھ/مئی 711ء میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار سپاہ بھیجی، جس میں اکثریت بربری باشندوں کی تھی۔ طارق نے سمندری آبنائے کو عبور کیا، اور پہاڑ پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد سے اس آبنائے کا نام آبنائے طارق اور پہاڑ کا نام جبل الطارق یا جبرآلٹر پڑ گیا۔

کچھ دن پہاڑ پر قیام کرکے طارق نے لشکر کو درست کیا، جاسوسوں نے اطلاع دی کہ راڈرک نے بہت بڑا لشکر تیار کر رکھا ہے، یہ دیکھ کر طارق نے موسیٰ سے مدد کی درخواست کی، موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار سپاہیوں کا دستہ روانہ کیا۔ بارہ ہزار کی فوج لے کر طارق نے اندلس کے ساحل پر لنگر ڈالا۔ راڈرک اور طارق کی فوج کا وادی 'لکہ' میں زبردست مقابلہ ہوا، ایک طرف ایک لاکھ فوج تھی، جس کے پاس سامان رسد کی فراوانی تھی، دوسری طرف بارہ ہزار کا لشکر تھا، جس کے لیے ہر چیز اجنبی تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی، اور مسلمانوں کو تاریخ کی اہم فتح حاصل ہوئی۔ اس ہزیمت کا پورے اندلس پر اس قدر اثر پڑا کہ طارق کے لیے شہر کے شہر فتح کرنا آسان ہوگیا۔ جلد ہی قرطبہ، مالقہ، بیرہ، طلیطلہ فتح ہوگئے، طلیطلہ گاتھ حکومت کا پایہ تخت تھا، یہاں سے بے شمار مال و دولت حاصل ہوئی۔ سنہ 93ھ/712ء تک اندلس میں فتوحات کا اہم مرحلہ مکمل ہوا۔

رمضان 93ھ/مئی 712 میں موسیٰ بن نصیر اندلس پہونچا، اس کے ساتھ اٹھارہ ہزار فوج تھی۔ اس نے قرمونہ اور اشبیلیہ فتح کئے۔ 'ماردہ' شہر کے باشندوں نے مصالحت کرکے شہر موسیٰ کے حوالہ کیا، آگے بڑھ کر اس نے برشلونہ، اربونہ فتح کئے۔ طلیطلہ شہر کے پاس اس کی طارق سے ملاقات ہوئی۔ آگے کی فتوحات کے لیے دونوں ساتھ روانہ ہوئے۔ سرقسطہ اور برشلونہ کی فتح میں دونوں شریک رہے۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے شمال کا رخ کیا، اور 'سبتمانیہ' قرقشونہ اور ناربون فتح کئے۔ آگے بڑھ کر فرانس کے علاقہ وادی الرون پر حملہ کیا، اور لیون شہر تک پہنچا۔ جب کہ طارق نے وادی 'ابرو' کو پار کرکے جلیقیہ پر حملہ کیا۔

اسی دوران دارالخلافہ دمشق سے موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں کو حکم ملا کہ فوجی کارروائیاں روک دیں، اور فوراً دمشق واپس آئیں۔

اس لیے آگے کی فتوحات روک دی گئیں، موسی اور طارق دونوں دارالخلافہ روانہ ہوئے۔

21.5.6 اندلس کی فتح کے اثرات:

اندلس کی فتح کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ مقامی عوام راڈرک کے ظلم سے پریشان تھی، مسلمانوں نے مقامی باشندوں کی ملکیت انہی کے ہاتھوں میں رکھی۔ جولین کو سبتہ کا دوبارہ حاکم بنادیا۔ وٹیزا کے بیٹے اخیلا اور اس کے خاندان کو ان کی دولت و جائدادیں واپس کیں۔ کسانوں کو اپنے حساب سے کھیتی کرنے کی اجازت دی، اندلس کی عوام نے اسلام میں مساوات اور مسلمانوں کے حسن سلوک کو دیکھ کر اسلام قبول کیا۔ یہودیوں کو مذہبی آزادی دی۔ اپنی تجارت اور مالی کاروبار دوبارہ شروع کرنے کا موقع دیا، بہت سے یہودیوں نے علم وادب کی مشغولیت اختیار کی، اندلس کی فتح کا سب سے زیادہ فائدہ یہودیوں کو پہونچا۔

شمالی افریقہ اور اندلس کی فتح اموی دور میں توسیع حکومت کا اہم باب تھا۔ جو ولید کے دور میں تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ سلیمان اور عمر بن عبد العزیزؒ نے داخلی اصلاحات پر پہلے توجہ مرکوز کی، بیرونی سیاست پر توجہ دینے سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی۔ آپ کے بعد اموی خلفاء کے زمانہ میں قابل ذکر فتوحات نہیں ہوئیں۔ بلکہ 98ھ/717ء سے اموی دور کے اختتام 132ھ/750ء تک کوئی قابل ذکر فتوحات نہیں ہوئیں، کیوں کہ داخلی انتشار اس دور میں بڑھتا گیا، جو اموی خلافت کے زوال پر منتج ہوا۔ خوارج کی بغاوتیں بڑھ گئیں تھیں۔ تمام بڑے بڑے سپہ سالار وفات پا چکے تھے۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ مسلمان اپنے مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کر سکے۔

21.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں ہم نے اموی دور میں ہونے والی توسیعی کاروائیوں کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے، ہم نے نوٹ کیا کہ:

- اموی دور میں تین سمتوں میں حکومت کی توسیع ہوئی، مشرقی سمت جہاں ماوراء النہر، سندھ اور کابل وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے۔ دوسرے بازنطینی محاذ، جو ملک شام کے شمال میں واقع تھا۔ تیسرے شمالی افریقہ جہاں مصر سے آگے کا تمام علاقہ مسلمانوں نے فتح کیا۔
- اموی دور میں سب سے زیادہ توسیعی کاروائیاں ولید بن عبدالملک کے دور میں وقوع پذیر ہوئیں۔ سندھ، ماوراء النہر، شمالی افریقہ اور اندلس کے ممالک اسی خلیفہ کے دور میں فتح ہوئے۔
- اموی دور کے اہم سپہ سالار قتیبہ بن مسلم باہلی، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، حسان بن نعمان، مسلمہ بن عبدالملک، موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد تھے، یہ سپہ سالار نہ صرف اموی بلکہ اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔
- مشرقی محاذ پر قتیبہ بن مسلم نے ماوراءالنہر اور محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا جسے حجاج بن یوسف نے مکمل مدد فراہم کی تھی۔
- بازنطینی محاذ پر اموی دور میں مسلمانوں نے اہم شہر فتح کئے، متعدد قلعے ان کے قبضہ میں آئے۔ اموی خلفاء نے بازنطینی دارالسلطنت قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی تین بار کوششیں کیں، لیکن موسمی حالات، شہر کی مضبوطی اور دیگر وجوہات کی بناء پر وہ ناکام رہے۔ مسلمہ بن عبد الملک نے اس محاذ پر اہم کارنامے انجام دیئے۔
- شمالی افریقہ میں توسیعی کاروائیاں سات مرحلوں میں انجام پائیں۔ عقبہ بن نافع، ابوالمہاجر دینار انصاری، حسان بن نعمان، معاویہ بن حدیج موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اس محاذ پر اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس دوران قیروان اور تونس دو اہم شہر بسائے گئے۔ سپہ سالاروں کی کوششوں کی وجہ سے بربری قبائل میں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور بربر اسلام کی ڈھال بن گئے۔

- شمالی افریقہ کے بعد مسلمانوں نے اندلس میں بھی فوجی کاروائیاں کیں، اندلس کا بڑا حصہ اموی دور میں ہی اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اندلس میں توسیعی کاروائیاں انجام دیں۔
- اموی دور میں مسلمانوں نے بحری بیڑے نے کافی ترقی کر لی تھی۔ بازنطینی اور شمالی افریقہ کے محاذ پر ہونے والی کامیابیوں میں مسلمانوں کے بحری بیڑے اور بحری فوج نے اہم کردار نبھایا۔

21.7 کلیدی الفاظ

ماوراءالنہر	:	نہر کے پیچھے کا علاقہ۔اس سے مراد وہ علاقہ ہے، جو نہر جیحون کے پیچھے واقع ہے
محاذ	:	مقابلہ کی جگہ، میدان جنگ
آماج گاہ	:	نشانہ کی جگہ
پہاڑی دروں	:	درہ کی جمع: دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ۔گھاٹی
کمک	:	مدد، وہ فوج جو لڑائی میں مدد کے لیے بھیجی جائے
رسد	:	غلہ، وہ غلہ اور ضرورت کی چیزیں جو لڑائی وغیرہ میں لشکر تک پہونچائی جائیں
نرغہ	:	گھیرا، نرغہ میں آنا: دشمن کے گھیرے میں آنا
پسپائی	:	پیچھے ہٹنا

21.8 نمونہ امتحانی سوالات

21.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. ماوراءالنہر کا علاقہ کس سپہ سالار نے فتح کیا؟

a. قتیبہ بن مسلم b. عبیداللہ بن زیاد c. مسلمہ بن عبدالملک d. طارق بن زیاد

2. قسطنطنیہ پر پہلے حملہ میں کون سے جلیل القدر صحابی شہید ہوئے تھے؟

a. ابوہریرہؓ b. ابوایوب انصاریؓ c. معاذ بن جبلؓ d. زید بن ثابتؓ

3. فاتح اندلس کس کو کہا جاتا ہے؟

a. موسیٰ بن نصیر b. عقبہ بن نافع c. طارق بن زیاد d. سب غلط

4. اموی دور میں قسطنطنیہ پر کتنے حملے کیے گئے تھے؟

a. تین b. دو c. چار d. چھ

5. اندلس پر حملہ کے لیے کس عیسائی سردار نے مسلمانوں کو آمادہ کیا تھا؟

a. کانٹ جولین b. راڈرک c. وٹیزا d. پہلے دونوں

6. وہ کون سا سپہ سالار تھا، جو خلیفہ کا بیٹا اور خلیفہ کا بھائی تھا، جس نے بازنطینی محاذ پر اہم کارنامے انجام دئے تھے؟

a. یزید b. مہلب c. ہبیرہ d. مسلمہ

7. سندھ کو کس نے فتح کیا تھا؟

a. محمد بن قاسم b. امیر معاویہؓ c. موسیٰ بن نصیر d. عقبہ بن نافع

8. قیران شہر کی بنیاد کس نے ڈالی تھی؟

a. محمد بن قاسم b. مسلمہ بن عبدالملک c. سلیمان بن عبدالملک d. عقبہ بن نافع

9. شمالی افریقہ میں اموی سپہ سالار حسان بن نعمان نے کس شہر کی بنیاد رکھی تھی؟

a. تونس b. الجزائر c. قرطاجنہ d. سبتہ

10. اندلس کی فتح کس سن میں ہوئی تھی؟

a. 92ھ b. 82ھ c. 100ھ d. 89ھ

21.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ماوراء النہر سے کون سے ممالک مراد ہیں؟ اور یہ علاقہ کس خلیفہ کے دور حکومت میں فتح ہوا؟ تحریر کیجیے۔
2. سندھ کی فتح پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. اندلس کی فتح پر روشنی ڈالیے۔
4. اسلامی تاریخ میں ''مغرب'' سے شمالی افریقہ کا کون سا علاقہ مراد لیا جاتا ہے؟ بیان کیجیے۔
5. اموی دور میں قسطنطنیہ پر ہونے والے حملوں کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔

21.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی دور میں بازنطینی محاذ پر ہونے والی کارروائیوں کا جائزہ لیجیے۔
2. شمالی افریقہ میں عقبہ بن نافع کی توسیعی کارروائیوں پر مفصل مضمون قلم بند کیجیے۔
3. امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں ہونے والی فتوحات پر تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔

21.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. تاریخ اسلام : محمد حمید الدین
2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : ثروت صولت
3. تاریخ اسلام : شاہ معین الدین ندوی
4. تاریخ اسلام : اکبر شاہ نجیب آبادی
5. تاریخ اندلس : سید ریاست علی ندوی

-:oOo:-

اکائی 22 : بنوامیہ کا نظم ونسق

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید
22.1 مقصد
22.2 سیاسی نظام
22.2.1 خلیفہ
22.2.2 وزیر
22.2.3 کاتب
22.2.4 حاجب
22.3 ملکی انتظام
22.3.1 صوبوں کی تقسیم
22.3.2 صوبیدار یا عامل
22.3.3 سرکاری زبان
22.3.4 سکہ
22.3.5 دیوان
22.3.5.1 دیوان الرسائل
22.3.5.2 دیوان الجند
22.3.5.3 دیوان الخراج
22.3.5.4 دیوان الصدقات
22.3.5.5 دیوان الخاتم
22.3.5.6 دیوان البرید
22.4 اکتسابی نتائج
22.5 کلیدی الفاظ
22.6 نمونہ امتحانی سوالات

22.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

22.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں اموی عہد کو اہم حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہ خلافت راشدہ کے فوراً بعد شروع ہوا، اموی خلفاء نے خلافت راشدہ میں قائم کیے گئے حکومتی شعبوں کو منظّم کیا اور ترقی دی۔ فتوحات کی وسعت اور نئے علاقوں کے زیر انتظام آنے کی وجہ سے ان کو مزید نئے شعبے قائم کرنے پڑے، جن کو دیوان کہا جاتا تھا۔ انہوں نے حکومت کی بنیاد عربی اور اسلامی قواعد پر استوار کی، اور روم و ایران کے تمدنی نظام اور ان میں کام کیے ہوئے تجربہ کار افراد سے بھی استفادہ کیا۔ گویا اس طرح بنوامیہ نے حکومتی نظم و نسق کا اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔

22.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اموی دور کے سیاسی نظام سے واقف کرایا جائے، اور ان کو یہ بھی بتایا جائے کہ اموی دور میں نظم و نسق کی صورت حال کیا تھی، مملکت کا انتظام کس طرح کیا جاتا تھا۔ اس اکائی کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ اموی دور میں حکومت کے اہم شعبے کون کون سے تھے، جن کے ذریعہ حکومت کا کام کاج انجام دیا جاتا تھا۔ حکومت کے مختلف عہدوں پر کام کرنے والے افراد کون ہوتے تھے۔ آپ یہ بھی جانیں گے کہ اموی دور خلافت کے سیاسی نظام میں کیا تبدیلیاں آئیں، اور ملکی نظم و نسق میں کیا ترقی ہوئی۔

22.2 سیاسی نظام

اموی دور کے سیاسی نظام کے چار اہم ستون تھے، جن میں مرکزی ستون کی حیثیت خلیفہ کو حاصل تھی، جس پر پوری سلطنت کا دار و مدار تھا۔ ملکی امور کو انجام دینے کے لیے خلیفہ وزیر اور کاتب سے مدد لیتا تھا۔ دربار خلافت میں ایک اہم عہدہ حاجب کا تھا، کاتب اور حاجب کو حکومتی نظام میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ ذیل میں ہم ان چاروں عہدوں پر گفتگو کریں گے۔

22.2.1 خلیفہ:

اموی دور کے سیاسی نظام میں سب سے اونچی حیثیت خلیفہ کی ہوتی تھی، خلیفہ تمام رعایا کے دینی اور دنیاوی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ امت کی وحدت کو قائم رکھنا، شرعی قوانین نافذ کرنا، ریاستوں کے گورنر مقرر کرنا، سرحدوں کی حفاظت کرنا اور عدالت میں قاضیوں کی تقرری خلیفہ کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔ بنوامیہ میں چودہ خلفاء ہوئے، بعض اموی خلفاء کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن جمہور امت نے ان کی خلافت کو کسی نہ کسی طرح تسلیم کیا۔ اور اسلامی مملکت میں سیاسی وحدت قائم رہی۔ کیونکہ امت کے سامنے وہ احادیث موجود تھیں، جن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے اوپر نیک و بد ہر طرح کے لوگ حاکم ہوں گے، نیک حاکم اپنی نیکی کے ساتھ اور برے حاکم اپنی برائی کیساتھ حکومت کریں گے۔ ان کے جو احکامات حق کے موافق ہوں، ان میں سننے اور اطاعت کرنے کی روش پر قائم رہنا۔ اس کے بعد وہ اگر نیکی کا معاملہ رکھیں، تو یہ ان کے اور تمہارے دونوں کے حق میں بہتر ہے، اور اگر وہ برائی کا معاملہ کریں تو ان کے حق میں برا ہے، اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔

خلافت راشدہ میں خلیفہ کا انتخاب قرابت کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا، نہ ہی ولی عہدی کا کوئی سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اموی حکومت کے سیاسی نظام میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ خلیفہ کے انتخاب میں وراثت کا نظام شروع ہوا۔ خلفاء اپنے بعد اپنے فرزندوں کے لیے منصب خلافت خاص کرنے اور اس کے لیے بیعت لینے لگے۔

دربار خلافت میں ایک اور بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ سادگی کی جگہ شان وشوکت کے مظاہر نظر آنے لگے۔ خلفائے راشدین کی سادہ مزاجی اور سادہ زندگی داستان پارینہ بن گئی۔ بیت المال میں خلیفہ کا ذاتی تصرف بڑھتا گیا۔ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں یہ مظاہر زیادہ صاف نظر آنے لگے، وہ باقاعدہ دربار لگاتے، دائیں طرف امراء ہوتے، بائیں طرف بڑے افسر ہوتے، سامنے کی جانب بادشاہوں کے قاصد، شعراء، ادباء، فقہاء اور دوسرے اہم لوگ ہوتے تھے۔

سیاسی نظام میں ان تبدیلیوں کے متعدد اسباب تھے، دارالخلافہ مدینہ منورہ سے دمشق منتقل ہو گیا تھا۔ فارس وروم کے لوگ بڑے پیمانے پر اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ جو درباری شان وشوکت کے عادی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سیاسی نظام کے ساتھ انتظامی امور میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہوئیں۔ خلفاء کے ذاتی مزاج کا بھی اس میں اثر تھا۔ صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز ایسے خلیفہ تھے، جنہوں نے اس نظام کو دوبارہ خلفائے راشدین کے طرز پر استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے بارے میں لوگوں کو اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو دوسرا خلیفہ چن لیں۔ لوگوں نے بالاتفاق خلیفہ کے منصب کے لیے ان ہی کو منتخب کیا۔ یہ ان کا بہت بڑا اور اہم اقدام تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے سادگی اختیار کیا، اور بیت المال کی آمدنی کو خلفاء اور امرا کے ذاتی تصرف سے نکال کر دوبارہ امت کے کاموں میں استعمال کیا۔

22.2.2 وزیر:

حکومت کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ خلیفہ اس کو تنہا ادا نہیں کر سکتا۔ خلیفہ کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ایسے شخص کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، جس پر وہ اعتماد کر سکے، کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ اس پر ڈال سکے۔ اس کے لیے وہ وزیر کی مدد لیتا ہے۔ وزیر کو وزیر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حکومت کی ذمہ داریاں اٹھانے میں حاکم کی مدد کرتا ہے، اور حاکم اس کی رائے اور تدبیر پر بھروسہ کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ سے مدد لیتے تھے۔ اس لیے ان کو حضور کا وزیر بھی کہا جاتا ہے، خلافت صدیقی میں حضرت عمر کی یہی حیثیت تھی، حضرت عمر اپنے دور میں عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مدد لیتے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی کے لیے بھی وزیر کے عہدہ یا لقب کا استعمال نہیں ہوا۔

بالکل یہی صورت حال بنو امیہ کے دور میں قائم رہی، وزیر کے لیے باقاعدہ کوئی عہدہ قائم نہیں کیا گیا۔ اس کے بغیر ہی اموی خلفاء اپنے امور میں اہل الرائے افراد سے مدد لیتے تھے، لیکن ان کو وزیر کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ زیاد بن ابی سفیان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کو حضرت معاویہ کا وزیر کہا جاتا تھا۔

22.2.3 کاتب:

وزیر کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کی وجہ سے کاتب کا عہدہ قائم کیا گیا، تاکہ بادشاہ اور وزیر امور سلطنت کی انجام دہی میں اس سے مدد لے سکیں۔ ابن خلدون کے مطابق بادشاہ کے احکامات کو دور رہنے والوں تک پہنچانے کا کام کاتب کی ذمہ داری تھی۔ رسول اللہ ﷺ خطوط ومعاہدات تحریر کرانے کے لیے صحابہ کرام سے مدد لیتے تھے۔ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی یہ عہدہ موجود تھا، انہوں نے معتمد افراد کو کتابت کی ذمہ داری دی تھی۔

بنوامیہ کے دور میں سلطنت کے کام کاج میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔جس کی وجہ سے حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے الگ الگ کاتب مقرر کیے گئے،ہمیں اس دور میں پانچ کاتبوں کے نام ملتے ہیں،جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1. کاتب الرسائل: جن کی ذمہ داری خلیفہ کے خطوط لکھنے کی ہوتی تھی۔ یہ بہت نازک عہدہ تھا،خلفاء اس عہدہ پر اپنے قریبی اور خاص افراد کو مقرر کرتے تھے،اس کے لیے ایک علاحدہ شعبہ قائم کیا گیا تھا،جس کا نام دیوان الرسائل تھا،جس کی تفصیل آگے آئے گی۔
2. کاتب الخراج: اس کے ذمہ خراج کی آمد وخرچ کا حساب رکھنا تھا۔
3. کاتب الجند :اس کے ذمہ لشکر اسلام سے مربوط ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔
4. کاتب الشرطہ: یعنی کوتوالی کا کاتب، جو جرائم وغیرہ کی تفصیلات لکھتا تھا۔
5. کاتب القاضی: جو قاضی کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات اور فیصلوں کو دیکھتا تھا۔

22.2.4 حاجب:

’حاجب‘ اس شخص کو کہتے ہیں، جو خلیفہ کا دربان ہوتا ہے،اور خلیفہ کے ساتھ لوگوں کی ملاقات کو منظّم کرتا ہے۔تاکہ خلیفہ کے کام کاج میں خلل نہ پڑے۔حاجب کی تقرری سے خلیفہ کو تو فائدہ ہوا،لیکن ضرورت مندوں کے لیے خلیفہ تک رسائی دشوار ہوگئی۔ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ضرورت مندوں کو حکام کے دروازے تک پہنچنے سے روکنا شریعت میں ممنوع تھا،لیکن جب خلافت کا نظام بادشاہت میں تبدیل ہوگیا، دربارشاہی کے آداب وقواعد مقرر ہوئے،تو سب سے پہلے حکام کے دروازے عوام کے لیے بند کیے گئے۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکام کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں خوارج ان کو انجانے میں قتل نہ کردیں۔ایک اور سبب یہ تھا کہ لوگوں کے بکثرت آنے جانے سے کاموں میں خلل پڑتا تھا،اس لیے اس کے لیے آدمی مقرر کیا گیا،جس کو حاجب یا دربان کہا جاتا تھا۔

عبدالملک کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے جب حاجب مقرر کیا تو کہا کہ میں نے تم کو اپنے دروازے کا نگران بنایا ہے،لیکن تین افراد کو نہ روکنا: ایک مؤذن، کیوں کہ وہ اللہ کا منادی ہے۔دوسرے ڈاک کا ملازم، وہ کسی نہ کسی ضرورت سے آیا ہوگا۔تیسرے کھانے پر بلانے والا، کیوں کہ کھانا خراب ہوجائے گا۔

22.3 ملکی انتظام

اموی دور میں ملکی نظم ونسق میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اہم قدم اٹھائے گئے،ایک یہ کہ نظام حکومت کی آسانی کے لیے پوری اسلامی مملکت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا،اور ان صوبوں پر عامل مقرر کیے گئے،سیاسی نظام میں ان صوبوں کے ذمہ داروں کی حیثیت ایک اہم ستون کی تھی۔دوسرے یہ کہ پورے حکومتی شعبوں کی زبان عربی کردی گئی، یہ اہم اقدام عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں اٹھایا گیا۔اسی دور میں تیسرا اہم کام یہ ہوا کہ زبان کی طرح مملکت میں کرنسی کے نظام میں یکسانیت لائی گئی۔اسلامی طرز پر سکے ڈھالے گئے،اور اسلامی مملکت غیر ملکی کرنسی سے بے نیاز ہوگئی۔

بنوامیہ کا دارالحکومت ملک شام کا قدیم شہر دمشق تھا،شام کا علاقہ تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔یہاں قدیم زمانہ سے ملکی امور کے نظم ونسق کی مضبوط روایات اور انتظامی سلسلہ تھا۔اس وجہ سے امویوں کو بھی اعلی قابلیتوں کے افراد سے مدد لینے کی ضرورت پڑی۔انہوں نے حکومتی کام کاج کو مختلف شعبوں میں تقسیم کردیا، اور نئے ادارے اور شعبے قائم کئے،جن میں دیوان الرسائل، دیوان الخاتم اور دیوان البرید شامل ہیں۔ذیل میں ہم

اموی دور میں صوبوں کی تقسیم، سرکاری زبان اور سکے اور اس دور میں قائم ہونے والے مختلف شعبوں کی تفصیلات جانیں گے۔

22.3.1 صوبوں کی تقسیم:

اسلامی قانون میں صوبوں اور شہروں کی امارت کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔امارت عام اور امارت خاص۔امارت خاص میں امیر کا کام سرحد کی حفاظت، لشکر کا انتظام اور عوام کی فلاح و بہبود تک محدود رہتا ہے، زکوٰۃ اور خراج کی وصولی اور عدالتوں میں فیصلہ کرنے کا اس کو اختیار نہیں ہوتا۔عدالت کے لیے قاضی اور مالیات کے ذمہ دار کو خلیفہ الگ سے مقرر کرتا ہے۔جب کہ امارت عام میں امیر کو وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں، وہ مذکورہ بالا تمام امور کا خود انتظام کرتا ہے، اور خلیفہ کو ان کاموں کی اطلاع دیتا ہے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں فتوحات کی وجہ سے جب مملکت اسلام کا رقبہ بڑھتا چلا گیا، تو حضرت عمرؓ نے پوری مملکت کو نئے سرے سے صوبوں میں تقسیم کیا، تا کہ حکومت اور نگرانی میں آسانی ہو۔اموی دور میں اسلامی مملکت کی حدود نہایت وسیع ہوگئی تھیں۔اس لیے نئے سرے سے ملک کی تقسیم کی گئی، اور خلیفہ کے زیر انتظام علاقے کو پانچ بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا:

1. پہلا صوبہ عرب: اس میں حجاز، یمن اور جزیرۃ العرب کے درمیانی علاقے شامل تھے۔
2. دوسرا صوبہ مصر: جس کے دو بڑے حصے تھے: بالائی مصر (علیا) اور زیریں مصر (سفلی)
3. تیسرا صوبہ عراق: اس میں عراق عرب اور عراق عجم کے نام سے دو حصے تھے، عراق عرب میں بابل اور آشور کے قدیم علاقے تھے، اور عراق عجم میں ایران کا علاقہ تھا۔عمان، بحرین، کرمان، بجستان، کابل، خراسان، ماوراالنہر کے علاقے، نیز سندھ اور پنجاب کے بعض علاقے عراق کے والی کے تابع رہتے تھے۔والی عراق کی جانب سے خراسان اور ماوراالنہر کے علاقے پر ایک عامل مقرر ہوتا تھا، جو عام طور پر مرو کے شہر میں قیام کرتا تھا۔بحرین اور عمان پر ایک علاحدہ عامل، سندھ اور پنجاب کے علاقے پر علاحدہ عامل مقرر ہوتا تھا۔
4. چوتھا صوبہ جزیرہ تھا، جس کو بلاد الجزیرہ بھی بولتے تھے، آرمینیا، آذربائجان اور ایشیائے کوچک کے بعض علاقے اس کے تابع تھے۔
5. پانچواں صوبہ شمالی افریقہ تھا، جس میں مصر کا مغربی علاقہ، اندلس، صقلیہ، سردانیہ اور بالیار کے جزیرہ شامل تھے، اس صوبہ کا مرکزی مقام قیروان تھا۔افریقہ کا والی اپنی جانب سے ان جزیروں اور اندلس وغیرہ کے لیے عامل مقرر کرتا تھا۔

22.3.2 صوبیدار یا عامل:

صوبوں کی نگرانی اور انتظام وانصرام کے لیے عامل مقرر کیے گئے۔'عامل' کے لفظ میں یہ بات شامل تھی کہ وہ خود مختار نہیں، بلکہ کسی کی ماتحتی میں کام کرے گا۔بعد میں صوبوں کے ذمہ داروں کے لیے 'والی' اور 'امیر' کا لفظ استعمال ہونے لگا، اور اس منصب کے لیے 'ولایت' اور 'امارت' کا لفظ بولا جانے لگا۔ان دونوں لفظوں میں یک گونہ خود مختاریت پائی جاتی ہے۔

اموی خلفاء نے صوبیداروں کو مقرر کرنے میں اسی طرز کو اختیار کیا، جو خلفائے راشدین کا تھا۔وہ عربوں کو صوبیدار مقرر کرتے، اس بات کو بھی مدنظر رکھا جاتا کہ وہ شخص باصلاحیت ہو۔اموی دور میں والی کو ولایت عام حاصل ہوتی، اور وہ اپنے صوبے کے اندرونی معاملات کا تقریباً خود مختار ہوتا تھا۔خراج کی وصولی میں بھی وہ اپنی رائے پر عمل کرتا۔زیاد بن ابی سفیان، حجاج بن یوسف اور موسیٰ بن نصیر اموی دور کے اہم والیوں میں شمار ہوتے ہیں، جو فوجی، سیاسی اور مالی معاملات میں خود مختار حیثیت کے مالک تھے۔خراج کی وصولی اور خرچ، ماتحت علاقوں میں عاملوں کے تقرر اور سزاؤں کے نفاذ میں وہ خلیفہ سے پوچھے بغیر عمل کرتے تھے۔ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ مرکزی بیت المال کو خراج کی رقم پابندی سے ادا کرتے رہیں،

زیرِ انتظام علاقوں میں امن وامان قائم رکھیں، اور حکومت مخالف سرگرمیوں پر قابو رکھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ظالم والیوں اور عاملوں کو برخواست کیا، اور اپنے نئے عاملوں کو حکم دیا کہ خراج کی وصولی میں نرمی برتیں، اور کسی فرد کو خلیفہ کی اجازت کے بغیر قتل کی سزا نہ دیں۔

اموی حکومت میں صوبہ کے عاملوں کی سبکدوشی کی کوئی خاص مدت کی تعیین نہیں تھی، بلکہ جب تک خلیفہ کی مرضی ہوتی، اس وقت تک عامل اپنے صوبوں کے ذمہ دار رہتے، اور جب خلیفہ مناسب سمجھتا، معزول کر دیتا۔ بعض والیوں کو ایک طویل مدت تک اپنے منصب پر قائم رہنے کا موقع ملا، مثال کے طور پر حجاج بن یوسف عراق میں اور عبد العزیز بن مروان مصر میں بیس بیس برس تک اپنے عہدہ پر قائم رہے۔

22.3.3 سرکاری زبان:

عبد الملک بن مروان نے اموی دور کے ملکی نظام میں اصلاحات کیں، انہوں نے انتظامی اور اور مالی اداروں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا عمل شروع کیا۔ سرکاری اداروں میں عربی زبان کی صورت حال یہ تھی کہ 'دیوان الجند' کا سارا کام کاج عربی زبان میں ہوتا تھا، اس کے علاوہ دیوان الرسائل، دیوان الخاتم اور دوسرے دواوین عربی کو ہی کام کاج کی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ لیکن دیوان الخراج جیسے اہم شعبہ کا کام عربی کے بجائے مقامی زبانوں میں ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ فارس، شام اور مصر کے علاقے نئے نئے فتح ہوئے تھے، یہاں کی آمدنی کے مصادر مثلاً زمین اور کھیتی وغیرہ سے مسلمان واقف نہیں تھے، نیز مقامی افراد کے ساتھ تعامل بھی مقامی افراد ہی کر سکتے تھے، اس لیے مسلمانوں نے مالیاتی نظام کو علاقائی زبانوں میں باقی رکھا، اور مقامی افراد کو ہی مالیات کے عہدوں پر مقرر کیا۔ چنانچہ فارس میں فارسی زبان، شام میں رومی زبان اور مصر میں قبطی اور یونانی زبان میں مالیاتی شعبوں کا کام کاج ہوتا تھا۔ زبان کے اس فرق کی وجہ سے حکام براہ راست مالیات کے بارے میں واقفیت نہیں حاصل کر سکتے تھے، نیز سرکاری کام میں یکسانیت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس وجہ سے عبد الملک بن مروان نے دیوان الخراج کو عربی میں منتقل کر کے تمام سرکاری دفاتر کی زبان عربی کر دی، اور مملکت کے نظم ونسق میں یکسانیت پیدا کی۔

مالیاتی نظام کو مقامی زبانوں سے عربی میں منتقل کرنے کا عمل پوری مملکت میں ایک ساتھ شروع نہیں ہوا، بلکہ سب سے پہلے ملک شام میں 81ھ میں اس کو شروع کیا گیا، یہاں جب کامیابی کے ساتھ نافذ ہو گیا، تو عراق میں 82ھ میں نافذ کیا گیا۔ پھر اخیر میں مصر میں نافذ کیا گیا۔ دیوان الخراج کو عربی میں منتقل کرنے کا عمل ملک شام میں سلیمان بن سعد نے انجام دیا، جو عبد الملک کی جانب سے اردن کے والی تھے، اور عراق میں صالح بن عبد الرحمٰن نے انجام دیا، جو حجاج بن یوسف کے کاتب تھے۔

دیوان الخراج کی زبان کو عربی میں منتقل کرنے کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اسلامی ممالک کے مالیاتی نظام میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔ سب سے اہم اثر یہ پڑا کہ سرکاری کام کاج میں غلطی یا بدعنوانی کا امکان کم ہو گیا، عرب حکام کو غیر عرب باشندوں پر مکمل انحصار کی کیفیت ختم ہو گئی۔ مالیات میں اسلامی احکام کو نافذ کرنا آسان ہو گیا۔ عربی زبان میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنی۔ سرکاری مناصب پر فائز ہونے کے لیے عربی سیکھنا ضروری ہو گیا، اور اس تبدیلی نے عربی زبان کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔

22.3.4 سکّہ:

سکہ یا کرنسی کسی بھی ملک اور قوم کے معاشی اور تہذیبی نظام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ معیشت کو منظّم کرنے اور لین دین کو آسان بنانے کے لیے نقد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سکّے اقوام وملل کی تہذیبی دستاویز سمجھے جاتے ہیں، جن سے ان کے تمدنی ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔

جاہلیت کے زمانہ سے جزیرۃ العرب کے پڑوسی ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے،جس کی وجہ سے جزیرۃ العرب کا مالیاتی نظام ان ملکوں کے تابع تھا۔ایران اورروم کے ساتھ تجارتی تعلقات کی وجہ سے وہیں کے سکے یہاں آتے۔عام طور سے ملک روم سے بازنطینی دیناراورایران سے ساسانی درہم آتے،اور جزیرالعرب میں استعمال ہوتے۔اہل عرب ان کوصرف گن کرنہیں،بلکہ تول کربھی استعمال کرتے تھے،قبیلہ قریش کے پاس وزن کے اپنے پیمانے تھے۔چاندی کے دس درہم سات مثقال کے برابر ہوتے۔رسول اللہﷺ نے اہل عرب کے اس تعامل کو باقی رکھا۔خود اپنی بیٹی حضرت فاطمہ کا مہر 480 کسروی درہم مقرر کیا تھا۔

حضرت عمرؓ پہلے شخص تھے،جنہوں نے چاندی کے سکے ڈھلوائے،ان کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی اسی طرح سکے ڈھلوائے۔ان کی شکل اورطرز مکمل کسروی سکوں کی طرح تھا،البتہ بعض سکوں پر الحمدللہ اور بعض سکوں پر محمد رسول اللہ کندہ کرایا گیا تھا۔

اسی طرح حضرت معاویہ اورحضرت عبداللہ بن زبیر کو بھی مملکت کی ضرورتوں کے پیش نظر سکے ڈھلوانے کی ضرورت پڑی تھی۔لیکن ان خلفاء کے ڈھلوائے ہوئے سکے غیرملکی نظام کے تابع تھے،اور بازار میں اسی نظام کے تحت قبول کیے جاتے تھے،ان پر غیراسلامی شعارات کندہ ہوتے تھے۔

عبدالملک بن مروان پہلے اموی خلیفہ ہیں،جنہوں نے مکمل طریقے سے مالیاتی نظام کوعربی میں منتقل کیا۔انہوں نے سب سے پہلے مملکت میں زیراستعمال سکوں کا جائزہ لیا،تو دیکھا کہ الگ الگ زمانوں اورعلاقوں میں تیار کیے گئے سکوں کے وزن میں اختلاف ہے۔نیز سکوں میں سونے اورچاندی کی مقدار میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔اس اختلاف کوختم کرنے اورمملکت کے مالیاتی نظام میں یکسانیت لانے کے لیے انہوں نے ٹکسال قائم کی،اورنئے سکے ڈھالنے کا حکم دیا۔عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں کرنسی کے نظام میں جو اصلاح کی گئی،اس کی درج ذیل خصوصیات تھیں:

1. انہوں نے چاندی اورسونے کے سکوں کے اوزان مقرر کئے۔
2. سکوں کا وزن مقرر کرنے میں شریعت کے احکامات کوسامنے رکھا۔
3. جس شہر میں سکہ ڈھلوایا اس کا نام کندہ کرایا۔
4. سکے ڈھالنے کا اختیار صرف حکومت کے لیے خاص کردیا۔غیرسرکاری طور پر سکہ ڈھلوانے کی ممانعت کردی۔
5. سکوں پر سے غیراسلامی شعائر کوختم کرادیا،اورعربی عبارت کندہ کرائی۔بعض سکوں پر قرآنی آیات ہوتی تھیں،بعض پر کلمہ،بعض پر عربی عبارت،جب کہ بعض سکے بالکل سادہ بھی ہوتے تھے۔
6. ان سکوں کے علاوہ دوسرے ممالک کے سکوں سے خریدوفروخت کومنع کردیا۔

عربی اوراسلامی نظام کے تحت سکے ڈھالنے کا کام 79ھ میں شروع ہوا۔دارالخلافہ دمشق کے علاوہ حلب،حمص،عمان اورعراق میں سکے ڈھالنے کا کام ہوتا تھا۔یہ سکے سونے اورچاندی دونوں دھاتوں کے ہوتے تھے۔چاندی کے سکے درہم کہلاتے تھے،اورسونے کے سکے دینار۔درہم اوردینار کے علاوہ چلر یا چھٹکر خریدوفروخت کے لیے فلوس بھی ڈھالے جاتے تھے۔

22.3.5 دیوان:

دیوان عربی زبان میں رجسٹر کو کہتے ہیں۔عہد اسلامی میں دیوان کی شروعات رسول اللہﷺ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔غزوات میں جوافراد شرکت کرتے،ان کے نام رجسٹر میں درج کیے جاتے۔مال غنیمت اوروظائف جب تقسیم کیے جاتے تو لینے والوں کے نام لکھ لیے جاتے۔یہی سلسلہ

عہد رسالت، خلافت صدیقی اور ابتدائے خلافت فاروقی میں جاری رہا۔ خلافت فاروقی میں جب مدینہ منورہ میں اموال کی آمد زیادہ ہوگئی، اور حضرت عمرؓ نے بیت المال سے وظائف اور تنخواہوں کی تقسیم کا باقاعدہ نظام شروع کیا، تو حضرت عمرؓ بن خطاب نے تمام مستفیدین کے نام رجسٹر میں درج کرائے، اور ان کے متعینہ حصوں کی تفصیل درج کی۔ حضرت عمرؓ کے تیار کردہ دیوان اور پہلے تیار کیے گئے رجسٹروں میں فرق یہ تھا کہ پہلے وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے رجسٹر تیار کیے گئے تھے، جب کہ حضرت عمرؓ کا تیار کردہ دیوان مستقل نوعیت کا تھا، نیز حضرت عمرؓ نے اس کو باقاعدہ ایک حکومتی ادارہ کی حیثیت عطا کردی۔ حضرت عمرؓ کے قائم کردہ دیوان کو دیوان العطاء کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، اور دیوان الجند کے نام سے بھی، کیوں کہ دونوں کام یہیں سے انجام پاتے تھے۔

اموی دور میں متعدد دیوان قائم ہوئے، دیوان الجند پہلے سے موجود تھا، دیوان الخاتم، دیوان البرید، دیوان الرسائل نئے شعبوں کی حیثیت سے قائم ہوئے۔ ہر دیوان کی حیثیت حکومت کے ایک علاحدہ شعبے کی تھی، بعض شعبے مرکز میں ہی قائم تھے، اور بعض شعبوں کی ذیلی شاخیں صوبوں اور شہروں میں قائم تھیں۔ جیسے دیوان الخراج اور دیوان الجند کا مرکزی ادارہ دارالسلطنت میں قائم تھا، اور ذیلی ادارے دوسرے صوبوں میں قائم تھے۔

اموی دور میں ہر دیوان کا ایک ذمہ دار ہوتا تھا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی شخص کے ذمہ کئی دیوان کردیئے جاتے، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ شخص نہایت قابل اعتماد ہے۔ مثال کے طور پر عبدالملک بن مروان نے قبیصہ بن ذیب کو دیوان الخاتم کے ساتھ ٹکسال کے انتظام کا بھی ذمہ دار بنایا تھا۔ یزید بن عبدالملک کے دور میں دیوان الخاتم، بیت المال اور خزانہ کی ذمہ داریاں مطیر نامی شخص کے حوالہ تھیں، جو خلیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

22.3.5.1 دیوان الرسائل:

دیوان الرسائل سے مراد وہ شعبہ ہے، جہاں خلیفہ کے خطوط اور تحریریں تیار ہوتی تھیں، اور ارسال کیے جانے والے اور موصول ہونے والے خطوط کا ریکارڈ رکھا جاتا۔ دیوان الرسائل کے ذمہ دار کو کاتب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں بھی خطوط لکھنے اور معاہدے تیار کرنے کا کام ہوتا تھا۔ متعدد کاتب تھے، البتہ کسی ایک کاتب کو پوری ذمہ داری نہیں دی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ حضرت عثمانؓ کے دور سے شروع ہوا تھا، اور خلیفہ کے خطوط و رسائل کے پہلے ذمہ دار مروان بن حکم کو بنایا گیا تھا۔

اموی دور میں اس شعبہ کی مزید ترقی ہوئی، مملکت کی توسیع و ترقی کے ساتھ خلیفہ کی مصروفیات بڑھتی گئیں، جس کی وجہ سے کاتب کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کاتب خلیفہ کے نام لکھے جانے والے خطوط پڑھتا، ان کا خلاصہ تیار کرکے خلیفہ کے گوش گذار کرتا، اور خلیفہ کی طرف سے جواب تیار کرتا۔ اس طرح والیوں اور سپہ سالاروں کے ساتھ خلیفہ کی خط و کتابت دیوان الرسائل کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگئی، نیز دوسرے ممالک کے ساتھ ہونے والے مراسلات کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد ہوگئی۔ اموی دور میں عام طور سے کاتب کا عہدہ عربوں کو یا آزاد کردہ غلاموں کو دیا جاتا، ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا، جو زبان و بیان کے ماہر ہوں، اور کم الفاظ اور بلیغ عبارت میں مفہوم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اموی دور میں کاتب کے منصب کی بہت اہمیت تھی، کیونکہ اس کو خلیفہ کی ہم نشینی کا سب سے زیادہ موقع ملتا، اور وہ خلیفہ کی طرح مملکت کے سارے احوال سے باخبر رہتا تھا۔

22.3.5.2 دیوان الجند:

'دیوان الجند' سے مراد وہ رجسٹر ہے، جس میں فوج کے نام اور ان کی تنخواہیں لکھی جاتی تھیں۔ اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے دیوان کو

ایک ادارہ کی حیثیت عطا کردی تھی، جس میں افراد کو بھی مقرر کیا گیا تھا۔حضرت عمرؓ بن خطاب نے مملکت اسلامی کے مختلف شہروں مثلاً بصرہ، کوفہ اور دمشق میں دیوان الجند کے ذیلی شعبے قائم کئے۔اموی دور میں دیوان الجند کا مرکز مدینہ کے بجائے دمشق ہوگیا۔اور بقیہ شاخیں قائم رہیں، نیز خراسان اور قیروان میں نئی شاخیں قائم ہوئیں۔

دیوان الجند میں ہر گھر، قبیلہ اور شہر میں پائے جانے والے افراد خاندان کی تفصیلات درج ہوتی تھیں، کہ کتنے افراد فوج میں بھرتی ہونے کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، اور کتنے ابھی تک کم عمر ہیں۔اموی دور میں جب زیاد بن ابی سفیان کو کوفہ کا والی بنایا گیا تو اس نے نئے سرے سے مردم شماری کروائی، معلوم ہوا کہ پہلے چالیس ہزار افراد لڑنے کے قابل موجود تھے، جن کی تعداد بڑھ کر ساٹھ ہزار ہو چکی ہے۔ابتدا میں ہر اس شخص کا نام درج دیوان میں شامل کرلیا جاتا، جو بالغ ہوجاتا، بعد میں اس قاعدہ میں ترمیم ہوئی، اور حکومت اپنی ضرورت کے مطابق افراد کے نام ہی رجسٹر میں درج رجسٹر کرنے لگی۔جتنے سپاہی بھرتی ہوتے، ان کے نام لکھ لیے جاتے، اور ان کے نام سے تنخواہ جاری ہوجاتی۔

جس سپاہی کا نام جس شہر کے رجسٹر میں درج ہوتا، اس کے لیے اسی شہر میں قیام ضروری ہوتا۔اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقلی کے لیے خلیفہ کی اجازت ضروری ہوتی۔اموی خلفاء نے اس سلسلہ میں یہ پالیسی بھی اختیار کر رکھی تھی کہ دار الخلافہ کے قریب صرف انہی قبائل کے نام درج رجسٹر کر کے تنخواہیں جاری کرتے، جو ان کے موافق ہوتے۔چنانچہ حضرت معاویہؓ ابتدا میں صرف یمنی قبائل کو ہی بلاد شام میں عطیات جاری کرتے تھے۔بعد میں عدنانی قبائل کو بھی جاری کرنے لگے۔عبدالملک بن مروان نے بکر وائل اور بنو تمیم کے فوجیوں کو دار الخلافہ میں تنخواہیں جاری نہیں کیں، اور کہا کہ یہ فتنہ وفساد بہت کرتے ہیں، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ یہاں ان کی تعداد میں اضافہ ہو۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے افراد نے خوارج کا عقیدہ اختیار کرلیا تھا۔

اموی خلفاء دیوان الجند کے کام کاج پر بذات خود توجہ دیتے، اور اپنی براہ راست نگرانی میں افراد مقرر کرتے، تاکہ افراد کے اندراج اور عطایا کی تقسیم میں غلطیاں نہ ہوں۔اور جو غلطی ہوجائے، اس کی اصلاح کی جائے۔حضرت معاویہؓ کو اطلاع ملی کہ اہل مدینہ اپنے مرحومین کا اندراج دیوان میں نہیں کروارہے ہیں، اور موت کے بعد بھی ان کے نام سے وظیفہ وصول کر رہے ہیں۔یہ دیکھ کر انہوں نے عاصم بن عتبہ کو مدینہ منورہ روانہ کیا، تاکہ وہ دیوان سے ان افراد کا نام خارج کریں، جن کا انتقال ہو چکا ہو، یا جو کہیں اور منتقل ہوگئے ہوں۔اموی خلفا میں ہشام بن عبدالملک سب سے زیادہ دواوین کا جائزہ لیتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے دور میں اندراجات کے رجسٹر تصحیح اور درستی کے اعلی معیار کو پہنچ گئے تھے۔

22.3.5.3 دیوان الخراج:

دیوان الخراج سے مراد وہ دیوان ہے، جہاں خراج کی آمدنی کا حساب رکھا جاتا تھا۔خراج اس ٹیکس کو بولتے ہیں، جو مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم زمین پر اسلامی حکومت کی جانب سے لگایا جاتا تھا۔دیوان الخراج کا آغاز بھی خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوگیا تھا۔دیوان الخراج کے شعبے کوفہ، بصرہ اور دمشق میں قائم تھے، اور مدینہ میں صرف ان کا حساب جاتا تھا۔دیوان الخراج کا تعلق چونکہ مقامی افراد سے زیادہ تھا، اس لیے اس میں حساب وکتاب مقامی زبان میں ہوتا تھا۔

اموی دور میں بھی خلفائے راشدین کے زمانہ کا یہی سلسلہ قائم رہا۔بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں دو علاحدہ علیحدہ دیوان تھے، ایک میں عربی میں حساب وکتاب ہوتا تھا، یہ دیوان الجند تھا۔دوسرے میں خراج کے اموال کا حساب ہوتا تھا، جو مقامی زبان میں تھا، کوفہ اور بصرہ میں فارسی زبان میں، شام میں رومی زبان میں اور مصر میں قبطی اور رومی دونوں زبانوں میں ہوتا تھا۔عبدالملک کے دور میں تمام اسلامی ممالک کے سرکاری کام کاج

عربی میں منتقل کیے گئے، جس میں سب سے اہم دیوان الخراج کی مقامی زبانوں سے عربی میں منتقلی کا عمل تھا، جو کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا۔

اموی دور میں خراج بیت المال کی آمدنی کا بہت اہم ذریعہ تھا۔ حکومت آمدنی کو باقاعدہ بنانے کے لیے خراجی زمینوں کی پیمائش کراتی اور نہایت باقاعدگی سے خراج کا حساب رکھتی تھی۔ اموی خلفاء بذات خود دیوان الخراج کی نگرانی کرتے، اور اس کی تصحیح کراتے رہتے تھے۔

ابتدا میں دیوان الخراج براہ راست خلیفہ کی نگرانی میں کام کرتا تھا، اموی دور میں نظم و نسق کو جب نئے سرے سے ترتیب دیا گیا تو ہر صوبہ کے دیوان الخراج کی ذمہ داری وہاں کے والی کے سپرد کر دی گئی۔ ہر صوبہ میں خراج سے حاصل ہونے والی آمدنی دیوان الخراج میں جمع ہوتی، نہایت نظم وضبط کے ساتھ اس کا حساب رکھا جاتا، اور صوبہ کی ضروریات پوری کی جاتیں، وقتی ضرورتوں اور ناگہانی صورت حال کے لیے کچھ بچا کر رکھ لیا جاتا، اور اس کے بعد جو مال بچتا وہ مرکزی دیوان الخراج میں خلیفہ کے پاس جمع کر دیا جاتا تھا۔

دیوان الخراج میں درج ذیل مدات کی رقمیں جمع ہوتی تھیں:

1. خراج: جو زمینوں کی آمدنی ہوتی تھیں۔
2. جزیہ: جو غیر مسلموں سے فوجی خدمت سے استثنا کی وجہ سے لیا جاتا تھا۔
3. مال تجارت پر لیا جانے والا ٹیکس: اسلامی مملکت میں باہر سے جو تجارتی سامان آتا، یہ اس کا ٹیکس تھا۔
4. خمس: یعنی غیر سرکاری زمین میں اگر خزانہ نکلتا، یا کانیں نکلتیں، تو اس زمین کا مالک اس کا خمس نکال کر دیوان الخراج میں جمع کرتا، بقیہ چار حصے خود رکھ لیتا۔

22.3.5.4 دیوان الصدقات:

اس دیوان میں زکوٰۃ اور عشر وصول کیا جاتا، اور ان کی آمد و خرچ کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔ اموی خلفاء دیوان الصدقات پر علاحدہ عامل مقرر کرتے تھے، دیوان الخراج سے الگ دیوان الصدقات کے ایک علاحدہ شعبہ کے قیام و انتظام کی وجہ یہ تھی کہ دیوان الخراج میں جمع ہونے والی آمدنی حکومت رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کسی بھی مصرف میں صرف کر سکتی تھی، جب کہ دیوان الصدقات میں زکوٰۃ اور عشر کی رقم جمع کی جاتی تھیں، جو صرف خاص افراد میں ہی تقسیم کی جاسکتی تھی، جن کی تعیین قرآن مجید نے کر دی تھی۔ دیوان الصدقات میں درج ذیل مدات کی رقمیں جمع ہوتی تھیں:

1. مال تجارت کی زکوٰۃ، 2. مویشیوں کی زکوٰۃ، 3. کھیتوں اور باغوں کی زکوٰۃ یعنی عشر

22.3.5.5 دیوان الخاتم:

دیوان الخاتم سے مراد وہ شعبہ ہے، جس میں سرکاری فرامین پر مہر لگتی تھی۔ خطوط اور احکامات پر مہر لگانے کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں شروع ہو گیا تھا۔ مہر لگانے کے دو طریقے تھے:

1. پہلے طریقہ میں خط یا عبارت کے آخر میں مہر لگائی جاتی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں عبارت ختم ہوئی، اور حکم نافذ کر دیا گیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مہر کو روشنائی میں بھگو کر عبارت کے نیچے ڈھپہ لگا دیا جاتا۔
2. دوسرا طریقہ یہ تھا کہ خط یا حکم نامہ کو موڑ دیا جاتا، اور اس کے دونوں سروں کو ملا کر اس پر مہر لگائی جاتی، یا کسی غلاف میں ڈال کر غلاف کا منہ بند کر کے اس پر مہر لگائی جاتی۔ اس کے لیے روشنائی کے بجائے کوئی نرم مواد مثلاً موم یا مٹی کا استعمال کیا جاتا، اس کو مطلوبہ جگہ لگا کر اس پر مہر لگا دی جاتی، جس سے مہر کی عبارت اس مواد پر ظاہر ہو جاتی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس جگہ خط یا حکم بھیجا جا رہا ہے، وہاں تک حفاظت

سے پہنچ جائے، اگر راستہ میں کوئی بھی اس خط کو کھولنے کی کوشش کرتا تو مہر توڑے بغیر ممکن نہ ہوتا۔

ابتدا میں مہر کا کام انگوٹھی سے لیا جاتا تھا۔ یہ انگوٹھی خلفاء کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ خط لکھنے کے بعد خلفاء خود ہی مہر لگاتے تھے۔ بعد میں جب رسائل اور فرامین کی کثرت ہوگئی، تو اس کے لیے افراد کا تقرر ہونے لگا، اور علاحدہ شعبہ وجود میں آیا۔ جس شخص کے پاس مہر ہوتی، وہ خلیفہ کا خاص آدمی سمجھا جاتا، کیوں کہ خلیفہ سب سے قابل اعتماد فرد کے حوالہ اپنی مہر کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں عبیداللہ بن اوس غسانی دیوان الخاتم کے ذمہ دار تھے۔ عبدالملک کی مہر قبیصہ بن ذؤیب کے پاس رہتی تھی۔

جو فرمان جاری ہوتا، وہ متعلقہ دیوانوں سے ہوتا ہوا آخر میں دیوان الخاتم میں آتا، اس پر مہر لگتی، پھر وہ جاری کیا جاتا تھا۔

اموی خلفاء کا طریقہ یہ تھا کہ مہر پر اپنے نام کے بجائے کوئی عبارت کندہ کراتے تھے، مثلاً حضرت معاویہ کی مہر پر کندہ تھا: ''**لکل عمل ثواب**'' (یعنی ہر عمل کا بدلہ ہے)۔ عبدالملک بن مروان کی مہر پر کندہ تھا: ''**آمنت به مخلصا**'' (یعنی میں اللہ پر اخلاص کے ساتھ ایمان لایا)۔

یزید بن عبدالملک کے خلیفہ بننے کے بعد ہمیں دیوان الخاتم کے نام سے دو دیوانوں کا ذکر ملتا ہے، ایک دیوان الخاتم الکبیر، دوسرا دیوان الخاتم الصغیر۔ خاتم کبیر سے حکومتی سطح کے فرامین پر مہر لگائی جاتی تھی، اور خاتم صغیر سے خلیفہ کے ذاتی خطوط پر مہر لگائی جاتی تھی۔ دونوں کے لیے علاحدہ افراد کا تقرر ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مختلف شعبہ جات کے لیے الگ الگ مہریں تھیں، آمدنی اور خرچ کے شعبوں میں جو مہریں استعمال ہوتی تھیں، ان پر خلفاء کے نام کندہ تھے، بعض مہروں پر آمدنی کی نوعیت کا تذکرہ تھا، جیسے کہ جزیہ کے اموال کی وصولی کی مہر پر 'جزیۃ' کا لفظ لکھا تھا۔

22.3.5.6 دیوان البرید:

برید یا ڈاک کا نظام خلافت راشدہ میں قائم ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں ڈاک کے انتظام کے لیے عمارتیں خاص کی تھیں۔ اموی دور میں حضرت معاویہؓ نے سب سے پہلے دیوان البرید قائم کیا، تاکہ دور اور قریب کی خبریں ان کے پاس جلد از جلد آسکیں۔ چنانچہ اس کے لیے ڈاک کے نظام کے ماہر لوگوں کو دربار خلافت میں بلوایا، جو ایرانی اور رومی حکومت میں اس نظام سے وابستہ تھے۔ اور ان کی مہارت سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاک کا نیا نظام بنایا، راستوں میں سنگ میل لگوائے، اور ڈاک ٹھہرنے کے لیے اسٹیشن قائم کئے۔ ڈاک لیجانے کے لیے خچروں کا انتظام کیا۔ آگے چل کر زیادہ تیز ڈاک کے لیے گھوڑوں سے بھی مدد لی جانے لگی۔

اموی دور میں ڈاک کا شعبہ مرکزی حیثیت کا تھا، اور براہ راست خلیفہ کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ ہر صوبے کے مرکز میں ایک صاحب البرید کا تقرر ہوتا تھا، جو اس ادارہ کا منتظم ہوتا۔ وہ نہ صرف ڈاک کا نگراں ہوتا، بلکہ خلیفہ کے لیے آنکھ اور کان کا کام کرتا تھا۔ یعنی خلیفہ کو والیوں اور ذمہ داروں کی خبریں بھی پہنچاتا تھا۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں اس شعبہ کو کافی ترقی ہوئی۔ انہوں نے ڈاک کے راستوں کی پیمائش کرائی، اور سنگ میل متعین کرائے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے دربان کو حکم دیا تھا کہ وہ ڈاک کو دروازے پر بالکل بھی نہ روکے، اور فوراً اندر بھیج دے۔ ڈاک کے نظام سے فوج کو روانہ کرنے میں بھی رہنمائی لی جاتی تھی، اور جہاں فوری کمک کی ضرورت ہوتی، وہاں ڈاک کے جانوروں پر سپاہی روانہ کیے جاتے تھے۔ ولید بن عبدالملک کے دور میں قسطنطنیہ سے دمشق تک 'فسیفساء' (یعنی ایک خاص قسم کے تعمیری مواد) کو فراہم کرنے کے لیے بھی ڈاک کے نظام کا سہارا لیا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اس میں مزید ترقی ہوئی، اور سرکاری خطوط کے ساتھ عام لوگوں کے خطوط بھی ڈاک سے ارسال کیے جانے لگے۔

اموی دور میں دیوان البرید نے اسلامی مملکت کے نظم ونسق میں اہم کردار ادا کیا۔ اموی خلفاء نے ڈاک کے نظام کو متعدد مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا، جو درج ذیل تھے:

1.	خطوط اور فرامین کو پہنچانا	2.	مال کو منتقل کرنا۔
3.	سامان پہنچانا	4.	وقتِ ضرورت سپاہی لے جانا
5.	خلیفہ کو علاقوں کے حالات سے باخبر رکھنا	6.	خلیفہ تک حکام اور والیوں کی خبریں پہنچانا

22.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھ کر ہم نے دمشق کی اموی حکومت کے نظم ونسق کے بارے میں واقفیت حاصل کی، ہم نے معلوم کیا ہے کہ بنوامیہ نے کس طرح اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں حکومت کا انتظام کیا، خلافت راشدہ میں قائم ہونے والے شعبوں کو ترقی دے کر بڑھایا، نئے شعبے قائم کئے۔ اور بعد والوں کے لیے نظام حکومت کا ایک بہتر ماڈل پیش کیا۔ اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں درج ذیل اہم نکات کا علم ہوتا ہے:

- اموی دور کے سیاسی نظام میں خلیفہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ خلیفہ تمام رعایا کے دینی اور دنیاوی امور کا ذمہ دار ہوتا، وہی شرعی قوانین نافذ کرتا، صوبوں میں عامل مقرر کرتا، عدالت میں قاضیوں کا تقرر کرتا اور امت کی وحدت کو قائم رکھتا تھا۔
- وزیر، کاتب اور حاجب سلطنت کے کاموں میں خلیفہ کی مدد کرتے تھے۔
- وزیر کا کام سلطنت کے کاموں میں خلیفہ کی مدد کرنا تھا، اموی دور میں باقاعدہ وزراء تو نہیں ہوتے تھے، لیکن عملی اعتبار سے مختلف افراد وزارت کے فرائض انجام دیئے تھے۔
- حاجب کا کام خلیفہ سے ملاقات کو منظّم کرنا تھا، تاکہ خلیفہ کے کاموں میں خلل نہ پڑے، اور عام لوگوں کو براہ راست خلیفہ سے ملنے کے بجائے متعلقہ محکمہ کی رہنمائی کر دی جائے۔
- کاتب کا کام خلیفہ کے خطوط اور فرامین تحریر کرنا تھا، کاتب اس شخص کو مقرر کیا جاتا تھا، جو باصلاحیت ہوتا، اور زبان و بیان پر قدرت رکھتا تھا۔
- اموی خلفاء نے مملکت کے نظم ونسق کو آسان کرنے کے لیے تمام اسلامی مملکت کو پانچ بڑے صوبوں میں تقسیم کیا۔ پہلا صوبہ عرب، دوسرا مصر، تیسرا عراق، چوتھا جزیرہ اور پانچواں صوبہ شمالی افریقہ تھا۔
- صوبوں کی دیکھ ریکھ کے لیے صوبے دار مقرر کیے جاتے تھے، جنہیں عامل، والی یا امیر کہا جاتا تھا۔ صوبہ دار کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ صوبہ کا انتظام کرے۔ ٹیکس وصول کرے، اپنے علاقے سے فوج بھرتی کر کے ضرورت کے مطابق استعمال کرے۔ امن وامان قائم رکھے۔ بعض صوبہ دار خود مختار حیثیت کے حامل ہوتے تھے، اور بعض صوبہ دار تمام معاملات میں خلیفہ سے اجازت لے کر عمل کرتے تھے۔ زیاد بن ابی سفیان، حجاج بن یوسف اور موسیٰ بن نصیر اموی دور کے اہم صوبہ دار تھے۔
- سرکاری کام میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے عبدالملک بن مروان نے حکومت کے تمام شعبوں کی زبان عربی کر دی تھی۔ یہ ایک اہم کام تھا، جس کی وجہ سے عربی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور حکومت کو مالیاتی نظام پر نگرانی کرنا آسان ہوگیا تھا۔
- عبدالملک بن مروان نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ غیر ملکی کرنسی کے بجائے اسلامی کرنسی رائج کی۔ انہوں نے دمشق، حمص اور دوسرے

شہروں میں ٹکسال قائم کی، دینار اور درہم کے اوزان مقرر کیے، نئے سکے ڈھالے، ان سکوں پر اسلامی شعار کندہ کرائے، اور پوری اسلامی مملکت کے معاشی نظام کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔

- اموی دور میں حکومت کے کام کاج کے لیے مختلف شعبے قائم تھے، ان شعبوں کو 'دیوان' کہا جاتا تھا۔ دیوان الرسائل، دیوان الجند، دیوان الخراج، دیوان الصدقات، دیوان الخاتم اور دیوان البرید حکومت کے اہم شعبے تھے۔
- دیوان الرسائل میں خلیفہ کے خطوط اور فرامین تیار کیے جاتے، اور ان کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس دیوان کے ذمہ دار کو کاتب کہا جاتا تھا۔ کاتب نہ صرف خلیفہ کے خطوط تیار کرتا تھا، بلکہ آنے والے خطوط کے خلاصے تیار کر کے خلیفہ کے کام کو آسان بھی کرتا تھا۔ اس عہدہ پر بااعتماد شخص کو مقرر کیا جاتا، اور کاتب کو خلیفہ کا قریبی شخص سمجھا جاتا تھا۔
- دیوان الجند فوج سے متعلق تھا، اس دیوان میں سپاہیوں کے نام، ان کی تفصیلات اور ان کی تنخواہیں درج ہوتی تھیں۔ یہ دیوان دار السلطنت دمشق میں قائم تھا، اور اس کی ذیلی شاخیں مختلف صوبوں میں قائم تھیں۔ اموی دور میں فوجیوں کے گھر والوں کو بھی وظائف جاری ہوتے تھے۔ اور ان کی تفصیلات بھی اسی دیوان میں لکھی جاتی تھیں۔
- دیوان الخراج میں خراج کی آمدنی کا حساب رکھا جاتا تھا۔ خراج اس ٹیکس کو کہتے ہیں، جو مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم زمینوں پر لگایا جاتا تھا۔ اموی دور کے آغاز میں دیوان الخراج ہر علاقے کی مقامی زبان میں تھا، عبدالملک بن مروان نے حکومت کے کام کاج میں یکسانیت لانے کے لیے دیوان الخراج کو بھی عربی زبان میں منتقل کر دیا تھا۔
- دیوان الخاتم اس شعبہ کو کہتے تھے، جہاں سرکاری خطوط اور فرامین پر مہر لگتی تھی۔ سرکاری فرمان جاری ہوتا، تو متعلقہ شعبوں سے ہوتا ہوا دیوان الخاتم میں آتا، اور مہر لگنے کے بعد فرمان کا اجرا ہوتا، یا خط ارسال کیا جاتا تھا۔
- دیوان البرید ڈاک کے شعبہ کا نام ہے، اموی دور میں اس شعبہ کو بہت اہمیت حاصل تھی، اموی خلفا براہ راست اس کو اپنی نگرانی میں رکھتے، اور ڈاک کے علاوہ مختلف علاقوں اور وہاں کے والیوں کے حالات بھی یہیں سے معلوم کرتے۔ ابتدا میں دیوان البرید کے ذریعہ سرکاری خطوط اور فرامین کے لانے لیجانے کا کام ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے کاموں میں اضافہ ہوتا گیا۔ عوام بھی اس نظام سے استفادہ کرنے لگے تھے۔

22.5 کلیدی الفاظ

جمہور امت	:	امت کا بڑا طبقہ، عوام
عود کر آنا	:	واپس آجانا، لوٹ کر آجانا
دواوین	:	دیوان کی جمع: شعبہ، ادارہ
مدات	:	مد کی جمع: رقم، حساب
سبک دوشی	:	کسی ذمہ داری سے فراغت، ریٹائرمنٹ
جند	:	فوج
شرطہ	:	پولیس

انصرام	:	بندوبست کرنا
نفاذ	:	نافذ کرنا، جاری کرنا، لاگو کرنا
اصلاحات	:	اصلاح کی جمع: ترمیم، وہ تبدیلیاں جو عوام کے فائدہ کے لیے کی جائیں۔
ٹکسال	:	وہ جگہ جہاں سکے ڈھالے جائیں
اندراج کرنا	:	درج کرنا، لکھنا
خمس	:	پانچواں حصہ
فسیفساء	:	ایک خاص قسم کا تعمیری مواد، جس کو استرکاری کے لیے استعمال کرتے تھے۔

22.6 نمونہ کے امتحانی سوالات

22.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. بنوامیہ کے ابتدائی دور میں کس دیوان کا کام مقامی زبان میں ہوتا تھا؟

a. دیوان الجند b. دیوان الخراج c. دیوان الخاتم d. دیوان البرید

2. اموی حکومت میں غیر ملکی کرنسی کے بجائے اسلامی کرنسی کو رائج کرنے کا کام کس خلیفہ نے انجام دیا؟

a. امیر معاویہؓ b. مروان بن حکم c. عبدالملک بن مروان d. یزید ثانی

3. خطوط اور فرامین پر مہر لگانے کا کام کس دیوان میں انجام دیا جاتا تھا؟

a. دیوان الانشاء b. دیوان الصدقات c. دیوان الجند d. دیوان الخاتم

4. ڈاک کے شعبہ کو کس نام سے جانا جاتا تھا؟

a. دیوان الانشاء b. دیوان البرید c. دیوان العشر d. دیوان الخراج

5. اموی حکومت میں اسلامی مملکت کو کتنے صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

a. پندرہ b. آٹھ c. دس d. پانچ

6. اموی حکومت میں صوبیدار کی سبک دوشی کی کیا عمر مقرر تھی؟

a. 55/سال b. 58/سال c. 65/سال d. کوئی عمر مقرر نہیں تھی

7. کس خلیفہ نے عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا؟

a. امیر معاویہؓ b. عمر بن عبدالعزیز c. عبدالملک بن مروان d. مروان بن حکم

8. حاجب کسے کہتے ہیں؟

a. خلیفہ کا باورچی b. خط لکھنے والا c. خلیفہ کا دربان d. مہر لگانے والا

9. دیوان الصدقات میں کیا کام ہوتا تھا؟

a. جزیہ کی وصولی b. زکوۃ کی وصولی c. خراج کی وصولی d. سب غلط

10. دیوان الخاتم کا کیا کام تھا؟

a. خطوط لکھنا b. معاہدہ تحریر کرنا c. خراج وصول کرنا d. مہر لگانا

22.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اموی دور میں صوبوں کی تقسیم پر گفتگو کیجیے۔
2. اموی حکومت میں 'دیوان' اور اس کی حیثیت اور اقسام پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. دیوان الرسائل کا تعارف کرائیے۔
4. دیوان الخراج میں کن مدات کی رقمیں جمع کی جاتی تھیں؟
5. اموی دور میں ڈاک کے نظام کو کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا؟

22.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. دمشق کی اموی حکومت کے سیاسی نظام کا مفصل تعارف کرائیے۔
2. اموی حکومت کے مالیاتی نظام اور اصلاحات کے سلسلہ میں عبدالملک بن مروان کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
3. دیوان الخراج اور دیوان الصدقات کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیجیے۔

22.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. تاریخ اسلام : محمد حمید الدین
2. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ : ثروت صولت
3. تاریخ اسلام : شاہ معین الدین ندوی
4. النظم الاسلامیۃ : ڈاکٹر حسن ابراہیم، ڈاکٹر علی ابراہیم
5. تاریخ النظم والحضارۃ الاسلامیۃ : ڈاکٹر فتحیہ عبدالفتاح النبراوی

-:oOo:-

اکائی 23 : عہد اموی میں علوم کا ارتقا (حصہ اول)

اکائی کے اجزا

23.0 تمہید
23.1 مقصد
23.2 عہد اموی میں شرعی علوم کا ارتقاء
23.3 عہد اموی میں علوم قرآن کا ارتقاء
23.3.1 علم تفسیر
23.3.2 تفسیر عہد نبوی میں
23.3.3 تفسیر عہد صحابہ/عہد اموی میں
23.3.4 تفسیر عہد تابعین/عہد اموی میں
23.3.5 عہد تابعین/عہد اموی میں علم تفسیر کے ارتقاء کے اسباب
23.3.6 عہد تابعین/عہد اموی کے تفسیری مکاتب فکر
23.3.7 دیگر قرآنی علوم
23.3.7.1 فن قرأت
23.3.7.1.1 فن قرأت تعریف
23.3.7.1.2 قرأت اور تلاوت کا فرق
23.3.7.1.3 فن قرأت عہد نبوی وصحابہ میں
23.3.7.1.4 عہد اموی میں علم قرأت کی ترقی
23.3.7.1.5 قراء سبعہ اور قرّاء عشرہ
23.3.7.2 علم نقط واعراب القرآن
23.4 عہد اموی میں علم حدیث کا ارتقاء
23.4.1 علم حدیث عہد نبوی اور عہد صحابہ میں
23.4.2 عہد اموی میں تدوین حدیث
23.4.3 تدوین حدیث اور اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز
23.4.4 فن حدیث میں امام زہری کی خدمات

23.4.5 عہد اموی میں احادیث کا تحریری سرمایہ
23.4.6 عہد اموی میں احادیث کے مراکز
23.5 علم فقہ
23.5.1 عہد نبوی وصحابہ میں فقہ
23.5.2 عہد اموی میں فقہ
23.5.3 عہد اموی کے فقہی مراکز
23.5.4 عہد اموی کے فقہی اسکول
23.5.5 عہد اموی میں فقہ کا تحریری سرمایہ
23.6 اکتسابی نتائج
23.7 نمونہ امتحانی سوالات
23.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
23.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
23.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
23.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

23.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں عہد اموی کو ایک اہم دور قرار دیا جاتا ہے۔اس عہد میں جہاں ایک طرف فتوحات کا سلسلہ جاری تھا وہیں دوسری جانب اہم ترین اسلامی علوم وفنون کی بنیادیں بھی رکھی جارہی تھیں۔ایک طرف جہاں علم تفسیر پروان چڑھ رہا تھا تو دوسری جانب سرکاری سطح پر علم حدیث کی تدوین کا آغاز ہو چکا تھا۔فقہ اسلامی پر بھی برگ وبال آنے لگے تھے اور علم فقہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔اسی عہد میں سیرت نبوی اور تاریخ جیسے علوم بھی منظر عام پر آتے ہیں۔دیگر زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں کے عربی ترجمہ کا آغاز بھی اسی عہد میں ہوتا ہے۔اسلامی علوم وفنون کے علاوہ دیگر علوم وفنون بھی اسی عہد میں اپنی ابتدائی منازل طے کر چکے تھے۔عہد اموی کی تمام علمی سرگرمیاں،عہد عباسی میں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور اسے اسلام کا ''سنہرا دور'' بنادیتی ہیں۔

23.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر آپ اموی دور کی ان علمی سرگرمیوں سے واقف ہوں گے جن کا تعلق شرعی علوم-تفسیر،حدیث اور فقہ سے ہے۔اس اکائی کو پڑھ کر آپ اس بات سے واقف ہوسکیں گے کہ عہد اموی میں شرعی علوم کی ابتداء کیسے ہوئی تھی اور کیونکر وہ پروان چڑھے تھے۔اس اکائی کو پڑھ کر آپ اس عہد کے مفسرین،محدثین اور فقہاء اور ان کی علمی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

23.2 عہد اموی میں شرعی علوم کی ابتداء اور ارتقاء

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمام اہم اور بنیادی اسلامی علوم وفنون کی بنیاد عہد اموی میں ہی رکھی گئی تھی۔اس عہد سے پہلے جو علمی سرمایہ ملتا ہے وہ سینوں میں محفوظ تھا جسے اس عہد میں سفینوں میں منتقل کرنے کی شروعات ہوئی تھی تاہم ان پر اصل برگ وبار خلافت عباسی کے دور اول میں آئے تھے اور وہ تمام علوم وفنون اپنے ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہوئے بام عروج کو پہنچ گئے تھے۔اسلامی علوم وفنون کے ارتقاء کا بنیادی سبب بقول ثروت صولت خود اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں کہ قرآن واحادیث میں جابجا علم حاصل کرنے پر ابھارا گیا ہے جس نے مسلمانوں کو اس میدان کا شہسوار بنانے میں اہم کردار کیا ہے۔قرآن وحدیث میں حصول علم کی تاکید کے ساتھ ساتھ خود اس کی تعلیمات اس بات کی متقاضی تھیں کہ ان کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے مختلف علوم وفنون سے واقف ہوا جائے مثلا صرف ونحو اور علم لغت کی بنیاد صرف اس بنا پر پڑی کہ ان کے بغیر قرآن کو کما حقہ نہیں سمجھا جاسکتا تھا اور علم تفسیر کی بنیاد اس لیے رکھی گئی کہ قرآن مجید میں مذکور علم وحکمت کے خزانوں سے واقف ہوا جائے۔اسی طرح دیگر علوم وفنون کا ارتقاء بھی صرف اس لیے ہوا تھا کہ ان کے ذریعہ قرآن واحادیث کو اچھی طرح سمجھا جاسکے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والی ضروریات کے مطابق اور حالات کی مناسبت سے اسلامی احکام کو بیان کیا جاسکے۔

جناب ثروت صولت صاحب نے اموی دور کی علمی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا دور وہ ہے جب حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس بن مالک جیسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ''معلم'' کے فرائض انجام دے رہے تھے اور شاگردوں کی صف میں تابعین کرام تشریف فرما تھے۔جناب ثروت صولت صاحب کی فراہم کردہ اہل علم کی لسٹ کے علاوہ دیگر صحابۂ کرام جیسے خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بھی اسلامی علوم وفنون کی ترسیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

دوسرا دور وہ ہے جس میں تابعین عظام مسند تدریس پر فائز نظر آتے ہیں اور تبع تابعین کی ایک معتد بہ جماعت ان کے حلقۂ دروس میں شامل ہو کر اپنی علمی پیاس بجھا رہی تھی۔مختلف اسلامی علوم وفنون کے ارتقاء میں جن تابعین عظام نے بنیادی کردار ادا کیا تھا ان میں حضرت سعید بن مسیّب (14ھ-94ھ)، حضرت عروہ بن زبیر (23ھ-94ھ)، حضرت مجاہد بن جبیر (21ھ-102ھ)، حضرت شعبی (19ھ-104ھ)، حضرت حسن بصری (20ھ-110ھ)، حضرت قتادہ (61ھ-117ھ)، حضرت مکحول (م 118ھ)، حضرت یزید بن حبیب (52ھ-118ھ)، حضرت امام زہری (50ھ-124ھ)، حضرت حماد راہویہ ()، حضرت عیسی بن عمر نحوی (م 147ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

عہد اموی کی علمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ کے مصنف نے لکھا ہے ''یہ صحیح ہے کہ اموی دور میں ان زبردست علمی سرگرمیوں کے باوجود تصنیف وتالیف کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا۔لوگ حافظہ کو تحریر پر زیادہ ترجیح دیتے تھے......لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، اور طب پر کتابیں لکھی گئیں اور ترجمہ کی گئیں۔اگرچہ ان میں سے اکثر کتابیں اب ناپید ہیں لیکن عباسی دور میں ان علوم پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کی بنیاد اموی دور کی ان ہی کتابوں اور تحریروں پر ہے''۔

23.3 عہد اموی میں علوم قرآن کا ارتقاء

23.3.1 علم تفسیر:

تفسیر کا لفظ ''فَسَّرَ'' (مادہ: ف س ر) سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔فن تفسیر میں قرآن کریم میں مذکور آیات

کریمہ کے معانی ومفاہیم اوران کے مدلولات کوواضح انداز میں بیان کیا جاتا ہےاس لیےاسے''علم تفسیر'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔امام زرکشی نے اپنی مشہور کتاب''البرهان في علوم القرآن ''میں اس علم کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے''تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے قرآن کریم کے مطالب ومعانی معلوم کیے جاتے ہیں اوراس میں مندرج احکام ومسائل اوراسرار وحِکم سے بحث کی جاتی ہے''۔اس فن کا آغاز عہد نبوی میں ہو چکا تھا جومختلف ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہوئے عہد عباسی میں اپنے بام عروج پر پہنچ گیا تھا۔

23.3.2 تفسیر عہد نبوی میں:

قرآن کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا تھا۔عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو آیات قرآنیہ کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں پیش آتی تھی کیوں کہ ان کی مادری زبان عربی تھی۔تاہم کچھ مقامات ایسے تھے جہاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آیات قرآنیہ کے مفہوم ومدلول کے سمجھنے میں دشواری پیش آجاتی تھی لہٰذا جب انہیں اس قسم کی کوئی دشواری پیش آتی تھی وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکراس کے مفہوم ومدلول سے واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔اس اعتبار سے آپ ﷺ قرآن کے سب سے پہلے شارح اور مفسر بھی ہیں کہ آپ ﷺ کا ایک فرض منصبی آیات قرآنیہ کی تشریح وتوضیح بھی تھی جس کی طرف سورہ نحل کی آیت''وَاَنزَلنَا اِلَیکَ الذِّکرَلِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم ''میں اشارہ کیا گیا ہے۔عہد نبوی کا تمام تفسیری سرمایہ احادیث ومرویات کی شکل میں کتب احادیث میں محفوظ کردیا گیا ہے۔

23.3.3 تفسیر عہد صحابہ/عہد اموی میں:

عہد نبوی کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنی آیات کے مدلول ومفہوم کو بیان کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی کہ انہوں نے براہ راست آپ ﷺ سے تفسیر وتشریح کا علم حاصل کیا تھا۔کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے جنھوں نے آپ ﷺ سے اس ضمن میں خاص طور سے استفادہ کیا تھا اسی وجہ سے انھیں''مفسرین صحابۂ کرام'' کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔مفسرین صحابۂ کرام کی جماعت میں حضرت ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس(م68ھ) رضی اللہ عنہما اس لحاظ سے ممتاز ومنفرد ہیں کہ ان کا شمار صاحب تفاسیر صحابہ میں ہوتا ہے۔ان دونوں صحابۂ کرام نے باقاعدہ تفسیر لکھی تھی جو امتداد زمانہ کی نذر ہوکر ناپید ہوگئیں تاہم ان کے اقتباسات بعد میں لکھی جانے والی تفاسیر میں جابجا ملتے ہیں۔ان کے علاوہ جن صحابہ نے اس فن میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا ان میں خلفائے راشدین اور حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ شامل ہیں۔

23.3.4 تفسیر عہد تابعین/عہد اموی میں:

تابعین عظام کا عہد ہی تفسیر کے ارتقاء کا بنیادی دور قرار دیا جاتا ہے کہ اسی عہد میں ہی تفسیر نے ایک 'علم' کی صورت اختیار کرنا شروع کی تھی۔کئی ایک تابعین نے اس فن میں اپنے علم وفضل کا لوہا منوایا ہے۔یہ تمام تابعین کرام مفسرین صحابہ کے تربیت یافتہ تھے اورانھوں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔جن تابعین نے اس فن میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں مسروق بن اجدع(م63ھ)،سعید بن جبیر(م94ھ) ابوالعالیہ رفیع بن مہران(م90ھ)،محمد بن کعب قرظی(م118ھ)،عطاء بن ابی رباح(27ھ-114ھ)،مجاہد بن جبر(21ھ-104ھ)،عکرمہ مولی ابن عباس(م104ھ)،ضحاک بن مزاح(م105ھ)،عطیہ بن سعد کوفی(م111ھ)،قتادہ بن دعامہ سدوسی(م117ھ)،اورابوالشعثاء وغیرہ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا تابعین میں سے سعید بن جبیر،مجاہد،حسن بصری،ابوالعالیہ رفیع بن مہران بصری،محمد بن کعب قرظی،عطاء بن ابی رباح،ابوحمزہ،محمد بن علی ہاشمی(امام باقر) اورابن جریج کے حوالہ سے مصادر میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ انہوں نے باقاعدہ تفسیر لکھی تھی اورانہیں مدون کیا تھا

تاہم ان کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں لیکن ان کے اقتباسات عہد عباسی میں لکھی جانے والی کتب تفسیر میں ملتے ہیں۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہی ناپید کتب عہد عباسی میں مرتب کی جانے والی کتب تفسیر کی بنیاد و اساس ہیں۔

23.3.5 عہد تابعین/عہد اموی میں علم تفسیر کے ارتقاء کے اسباب:

عہد اموی میں تفسیر کے فروغ کا بنیادی سبب تو وہی تھا جو عہد نبوی میں اس فن کی ابتداء کا سبب قرار دیا جاتا ہے یعنی جس طرح عہد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو آیات قرآنیہ کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی اور وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس جا کر انہیں سمجھ لیا کرتے تھے اسی طرح عہد صحابہ میں تابعین عظام کو بھی یہی دشواری پیش آئی لہٰذا وہ صحابۂ کرام سے رجوع کر کے اپنے اشکالات کو دور کر لیا تھے۔

عہد اموی تفسیر کے ارتقاء کا دوسرا سبب عوامی اور عمومی تھا کہ خلافت راشدہ میں اسلامی حکومت کے رقبہ میں ہونے والی توسیع کے نتیجہ میں دیگر اقوام و ملل کے ان افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی لہٰذا انہیں قرآن کریم پڑھنے کے ساتھ ساتھ سمجھنے میں دشواریاں پیش آنے لگیں۔یہی دشواریاں اس عہد میں بہت سے علوم و فنون کی ابتداء اور ارتقاء کا سبب بن گئی تھیں جیسے علم قراءت وتجوید،علم رسم الخط،علم الاعراب،علم نحو،علم صرف اور علم لغت جیسے علوم و فنون کی ابتداء وارتقاء صرف اہل عجم کو پیش آنے والی دشواریوں کے سبب ہی ہوا تھا۔

23.3.6 عہد تابعین/عہد اموی کے تفسیری مکاتب فکر:

عہد تابعین/عہد اموی میں تفسیر کا فن ارتقاء کی جانب گامزن تھا اور اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا۔اس عہد کے تمام مفسرین نے مفسرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا تھا اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔مذکورہ عہد میں فن تفسیر کا اتنا بول بالا تھا کہ تفسیر کے تین مکاتب فکر-مکی مکتب تفسیر،مدنی مکتب تفسیر اور عراقی مکتب تفسیر-سامنے آتے ہیں۔یہ مکاتب فکر مکہ،مدینہ،عراق(کوفہ اور بصرہ) کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں کہ انہیں شہروں میں فن تفسیر نے اپنے ارتقائی مراحل کو طے کیا تھا۔ان شہروں میں الگ الگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے اپنے تفسیری حلقے قائم کیے تھے جنھوں نے آگے چل کر مکاتب تفسیر کی شکل اختیار کر لی تھی اسی بنا پر انہیں ان شہروں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

مکی مکتب تفسیر: حضرت عبداللہ بن عباس کا مقام و مرتبہ مفسرین صحابہ میں بہت ہی ممتاز قرار دیا جاتا ہے۔انھوں نے فن تفسیر کو براہ راست آپ ﷺ سے حاصل کیا تھا۔ان کے بارے میں روایات میں ملتا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں اپنا حلقۂ درس لگاتے تھے اور جو کچھ آپ ﷺ سے حاصل کیا تھا اس کی ترسیل کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔انھوں نے مختلف علوم و فنون کے درس کے لیے ایک ہفتہ واری ٹائم ٹیبل بھی بنا رکھا تھا اور اسی کے مطابق علوم و فنون کا درس دیا کرتے تھے۔

مکی مکتب تفسیر کا بانی حضرت عبداللہ بن عباس کو قرار دیا جاتا ہے کہ انہوں نے مکہ میں ہی رہتے ہوئے اس فن کو پروان چڑھایا تھا۔اس مکتب فکر کے نمائندہ مفسرین میں حضرت مجاہد بن جبر (21ھ-104ھ)،عطاء بن ابی رباح (27ھ-114ھ)،عکرمہ مولی ابن عباس (م104ھ)،طاؤس بن کیسان یمانی (م106ھ)،ابوالشعثاء اور سعید بن جُبیر (م95ھ) کا شمار کیا جاتا ہے۔

مدنی مکتب تفسیر: مدنی مکتب تفسیر کی تاسیس حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔حضرت ابی بن کعبؓ بھی براہ راست مکتب نبوی کے فیض یافتہ تھے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر علم نبوی سے مستفاد علم کو دوسروں تک پہنچانے میں مصروف عمل رہا کرتے تھے۔اس مکتب فکر کے نمائندہ مفسرین میں ابوالعالیہ رفیع بن مہران (م90ھ)،محمد بن کعب قرظی (م118ھ) زید بن اسلم (م118ھ)۔مؤخر الذکر کے تلامذہ میں امام مالک بن انس جیسے اصحاب علم و فضل شامل ہیں۔

عراقی مکتب تفسیر: عراقی مکتب تفسیر کا بانی مبانی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اس علم کو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حاصل کیا تھا اور اس کو فروغ دینے کے لیے کوفہ کو اپنا مرکز بنایا تھا کہ آپ ﷺ نے ہی انہیں اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے وہاں بھیجا تھا۔ عراقی مکتب تفسیر دیگر مکاتب تفسیر سے اس لحاظ سے منفرد قرار دیا جاتا ہے کہ اسی مکتب فکر نے تفسیر بالماثور کے ساتھ تفسیر بالرائے کو پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا جس نے آگے چل کر تفسیر کو دو بنیادی زمروں تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے میں تقسیم کر دیا تھا۔

عراقی مکتب تفسیر کے مکاتب تفسیر: عراق اسلامی سلطنت کا ایک وسیع و عریض علاقہ تھا جو کئی شہروں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے کے دو شہر کوفہ اور بصرہ اپنی علمی سرگرمیوں کی وجہ سے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں کہ یہاں بہت سے علوم وفنون پروان چڑھے تھے۔ ان دونوں شہروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں عہد اموی میں وہی مقام و مرتبہ حاصل تھا جو عہد عباسی میں بغداد کو حاصل تھا۔ اسے بھی حسن اتفاق ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ شہر بھی عراق میں ہی واقع ہے۔

عراقی مکتب تفسیر کو اس کے نمائندہ مفسرین کے اعتبار سے حسب ذیل دو مکاتب تفسیر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

کوفی مکتب تفسیر: اس مکتب تفسیر کے مفسرین کا تعلق شہر کوفہ سے تھا یا انہوں نے اپنے حلقۂ دروس کو اس شہر میں قائم کیا تھا لہٰذا ان کے مکتب تفسیر کو ''کوفی مکتب تفسیر'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس اسکول کے مشہور مفسرین میں علقمہ بن قیس (م 62ھ)، مسروق بن اجدع (م 63ھ)، اسود بن یزید (م 75ھ)، مُرّہ ہمدانی (م 76ھ) اور عامر شعبی (20ھ-109ھ) جیسے ائمہ تفسیر شامل ہیں۔

بصری مکتب تفسیر: اس مکتب تفسیر کے مفسرین کا تعلق شہر بصرہ سے تھا یا انہوں نے اپنے حلقۂ دروس کو اس شہر میں قائم کیا تھا لہٰذا ان کے مکتب تفسیر کو ''بصری مکتب تفسیر'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مکتب تفسیر کے اہم اور نمائندہ مفسرین میں حضرت امام قتادہ (م 117ھ) اور حضرت امام حسن بصری (م 110ھ) کا شمار ہوتا ہے۔

23.3.7 دیگر قرآنی علوم:

23.3.7.1 فن قرأت:

23.3.7.1.1 فن قرأت کی تعریف:

فن قرأت سے مراد وہ علم ہے جس میں قرآن مجید کے الفاظ کی ادائیگی اور اس کے اختلاف سے واقف ہوا جاتا ہے۔ بقول مقالہ نگار دائرۃ المعارف ''قرأۃ عربی میں مصدر ہے اور اس کے مطلق معنی پڑھنے کے ہیں۔ علم القراءات سے وہ علم مراد ہے جس میں قرآنی کلمات کے ادا کی کیفیت اور اس میں جو اختلاف ہے وہ بیان کیا جاتا ہے اور اختلاف قراءات کو اس کے ناقلین کی جانب منسوب کیا جاتا ہے تا کہ قرآن مجید میں لفظ اور لہجے کی تحریف کو راہ پانے کا موقع نہ ملے''۔

23.3.7.1.2 قرأت اور تلاوت کا فرق:

قرأت اور تلاوت میں فرق یہ کہ تلاوت صرف قرآن مجید کے پڑھنے کو کہا جاتا ہے جب کہ قرأت سے مراد تلاوت کے دوران کسی امام کے منہج کو اختیار کرنا ہے۔

23.3.7.1.3 فن قرأت عہد نبوی وصحابہ میں:

فن قرأت کا آغاز عہد نبوی سے ہوتا ہے جس میں عہد بہ عہد ترقی ہوتی گئی حتی کہ اس نے ایک علم کی شکل اختیار کر لی۔ بقول ڈاکٹر شوقی ضیف آپ ﷺ نے قبائل کے لہجات کی رعایت کرتے ہوئے تلاوت فرماتے تھے تاکہ وہ قرآن کریم کی آیات کریمہ کی تلاوت آسانی سے کر سکیں۔ اس اختلاف قرأت کی مثال عہد اموی میں ہی ملتی ہے کہ صحابۂ کرام مختلف طریقوں سے آیات کریمہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت عمر اور حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ نے دونوں کی قرأت کو صحیح قرار دیا تھا۔

اس علم کی بنیاد عام طور پر حدیث نبوی ''انزل القرآن علی سبعة احرف، فاقرؤا ما تیسر منه '' کو قرار دیا جاتا ہے لیکن الاتقان فی علوم القرآن کے مؤلف نے اس نظریہ کو غلط بتاتے ہوئے اسے اجماع علماء کے خلاف قرار دیا ہے اور اس خیال کے ہم نوا لوگوں کو جاہل قرار دیا ہے۔

آیات قرآنیہ کی مختلف قراءتوں کا ذکر عہد نبوی وصحابہ میں بھی پایا جاتا ہے جس نے خلافت راشدہ میں خصوصاً خلافت عہد عثمانی میں ایک سنگین شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ عہد خلافت عثمانی میں صحابۂ کرام اپنے اپنے علم کے مطابق قرآنی آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے قرأت کے اختلافات بڑھتے چلے جا رہے تھے جس سے قرآن کریم میں تحریف کا اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا۔ اس فتنہ کو مکمل طور پر سر اٹھانے سے پہلے ہی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تمام امت اسلامیہ کو ایک مصحف پر جمع کر کے ختم کر دیا تھا۔ مصحف عثمانی میں نقطے نہیں لگے ہوئے تھے اور اس کی کتابت کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ اس میں عہد نبوی کی تمام متواتر قراءتیں سما گئی تھیں۔

23.3.7.1.4 عہد اموی میں علم قرأت کی ترقی:

فن قرأت اور اس کی روایات کی تدوین کا آغاز بنیادی طور عہد اموی سے ہوتا ہے اور دوسری صدی کے اختتام تک اس فن پر کافی برگ وبال آچکے تھے۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، لاہور کے مقالہ نگار کے مطابق فن قرأت پر سب سے پہلی تصنیف ابوعمرو بن علاء بصری (م 154ھ) کی ہے۔ دیگر اسلامی علوم وفنون کی طرح اس فن کے بنیادی مراکز مکہ، مدینہ بصرہ، کوفہ اور شام تھے۔

قرّ اسبعہ /عشرہ کے علاوہ اس عہد کے مشہور قراء میں عبیدہ سلمانی (م 72ھ)، عبداللہ بن عیاش (م 78ھ)، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابوعمرو شیبانی سعد بن ایاس کوفی (م 96ھ)، یحییٰ بن وثاب (م 103ھ)، مجاہد بن جبر (21-104ھ)، حسن بصری (م 110ھ)، مسلم بن جندب ہذلی (م بعد 110ھ/ ایک قول کے مطابق 130ھ)، عکرمہ (م 115ھ)، عبداللہ بن ابی اسحاق (م 117ھ)، عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج (م 117ھ)، ابن مُحیصن (م 123ھ)، عاصم جحدری (م 128ھ)، شیبہ بن نصاح (م 130ھ)، یزید بن رومان (م 130ھ)، جعفر بن محمد صادق (م 148ھ)، محمد بن عبدالرحمٰن معروف بہ قاضی ابن ابی لیلی (م 148ھ)، عیسی بن عمر (م 149ھ) وغیرہ جیسے ائمہ فن قراءت شامل ہیں۔

23.3.7.1.5 قراء سبعہ اور قرّ اءعشرہ:

قرآن کی قرأت کی بہت ساری روایات بیان کی جاتی ہے جن کی تعداد سات سے پچاس تک بیان کی جاتی ہے۔ ان قرأت میں قرأت سبعہ (سات قرأت) اور قرأت عشرہ (دس قرأت) سب سے زیادہ مشہور ہیں اور انہیں قبول عام حاصل ہے اور ان کے راویان کو بالترتیب قرّ اسبعہ اور قرّ اءعشرہ کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔

مشہورترین سات قاریوں/ دس قاریوں (قرّ اءسبعہ/قرّ اعشرہ) نے مملکت اسلامی کے مختلف شہروں میں رہتے ہوئے اس فن کی ترویج

واشاعت کے فرائض انجام دیے تھے۔

کتاب السبعة في القراء ات کے مصنف اورفن قرأت کے مشہور امام ابن مجاہد، احمد بن موسیٰ (245-324) کے مطابق حسب ذیل ائمہ فن کو قرّاءسبعہ قرار دیا جاتا ہے:

☆مدینہ: ابوعبدالرحمٰن نافع بن عبدالرحمٰن (م169ھ)

☆مکہ: عبداللہ بن کثیر داری (45-120ھ)

☆کوفہ: ابوبکر عاصم بن بہدلہ ابی النجو دکوفی (م127ھ)،حمزہ بن حبیب الزیّات (80-156ھ)،علی بن حمزہ کسائی (م189ھ)

☆بصرہ: ابوعمرو بن علاء (68-154ھ)

☆شام: عبداللہ بن عامر (م118ھ)

النشر في القراء ات العشر کے مصنف ابن جزری، محمد بن محمد (751-833ھ) نے مذکورہ بالا قراء سبعہ میں حسب ذیل تین قاریوں کا اضافہ کرتے ہوئے انہیں قرّاءعشرہ قرار دیا ہے:

☆مدینہ: ابوجعفر یزید بن قعقاع (م130ھ)

☆بصرہ: یعقوب بن اسحاق حضرمی (117-205ھ)

☆کوفہ: خلف (150-229ھ)

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ قرّ اسبعہ/عشرہ کی اکثریت کا تعلق عصر اموی سے تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ اسی عہد میں گذارا تھا۔قرّ اسبعہ/عشرہ میں صرف امام علی بن حمزہ کسائی اور امام خلف ایسے قاری ہیں جنھیں عہد اموی کے ائمہ فن میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کا صرف بچپن عہد اموی میں گذرا تھا اور مؤخر الذکر کی پیدائش ہی عہد اموی کے بعد ہوئی تھی۔

23.3.7.2 علم نقط واعراب القرآن:

عہد اموی میں قرآن کے حوالہ سے کئی اور خدمات انجام دی گئی ہیں جیسے قرآن پر نقطوں اور اعراب کا لگایا جانا۔اس کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت تک لوگ مصحف عثمانی کے مطابق تلاوت کرتے رہے لیکن اسلامی مملکت کے حدود اربعہ میں اضافے کے بعد بہت سے لوگ خاص طور سے عجم سے تعلق رکھنے والے افراد قرآن کی تلاوت میں غلطی کرنے لگے تھے۔یہ واقعات عراق میں بہت زیادہ پیش آنے لگے تو حجاج بن یوسف نے اپنے کاتبوں کو باہم مشابہ الفاظ پر علامات مقرر کرنے کو کہا تا کہ تلاوت کی غلطیوں سے بچا جا سکے۔اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول نصر بن عاصم یا یحییٰ بن یعمر نے قرآن مجید پر نقطے لگائے تاہم غلطی کے امکانات موجود تھے اس لیے اعراب لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ایک قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایماء پر ابوالاسود دؤلی (م69ھ) نے قرآن مجید پر اعراب لگائے تھے۔نقط مصاحف کے موضوع پر سب سے پہلے بصرہ کے قاضی ابوالاسود دؤلی نے ایک مختصر رسالہ مرتب کیا تھا۔

23.4 عہد اموی میں علم حدیث کا ارتقاء

23.4.1 علم حدیث عہد نبوی اور عہد صحابہ میں:

اسلامی شریعت کے مصادر و مآخذ میں احادیث نبویہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کے

نزول اور آیات کریمہ کو احادیث نبویہ سے الگ رکھنے اور ان دونوں کے درمیان خلط ملط سے بچنے کی خاطر احادیث کو مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اس عہد میں ''تدوین کے مروجہ مفہوم'' میں احادیث نبویہ کی تدوین نہیں کی گئی تھی لیکن اس اعتبار سے غلط ہے کہ انہیں قلم وقرطاس کے حوالہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس عہد میں بھی بعض صحابۂ کرام کے متعلق صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے احادیث کے مجموعے اکٹھا کیے تھے بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ عہد اموی میں کم از کم پچاس صحابۂ کرام اور ڈیڑھ سو سے زیادہ تابعین عظام نے احادیث پر مشتمل مختصر یا متوسط ضخامت کے صحیفے مرتب کیے تھے۔ صحابۂ کرام کا اتنی بڑی تعداد میں احادیث کے مجموعوں کو مرتب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کچھ نہ کچھ عہد نبوی میں بھی مرتب کیے گئے ہوں گے۔

23.4.2 عہد اموی میں تدوین حدیث:

قرآن اور قرآنی علوم کے بعد عہد اموی میں علم حدیث کو سب سے زیادہ فروغ ملا تھا۔ اس عہد میں مدینہ سب بڑا مرکز حدیث تھا جہاں سے احادیث کی ترسیل بڑے پیمانہ پر کی جا رہی تھی۔ علم حدیث کے دیگر مراکز میں کوفہ، بصرہ اور دمشق وغیرہ تھے۔ عہد نبوی وعہد صحابہ میں عام طور سے احادیث کی ترسیل زبانی ہوتی تھی تاہم کچھ صحیفے مرتب بھی کیے گئے تھے جن کا ذکر مصادر میں ملتا ہے۔

عہد اموی میں تدوین احادیث کا کام باقاعدہ اور سرکاری طور پر شروع کیا گیا تھا اس عہد میں مرتب کیے جانے والے صحف احادیث میں صحیفۂ ہمام بن منبہ (40ھ-101ھ/660ء-719ء)، صحیفۂ حُمید طویل بصری (68ھ-142ھ/687ء-759ء) اور صحیفۂ خراش بن عبداللہ وغیرہ جیسے مجموعۂ احادیث شامل ہیں۔ مذکور مجموعۂ احادیث میں ''صحیفۂ ہمام بن منبہ'' کو دستیاب شدہ پہلا مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے۔

عہد اموی کے سرمایۂ حدیث میں سب سے اہم سرمایہ 'کتاب المؤطا' ہے جسے امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے مرتب کیا تھا۔

23.4.3 تدوین حدیث اور اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز:

تدوین احادیث کا آغاز عہد نبوی وصحابہ میں ہی ہو چکا تھا تاہم منظم اور سرکاری سطح پر احادیث نبویہ کی تدوین کا آغاز اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ہوا تھا۔ انھوں نے سرکاری حکم کے ذریعہ احادیث کی جمع وتدوین کا آغاز کیا اور اس وقت کے تمام اکابر محدثین تابعین جیسے عامل مدینہ ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم (م117ھ)، عمرہ بنت عبدالرحمٰن (م98ھ)، قاسم بن محمد (م107ھ)، امام زہری (م124ھ) وغیرہ کو فرامین روانہ کیے اور ان سے احادیث کو جمع کرنے کی درخواست کی۔ ان ماہرین حدیث کے علاوہ انہوں نے تمام بڑے شہروں کے حکام کو ایک عمومی فرمان بھی جاری کیا تھا جس میں احادیث کو جمع کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان عمومی اور خصوصی فرامین کی مشترک بات یہ تھی کہ انہیں احادیث کے ضائع ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔

انھوں نے صرف فرامین جاری کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ جب احادیث کا معتد بہ ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تو علماء وفقہاء کی ایک میٹنگ بلا کر اس جمع شدہ ذخیرہ کے تعلق سے گفتگو بھی فرمائی اور اس کی تدوین کے اسباب فراہم کیے۔ بقول جناب ثروت صولت ''حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر اسلامی مملکت کے ہر حصے سے احادیث کے مجموعے مرتب کر کے دمشق بھیجے گئے جہاں سے ان کی نقلیں اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں بھیجی گئیں''۔

23.4.4 فن حدیث میں امام زہری کی خدمات:

اموی عہد میں حدیث کے علم کو بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ حدیث کی ترسیل میں عہد اموی کے صحابہ کرام وتابعین عظام نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ اس عہد کے اہم ترین محدثین میں امام محمد بن مسلم معروف بہ ابن شہاب زہری کا درجہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

'زبانی ترسیل کے علاوہ اموی خلیفہ ہشام کے حکم پر حدیث کی ایک کتاب بھی مرتب کی تھی'۔ان کے علم وفضل کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے ذاتی طور پر حدیث جمع کرنے کی درخواست کی تھی۔خلیفۂ وقت نے ان کے علاوہ دیگر محدثین عظام سے بھی حدیث کو جمع کرنے کی درخواست کی تھی۔اس سے حتمی طور پر نہ سہی ظنی طور پر ہی سہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خلیفۂ وقت نے محدثین عظام کا ایک بورڈ بنادیا تھا جن کے ذمہ احادیث نبوی کو نہ صرف جمع کرنا تھا بلکہ جمع شدہ ذخیرہ کی چھان پھٹک کے بعد انہیں مدون کرنا بھی تھا۔اس بورڈ کے اہم ارکان میں امام زہری بھی شامل تھے بلکہ بعض روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس بورڈ کے صدر تھے اور ان ہی کی نگرانی میں تدوین حدیث کا کام مکمل ہوا تھا۔اسی بنیاد پر ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے احادیث کی تدوین کی تھی۔اس اولیت کا ذکر انہوں نے خود بھی کیا ہے اور انہیں یہ کہنے کا حق بھی حاصل ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے علم حدیث کو مدون نہیں کیا تھا۔

علم حدیث کے فروغ میں امام زہری کی خدمات کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طلب حدیث میں ان کا ڈوب جانا ہی آگے چل کر تدوین حدیث کا سبب بن گیا تھا جس کی طرف اس عہد کے ایک اہم محدث ابوالزناد عبدالرحمٰن بن ذکوان قرشی نے اپنے ایک قول میں اشارہ کیا ہے۔ان کا قول تھا کہ ہم حلال وحرام ہی لکھ رہے تھے اور ابن شہاب جو بات سن لیتے لکھ لیتے۔جب اس کی ضرورت سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ سب سے زیادہ عالم حدیث تھے۔

23.4.5 عہد اموی میں احادیث کا تحریری سرمایہ:

بقول ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب مؤلف ''السنۃ قبل التدوین''(اردو ترجمہ: تاریخ تدوین سنت از مولانا حکیم عزیز الرحمٰن) عہد اموی میں احادیث کی کتابت میں روز افزوں ترقی کی بنا پر دوسری صدی کے نصف اول تک احادیث کے مدون شدہ نسخے اسلامی سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے تھے اور بہت ہی تھوڑے عرصہ میں عوام کے درمیان رائج ہو گئے تھے۔پھر محدثین نے ان صحیفوں سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں ابواب کے تحت جمع کرنا شروع کر دیا جو سنن، جامع اور مصنف کے نام سے موسوم کیے گئے تھے۔

23.4.6 عہد اموی میں احادیث کے مراکز:

محمد عجاج الخطیب نے علم حدیث کے اولین مصنفین کا ذکر اس عہد کے علمی مراکز کے اعتبار سے کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

- ☆ مکہ: عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج بصری (م150ھ)۔
- ☆ مدینہ: مالک بن انس (93ھ-179ھ)، محمد بن اسحاق (م151ھ) اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب (80ھ-158ھ)۔

مؤخر الذکر کے حوالہ سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی کتاب امام مالک کی **کتاب المؤطا** سے کہیں زیادہ ضخیم تھی اور اس کا نام بھی انہوں نے ''**کتاب المؤطا**'' ہی رکھا تھا۔

- ☆ بصرہ: ربیع بن صبیح (م160ھ) سعید بن ابی عروبہ (م156ھ) اور حماد بن سلمہ (م167ھ)۔
- ☆ کوفہ: سفیان ثوری (م161ھ)۔
- ☆ یمن: معمر بن راشد (95ھ-153ھ)۔
- ☆ شام: عبدالرحمٰن بن عمر اوزاعی (88ھ-157ھ)۔

مذکورہ لسٹ میں راغب الطباخ نے سعید بن عروبہ (م156ھ) کا اضافہ کیا ہے لیکن ان کے شہر کا نام نہیں بتایا ہے۔

مذکورہ بالا مصنفین حدیث کے علاوہ دیگر کئی ایک محدثین کا ذکر مذکورہ بالا مصنف نے کیا ہے جنھوں نے احادیث کو تحریری شکل میں مرتب کیا تھا جیسے عروہ بن زبیر، موسی بن عقبہ، ہمام بن منبہ، محمد بن سوقہ (م135ھ)، اشعث بن عبد الملک حمرانی (م132ھ) عقیل بن خالد (م132ھ) یحیٰ بن سعید انصاری (م143ھ)، عوف بن ابو جمیلہ عبدی (م146ھ) وغیرہ۔

اس عہد کے دیگر محدثین میں حضرت سعید بن مسیّب، سالم بن عبداللہ بن عمر، سعید بن جبیر، عبدالرحمٰن بن ابی لیلی، عامر شعبی، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، نافع مولی ابن عمر، عکرمہ مولی ابن عباس، علقمہ بن قیس، قتادہ سدوسی، مجاہد بن جبر، محمد بن سیرین، محمد بن منکدر، مکحول شامی اور حسن بصری علیہم الرحمہ وغیرہ شامل ہیں۔ قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے اپنی کتاب ''خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت'' میں مذکورہ بالا اکثر محدثین کے حوالہ سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے حلقۂ دروس قائم کر رکھے تھے اور ان کی اپنی اپنی درس گاہیں تھیں جہاں قرآن وحدیث اور فقہ وسیرت نبوی جیسے اسلامی علوم پر درس دیا کرتے تھے۔ ان حلقۂ دروس کا اسلامی علوم وفنون خاص طور سے تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت نبوی ﷺ کی اشاعت میں کافی نمایاں حصہ ہے۔

23.5 فقہ

23.5.1 عہد نبوی وصحابہ میں فقہ:

عہد نبوی میں فقہی مسائل میں صحابۂ کرام آپ ﷺ سے رجوع کرتے تھے اور اپنے مسائل کو حل کرلیا تھے جس کی متعدد مثالیں کتب احادیث میں مذکور ہیں گویا عہد نبوی میں حدیث میں فقہ شامل تھی۔ عہد صحابہ میں فقہی مسائل کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے رجوع کیا جاتا تھا اور وہ ان کا قرآن وحدیث کی روشنی میں حل پیش کردیا کرتے تھے۔

صاحب فتاوی صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو خاص مرکزیت حاصل تھے اور وہ اپنے اپنے علاقوں میں مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔ صاحب فتاوی صحابۂ کرام حسب ذیل مراکز پر اپنے علم وفضل کے دریا بہارہے تھے اور تشنگان علم اپنی علمی پیاس بجھارہے تھے:

☆ مدینہ منورہ: اہل مدینہ عام طور سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فتاوی پر عمل کرتے تھے۔

☆ کوفہ: اس علاقے کے لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاوی پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

☆ مکہ: اس شہر کے باشندے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاوی کو اپنا حرز جان بنائے ہوئے تھے۔

☆ مصر: اہالیان مصر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے فتاوی کی اتباع کرتے تھے۔

23.5.2 عہد اموی میں فقہ:

عہد اموی میں علم فقہ نے بھی کافی ترقی کی جس کی شروعات عہد نبوی وصحابۂ کرام سے ہوچکی تھی۔ اس عہد میں موجود تابعین عظام ان صحابۂ کرام سے رجوع کرتے تھے جو صاحب فتاوی تھے اور ان سے علم فقہ وفتاوی کو حاصل کرتے تھے۔ صاحب فتاوی صحابۂ کرام مملکت اسلامی کے مختلف علاقوں میں مقیم تھے لہٰذا ہر علاقے کے افراد اپنے اپنے علاقے میں موجود صحابی رضی اللہ عنہ کے فتاوی پر اکثر بیشتر عمل کرتے تھے اور ان کے فتاوی سے بہت کم تجاوز کرتے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد اموی تک تفسیر، حدیث، فقہ اور سیر ومغازی جیسے علوم وفنون پر تمام اکابر صحابہ اور

تابعین عظام یکساں مہارت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا علوم وفنون کے ماہرین میں تقریبا ایک جیسے ہی نام ملتے ہیں اور وہ سب بیک وقت ان سارے علوم وفنون کے ماہر ہوتے تھے تاہم دھیرے دھیرے ان علوم وفنون میں تخصص وامتیاز پیدا ہوتا چلا گیا اور ماہرین فن پیدا ہوتے چلے گئے اور مختلف علوم وفنون کی درجہ بندی ہوتی چلی گئی۔

عہد تابعین میں ان صحابۂ کرام سے رجوع کیا جاتا تھا جو صاحب فتاوی تھے اور مملکت اسلامی کے مختلف علاقوں میں مقیم تھے لہٰذا ہر علاقے کے علم کے متوالے تابعین اپنے اپنے علاقے میں موجود صحابی رضی اللہ عنہ کے فتاوی پر اکثر بیشتر عمل کرتے تھے اور ان کے فتاوی سے بہت کم تجاوز کرتے تھے۔

23.5.3 عہد اموی کے فقہی مراکز:

عہد اموی میں قرآن وحدیث کی طرح فقہ کے بھی چار بنیادی مرکز تھے لیکن ان میں بھی مدینہ منورہ کو سب سے بڑے مرکز ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اس مرکز کے فقہائے سبعہ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی جنھوں نے اس فن کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ فقہائے سبعہ کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ ہذلی، عروہ بن زبیر اسدی، قاسم بن محمد بن ابی بکر تیمی، سعید بن مسیّب، سلیمان بن یسار، ابوبکر محمد بن عبدالرحمٰن مخزومی اور خارجہ بن زید علیہم الرحمہ۔

دیگر اہم مدنی فقہاء میں ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان قرشی، زید بن اسلم، یحییٰ بن سعید انصاری کا شمار ہوتا ہے جو بیک وقت فقیہ، مفسر ومحدث تھے۔

عہد اموی کے دیگر علمی مراکز میں کوفہ، بصرہ اور شام کے مراکز علمی تھے جہاں سے بڑے بڑے فقہاء پیدا ہوئے تھے۔ ان فقہاء میں ربیعہ بن فروخ الرائی، ابراہیم نخعی، عامر شعبی، قاضی شریح، حسن بصری، مکحول دمشقی، قبیصہ بن ذؤیب، حماد اشعری وغیرہ کا شمار اہم فقہاء میں ہوتا ہے۔

23.5.4 عہد اموی کے فقہی اسکول:

عہد اموی میں علم فقہ کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی عہد کے اواخر میں حسب ذیل فقہی اسکول پروان چڑھے تھے:

☆ امام اوزاعی کا فقہی اسکول: اس اسکول کو اس عہد کا سرکاری فقہی اسکول کہا جاسکتا ہے کہ اس کے پیرو تمام اموی خلفاء اور بیشتر کارکن کے ساتھ ساتھ اہل شام تھے۔ اس اسکول کے بانی امام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی تھے۔ ان کا فقہی مکتب فکر دوسری صدی میں دیگر فقہی مذاہب میں ضم ہو کر ختم ہو گیا تھا۔

☆ امام ابوحنیفہ کا فقہی اسکول: یہ عراق کا فقہی اسکول تھا جس کے مؤسس امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت تھے۔ اس اسکول کے فقہاء کو اہل الرائے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ قیاس سے بھی کام لیا تھا۔ اس اسکول کو عہد عباسی میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

☆ امام مالک کا فقہی اسکول: یہ اسکول مدینہ کے فقہی اسکول کی نمائندگی کرتا تھا جس کی تاسیس کا سہرا امام مالک کے سر بندھتا ہے۔ اس اسکول کو بھی عہد عباسی میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

☆ حسن بصری کا فقہی اسکول: عہد اموی میں امام حسن بصری کا بھی ایک فقہی مکتب فکر تھا لیکن چونکہ ان کے متبعین بہت کم تھے لہٰذا بہت جلد

معدوم ہو گیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ فقہی مذاہب کے علاوہ دو مشہور اور مروج فقہی مذاہب-فقہ شافعی اور فقہ حنبلی-عہد عباسی میں پروان چڑھے تھے۔

23.5.5 عہد اموی میں فقہ کا تحریری سرمایہ:

عہد اموی کے جن فقہاء نے تحریری سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے ان میں عروہ بن زبیر اور امام زہری علیہما الرحمہ شامل ہیں۔اول الذکر نے فقہ پر کئی کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں تو امام زہری کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے فتاوی کو تین جلدوں میں جمع کیا گیا تھا۔امام مالک کی کتاب **المؤطا** تو بنیادی طور پر حدیث کی کتاب ہے لیکن اسے فقہی کتاب بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے اور اس میں فقہ کے کچھ بنیادی اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

23.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے حسب ذیل نکات کے بارے میں جانکاری حاصل کی:

- عہد اموی میں شرعی علوم کی ابتداء اور ترقی کیونکر ہوئی تھی۔
- عہد اموی کے مشہور مفسرین اور ان کی تفسیری خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اس علم کے پروان چڑھنے کے اسباب، مکاتب تفسیر سے بھی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- عہد اموی میں فن قراءت کے ارتقاء کے ساتھ اس عہد کے مشہور قرّاء خصوصا قرّاءِ سبعہ اور قرّاءِ عشرہ کے بارے میں جانکاری ملی۔
- عہد اموی میں پروان چڑھنے والے دیگر قرآنی علوم-علم نقط واعراب القرآن- کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔
- عہد اموی میں علم حدیث کے ارتقاء، مشہور محدثین، تدوین حدیث میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام زہری کی خدمات، اس عہد کا تحریری سرمایۂ حدیث اور علم حدیث کو فروغ دینے والے مراکز سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- عہد اموی میں علم فقہ کا ارتقاء، اس علم کو فروغ دینے والے مراکز کے علاوہ اس عہد کے فقہی اسکول اور فقہ کے تحریری سرمایہ کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔

23.7 نمونہ امتحانی سوالات

23.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. کس صحابی کی جانب یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ تفسیر لکھی تھی؟

a. حضرت ابن عباسؓ b. حضرت ابن مسعودؓ c. حضرت عمرؓ d. حضرت ابن عمرؓ

2. عہد اموی میں تفسیر کے کتنے مکاتب فکر تھے؟

a. چھ b. تین c. پانچ d. چار

3. تفسیر بالرائے کو فروغ دینے میں کس مکتب تفسیر نے بنیادی کردار ادا کیا تھا؟

a. مکی مکتب تفسیر b. عراقی مکتب تفسیر c. مدنی مکتب تفسیر d. شامی مکتب تفسیر

4. قرّاء عشرہ میں کس کا شمار ہوتا ہے؟

a. ابن مجاہد b. ابن جزری c. ابوجعفر یزید بن قعقاع d. حسن بصری

5. فن قرأت پر پہلی تصنیف کس کی ہے؟

a. نافع بن عبدالرحمٰن b. عبداللہ بن کثیر c. حمزہ بن حبیب الزیات d. ابوعمرو بن علاء بصری

6. کس خلیفہ کے حکم پر تدوین احادیث کا کام شروع کیا گیا تھا؟

a. حضرت عمر بن عبدالعزیز b. حضرت عمر بن خطابؓ c. حضرت ابوبکر صدیقؓ d. حضرت معاویہؓ

7. عہد اموی میں علم حدیث کے مشہور مراکز کی تعداد کتنی تھی؟

a. تین b. سات c. چھ d. نو

8. کتاب المؤطا کے مصنف کا نام کیا ہے؟

a. شہاب الدین زہری b. انس بن مالک c. مالک بن انس d. حسن بصری

9. عہد اموی میں فقہ کا سب سے بڑا مرکز کون سا شہر تھا

a. مدینہ b. بغداد c. بصرہ d. کوفہ

10. عہد اموی میں کن ائمہ کے فقہی اسکول ناپید ہو گئے تھے؟

a. امام مالک اور امام ابوحنیفہ b. امام اوزاعی اور امام حسن c. امام شافعی اور امام احمد d. امام مالک اور امام اوزاعی

23.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. عہد اموی میں شرعی علوم کی ابتداء اور ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
2. عہد اموی میں علم تفسیر کے ارتقاء پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. علم حدیث کو فروغ دینے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام زہری کی خدمات کو اجاگر کیجیے۔
4. عہد اموی میں احادیث کے مراکز اور مشہور محدثین پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. قرأت سبعہ اور قرأت عشرہ اور اس کے اصحاب پر ایک نوٹ لکھیے۔

23.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. عہد اموی کے مکاتب تفسیر پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. فن قرأت کی تعریف کرتے ہوئے اس کی ابتداء اور ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
3. علم فقہ کے فروغ، اس کے مراکز اور مکاتب پر ایک بھرپور نوٹ لکھیے۔

23.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. تہذیب وتمدن اسلامی (جلد دوم) : رشید اختر ندوی

2.	تاریخ افکار وعلوم اسلامی (حصہ اول ودوم)	:	راغب الطباخ/افتخار احمد بلخی
3.	تاریخ تفسیر ومفسرین	:	محمد حسین ذہبی/غلام احمد حریری
4.	علوم القرآن	:	مولانا محمد تقی عثمانی
5.	خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت	:	قاضی اطہر مبارکپوری

-:oOo:-

اکائی 24 : عہد اموی میں علوم کا ارتقا (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا

24.0 تمہید

24.1 مقصد

24.2 عہد اموی میں دیگر علوم کی ابتداء اور ارتقاء

24.3 عہد اموی میں فن سیرت نبوی کا ارتقاء

24.3.1 عہد اموی میں سیرت نبوی کا تحریری سرمایہ

24.3.2 مؤلفین سیرت نبوی

24.3.3 دیگر ماہرین سیرت نبوی

24.4 عہد اموی میں سماجی علوم کا ارتقاء

24.4.1 فن تاریخ کا ارتقاء

24.4.2 عہد اموی کے مؤرخین

24.4.3 عہد اموی کے دیگر ماہرین فن تاریخ

24.4.4 علم نسب

24.5 ادبی علوم

24.5.1 شاعری

24.5.1.1 عہد اموی کے مشہور شعراء

24.5.2 نثر

24.5.2.1 خطابت

24.5.2.2 رسائل نگاری/فن انشاء پردازی

24.5.3 تاریخی قصص و واقعات

24.5.4 علم نحو

24.5.5 علم لغت

24.6 سائنسی علوم

24.7 ترجمہ نگاری
24.8 اکتسابی نتائج
24.9 نمونہ امتحانی سوالات
24.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
24.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
24.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
24.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

24.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں عہد اموی کو ایک اہم دور قرار دیا جاتا ہے۔اس عہد میں جہاں ایک طرف فتوحات کا سلسلہ جاری تھا وہیں دوسری جانب قرآنی علوم وتفسیر،حدیث اور فقہ جیسے علوم وفنون کے ساتھ ہی ساتھ فن سیرت نگاری اور تاریخ جیسے علوم وفنون بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس عہد میں ادبی علوم کا بھی کافی بول بالا تھا اور شاعری اور نثر نگاری کی نئی جہات سامنے آئیں تھیں۔دیگر زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں کے عربی ترجمہ کا آغاز بھی اسی عہد میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے سائنسی علوم وفنون کا آغاز ہوا۔عہد اموی کی یہ تمام علمی سرگرمیاں،عہد عباسی میں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور اسے اسلام کا ''سنہرا دور'' بنادیتی ہیں۔

24.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر آپ اموی دور کی ان علمی سرگرمیوں سے واقف ہوں گے جن کا تعلق شرعی علوم کے علاوہ دیگر علوم وفنون جیسے فن سیرت نگاری،سماجی علوم جیسے فن تاریخ،ادبی علوم جیسے شاعری اور نثر نگاری،سائنسی علوم جیسے کیمسٹری اور فن ترجمہ سے ہے۔اس اکائی کو پڑھ کر آپ اس بات سے واقف ہوسکیں گے کہ عہد اموی میں ان علوم کی ابتداء کیسے ہوئی تھی اور کیونکر وہ پروان چڑھے تھے۔اس اکائی کو پڑھ کر آپ اس عہد کے اہم سیرت نگاران،مؤرخین،شعراء وادباء،ماہرین نحو اوران کی علمی خدمات کے بارے میں جانکاری حاصل کرسکیں گے۔

24.2 عہد اموی میں دیگر علوم کی ابتداء اور ارتقاء

عہد اموی میں اسلامی قلمرو کا رقبہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔اس وسعت کے نتیجہ میں بہت سی اقوام وملل اپنی اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہوگئیں تھیں اوران کے معاشرتی تعلقات آپس میں قائم ہو چکے تھے جس نے اس عہد کی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے ارتقاء کے اسباب بھی فراہم کیے تھے۔یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمام اہم اور بنیادی اسلامی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ دیگر علوم وفنون کی بنیاد عہد اموی میں ہی رکھی گئی تھی۔عہد اموی کی انہیں علمی بنیادوں سے استفادہ کرتے ہوئے عہد عباسی میں علوم وفنون کی ایسی ترقی ہوئی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی اور چہار سو مسلمانوں کے علم وفضل کا بول بالا رہا۔

اموی دور سے ما قبل کا علمی سرمایہ سینوں میں محفوظ تھا جسے اس عہد میں سفینوں میں منتقل کرنے کا آغاز ہوا تاہم ان پر اصل برگ وبار خلافت عباسی کے دور اول میں آئے تھے اور وہ تمام علوم وفنون اپنے ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہوئے بام عروج کو پہنچ گئے تھے۔ان علوم وفنون کے

ارتقاء کا بنیادی سبب بقول ثروت صولت خود اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جس نے مسلمانوں کو اس میدان کا شہسوار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔قرآن وحدیث میں حصول علم کی تاکید کے ساتھ ساتھ خود اس کی تعلیمات اس بات کی متقاضی تھیں کہ ان کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے مختلف علوم وفنون سے واقف ہوا جائے مثلاً صرف ونحو اور علم لغت کی بنیاد صرف اس بنا پر پڑی کہ ان کے بغیر قرآن کو کما حقہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

اموی دور کی علمی سرگرمیوں کو حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا دور: اس دور میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مسند تدریس پر براجمان تھے اور اپنے علم وفضل کا دریا بہا رہے تھے اور ان کے سامنے تابعین عظام شاگرد کی حیثیت سے تشریف فرماتے اور اپنے دامن کو علم کے موتیوں سے بھر رہے تھے۔

دوسرا دور: اس دور میں تابعین عظام ''معلم'' کے فرائض انجام دے رہے تھے اور انہوں نے جو کچھ صحابۂ کرام سے حاصل کیا تھا اسے اگلی نسل تک پہنچانے کا انتظام کر رہے تھے اور تبع تابعین ان کے حلقۂ دروس میں شامل ہو کر اپنی علمی پیاس بجھا رہے تھے۔

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ نے اموی دور میں علوم وفنون کے ارتقاء کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''اموی خلافت کے دور میں تمام اسلامی علوم وفنون کو بنیادی فروغ ملا بلکہ اس زمانہ میں زبانی روایات کتابوں اور صحیفوں دونوں کی صورت میں اسلامی علوم وفنون کی جو شکل وصورت متعین ہوئی اس کی بنیاد پر بعد کے دور خلافت 'عباسی عہد' میں کتابوں کی تدوین ہوئی''۔

قبل اس کے کہ عہد اموی میں مختلف علوم وفنون کے ارتقاء پر روشنی ڈالی جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد اموی کے تابعین وتبع تابعین علماء کی اکثریت مختلف الجہات شخصیت کی حامل ہوتی تھی یعنی وہ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، سیرت نگار اور مؤرخ وغیرہ ہوتے تھے لیکن وہ اپنی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو کی وجہ سے صرف اسی علم وفن سے منسوب کر دیے جاتے ہیں جیسے امام ابن شہاب زہری کی عمومی شہرت ایک محدث کی ہے لیکن انہیں فن سیرت میں کمال حاصل تھا اور ان کی کتاب ''کتاب المغازی'' کا شمار سیرت کی اہم اور بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے۔اصل کتاب تو ضائع ہو چکی ہے لیکن اس کے بکھرے ہوئے مواد کو مختلف مصادر ومراجع سے اکٹھا کر کے شائع کیا گیا ہے۔اسی طرح امام مغازی محمد بن اسحاق ایک سیرت نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں حالانکہ وہ مؤرخ بھی تھے اور انہوں نے تاریخ کے موضوع پر 'تاریخ الخلفاء'' نامی کتاب بھی لکھی تھی جو ناپید ہو چکی ہے۔اسی طرح دیگر اشخاص وافراد بھی ہیں جنھیں مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل تھا لہٰذا ان کا ذکر ان تمام علوم وفنون میں کیا جاتا ہے۔

24.3 عہد اموی میں فن سیرت نبوی کا ارتقاء

عہد اموی میں سیرت نبوی پر کتب مرتب کرنے کا آغاز ہوا تھا۔اس عہد سے پہلے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو احادیث نبویہ کے ضمن میں بیان کیا جاتا تھا لیکن آگے چل کر اس نے ایک مستقل بالذات فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔اکابر صحابۂ کرام کے زمانے میں ہی تابعین کا ایک طبقہ ایسا وجود میں آیا جس نے حدیث کے ساتھ ساتھ سیرت پر خاص توجہ دی اور رفتہ رفتہ انہوں نے سیرت کو حدیث سے ایک الگ ممتاز مقام بخش دیا جس کے نتیجہ میں سیرت، حدیث سے الگ ایک موضوع بن گیا......اور ایسا محدثین کرام کے اولین طبقۂ تابعین کے مبارک ہاتھوں سے ہوا جس کے سبب اس نئے موضوع سیرت کا بھرم بھی قائم ہوا اور کسی کو اعتراض یا نکتہ چینی کی مہلت بھی نہ ملی''۔

سیرت نبوی کو ایک فن کی شکل دینے میں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (۶۱-۱۰۱ھ) نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے جس طرح اپنے عہد خلافت میں احادیث کو اکٹھا کرنے کے لیے سرکاری فرامین جاری کیے تھے اسی طرح سیرت ومغازی کے خصوصی حلقۂ دروس قائم کرنے کے

احکامات بھی جاری کیے تھے۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ انہوں نے عاصم بن عمر بن قتادہ (م121ھ) کو جامع مسجد دمشق میں سیرت ومغازی کا درس دینے کا فرمان جاری کیا تھا۔

اس موضوع پر باقاعدہ پہلی کتاب عروہ بن زبیر (م93ھ) نے مرتب کی تھی جس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔دیگر اسلامی فنون کی طرح اس فن کا مرکز بھی مدینہ منورہ ہی تھا۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے تدوین سیر ومغازی کے مختلف اسباب وعوامل میں ایک ممکنہ سبب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کتاب الملوک واخبار الماضیین (مؤلف عبید بن شریہّ جرہمی) کا لکھوانا بھی بتایا ہے۔تاریخ تہذیب اسلامی کے مصنف نے اس عہد میں سیرت کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عہد عباسی میں لکھی جانے والی کتب سیرت کے بنیادی مصادر ومراجع عہد اموی میں لکھی جانے والی کتب سیرت ہی ہیں کہ 'سیرت ومغازی کی اصل اور بنیادی روایات اسی دور میں جمع کی گئیں تھیں'۔

24.3.1 عہد اموی میں سیرت نبوی کا تحریری سرمایہ:

عہد اموی میں سیرت نبوی پر بنیادی کتب مرتب کی گئیں تھیں جن میں سے زیادہ تر امتداد زمانہ کی وجہ سے ناپید ہوگئی ہیں اور ہم تک اپنی اصلی شکل میں نہیں پہنچ سکی ہیں تاہم ان کتب سیرت کے اقتباسات بعد میں لکھی جانے والی تألیفات سیرت کے علاوہ دیگر اسلامی علوم وفنون پر لکھی جانے والی کتب خاص طور سے تفسیر، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہد اموی میں اس فن نے کس قدر ترقی کر لی تھی اور اس زمانہ کے سیرت نگاران کا کیا مقام ومرتبہ تھا۔مختلف کتب میں بکھرے ہوئے ان اقتباسات سے عہد اموی میں لکھی جانے والی حسب ذیل کتابوں کا سراغ ملتا ہے:

کتاب المغازی از عروہ بن زبیر اسدی (23-94ھ):

اب تک کی معلومات کے مطابق اس کتاب کو سیرت کی اولین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔یہ کتاب واقعہ حرہ میں نذر آتش ہوگئی تھی تاہم ان کے ایک شاگرد ابوالاسود یتیم عروہ نے آخری عمر میں مصر جا کر روایت کی تھی۔ان ہی بیان کردہ مرویات سیرت کو ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمیؒ نے اکٹھا کر کے ''مغازی رسول اللہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔اس کتاب کا اردو ترجمہ از محمد سعید الرحمٰن علوی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور سے 1990ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

کتاب المغازی از محمد بن شہاب زہری (م124ھ):

عہد اموی کے سیرت نگاران میں سب سے نمایاں نام امام زہری کا ہے جن کی کوششوں سے فن سیرت کو بہت زیادہ فروغ ملا تھا۔انہیں فن سیرت نگاری کا باوا آدم کہا جاتا ہے کہ ان کے کئی ایک شاگردوں نے اس موضوع پر اہم اور بنیادی کتابیں لکھی تھی جن میں موسی بن عقبہ اور محمد بن اسحاق جیسے سیرت نگاران بھی شامل ہیں۔بقول مقالہ نگار اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ انہوں نے اپنی '' کتاب المغازی'' حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے مطابق لکھی تھی۔یہ کتاب بھی اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ رہ سکی لیکن شاید ہی کوئی ایسی کتاب سیرت ہو جس میں اس کی مرویات نہ پائی جاتی ہوں۔یہ کتاب ''المغازی النبویۃ'' کے نام سے 1981ء میں دار الفکر بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ابن شہاب زہری کی مرویات سیرت کو مرتب کرنے کا کارنامہ دمشق کے ایک فاضل نے انجام دیا ہے۔

کتاب المغازی از موسی بن عقبہ (م141ھ):

اس کتاب کا شمار سیرت کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے۔سوئے اتفاق سے یہ کتاب ہم تک مکمل شکل میں نہیں پہنچ سکی ہے تاہم اس کی

مرویات دسویں صدی ہجری تک لکھی جانے والی کتب سیرت میں ملتی ہیں۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ امام مالک فرماتے تھے کہ مغازی کا فن موسیٰ بن عقبہ سے حاصل کرو۔اس کتاب کی اہم خصوصیت اس کا صحیح ترین روایات پر مشتمل ہونا ہے۔اس کتاب کی مرویات کومختلف مصادر سے اکٹھا کر کے شائع کیا جاچکا ہے۔موسی بن عقبہ کی منتشر روایات سیرت کوسب سے پہلے محمد باقشیش اوران کے بعد حسین مرادی نصب نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ان کے علاوہ ولید قیسہ نے مغازی موسی بن عقبہ کی مرویات کومختلف مصادر سے اکٹھا کر کے ان کا تحلیل وتجزیہ کیا ہے۔

کتب سیرت نبوی میں اس کتاب کوجتنی شہرت ملی ہے اس کا عشرعشیر بھی کسی سیرت کی کتاب کونہیں مل سکا ہے۔اس کتاب نے عوام میں سیرت نبوی کے ذوق کو بہت زیادہ عام کر دیا تھا۔اس کتاب کوفن سیرت کی پہلی مکمل اور جامع کتاب قرار دیا جاتا ہے۔یہ کتاب بھی سیرت کے مفقودہ مصادر میں ہوتا ہے۔مفقودہ کتب سیرت نبویہ کے مؤلفین میں ابن اسحاق کواس لحاظ سے ممتاز قرار دیا جاتا ہے کہ انہیں ابن ہشام جیسا بہترین شاگرداورراوی ملا تھاجس نے ان کی کتاب کوکم وبیش محفوظ کر دیا تھا۔ابن ہشام کی کتاب ''السيرة النبوية'' کوسیرت ابن اسحاق کا بدل قرار دیا جاتا ہے۔ان کے علاوہ بھی اس کتاب کے دیگر رواۃ پائے جاتے ہیں جنھوں نے اس کتاب کوشہرت بام پر پہنچادیا ہے۔

سیرت ابن اسحاق کے دوناقص نسخوں کوڈاکٹر حمیداللہ صاحب مرحوم نے تلاش کر کے اورانہیں ایڈٹ کرنے کے بعد شائع کر دیا ہے۔ان میں سے ایک یونس بن بکیر (م199ھ) کی روایت سے اور دوسرا محمد بن سلمہ (م191ھ) کی روایت سے مروی ہے۔ان کے اس محقق شدہ ایڈیشن کا اردوترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

24.3.2 دیگر مؤلفین سیرت نبوی:

- **کتاب المغازی** از ابان بن عثمان (20-105ھ)۔یہ کتاب خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حکم سے ضائع کر دی گئی تھی۔
- **کتاب المغازی** از وہب بن منبہ (م110ھ)۔
- **کتاب المغازی** از عاصم بن عمر بن قتادہ (م120ھ)۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم کی تعلیم کرتے ہوئے مؤلف کتاب، دمشق کی جامع مسجد میں سیرت نبوی درس دیا کرتے تھے جس کا سلسلہ مدینہ لوٹنے کے بعد بھی جاری رہا۔ان کے اس طرزعمل نے عوام میں سیرت نبوی کا مذاق پیدا کر دیا تھا۔
- **کتاب المغازی** از عبداللہ بن ابوبکر بن حزم انصاری مدنی (م135ھ)۔
- **کتاب المغازی** از ابوالاسود یتیم عروہ بن زبیر (م137ھ)۔
- **کتاب المغازی** از معمر بن راشد (96-150ھ)۔
- **کتاب الغزوۃ** از جعفر بن محمود انصاری مدنی۔

24.3.3 دیگر ماہرین سیرت

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مؤلفین سیرت نبوی کے علاوہ متعدد اصحاب علم وفضل نے اس فن کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے غالبا اس موضوع پر کوئی تحریری سرمایہ نہیں چھوڑا ہے تاہم انہوں نے اپنے اپنے حلقہ دروس میں سیرت نبوی کے موضوع پر درس دینے کا اہتمام کیا تھا جیسے محمد بن سعد بن ابی وقاص (م82ھ)،امام زین العابدین علی بن حسین (م94ھ)،عبیداللہ بن کعب بن مالک انصاری (م۹۷ھ) عکرمہ مولی ابن عباس (م105ھ)،شرحبیل بن سعد انصاری (م123ھ) اور معمر بن راشد (م154ھ)

وغیرہ۔

24.4 عہد اموی میں سماجی علوم کا ارتقاء

24.4.1 فن تاریخ کا ارتقاء:

فن تاریخ کی ابتداء عہد اموی میں ہوئی تھی۔ اس فن کو بطور فن متعارف کرانے کا سہرا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر بندھتا ہے کہ انہیں اقوام سابقہ کے حالات جاننے کا کافی شوق تھا۔ روایات کے مطابق وہ ہر روز ماہرین تاریخ کے ساتھ اچھا خاصا وقت گذارتے تھے جوان کے سامنے سابق حکمرانوں کے واقعات پیش کرتے تھے۔ اسی طرح روز انہیں اقوام عالم کی تاریخ کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا تاکہ ان کی روشنی میں وہ امور خلافت وحکومت کو آسانی کے ساتھ حل کرسکیں اور جنگ کے مسائل اوراس کی باریکیوں کو سمجھ سکیں۔

ایک قول کے مطابق ان کے سامنے جو کتابیں پڑھی جاتی تھیں وہ عربی کی بجائے دیگر زبانوں جیسے یونانی اور لاطینی زبان میں لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کو پڑھنے والے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا عربی میں ترجمہ بھی کرتے جاتے تھے تاکہ ان کا مفہوم ومطلب خلیفۂ وقت بھی سمجھ سکیں۔ گویا اس عمل کو ترجمہ نگاری کی ابتداء بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

عہد اموی میں تاریخ نگاری کا آغاز تاریخی واقعات کو قصہ گوئی کے انداز میں بیان کرنے سے ہوا تھا۔ ان روایات میں سچ کے ساتھ ساتھ جھوٹ کی آمیزش اور مبالغہ آرائی بھی شامل ہوگئی تھی اور بہت سی من گھڑت باتیں بھی ان روایات کا حصہ ہوا کرتی تھیں جن کی زبانی ترسیل ہوتی رہی۔ دوسرے مرحلہ میں ان تاریخی روایات کو بیان کرنے والے راوی منظر عام پر آتے ہیں جنھوں نے بغیر کسی چھان پھٹک کے ان کو اکٹھا اور جمع کرنے کا کام انجام دیا لہذا ان تاریخی روایات پر آنکھ بند کرکے اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ تہذیب اسلامی کے مصنف نے ان روایات کی قدر وقیمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ انہیں کسی چھان پھٹک کے اکٹھا کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے سچی روایات کے ساتھ ساتھ جھوٹی روایات بھی تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں لہذا انہیں نقد وتبصرہ کے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ راویان عام طور پر کسی ایک واقعہ سے متعلق تمام روایات کو صحیفہ کی شکل میں جمع کردیتے تھے۔ ان صحائف کو ''حولیات'' (ایک واقعہ کے ارد گرد گھومنے والی کتب وروایات) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عہد اموی میں سیف بن عمر تیمی (م154ھ)، ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی (157ھ) اور عوانہ بن حکم کلبی (م147ھ) کا شمار ماہرین حولیات میں ہوتا تھا۔

24.4.2 عہد اموی کے مؤرخین:

عبید بن شریّہ: عہد اموی کے سب سے بڑے مؤرخ میں عبید بن شریّہ ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عربوں میں انہوں نے سب سے پہلے کتاب لکھی تھی۔ وہ عہد جاہلیت کے حکمرانوں کی تاریخ کے ماہر تھے، انھیں حضرت معاویہؓ نے صنعاء سے دمشق بلا لیا تھا اوران سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں قدیم حکمرانوں کے حالات سے باخبر کرائیں۔ انھوں نے حضرت معاویہؓ کی فرمائش پر ''کتاب الملوک واخبار الماضیین''، لکھی تھی۔ اس کتاب میں عرب وغیر عرب سلاطین اوران کے عہد حکومت کی تاریخ کو زیر تحریر لایا گیا ہے۔ اس کتاب کو عہد اموی میں تاریخ نویسی کی پہلی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہوچکی ہے۔

وہب بن منبہ: وہب بن منبہ کا شمار بھی اس عہد کے اہم مؤرخین میں ہوتا ہے۔ انھیں قدیم کتابوں کا ماہر قرار دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اساطیری قصوں اور کہانیوں خاص طور سے اسرائیلیات کے ماہر تھے۔ کتب تفسیر میں اسرائیلیات کا خاص حصہ انہیں کے حوالہ سے پایا جاتا

ہے۔انھوں نے سلاطین حمیر کے حالات کو’’کتاب التیجان في ملوک حمیر ‘‘ کے نام سے قلم بند کیا تھا۔ غالباً اسی کتاب کا ذکر زرکلی نے الأعلام میں’’ذکر الملوک المتوجة من حمیر وأخبارهم وقصصهم وقبورهم وأشعارهم ‘‘کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے علاوہ’’کشف الظنون فی أسامی الکتب ‘‘نامی کتاب میں ان کی مزید دو کتابوں’’قصص الأنبیاء اور قصص الأخیار‘‘ کا ذکر ملتا ہے۔

ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی: ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی (57-157ھ) عہد اموی کے زود نویس مؤرخ ہیں۔ وہ علم انساب کے بھی ماہر تھے۔ ابن ندیم اور ابن شاکر جیسے اصحاب علم وفضل نے تاریخ کے موضوع پر ان کی ۳۳ س کتابوں کا ذکر کیا ہے جب کہ ابومخنف خود اپنی کتابوں کی تعداد ۵۰ بتاتے ہیں۔ ان کتابوں میں کتاب الردۃ، کتاب فتوح الشام، کتاب فتوح العراق، کتاب مقتل علی بن أبي طالب اور کتاب تاریخ الائمة جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ابومخنف ازدی ایک شیعہ اور حکومت مخالف مؤرخ تھے لہٰذا انہوں نے اپنی روایات میں حکومت مخالف بہت سی من گھڑت باتوں کو بھی شامل کر دیا تھا لہٰذا ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ابومخنف ازدی کی مرویات تاریخ کو مشہور محقق کامل سلیمان جبوری نے’’نصوص من تاریخ أبي مخنف‘‘ کے نام سے شائع کیا ہے۔

عوانہ بن حکم کلبی: ابوالحکم عوانہ بن حکم کلبی (م 147ھ) کا شمار عہد اموی کے معتدل مؤرخین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اعتدال کے ساتھ اموی خلافت وحکومت کی تاریخ اپنی ایک کتاب میں بیان کی ہے اور حضرت معاویہؓ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے بنوامیہ کے لیے جھوٹی خبریں گھڑتے تھے۔ فن تاریخ کے ساتھ ساتھ وہ علم انساب اور عرب شاعری کے بھی ماہر تھے۔

24.4.3 عہد اموی کے دیگر ماہرین فن تاریخ:

عہد اموی میں مؤرخین کی ایک تعداد ایسی بھی پائی جاتی ہے جن کا شمار کسی اور فن کے ماہرین میں کیا جاتا ہے۔ ان مؤرخین میں فن سیرت نبوی کے ماہرین بھی شامل ہیں جیسے ابن اسحاق نے تاریخ کے موضوع پر’’تاریخ الخلفاء ‘‘نامی کتاب بھی لکھی تھی جو ناپید ہو چکی ہے۔ عروہ بن زبیر، ابن شہاب زہری، وہب بن منبہ، معمر بن راشد وغیرہ نے اسلامی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو محفوظ کر دیا تھا اور اسلامی تاریخ نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا تھا کہ ان کی مرویات، بعد میں لکھی جانے والی کتب تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ بقول مصنف انہوں نے اموی خلافت ہی کی تاریخ نہیں بیان کی یا لکھی بلکہ اس سے قبل کے دور کی روایات بھی جمع کیں اور بیان کیں‘‘۔ ان ثقہ راویان تاریخ کے ساتھ ساتھ سیف بن عمر تیمی (م 154ھ) جیسے غیر ثقہ راویان تاریخ بھی اس عہد میں موجود تھے۔

24.4.4 علم نسب:

عربوں کی نظر میں حسب ونسب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی لہٰذا انہوں نے اپنے سلسلہ نسب کو محفوظ کرنے کے لیے خاصا مضبوط اور محفوظ طریقہ چنا تھا۔ انھیں اپنے حسب ونسب سے کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے گھوڑوں تک کے حسب ونسب کو محفوظ کر رکھا تھا۔

سیاسی وسماجی مقاصد کے حصول کے لیے عہد اموی میں قبائل عصبیت کو ایک مرتبہ پھر سے ہوا دے دی گئی تھی لہٰذا اس عہد میں اس فن کو کافی فروغ ملا۔ اس عہد کے ماہرین انساب میں دغفل بن حنظلہ نسابہ، نخار بن اوس عذری، زید بن کیس نمری، شہاب بن مذعور سعید بن مسیّب، محمد بن

سیرین، محمد بن سائب کلبی، ہشام بن محمد کلبی کا شمار کیا جاتا ہے۔ان ہی کی روایات پر عہد عباسی میں اس فن کی کتابیں مرتب کی گئیں تھیں۔

24.5 ادبی علوم

عہد اموی میں شرعی و دینی علوم وفنون کے ساتھ ادبی علوم کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔خاص طور سے عربی شاعری میں نت نئے تجربے کیے گئے اور نقائض اور غزل جیسی اصناف سخن کا اضافہ ہوا اور سیاسی شاعری کا فروغ ہوا۔اس عہد میں نثر نگاری کا بھی کافی فروغ ہوا۔خطابت کی ترقی کے ساتھ ساتھ رسائل نگاری جیسے فن کی داغ بیل بھی اسی عہد میں پڑی تھی۔نحو ولغت جیسے ادبی علوم وفنون کا ارتقاء ہوا اور تنقید کے ابتدائی نقوش سامنے آئے۔کمیت و کیفیت دونوں کے لحاظ سے اس عہد کی نثر کو عمدہ اور فائق قرار دیا جاتا ہے۔عہد اموی میں ان ادبی علوم کو پروان چڑھانے میں خلفاء اور اہالیان حکومت کے ساتھ عوام نے بھی بھرپور دلچسپی دکھائی تھی۔

24.5.1 شاعری:

عہد اموی کی شاعری کی اپنی خصوصیات اور امتیازات ہیں جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کے ادوار میں نہیں پائی جاتی ہیں۔اس عہد کی شاعری کو زمانہ جاہلیت کی شاعری کے ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے کہ جس طرح جاہلی شاعری سے استشہاد کیا جاتا ہے اسی طرح اموی عہد کی شاعری سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے۔اس عہد کے بعد کی شاعری کو ماہرین فن نے قابل استشہاد نہیں سمجھا ہے۔

اس عہد کی شاعری میں مروجہ اصناف مدح، فخر، وصف ومنظر نگاری، مرثیہ اور ہجو وغیرہ کے ساتھ ساتھ کچھ نئے اصناف سخن نقائض، غزل اور سیاسی شاعری کا اضافہ ہوتا ہے۔ان نئے اصناف سخن کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے وہ اسی عہد میں منظر عام پر آئے اور اس عہد کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی دم توڑ دیتے ہیں۔اس عہد میں شاعری کی تمام اصناف سخن کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور شعراء نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے عربی زبان وادب کے دامن کو انمول موتیوں سے بھر دیا تھا۔

اموی عہد میں شاعری کے ترقی کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی اسباب تھے۔ارباب حکومت کی ہمت افزائی اور ان کی قدردانی نے بھی اس فن کو فروغ دینے میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا۔سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے قبائلی عصبیت کو بڑھاوا دینے اور مختلف قسم کے سیاسی جماعتوں کی موجودگی نے عربی شاعری میں نئے بال و پر پیدا کیے تھے کہ ہر سیاسی جماعت کا ایک شاعر ہوتا جو اپنی جماعت کے فضائل اور دوسری جماعتوں کے رذائل بیان کیا کرتے تھے۔

24.5.1.1 عہد اموی کے مشہور شعراء:

عہد اموی کی شاعری کی مختلف جہات ہیں اور ہر جہت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ وہی اس عہد کی سب سے نمایاں اور عمدہ جہت ہے۔اس دور میں شعر وشاعری کا مذاق عام ہو گیا تھا۔خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی اس فن کو فروغ دینے میں شامل تھے جس کی وجہ سے شعراء کی ایک معتدبہ جماعت منظر عام پر آئی تھی جو اپنے عمدہ اور بہترین اشعار سے سامعین کے دل ودماغ پر چھا جاتے تھے۔

اس عہد کے سب سے زیادہ نمایاں شعراء میں جریر، فرزدق اور اخطل کا شمار کیا جاتا ہے کہ ان کے ذکر کے بغیر عہد اموی کی عربی شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ان شعراء نے شاعری کی تقریبا ہر ایک صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور شعر وشاعری کے عمدہ اور لازوال نمونے پیش کیے ہیں۔ان کی شاعری کا ایک اہم باب نقائض ہیں جس کے نمونہ سے ماقبل اور مابعد کی شاعری کا دامن خالی اور تہی دامن ہے۔

ان کے علاوہ عمر بن ابی ربیعہ اور جمیل بثینہ نے غزل گوئی میں کمال حاصل کیا تھا اور عربی شاعری کو ایک نئی صنف سے روشناس کرایا

تھا۔ سیاسی شاعری کے نمائندہ شعراء میں کمیت بن زید، طرماح بن حکیم اور عمران بن حطان جیسے شعراء شامل ہیں جنھوں نے اپنے اشعار سے اس وقت کے سماج میں ایک آگ سی لگادی تھی۔ یہاں سب شعراء کا مختصر اتذکرہ بھی نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا ہر صنف شاعری کے مشہور اور نمائندہ شعراء کے صرف ناموں کو درج کیا جاتا ہے۔ قبل اس کے ان شعراء کے نام کو درج کیا جائے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے عہد اموی کے کچھ شعراء ایسے ہیں جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی تھی لہٰذا ان کا نام مختلف ذیلی عناوین کے تحت درج کیا گیا ہے۔

1. غزل: عمر بن ربیعہ، عبداللہ عرجی، ابن قیس رقیات، ولید بن یزید اور عبداللہ احوص انصاری وغیرہ (غزل اباحی کے نمائندے)، جمیل بثینہ، قیس بن مُلوّح، قیس بن ذریح اور کثیر عزّہ وغیرہ (غزل عذری کے نمائندے)، جریر و فرزدق (روایتی غزل کے نمائندے)۔
2. سیاسی شاعری: کمیت بن زید (بنو ہاشم/ جماعت شیعہ کے نمائندہ شاعر)، عبیداللہ بن قیس رقیات (شاعر قریش)، طرماح بن حکیم، قطری بن فجأ ۃ اور عمران بن حطان (خوارج کے نمائندہ شاعر)، عبداللہ بن زبیر اسدی، عدی بن رقاع اور أعشی بن ربیعۃ (بنوامیہ کے نمائندہ شاعر)۔
3. نقائض: جریر، فرزدق اور اخطل۔
4. مدحیہ شاعری: نصیب بن رباح، قطامی تغلبی، کعب بن معدان اشقری اور زیاد اعجم۔
5. ہجویہ شاعری: حطیئہ، جریر، فرزدق اور اخطل۔
6. فخریہ شاعری: جریر، فرزدق اور اخطل۔
7. رجزیہ شاعری: اغلب عجلی، ابونجم، عجاج اور رؤبہ بن عجاج۔
8. مراثی: جریر اور فرزدق۔
9. وصف اور منظر نگاری: جریر، فرزدق اور اخطل۔
10. شعراء فطرت اور بدوی تہذیب کے نمائندہ شعراء: راعی الابل نمیری، ذوالرمہ اور یزید بن طرثیہ۔
11. شراب وشباب کے رسیا شعراء: شمردل بن شریک، ولید بن یزید، ابوالہندی۔
12. درباری شعراء: جریر، فرزدق اور اخطل۔

24.5.2 نثر:

عربی ادب کی تاریخ کا بنیادی حصہ اس کی شاعری پر مشتمل ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے مقابلے میں اس عہد کی نثر کے نمونہ بہت کم دستیاب ہوسکے ہیں۔ نثر کا جو حصہ دستیاب ہوسکا ہے وہ خطابت، سجع کاہن، وصایا، امثال اور کہاوتوں پر مشتمل ہے۔ عربی نثر کا ارتقاء قرآن کے نزول کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ وہی عربی نثر کا عمدہ ترین اور سب سے بہتر نمونہ ہے جس کی مثال آج تک نہیں پیش کی جاسکی۔ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ نے بھی عربی نثر کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا ہے آپ ﷺ جوامع الکلم تھے اور آپ کی زبان مبارک سے نکلنے والی ہر بات 'وحی غیر متلو' کا درجہ رکھتی ہے۔

عہد جاہلیت کے مروجہ نثری اصناف سخن جیسے خطابت، وصایا اور امثال پر عہد اموی میں عربی نثر نگاری پر نئے بال و پر آئے تھے۔ خاص طور سے فن خطابت کو کافی فروغ حاصل تھا جس کے دینی، سیاسی اور سماجی اسباب تھے۔ اس عہد کی نثر نگاری میں ''فن انشاء پردازی یا رسائل نگاری'' کی

شکل میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے جسے عہد عباسی میں بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

اس عہد کا سب سے اہم اور بنیادی نثری کارنامہ ابن مقفع کی مشہور کتاب کلیلہ ودمنہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔بعض مؤرخین ابن مقفع کو عہد عباسی کا نثر نگار قرار دیتے ہیں جب کہ بعض انہیں عہد اموی کے مشاہیر میں شمار کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ عہد اموی میں گذرا تھا۔ان کے مقابلے میں اول الذکر مؤرخین کی دلیل یہ ہے کہ ان کا انتقال عہد عباسی میں ہوا تھا لہٰذا انھیں عہد عباسی کا نثر نگار قرار دیا جائے گا۔

24.5.2.1 خطابت:

عہد جاہلی کے ادبی سرمایہ میں فن خطابت کے نمونے ملتے ہیں۔صدر اسلام میں حالات وضرورت کے تحت اس کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔آپ ﷺ اور خلفائے راشدین کی تقریریں اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔عہد اموی میں فن خطابت اپنے بام عروج پر نظر آتا ہے۔اس عہد کے خطباء اپنے زور خطابت سے مجمع کے افکار وخیالات کو پلٹ کر رکھ دیا کرتے تھے۔اس عہد میں کافی سیاسی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی اور کئی ایک دینی فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا اور ہر گروپ چاہے وہ سیاسی ہو یا دینی فن خطابت کے ذریعہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر گروپ وجماعت کے کچھ خطیب ہوتے تھے جن کے ذریعہ وہ اپنے افکار وخیالات کو عوام کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔وہ اپنی خطابت کی زور بیانی سے مجمع کے دل ودماغ کو پلٹ دیا کرتے تھے۔ذیل میں جماعت کے اعتبار سے مشہور خطباء (صرف نام) کا ذکر کیا جا رہا ہے:

1. اموی حکومت کے خطباء: حضرت معاویہؓ،عبدالملک بن مروان،عمر بن عبدالعزیز، یزید ناقص، طارق بن زیاد، حجاج بن یوسف وغیرہ
2. خوارجی خطباء: حیان بن ظبیان سلمی، مستورد بن علفہ، نافع بن ازرق، زبیر بن علی، قطری بن فجاۃ اور ابوحمزہ خارجی وغیرہ۔
3. شیعی خطباء: سلیمان بن صرد، عبیداللہ بن عبداللہ، مختار ثقفی، زید بن علی اور ان کے بیٹے یحییٰ وغیرہ۔
4. زبیری خطباء: عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر وغیرہ۔
5. باغی خطباء: عبداللہ بن حنظلہ، عمرو بن سعید بن عاص، عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث، قتیبہ بن مسلم باہلی اور یزید بن مہلب۔
6. درباری خطباء: سحبان وائل اور احنف بن قیس وغیرہ۔
7. دینی ومذہبی خطباء: حسن بصری، سعید بن جبیر، مسلم بن جندب، ذر بن عبداللہ، یزید بن ابان رقاشی اور ابراہیم تیمی کوفی وغیرہ۔
8. درباری خطباء: اس عہد کے مشہور درباری خطباء میں سحبان بن وائل (م 54ھ)، وغیرہ تھے جن کا تعلق حکمراں جماعت سے تھا۔

24.5.2.2 رسائل نگاری/فن انشاء پردازی:

اس فن کی ابتداء عہد اموی میں ہی ہوئی تھی اور وہ عصر عباسی میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔سرکاری دفاتر کی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر اس فن کی ابتداء ہوئی تھی۔کاروبار خلافت کے وسیع ہونے کی وجہ سے ایک ماہر انشاء پردازوں پر مشتمل عملہ کو فرامین واحکام جاری کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔سرکاری فرامین اور سرکاری خط وکتابت کو ہی عام طور سے رسائل نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے تاہم اس فن میں ذاتی رسائل کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو مختلف مقاصد کے حصول کے لیے لکھے گئے تھے جیسے حضرت حسن بصری اور غیلان دمشقی وغیرہ کے واعظانہ رسائل وغیرہ۔اس فن کے ارتقاء میں ان غیر سرکاری رسائل کا حصہ بھی شامل ہے۔

رسائل نگاری کو فروغ دینے میں انشاپردازوں کے علاوہ خلفاء، والیان حکومت اور دیگر حضرات نے بھی حصہ لیا ہے۔اس فن کو فروغ دینے میں عبدالحمید کاتب کے ساتھ ساتھ عبداللہ بن عمر، حجاج بن یوسف ثقفی، عبیداللہ بن اوس غسانی، روح بن زنباع جذامی، صالح بن عبدالرحمٰن، حضرت

حسن بصری، غیلان دمشقی، عقال بن شبہ اور عبداللہ بن معاویہ نے بھی حصہ لیا تھا۔

عبدالحمید کاتب: رسائل نگاری/فن انشاء پردازی کا موجد عبدالحمید کاتب (م 132ھ) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس فن میں اس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے 'الکاتب' کا لاحقہ ان کے نام کا جز بن کر رہ گیا ہے۔ عبدالحمید کاتب نے بقول احمد حسن زیات ''مخاطب کے حسب حال خطاب میں رعایتیں کیں، حالات کے مطابق مضمون میں طول واختصار کو مدنظر رکھا اور مضمون کی ابتداء وانتہاء میں موضوع کی مناسبت سے نیرنگی پیدا کی۔ رسائل کے شروع میں حمد وثنا کو طول دیا۔ مقبولیت کی بنا پر تمام رسائل نگاروں نے اس کے اسلوب کی پیروی کی جس سے انشاء پردازی ایک مرتب ومنظم اور باقاعدہ وباصول فن بن گیا''۔

عبدالحمید کاتب کا تعلق غیر عربی النسل خاندان سے تھا۔ انھوں نے یہ فن سالم مولی ہشام بن عبدالملک سے سیکھا تھا اور اس میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ انھیں مروان بن عبدالملک نے آرمینیا کی گورنری کے زمانہ میں اپنا سکریٹری منتخب تھا اور جب مروان بن عبدالملک مسند خلافت پر براجمان ہو گئے تب وہ انہیں اپنے ساتھ دار الخلافت لے گئے اور اپنی حکومت کا چیف سکریٹری بنا دیا۔ وہ اس عہدہ پر تاحیات فائز رہے حتی کہ عباسی خلافت کے برپا کیے جانے والے انقلابات کی بھینٹ چڑھ گئے اور عربی زبان وادب اپنے ایک اہم نمائندہ سے محروم ہو گئی۔

عبدالحمید کاتب کا اسلوب نگارش اپنے اندر ایک جادوسی تاثیر رکھتا تھا جو مخاطب کے دل ودماغ کو اپنے قابو میں کر لیتا تھا۔ اس کا اسلوب کس قدر متاثر کن تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ابومسلم خراسانی نے اس کا خط پڑھے بنا ضائع کر دیا تھا کہ کہیں وہ بھی مروان بن عبدالملک کا حامی وطرفدار نہ بن جائے اور عباسی انقلاب کے لیے کی جانے والی کوششیں برباد نہ ہو جائیں۔

24.5.3 تاریخی قصص وواقعات:

اس عہد میں تاریخی قصص وواقعات کو بیان کرنے کے لیے قصہ گوئی کو بھی فروغ ملا۔ عہد خلافت فاروقی کے آخری دور میں تاریخی واقعات وقصص کو بیان کرنے کی ابتداء حضرت تمیم داریؓ (م 40ھ) نے اپنے وعظوں کے ذریعہ کی تھی جس کا سلسلہ عہد اموی میں بھی جاری رہا۔ عہد اموی کے قصہ گو حضرات میں سلیمان تجیبی اور وہب بن منبہ جیسے صاحب علم وفضل شامل ہیں۔

بقول مصنف قصہ گوئی کو عوام اور خواص کے لیے بیان کیے جانے والے قصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عوامی قصوں میں قصہ گو وعظ وارشاد کی شکل میں ان کے سامنے قصے بیان کیا کرتا تھا جب کہ خواص کے قصوں کو انہوں نے سرکاری قصہ گوئی قرار دیا ہے کہ عہد اموی میں باقاعدہ طور پر قصہ گو حضرات کا انتخاب کیا جاتا تھا جو ایک متعین وقت پر خلفاء اور دیگر اہالیان حکومت کے سامنے قصہ گوئی کیا کرتے تھے۔

ان قصص کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے بہت سی من گھڑت اسرائیلی اور مسیحی کہانیاں عربی زبان میں شامل ہو گئیں۔ یہ کہانیاں زیادہ تر آیات قرآنی کی تفسیر کے حوالہ سے عربی ادب کا حصہ بنی ہیں جنھیں ''اسرائیلیات'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

24.5.4 علم نحو:

عہد جاہلیت اور صدر اسلام کے عربی زبان وادب کا دستیاب سرمایہ زبان وبیان کی تمام تر غلطیوں سے پاک وصاف ہے لیکن جوں جوں اسلامی خلافت کے رقبہ میں وسعت ہوتی گئی تو اس وقت عربی زبان وادب میں مختلف تہذیبوں کے ملاپ کی وجہ سے غلطیاں ہونے لگیں۔ عہد اموی میں صورت حال میں مزید بگاڑ پیدا ہوا حتی کہ خلفاء اور خواص بھی زبان وبیان میں غلطیاں کرنے لگے اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ان غلطیوں کے نتیجہ میں قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف نہ ہو جائے لہٰذا آیات قرآنیہ پر نکات اور اعراب لگانے کے ساتھ ساتھ نحو وصرف کے قواعد بھی مرتب کیے گئے

تھے۔

قرآن کریم کو تمام تر تحریفات سے محفوظ رکھنے کی کوششوں کا آغاز عہد راشدہ سے ہی ہو چکا تھا۔ایک قول کے مطابق حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں ہی ابوالاسود دؤلی (م 69ھ) کو نحو کے قواعد مرتب کرنے کے لیے کہا تھا۔فن نحو کی ابتداء اور آغاز کے حوالہ سے کئی ایک روایات بیان کی جاتی ہیں۔ان روایات میں جو بات مشترک ہے وہ ابوالاسود دؤلی کا اس فن کا بانی وموجد ہونا ہے۔انھوں نے اس فن کی بنا تو حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہی رکھ دی تھی تاہم اس فن کو باقاعدہ طور پر عہد اموی میں مرتب کیا تھا۔انھوں نے نحو کے مختلف قواعد مرتب کیے تھے۔جب کوئی غلطی ان کے سامنے آتی تو وہ اس کے متعلق ایک قاعدہ بنا دیتے تھے جسے لوگ محفوظ کر لیتے تھے۔انھیں قواعد کی بنا پر آگے چل کوفہ وبصرہ کے نحوی اسکولوں کی بنیاد رکھی گئی تھی۔عہد اموی میں اس فن کے ماہرین میں ابوعمرو بن علاء (65-152ھ)، یحییٰ بن یعمر، عتبہ بن معدان، میمون بن اقرع اور عیسی بن عمرو ثقفی (م 147ھ) کا شمار ہوتا ہے۔مؤخر الذکر نے اس فن میں دو کتابیں ''کتاب الجامع اور کتاب المکمل'' بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

24.5.5 علم لغت:

اس علم کا آغاز قرآن کے مفردات کو سمجھنے کی خاطر ہوا تھا تاہم اس کا دائرہ بڑھتا چلا گیا اور اس نے ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر لی۔اس فن کے آغاز کا سہرا بھی حضرت ابن عباسؓ کے سر بندھتا ہے کہ وہ دوران تفسیر قرآن کے مفرد الفاظ کی تشریح وتوضیح بھی کرتے تھے۔ان کی جانب ''غریب القرآن'' نامی کتاب کو بھی منسوب کیا جاتا ہے۔قرآن کی طرح وہ اپنے دروس احادیث میں فرمان نبوی کے مشکل مفرد الفاظ کی بھی تشریح کیا کرتے تھے۔اس فن میں عہد اموی کے جس شخص کو کمال حاصل تھا ان کا نام ابان بن تغلب (م 141ھ) ہے۔انھوں نے ''غریب القرآن'' نامی کتاب لکھی تھی جس میں عربی اشعار سے جابجا استشہاد کیا گیا ہے۔

اس عہد کے دیگر ماہرین لغت میں قتادہ بن امامہ سدوسی، ابوخیرہ اعرابی، الشرقی بن القطامی (م 150ھ)۔ابوعمرو بن علاء بصری (65-152ھ)، عیسی بن عمرو ثقفی (م 147ھ)، اور عطاء بصری (م 170ھ) اور خلیل بن احمد فراہیدی ازدی (100-160ھ) کا شمار کیا جاتا ہے۔مذکورہ بالا امامان لغت میں سے اکثریت کی وفات عہد عباسی میں ہوئی تھی ان کا ذکر یہاں صرف اس لیے کر دیا گیا ہے کہ انہوں اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ عہد اموی میں گذرا تھا اور اس فن کو فروغ دینے کا آغاز عہد اموی میں کیا تھا۔

ابوخیرہ اعرابی نے ''کتاب الحشرات'' نامی کتاب لکھی تھی جس کی روایت ابوعمرو بن علاء نے کی تھی۔ابوعمرو بن علاء نے اس موضوع پر ''کتاب النوار'' اور ''کتاب الامثال'' جیسی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں ہیں۔علم لغت کو فنی طور پر مرتب کرنے کا سہرا خلیل بن احمد فراہیدی ازدی کے سر بندھتا ہے جنھوں نے ابوعمرو بن علاء اور عیسی بن عمرو ثقفی جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا۔ان کی کتاب ''کتاب العین'' کو اس فن کی اولین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

24.6 سائنسی علوم

عہد اموی میں سائنس وٹیکنالوجی کے ابتدائی نقوش وآثار ملتے ہیں۔حضرت معاویہؓ نے جہاز سازی کی ابتداء کی تھی اور ایک مضبوط بحری بیڑے کی بنیاد خلافت راشدہ میں ہی رکھ دی تھی اور اپنے عہد خلافت میں اسے مزید مضبوط کیا تھا۔اس عہد میں آب رسانی (Hydrolics) کا نظام قائم کیا گیا تھا۔علم فرائض کی وجہ سے ریاضی کے علم نے کافی ترقی کی اور حساب کے موضوع پر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

حضرت معاویہؓ کے پوتے خالد بن یزید کو سائنسی علوم کو سیکھنے کا جنون تھا۔انھیں فن کیمیاء سے کافی دلچسپی تھی اور اسے سیکھنے کے لیے انہوں

نے اسکندریہ سے علماء کی ایک جماعت کو بلوایا تھا اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ کیمیاء کے علاوہ انہیں فلسفہ، ہندسہ اور فلکیات جیسے موضوعات سے دلچسپی تھی۔ بقول پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ انہوں نے مذکورہ موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں تھیں جن کا ذکر ابن ندیم نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''الفھرست'' میں کیا ہے۔

24.7 ترجمہ نگاری

فن ترجمہ کو بنیادی طور پر فروغ عہد عباسی میں حاصل ہوا تھا تاہم اس فن کا آغاز بھی عہد اموی میں ہو چکا تھا۔ فن تاریخ میں اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہؓ کے سامنے جو تاریخی کتابیں پڑھی جاتی تھیں وہ عربی زبان میں نہیں ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کے کتاب خواں ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کے مباحث کا ترجمہ بھی کرتے چلے تھے تاکہ خلیفۂ وقت ان مباحث کو سمجھ سکیں۔ خلیفۂ وقت کے اس طرز عمل کو ترجمہ نگاری کا ابتدائی نقش قرار دیا جا سکتا ہے۔

روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ کے پوتے خالد بن یزید کو سائنسی علوم سے کافی دلچسپی تھی۔ ترجمہ نگاری کی ابتدء کا سہرا ان کے ہی سر بندھتا ہے۔ بقول احمد حسن زیات انہوں نے اسکندریہ سے علماء کی ایک جماعت کو بلوایا تھا جس نے انہیں علم کیمیاء سکھایا تھا اور موضوع سے متعلق کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ فن کیمیاء کے علاوہ نجوم اور طب کے موضوع پر بھی انھوں نے کچھ کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا۔

عہد اموی میں فن ترجمہ کو فروغ دینے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک نے بھی کسی قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اول الذکر کے حکم پر ماسرجویہ بصری نے اہرن بن اعین کی ایک طبی کتاب ''قرابادین'' کا ترجمہ عربی میں کیا جب کہ مؤخر الذکر کے آزاد کردہ غلام سالم نے ارسطو کے بعض رسائل کا عربی ترجمہ کرنے کے علاوہ امور سلطنت سے متعلق ایک فارسی کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ ترجمہ نگاری کے حوالہ سے عہد اموی کا سب سے بڑا کارنامہ دفتر مالیات کا عربی زبان میں منتقل کرانا ہے۔ اس اہم کارنامہ کو صالح بن عبدالرحمٰن اور ابو ثابت سلیمان بن سعد نامی اشخاص نے اموی مملکت کے مختلف صوبوں میں انجام دیا تھا۔

24.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں ہم نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اس اکائی میں آپ نے عہد اموی میں پروان چڑھنے والے شرعی علوم کے علاوہ دیگر علوم وفنون سے جانکاری حاصل کی۔
- عہد اموی میں پروان چڑھنے والے دیگر علوم کے حوالہ سے آپ نے یہ جانکاری حاصل کی کہ ان علوم کا تعلق دینی علوم، سماجی علوم، ادبی علوم اور سائنسی علوم سے ہے۔
- اس اکائی کے ذریعہ آپ کو فن سیرت نگاری کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ممتاز سیرت نگاران اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔
- اس اکائی میں آپ نے عہد اموی میں پروان چڑھنے والے سماجی علم ''تاریخ'' کے آغاز وارتقاء اور اس عہد کے مؤرخین اور ان کی کتب تاریخ کے بارے میں جانا۔
- اس اکائی کے ذریعہ آپ نے عہد اموی کی ادبی صورت حال کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ شعر ونثر میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہوئے۔

- اس اکائی کے ذریعہ آپ کو اس عہد میں پروان چڑھنے والے ان ادبی علوم کے آغاز وارتقاء کے بارے میں پتہ چلا جن کا تعلق نثر سے ہے جیسے رسائل نگاری اور علم لغت۔
- اس اکائی کے ذریعہ آپ عہد اموی میں پروان چڑھنے والے سائنسی علوم کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
- ساتھ ہی ساتھ اس بات سے بھی واقف ہوئے کہ اس عہد میں کیونکر ترجمہ نگاری کا آغاز ہوا۔

24.9 نمونۂ امتحانی سوالات

24.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. سیرت نبوی پر سب سے پہلے کس نے کتاب لکھی تھی؟

a. عروہ بن زبیر　b. محمد بن اسحاق　c. ابن ہشام　d. ابن جریر طبری

2. کس اموی خلیفہ کو تاریخی کتابیں سننے کی عادت تھی؟

a. حضرت عمر بن عبدالعزیز　b. حضرت عبدالملک　c. حضرت خالد بن یزید　d. حضرت معاویہؓ

3. کتاب الملوک واخبار الماضیین کس کی تالیف ہے؟

a. عبید بن مروہ　b. ابن جریر طبری　c. عبید بن شریہ　d. ابومخنف ازدی

4. نقائض کا فروغ کس عہد میں ہوا تھا؟

a. عہد عباسی　b. عہد اموی　c. عہد اسلامی　d. عہد جاہلی

5. عبدالحمید کاتب کس خلیفہ کے سکریٹری تھے؟

a. حضرت عمر بن عبدالعزیز　b. حضرت مروان　c. حضرت خالد بن یزید　d. حضرت معاویہؓ

6. علم نحو کا بانی کون ہے؟

a. ابوالاسود دؤلی　b. ابوعمرو بن علاء　c. حضرت علیؓ　d. عبدالحمید کاتب

7. کس اموی خلیفہ کو سائنسی علوم سے دلچسپی تھی؟

a. حضرت معاویہ بن یزید　b. حضرت عبدالملک　c. حضرت خالد بن یزید　c. حضرت معاویہؓ

8. عمر بن ابی ربیعہ کس صنف سخن کا نمائندہ شاعر کہلاتا ہے؟

a. اباحی غزل　b. روایتی غزل　c. عذری غزل　d. مدح

9. عہد اموی میں ارسطو کے رسائل کا ترجمہ کس نے کیا تھا؟

a. سالم　b. عبدالحمید کاتب　c. فرزدق　d. جریر

10. سحبان وائل کس فن میں مشہور ہیں؟

a. شاعری　b. رسائل نگاری　c. لغت　d. خطابت

24.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. فن رسائل نگاری کے ارتقاء پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. علم لغت کے آغاز اور ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
3. عہد اموی میں ترجمہ نگاری کی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
4. عبدالحمید کاتب پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. عہد اموی میں فن خطابت کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔

24.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عہد اموی کے سیرت نبوی کے تحریری سرمایہ کا تعارف کرائیے۔
2. عہد اموی کے مورخین پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. عہد اموی کی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

24.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.	تاریخ ادب عربی	:	احمد حسن زیات، ترجمہ از عبدالرحمٰن طاہر سورتی
2.	تاریخ افکار وعلوم اسلامی (حصہ اول ودوم)	:	راغب الطباخ / افتخار احمد بلخی
3.	تاریخ اسلام (جلد دوم)	:	شاہ معین الدین احمد ندوی
4.	تاریخ تہذیب اسلامی (حصہ دوم)	:	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
5.	تدوین سیر و مغازی	:	قاضی اطہر مبارکپوری

-:oOo:-

نمونہ امتحانی پرچہ

پروگرام: بی اے، اسلامک اسٹڈیز

پہلا پرچہ (سیرت نبویؐ، خلافت راشدہ اور اموی دور)

ہدایات:

پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے: اول، دوم، سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1. حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (10×1=10 Marks)

i. بحیرہ احمر کا قدیم نام کیا ہے؟

a. بحیرہ روم b. بحیرہ عرب c. بحیرہ قلزم d. بحیرہ حجاز

ii. عرب عاربہ کون ہیں؟

a. بنو قحطان b. بنو عدنان c. بنو قریظہ d. تمام غلط

iii. آنحضور ﷺ کے دایہ اور خادمہ کا کیا نام تھا؟

a. ام ایمن b. قتیلہ بنت نوفل c. خنساء d. زینب

iv. ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کس کے مہمان ہوئے تھے؟

a. مقدادؓ b. ابوذر غفاریؓ c. ابوایوب انصاریؓ d. کلثومؓ

v. خندق کھودنے کا مشورہ کس صحابی نے دیا تھا؟

a. خالد بن ولید b. عبداللہ بن مسعود c. ابی بن کعب d. سلمان فارسی

vi. جھوٹے مدعیان نبوت میں سے ایک عورت تھی، اس کا نام کیا ہے؟

a. ام طلحہ b. خنساء c. سجاح d. تمام غلط

vii. مصر کی فتح کس خلیفہ کے زمانہ میں ہوئی تھی؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. معاویہؓ

viii. ہجری کیلنڈر کا آغاز کس کے عہد خلافت میں ہوا تھا؟

a. حضرت ابوبکرؓ b. حضرت عمرؓ c. حضرت عثمانؓ d. حضرت علیؓ

ix. ’’الجامع الاموی‘‘ کس خلیفہ کے زمانہ میں تعمیر کی گئی تھی؟

a. حضرت عمرؓ b. حضرت علیؓ c. عمر دومؒ d. تمام غلط

x. بنو امیہ کے ابتدائی دور میں کس دیوان کا کام مقامی زبان میں ہوتا تھا؟

a. دیوان الجند b. دیوان الخراج c. دیوان الخاتم d. دیوان البرید

ب۔ حصہ دوم آٹھ سوالات پر مبنی ہے، اور اس میں طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5×6=30 Marks)

2. جاہلی دور میں جزیرہ عرب کے سیاسی حالات پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

3. دور جاہلی میں جزیرہ عرب کے مذہبی حالات پر روشنی ڈالئے۔

4. نبی کریم کی بعثت پر گفتگو کیجیے۔

5. نبی کریم کا حجۃ الوداع پر ایک نوٹ لکھیے۔

6. خلافت راشدہ کے ارتقاء سے بحث کیجیے۔

7. خلافت راشدہ کی خصوصیات سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

8. اموی حکومت کے قیام و استحکام پر اختصار کے ساتھ ایک مضمون لکھیے۔

9. اموی عہد میں علوم عقلیہ کے میدان میں کیا ترقی ہوئی؟ واضح کیجیے۔

ج۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3×10=30 Marks)

10. بعثت سے پہلے کے آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ کے اہم واقعات قلم بند کیجئے۔

11. آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ پوری انسانیت کے لیے اسوہ ہے، کیسے؟ ایک مفصل وضاحتی نوٹ لکھیے۔

12. حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جھوٹے مدعیان نبوت کا مقابلہ کس طرح کیا؟ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیجیے۔

13. حضرت امام علیؓ کے انتخاب پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کے زمانہ کے اہم واقعات کا تفصیلی ذکر کیجیے۔

14. اموی حکومت کے نظم و نسق پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔

☆☆☆